
بہنوں کا اپنا ماہنامہ
شعاع
اپریل 2013

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری
پاکستان (سالانہ) ------ 600 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ ----- 5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا --- 6000 روپے



مستقل سلسلے

اپریل 2013
جلد 27 شمارہ 8
قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اُردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابنِ حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - مقام: 21/ای، پی ای سی ایچ ایس سوسائٹی، کراچی۔

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

رضیہ جمیل

پہلی بات

شعاع کا اپریل کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

شعاع کے سلسلے بلاشبہ منفرد ہیں۔ ہم نے یہ سلسلے اپنے قارئین کی شرکت کے لیے شروع کیے ہیں تاکہ ان کی صلاحیتیں سامنے آسکیں اور شعاع کی ترتیب میں ان کا بھی حصہ ہو۔

ہر ماہ ہمیں مختلف سلسلوں کے لیے قارئین کا انتخاب اور خطوط موصول ہوتے ہیں، جس سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ہماری قارئین نہ صرف ذہین ہیں بلکہ بہترین تخلیقی اور تنقیدی صلاحیتوں سے بھی مالا مال ہیں۔

اکثر قارئین کو شکایت ہوتی ہے کہ ان کے منتخب کردہ اشعار اور شاعری کے انتخاب کو جگہ نہیں دی جاتی۔ اشعار کے انتخاب کے سلسلوں کو شروع کرنے کا مقصد قارئین میں صاف ستھرا شعری ذوق پیدا کرنا ہے۔ آپ اچھے اشعار انتخاب کرکے بھجوائیں۔ ہم ضرور جگہ دیں گے۔

اسی طرح خطوط کے سلسلے میں ہماری ترجیح وہ خطوط ہوتے ہیں جن میں شعاع کی تعریف اور پسندیدگی کے اظہار کے ساتھ کہانیوں کا تفصیلی اور تنقیدی جائزہ بھی لیا گیا ہو۔ اور ہمیں مشوروں سے بھی نوازا گیا ہو تاکہ ان کی روشنی میں ہم پرچے کو مزید بہتر بنا سکیں۔

بہت سی قارئین سوال کرتی ہیں کہ انہوں نے افسانہ یا ناولٹ لکھا ہے۔ وہ بھجوا دیں؟ افسانہ بھجوانے کے لیے پوچھنے یا اجازت لینے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ آپ اپنی تخلیقات ضرور بھجوائیں۔ اچھی تحریروں کے لیے ہمارے دروازے ہمیشہ کھلے ہوئے ہیں۔ تاہم افسانے کی ایک نقل اپنے پاس ضرور رکھیں کیونکہ ہم ناقابل اشاعت تحریریں واپس نہیں بھجواتے۔

اس شمارے میں،

- نمرہ احمد کا مکمل ناول ۔ جنت کے پتے،
- عظمیٰ افتخار کا مکمل ناول ۔ زندگی خاک نہ تھی،
- آسیہ رزاقی، راشدہ رفعت، صائمہ اکرم اور فرحانہ ناز ملک کے ناولٹ،
- عاصمہ احمد علی، صدف آصف، میمونہ الکبریٰ اور سمیرا حمید کے افسانے،
- وہاج خان اور ثمینہ وہاج کا بندھن،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ ۔ دستک،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں ۔ احادیث کا سلسلہ،
- خط آپ کے، شعاع کے ساتھ ساتھ اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

شعاع آپ کا اپنا پرچہ ہے۔ ہم اس کا ہر شمارہ پوری محنت سے ترتیب دیتے ہیں۔ آپ ہمیں خط ضرور لکھیں تاکہ ہم آپ کی رائے سے آگاہ ہوسکیں۔

اپنی رائے سے ضرور نوازیے گا۔ ہم منتظر ہیں۔

حمد باری تعالیٰ

حوصلہ دے فکر کو اور بارش فیضان کر
ہے ثنا تیری بہت مشکل اسے آسان کر

رفتہ رفتہ کھول مجھ پر رازہائے جسم و جاں
دھیرے دھیرے مجھ پہ ظاہر تو مری پہچان کر

زیست کے تپتے ہوئے صحرا میں ہوں اس سے نکال
میرے سر پر بیکراں رحمت کی چادر تان کر

کفر آلود فضا میں سانس لینا محال ہے
پھر سے اس گم کردہ رہ کو صاحبِ ایمان کر

ختم ہو جائے بساطِ خاک کا سب شور و شر
بے سکونی کو عطا پھر حسنِ اطمینان کر!

خیمۂ شب سے یہی آواز آئی ہے صبیح
حمد لکھ اور اس طرح بخشش کا کچھ سامان کر

صبیح رحمانی

نعت رسولِ مقبول

جب نظر کے سامنے روضے کا منظر آئے گا
خود بخود میری زباں پر ذکرِ سرورؐ آئے گا

دیکھنا ہے سایۂ احمدؐ تو دیکھو عرش پر
آسماں کا سایا آخر کیوں زمیں پر آئے گا

مجھ کو نسبت ہے محمدؐ سے، نہیں دنیا کا خوف
مجھ سے ٹکرائی تو گردش کو بھی چکر آئے گا

تیرگی کو کاٹ دے گی جنبشِ نوکِ قلم
روشنی کے ہاتھ میں کرنوں کا خنجر آئے گا

میں ہوں مداحِ نبیؐ ممکن نہیں مجھ کو زوال
دیکھنا کس اوج پر میرا مقدر آئے گا

جس کے دل میں آئے گا کوکب محمدؐ کا خیال
بخت کی تاریکیوں میں مثلِ خاور آئے گا

کوکب مظہر خان

پیارے نبیﷺ کی پیاری باتیں

ادارہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی برکت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اس اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں! میں اپنا پیٹ بھوک کی شدت سے زمین پر ٹیک دیتا تھا اور (اسی طرح بعض دفعہ) بھوک کی شدت سے میں اپنے پیٹ پر پتھر باندھ لیتا تھا۔ ایک روز میں اس راستے پر بیٹھ گیا جہاں سے لوگ گزرتے تھے۔ چنانچہ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ (میرے پاس سے) گزرے تو میں نے ان سے کتاب اللہ کی ایک آیت کے متعلق پوچھا۔ میں نے تو ان سے اس لیے پوچھا تھا کہ وہ مجھے پیٹ بھر کر کھانا کھلادیں، لیکن وہ گزر ہی گئے اور کچھ نہ کیا۔ پھر میرے پاس سے عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ گزرے تو میں نے ان سے قران مجید کی ایک آیت کے متعلق پوچھا۔ میں نے تو ان سے بھی اسی لیے پوچھا تھا کہ وہ مجھے پیٹ بھر کر کھانا کھلادیں، لیکن وہ بھی گزر گئے اور انہوں نے بھی کچھ نہ کیا۔

پھر میرے پاس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم گزرے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس وقت مجھے دیکھا اور مسکرائے اور میرے چہرے اور دل کی کیفیت کو جان گئے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ "ابو ہریرہ!"

میں نے کہا۔ "حاضر اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم!"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "ساتھ آؤ۔" اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم چل پڑے۔ میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے ہولیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم گھر کے اندر تشریف لے گئے۔ میں نے اجازت طلب کی تو مجھے بھی اجازت مرحمت فرمادی اور میں بھی اندر چلا گیا۔

وہاں آپؐ نے دودھ کا ایک پیالہ پایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا۔

"یہ دودھ کہاں سے آیا؟"

گھر والوں نے کہا۔ "فلاں مرد یا فلاں عورت نے آپؐ کے لیے ہدیہ بھیجا ہے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "ابو ہریرہ!"

میں نے کہا۔ "اے اللہ کے رسولؐ (فرمائیے) حاضر ہوں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اہل صفّہ کے پاس جاؤ اور انہیں میرے پاس بلالاؤ۔"

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔ اہل صفّہ (درس گاہ نبوی کے طلبا) اسلام کے مہمان تھے۔ ان کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا، گھر بار تھا نہ کوئی مال اور نہ کسی اور کا سہارا۔ جب کبھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس صدقے کی کوئی چیز آتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی طرف بھیج دیتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود اس میں سے کچھ نہ لیتے۔ اور جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی ہدیہ آتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں بلا بھیجتے اور خود بھی اسے استعمال فرماتے اور انہیں بھی اس میں شریک فرماتے۔ چنانچہ اپنی اس عادت مبارکہ کے مطابق جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اہل صفہ کو بلالاؤ۔" تو آپؐ کی یہ بات مجھے ناگوار سی گزری (کہ ایک پیالہ دودھ ہے اور میں بھوک کی شدت سے نڈھال ہوں اور آپؐ مجھے پلانے کے

بجائے فرما رہے ہیں کہ اہل صفہ کو بلالاؤ۔)

میں نے (دل میں) کہا۔ اس دودھ سے اہل صفہ کا کیا بنے گا! میں اس بات کا زیادہ حق دار ہوں کہ میں اتنا پی لوں جس سے میں طاقت حاصل کرلوں۔ چنانچہ جب وہ آئیں گے تو آپؐ مجھے ہی حکم دیں گے کہ میں انہیں دوں، اور مجھے امید نہیں کہ اس دودھ کا کچھ حصہ مجھے بھی ملے۔ لیکن اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے بغیر چارہ نہیں۔

چنانچہ (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق) میں ان (اہل صفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کے پاس آیا اور انہیں بلایا، تو وہ سب آئے اور اندر داخل ہونے کی اجازت مانگی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اجازت دے دی اور وہ گھر میں اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھ گئے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

"اے ابو ہریرہ!"

میں نے کہا۔

"حاضر ہوں اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم!

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "یہ پیالہ پکڑو اور انہیں دو (باری باری پیش کرو)۔"

چنانچہ میں نے پیالہ لیا اور ایک ایک آدمی کو دینے لگا۔

ایک کو دیتا، تو وہ پیتا یہاں تک کہ سیراب ہوجاتا، پھر وہ پیالہ مجھے لوٹا دیتا۔

میں وہ دوسرے کو دیتا، پس وہ پیتا حتی کہ سیراب ہوجاتا، پھر وہ پیالہ مجھے لوٹا دیتا۔

پھر (اگلا آدمی) پیتا اور سیراب ہو کر مجھے واپس لوٹا دیتا۔

یہاں تک میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ گیا اور سب لوگ پی کر سیراب ہوچکے تھے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیالہ پکڑا اور اسے اپنے ہاتھ پر رکھا اور پھر میری طرف دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا۔

"اے ابو ہریرہ!"

میں نے کہا۔ "حاضر ہوں اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم!"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اب میں اور تم ہی باقی رہ گئے۔"

میں نے کہا۔ "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ نے سچ کہا۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "بیٹھ جاؤ اور پیو!"

چنانچہ میں بیٹھ گیا اور دودھ پیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر فرمایا۔ "اور پیو۔"

میں نے پھر پیا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہی فرماتے رہے "پیو!" (اور میں پیتا رہا) یہاں تک کہ میں نے کہا۔

"قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ بھیجا! اب میں کوئی گنجائش اس کے لیے اپنے اندر نہیں پاتا۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اچھا مجھے دکھاؤ۔" چنانچہ وہ پیالہ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دے دیا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی حمد کی اور اس کا نام لیا اور (سب کا) بچا دودھ پی لیا۔ (بخاری)

فوائد و مسائل:

(1) اس میں معجزہ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے علاوہ اصحاب صفہ کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور ان کا خیال رکھنے کا بیان ہے۔

(2) نبی صلی اللہ علیہ وسلم صدقے کی چیز نہیں کھاتے تھے، تاہم ہدیے کی چیز کھالیتے۔

(3) آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہدیے میں بھی دوسروں کو شریک فرماتے۔

(4) مسلمان کا بچا ہوا کھانا پینا جائز ہے، جیسے اس واقعے میں ہے۔

(5) مہمان کو مزید کھانے پینے کے لیے کہنے کا

استحباب۔

(6) اگر میسر ہو تو خوب سیر ہو کر کھانا پینا بھی جائز ہے۔ خاص طور پر غریب اور بھوکے ننگے کو شکم سیر کرنا مستحب ہے۔

صحابہ کی خودداری

محمد بن سیرین بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔

"میرا یہ حال ہوتا کہ میں منبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حجرے کے درمیان بے ہوش ہو کر گر پڑتا تو آنے والا آتا اور اپنا پاؤں میری گردن پر رکھ دیتا اور خیال کرتا کہ میں دیوانہ ہوں حالانکہ مجھے کوئی دیوانگی نہیں تھی۔ صرف بھوک تھی (جس کی شدت سے مجھے غشی آجاتی۔" (بخاری)

فوائد و مسائل:

گردن پر پیر رکھنے کا مقصد تحقیر و تنقیص نہیں ہوتا تھا بلکہ یہ عام خیال تھا کہ اس طرح بے ہوش آدمی ہوش میں آجاتا ہے۔ اس میں صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ابتدائی تنگی کے ذکر کے علاوہ ان کی خودداری اور صبر و قناعت کا بھی بیان ہے۔

وصال کے وقت

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات اس حال میں ہوئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زرہ ایک یہودی کے پاس 30 صاع جو کے بدلے میں گروی رکھی ہوئی تھی۔ (بخاری و مسلم)

فائدہ:

اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زہد کے بیان کے علاوہ اہل کتاب سے ادھار وغیرہ کا معاملہ کرنے کا جواز ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اصحاب ثروت صحابہ کے بجائے ایک یہودی سے قرض اسی جواز کی وضاحت کے لیے لیا، یا اس لیے کہ صحابہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی معاوضہ یا رقم واپس لینا پسند نہ فرماتے جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طبع غیور کو یہ پسند نہیں تھا۔

قناعت

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زرہ جو کے بدلے میں گروی رکھی۔ اور میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جو کی روٹی اور پگھلی ہوئی چربی، جس میں کچھ تغیر آچکا تھا، لے گیا اور میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے یہ فرماتے ہوئے سنا۔

"محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے گھر والوں کے پاس صبح اور شام کو ایک صاع خوراک بھی نہیں ہوتی۔" حالانکہ وہ نو (9) گھر تھے۔" (بخاری)

سادگی

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر چمڑے کا تھا جس میں کھجور کے درخت کی پتلی چھال بھری ہوئی تھی۔ (بخاری)

فوائد و مسائل

(1) ان احادیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سادگی کا جو نمونہ ملتا ہے وہ آج کل کی پرتکلف معاشرت سے کس قدر مختلف ہے جسے مسلمانوں نے بھی اپنا لیا ہے۔ کاش! مسلمان اپنے پیغمبر کی سادگی کو اختیار کریں۔

(2) نرم گداز بستر انسان کو غافل کر دیتا ہے اور رات کو اٹھنا بھی نہایت گراں گزرتا ہے، پھر نرم بستر پر نیند بھی زیادہ گہری آتی ہے۔

عیادت

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے

کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک انصاری آدمی آیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کیا، پھر وہ واپس جانے لگا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اے انصار کے بھائی! میرے بھائی سعد بن عبادہ کا کیا حال ہے؟"

اس نے کہا۔ "ٹھیک ہیں۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "تم میں سے کون ان کی عیادت کے لیے تیار ہے؟"

چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو گئے اور ہم بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے اور ہم دس سے کچھ اوپر تھے۔ ہمارے پاس جوتے تھے نہ موزے، ٹوپیاں تھیں نہ قمیصیں۔ اس شوریلی زمین میں ہم پیدل چل رہے تھے، یہاں تک کہ ان کے پاس پہنچ گئے۔ چنانچہ ان کے گھر والے، ان کے پاس سے پیچھے ہٹ گئے، یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے، وہ ان کے قریب ہو گئے۔ (مسلم)

فوائد و مسائل:

(1) اس حدیث میں صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی جو کیفیت بیان کی ہے، اس کی مناسبت باب سے واضح ہے کہ ان میں کس قدر غربت اور سادگی تھی۔

(2) دوسرا نکتہ اس میں یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنا بھائی کہا۔ جس سے معلوم ہوا کہ ہر مسلمان کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک رشتہ دینی اخوت کا بھی ہے۔

(3) جگہ تنگ ہو تو گھر والوں کو چاہیے کہ مزاج پرسی کے لیے آنے والوں کے لیے جگہ خالی کر دیں تاکہ وہ مریض کے پاس چند لمحے بیٹھ کر مریض کی عیادت کریں۔

مال جمع کرنا

حضرت ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اے فرزند آدم! اگر تو زائد از ضرورت مال اللہ کی راہ میں خرچ کرے گا تو تیرے لیے بہتر ہو گا اور اگر تو اسے روکے گا تو تیرے لیے برا ہو گا۔ اور برابر سرابر مال پر تو ملامت کے لائق نہیں ہو گا۔ اور (خرچ کرنے کی) ابتدا ان لوگوں سے کر جن کے اخراجات زندگی کا ذمہ دار تو ہے۔" (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔)

فوائد و مسائل:

(1) اس میں جہاں اپنی اور اپنے اہل و عیال کی ضرورت کے مطابق مال رکھنے کی اجازت بلکہ تاکید اور حکم ہے، وہاں دوسری طرف ضرورت سے زائد مال کو ضرورت مندوں پر خرچ کرنے کا استحباب بھی ہے۔

(2) مال کے روکے رکھنے کو انسان کے حق میں برا قرار دیا گیا ہے کیونکہ اس کا نتیجہ دنیا اور آخرت دونوں جگہ صحیح نہیں۔ دنیا میں دولت کے ارتکاز (جمع کرنے) سے گردش دولت رک جاتی ہے۔ جس سے معاشرے میں بہت سی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور آخرت میں تو اس بخل کا انجام بد واضح ہی ہے۔

(3) بعض علما کے نزدیک سالانہ زکاۃ کی ادائی کے بعد مزید خرچ کرنا ضروری نہیں۔ لیکن صحیح تر بات یہ ہے کہ زکوٰۃ کی ادائی کے بعد بھی اگر کسی کے پاس دولت موجود ہے اور اہل حاجت بھی اس کے علم میں ہوں تو ان پر خرچ کرنا اس کے لیے مستحب ہی نہیں، ضروری ہے۔

کافی ہے

حضرت عبید اللہ بن محصن انصاری خطمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وسلم نے فرمایا۔
"جو شخص تم میں سے اس حال میں صبح کرے کہ وہ اپنے گھر یا قوم میں امن سے ہو' جسمانی لحاظ سے تندرست ہو اور ایک دن کی خوراک اس کے پاس موجود ہو تو گویا اس کے لیے دنیا اپنے تمام تر سازوسامان کے ساتھ جمع کردی گئی۔" (اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے۔ یہ حدیث حسن ہے۔)

فوائدومسائل :

(1) امن اور صحت کے ساتھ ایک دن کی خوراک فی الواقع بہت بڑی نعمت ہے 'گویا اسے ایسی آسودگی حاصل ہوگئی جیسی کسی کو ساری دنیا مل جانے پر ہوسکتی ہے۔ اور اگر امن یا صحت نہ ہو تو دنیا بھر کے خزانے بھی انسان کے لیے بے کار ہیں کیونکہ دولت کے انبار انسان کو امن فراہم کرسکتے ہیں نہ صحت۔
(2) اس میں بالواسطہ یہ نصیحت بھی ہے کہ انسان کو دولت کے پیچھے نہیں بھاگنا چاہیے بلکہ صبرو قناعت کا راستہ اختیار کرنا چاہیے کہ اسی میں امن و سکون اور راحت و آسائش ہے' ورنہ اس سراب کے تعاقب میں سب کچھ گنوا بیٹھنے کا خدشہ ہے۔

کامیاب

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالی عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"وہ شخص کامیاب ہوگیا جس نے اسلام قبول کرلیا اور اسے برابر سرابر روزی حاصل ہوئی اور اللہ نے اسے اپنے دیے ہوئے پر قانع بنادیا۔" (مسلم)

فوائدومسائل :

(1) کامیابی آخرت میں اللہ کی رحمت و مغفرت سے شاد کام ہونا ہے اور اللہ کی رحمت حاصل کرنے کا ذریعہ صرف اور صرف اسلام ہے۔ اگر بدقسمتی سے انسان کا دامن دولت اسلام سے خالی ہے تو دنیا بھر کے خزانے بھی اسے اخروی کامیابی سے ہمکنار نہیں کرسکتے۔ بلکہ دنیا سے آنکھیں موند لینے کے بعد عذاب الٰہی کے شکنجے میں کس دیا اور جہنم کی بیڑیوں میں اسے جکڑ دیا جائے گا اور یوں یہ ناکام ترین انسان ہوگا۔
(2) اسی طرح بقدر کفاف (روز مرہ ضرورت کے مطابق) روزی کے ساتھ قناعت و استغفار کامل جانا بھی امن و سکون کی ضمانت ہے۔ ورنہ دنیا کی حرص اور زیادہ سے زیادہ دولت کمانے کی خواہش اور کوشش انسان کا سکون چھین لیتی ہے۔ اس لیے ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ تونگری زیادہ سازوسامان کا نام نہیں بلکہ اصل تونگری نفس کی تونگری ہے۔

زہد

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالی عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کئی کئی راتیں متواتر بھوکے گزار دیتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والوں کو بھی رات کا کھانا میسر نہ ہوتا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اکثر روٹی' جو کی روٹی ہوتی۔ (اسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے۔ یہ حدیث حسن صحیح ہے۔)

فوائدومسائل :

اس میں بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے زہد اور تنگ دستی کا تذکرہ ہے۔

ینگ ھٹ

وہاج خان ہمراہ ثمینہ وہاج خان

وہاج خان

شوبز ایک ایسی فیلڈ ہے' جہاں لوگ قدرے آزادانہ ماحول میں کام کرتے ہیں۔ پھر اکثر ڈراموں کا موضوع "محبت" ہی کو بنایا جاتا ہے۔ ڈرامے کے موضوعات اور کہانیوں کا اثر اکثر ناظرین بہت زیادہ قبول کرتے ہیں۔ جب عام ناظرین ان موضوعات کے اثر سے نہیں بچ سکتے تو ان ڈراموں میں کام کرنے والے افراد پر ان اثرات کا مرتب ہونا لازمی امر سمجھا جاتا ہے۔ یوں فنکاروں کی جانب سے پسند کی شادیوں کی توقعات زیادہ رکھی جاتی ہیں۔ تاہم ایسے میں جب وہاں سے کسی مکمل ارینج میرج کی خبر آتی ہے تو بے حد خوش گوار حیرت ہوتی ہے۔ معروف نوجوان فنکار وہاج خان بھی ایسے ہی فنکار ہیں' جنہوں نے خالصتاً" گھر والوں کی پسند سے شادی کی ہے اور وہ ایک نہایت کامیاب اور خوش گوار گھریلو زندگی بھی گزار رہے ہیں۔ ان کے خیال میں انہوں نے ارینج میرج کرکے کوئی غلطی نہیں کی ہے اور وہ بہت خوش ہیں۔
"کیسے ہیں وہاج خان!"
"الحمدللہ۔"
"کچھ اپنے بارے میں بتائیں۔"
"میرا تعلق سرگودھا سے ہے۔ ہم چار بھائی ہیں۔ میں بڑا ہوں سب سے۔ مجھ سے چھوٹا بھائی وحید اٹلی میں رہتا ہے۔ وہاں جاب کرتا ہے۔ اب وہ بھی باہر جانے کی تیاری کررہا ہے۔ سب سے چھوٹا زوہیب ایم کام کررہا ہے' ہمارے والد کا انتقال ہوچکا ہے' والدہ حیات ہیں' اللہ انہیں لمبی زندگی دے۔ میں 25 اپریل کو پیدا ہوا تھا۔"
"اچھا گڈ! آپ کی شادی بھی تو اپریل میں ہوئی ہے نا؟"
"جی بالکل... اور دلچسپ بات بتاؤں اپریل کے بارے میں کہ میں پیدا بھی اپریل میں ہوا' شادی بھی اپریل میں ہوئی' میری پہلی فلم جو ریلیز ہوئی وہ 4 اپریل کو ہوئی اور جب میں شوبز میں آیا' وہ بھی اپریل کا ہی مہینہ تھا۔"
"کتنے سال ہوگئے ہیں شادی کو؟"
"22 اپریل کو پورے سات سال ہوجائیں گے۔"
"شادی میں آپ کی پسند کا کتنا دخل تھا؟"
"میں نے تو دیکھا بھی نہیں تھا۔ میری امی کی پسند تھی' میں نے تو شادی کے دن ہی دیکھا تھا۔ مکمل طور پر ارینج میرج تھی۔"
"آپ شوبز سے ہیں' آپ کا دل نہیں چاہا کہ پسند سے کریں؟"
"اصل میں اس جگہ شادی ہونے سے پہلے دو جگہ سے میرا دل ٹوٹ چکا تھا۔ عشق کے بخار میں جب دل دو مرتبہ ٹوٹا تو پھر اس کے بعد حالات کچھ ایسے ہوگئے کہ میں نے سوچا کہ یہ سب کچھ بھاڑ میں جائے' پھر ان دنوں والد کا بھی انتقال ہوگیا تھا تو میں بہت ٹینشن میں تھا اور اتنا میچور بھی نہیں تھا۔ میں اپنی والدہ سے بہت پیار کرتا ہوں۔ میں نے اپنی والدہ سے کہہ دیا کہ جو آپ کو پسند ہو' مجھے منظور ہے۔ ہاں! بس میں نے یہ

ضرور کہا تھا کہ لڑکی پڑھی لکھی ہو کہ کل کو ہماری اولاد کی تربیت اچھے انداز میں ہو۔ پھر اللہ کا بڑا شکر ہے کہ پڑھی لکھی اور خوب لڑکی مل گئی اور اللہ کا شکر ہے کہ بہت اچھی گزر رہی ہے۔"

"من پسند خوب صورت اور پڑھی لکھی بیوی مل گئی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر کیا کرتے؟"

"کرنا کیا تھا' کمپرومائز کر رہا ہوتا یا شاید دوسرے اداکاروں کی طرح دو دو' تین تین شادیاں کر رہا ہوتا۔ ویسے مجھے اپنی ماں کی پسند پر پورا بھروسا تھا۔"

"بچوں کے بارے میں بتائیں؟"

"ماشاء اللہ تین بچے ہیں۔ بیٹی بڑی ہے' پھر دو بیٹے ہیں۔ سب سے چھوٹا بیٹا چھ ماہ کا ہے۔"

"تو اپنی کامیاب شادی پہ لوگوں کو ارینج میرج کا ہی مشورہ دیں گے؟"

"اب جب کبھی میں اپنی محبت کے بارے میں سوچتا ہوں تو ہنستا ہوں' کیونکہ ہم جن سے محبت کر رہے ہوتے ہیں' ان سے بعض اوقات جھوٹ بول رہے ہوتے ہیں جو بعد میں جھگڑے کا باعث بنتے ہیں' یہی وجہ ہے کہ نوے فیصد لو شادیاں ناکام ہوتی ہیں۔"

"شادی کی ناکامی کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے' لڑکی پہ یا لڑکے پر؟"

"دونوں پر منحصر ہے۔ کسی ایک کو قصوروار نہیں کہہ سکتے۔"

"مگر ارینج میرج میں تو نہ مزاج کا پتا ہوتا ہے' نہ سگھڑاپے کا۔ بعد میں خامیاں نکلتی ہیں تو لڑکا پریشان ہو جاتا ہے' تو ثمینہ کو کیسا پایا آپ نے؟"

"بہت اچھا اور میں سمجھتا ہوں کہ میں اس معاملے میں بہت بہت لکی ہوں۔ میری بیوی بہت اچھی کک ہے اور روایتی بیوی کی طرح سگھڑ ہے۔ گھرداری کرنا' بچوں کی پرورش کرنا' ان کی تعلیم و تربیت کرنا' میری ماں کا خیال رکھنا' ایک مکمل بیوی والی ساری خوبیاں موجود ہیں۔ میں بہت ــــ خوش نصیب ہوں کہ مجھے اتنی اچھی بیوی ملی۔"

"آپ چاہیں گے آپ کی بیگم بھی گھر سے باہر نکلیں اور کمائیں؟"

"ابھی تو نہیں' کیونکہ ابھی بچے چھوٹے ہیں اور کچھ ذمہ داریاں بھی ہیں اس پہ۔ ویسے وہ بیوٹی پارلر کا کام بھی جانتی ہے اور ہومیوپیتھک ڈاکٹر بھی بن رہی ہے۔ تو فیوچر میں کبھی پانچ' سات سال بعد شاید وہ اپنی تعلیم کو کام میں لائے۔"

"بیگم نے کبھی الگ رہنے کی فرمائش کی؟"

"نہیں' نہیں ــــ ثمینہ نے کبھی ایسی فرمائش نہیں کی۔ وہ یہ ضرور کہتی ہے کہ اللہ ہمیں اپنا ایک گھر دے اور ایک وقت آتا ہے کہ علیحدہ ہونا پڑتا ہے' جب بچے بڑے ہو جاتے ہیں اور گھر چھوٹے پڑنے شروع ہو جاتے ہیں کیونکہ پھر دوسرے بھائیوں کی بھی شادیاں ہوں گی۔ ساری تبدیلیاں آہستہ آہستہ وقت کے ساتھ ہوتی چلی جاتی ہیں' مگر ابھی ایسا کوئی چکر نہیں ہے۔"

"مزاج کی کیسی ہیں ثمینہ؟"

"ثمینہ میں دو ہی خامیاں ہیں۔ ایک تو غصے کی تیز ہے اور دوسری خامی یہ کہ شک کرتی ہے۔ پہلے تو بہت شک کرتی تھی' مگر اب اس میں ستر فیصد کمی آگئی ہے۔ اتنا عرصہ گزرنے کے بعد بیگم نے سوچا ہو گا کہ بندہ ٹھیک لگ رہا ہے۔"

"بچت کی عادت کس کو ہے اور فضول خرچ کون ہے؟"

"میں فضول خرچ ہوں اور ثمینہ کو بچت کی عادت ہے۔ میں زیادہ تر ہوٹلنگ اور موبائل پہ خرچ کرتا ہوں ــــ فیملی پہ بھی اور کپڑوں پر بھی ــــ اسے آپ فضول خرچی میں شمار نہیں کر سکتیں۔"

"جن لوگوں کی ابھی شادی نہیں ہوئی ان کے لیے کچھ کہنا چاہیں گے؟"

"میری جب شادی ہوئی تھی تو نہ ہی میرے پاس پیسہ تھا اور نہ ہی میں کچھ خاص اسٹیبلش ہوا تھا۔ یہ بات مجھے بہت محسوس ہوتی تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ



شادی انسان کو اس وقت کرنی چاہیے جب وہ اسٹیبلش ہو۔ تو میں لوگوں سے بلکہ نوجوانوں کو یہی کہوں گا کہ شادی ضرور کریں' مگر اس وقت جب آپ اپنے پیروں پر کھڑے ہو چکے ہوں۔ کیونکہ شادی کے بعد ذمہ داریاں بڑھتی ہیں' فیملی بڑھتی ہے تو یہ سب کچھ پیسے کے بغیر ناممکن ہے۔"

مسز ثمینہ وہاج خان

"کیسی ہیں مسز وہاج! کچھ اپنے بارے میں بتائیے۔"

"جی! اللہ کا شکر ہے' میرا تعلق گجرات سے ہے۔ ہم سات بہن بھائی ہیں میں سیکنڈ لاسٹ ہوں' میری تاریخ پیدائش 9 مارچ ہے۔ میرے والد واپڈا میں تھے اور والدہ ہاؤس وائف تھیں' دونوں کا انتقال ہو چکا ہے۔ میں گریجویٹ ہوں اور اب ہومیوپیتھک ڈپلوما کر رہی ہوں اور تھرڈ ایئر میں ہوں۔"

"اچھا ــــ گڈ ــــ ہومیوپیتھک ڈاکٹر بننے کا کیوں شوق ہوا؟"

"مجھے ہمیشہ سے ہی ہومیوپیتھک ڈاکٹر بننے کا شوق تھا' مگر مواقع نہیں ملے۔ ہماری فیملی میں میری بہن کا بھی کلینک ہے اور سسرال میں بھی کچھ لوگ اس فیلڈ سے ہیں۔"

"شادی کو ماشاء اللہ سات سال ہو گئے ہیں' آپ کی پسند سے ہوئی؟"

"ہماری مکمل طور پر ارینج میرج ہے' ہم دونوں ایک ہی برادری سے ہیں' لیکن بہت ہی دور کی رشتے داری ہے۔"

"وہاج صاحب کا تعلق شوبز سے تھا اور شوبز کی کمائی کو ہوائی روزی کہتے ہیں' تو گھر والوں نے کوئی اعتراض کیا تھا؟"

"جی ہاں ــــ پاپا نے تھوڑا سا اعتراض کیا تھا مگر ان کی طرف سے کہا گیا کہ شوقیہ کر رہے ہیں' لیکن بعد میں انہوں نے اسے پروفیشن بنا لیا' تو بس اللہ کا شکر ہے' کچھ زیادہ مسائل سامنے نہیں آئے۔"

"فیلڈ خطرناک ہے اور آئے دن گھر سے باہر بھی رہتے ہیں' ڈر لگتا ہے؟"

"شروع شروع میں لگتا تھا' مگر اب ایسا نہیں ہے' کیونکہ انہوں نے یہ ثابت کردیا ہے کہ یہ بہت اچھے شوہر ہیں اور جہاں تک گھر سے باہر رہنے کی بات ہے تو ظاہر ہے کہ یہ ان کا پروفیشن ہے' مگر فارغ ہوتے ہی گھر کی راہ لیتے ہیں اور ہم سب کو پورا ٹائم دیتے ہیں' کوئی شکایت نہیں ہے مجھے ان سے۔"

"کبھی ان کے ساتھ شوٹنگ وغیرہ پہ گئیں یا آپ کا دل چاہا اس فیلڈ میں آنے کا؟"

"جی! شروع کے تین ساڑھے تین سال تو میں ان کے ساتھ جاتی تھی' مگر پھر بچوں کی وجہ سے مصروفیات اتنی ہو گئیں کہ میں نے جانا چھوڑ دیا۔ میرا تو کبھی بھی دل نہیں چاہا اس فیلڈ میں آنے کا' نہ یہ چاہتے تھے اور نہ ہی میرے گھر والے چاہتے تھے کہ میں اس فیلڈ میں آؤں۔ اندر سے ہمارے سارے مرد دیسی بندے ہیں۔" (قہقہہ)

"آپ کو جوائنٹ فیملی اچھی لگتی ہے یا علیحدہ گھر ہونا چاہیے' لڑکیوں کا تو خواب ہوتا ہے علیحدہ گھر۔"

"جوائنٹ فیملی بھی اچھی ہے اور اب میں کیا جواب دوں آپ کے سوال کا۔ ابھی وہاج پر بہت ذمہ داریاں ہیں۔ ان شاء اللہ وقت کے ساتھ ساتھ سب ٹھیک ہو جائے گا' کچھ عرصہ قبل میری ساس عمرے پر گئی تھیں تو ان کے جانے سے گھر بالکل خالی خالی لگ رہا تھا۔ وہ واپس آئیں تو سکون ملا۔"

"میاں صاحب گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹاتے ہیں؟ کبھی آپ کی خدمت خاطر کی؟"

"میاں صاحب؟ نہیں جی... بالکل نہیں' انہیں تو صرف انڈا ابالنا آتا ہے اور چائے بنانی آتی ہے اور میں جب کبھی بیمار ہوتی ہوں تو خدمت خاطر کرتے ہیں' ورنہ تو جناب بیٹھ کر کھانے والوں میں سے ہیں۔ (قہقہہ) مذاق کر رہی ہوں۔ یہ بچوں کی تربیت میں بہت ہاتھ بٹاتے ہیں۔ جب گھر آتے ہیں تو بچوں کو زیادہ سے زیادہ وقت دیتے ہیں۔"

"مزاج کے کیسے ہیں؟ رومانٹک ہیں؟"

"نہیں کبھی کبھی غصہ آتا ہے اور بہت زیادہ آتا ہے' مگر کنٹرول کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ غصے میں گھر نہیں بیٹھتے۔ بلکہ باہر نکل جاتے ہیں۔ شوبز کا بندہ ہو اور رومانٹک مزاج نہ ہو' یہ کیسے ممکن ہے۔ اگر کبھی ہماری لڑائی ہو تو کبھی یہ منا لیتے ہیں۔ کبھی میں منا لیتی ہوں' ویسے زیادہ تر لڑائی تب ہوتی ہے' جب یہ میری کال ریسیو نہیں کرتے تو میں پریشان ہو جاتی ہوں کہ خیریت سے ہوں۔"

"فضول خرچ کون ہے' گھر کا بجٹ کس کے ہاتھ میں ہے' اور کھانا خود ہی پکاتی ہیں؟"

"وہاج کے ہاتھ میں پیسہ ٹکتا ہی نہیں ہے۔ ادھر آئے گا' ادھر چلا جائے گا۔ گھر کا بجٹ میری ساس کے ہاتھ میں ہے' مجھے جتنی ضرورت ہوتی ہے' میں ان سے لے لیتی ہوں' کھانا خود ہی پکاتی ہوں' کیونکہ وہاج کو میرے ہاتھ کا پکا ہوا بہت پسند ہے۔ انہیں میرے ہاتھ کی دال ماش اور مٹن کڑاہی بہت پسند ہے' کھانے کے شوقین ہیں' لیکن ڈائٹنگ کی وجہ سے بہت کم کھاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ تمہارے ہاتھ کے مزے دار کھانے کھا کر تو میں موٹا ہو جاؤں گا۔"

"رخصتی کے وقت کیا احساسات تھے اور ہنی مون منانے کہاں گئی تھیں؟"

"میں رخصت ہو کر کافی دور آئی تھی تو بہت عجیب سے احساسات تھے' سب سے زیادہ میں اپنی امی کو مس کر رہی تھی۔ ہنی مون کے لیے یہ مجھے کراچی لے کر آئے تھے' چونکہ میں کراچی پہلی مرتبہ آئی تھی تو انہوں نے کہا کہ یہی ہمارا ہنی مون ہے۔"

"منہ دکھائی میں کیا ملا تھا اور سالگرہ مناتی ہیں شادی کی؟"

"منہ دکھائی میں سونے کا لاکٹ ملا تھا' ہم شادی کی سالگرہ مناتے ہیں' اس دن گھر سے باہر کھانا کھانے ضرور جاتے ہیں۔"

"شادی کے بعد لڑکی کی ساری ذمہ داری شوہر کے سر پر ہوتی ہے' آپ کے خیال میں لڑکیوں کو خود بھی

کمانا چاہیے یا بس مل گیا کمانے کھلانے والا' اب کیا کرنا ہے کام کرکے؟"

"میں تو کہتی ہوں کہ ساری ذمہ داری شوہر پر نہیں ڈالنی چاہیے' بلکہ لڑکیوں کو بھی کمانا چاہیے' اگر پڑھی لکھی ہے تو ضرور کمائے' ان شاءاللہ جب میں ڈاکٹر بن جاؤں گی تو یہ ضرور مجھے پریکٹس کی اجازت دیں گے' فی الحال تو کچھ کرنے اجازت نہیں ہے۔"

"میاں صاحب کی کوئی اچھی اور بری عادت بتائیں؟"

"غصے کے تیز ہیں' بس یہی بری عادت ہے اور باقی تو ماشاءاللہ سب ہی اچھی عادتیں ہیں۔"

"جب وہاج آٹھ دس دن کے بعد گھر آتے ہیں تو گھر کی ساری روداد بتاتی ہیں یا نہیں؟"

(قہقہہ۔۔۔) "روداد؟ اب تو ہر پانچ دس منٹ بعد یا آدھے ایک گھنٹے کے بعد فون کرتے ہیں تو اسی وقت ساری باتیں گوش گزار کردیتی ہوں۔ اب انتظار نہیں ہوتا اور یقین کریں کہ بعض اوقات تو کچھ بتانے کے لیے ہوتا بھی نہیں ہے' اتنے ایک دوسرے کو فون کرتے ہیں۔ موبائل نے کام بہت آسان کردیا ہے۔"

"شادی کے دوران کوئی خاص واقعہ ہوا؟ رسم و رواج میں بوریت ہوئی؟"

"نہیں' کوئی واقعہ نہیں ہوا' رسمیں بھی انجوائے کیں' ہاں! بس لمبا سفر تھا تو تھکاوٹ بہت ہوگئی تھی' میرا میکہ گجرات میں اور سسرال سرگودھا تو کافی لمبا سفر ہوگیا تھا' جب گھر پہنچی تو بہت تھک چکی تھی۔"

"ہمارے مذہب میں چار شادیوں کی اجازت ہے' ان کی فیلڈ بھی خطرناک ہے تو اگر انہوں نے دوسری شادی کرلی (خدانخواستہ) تو آپ کا کیا ردعمل ہوگا؟"

"بالکل بھی اجازت نہیں دوں گی اور یہ ایسا کریں گے بھی نہیں۔ اگر خدانخواستہ ایسا کیا تو بچوں کو لے کر کہیں چلی جاؤں گی۔"

"وہاج فیشن پرست ہیں' چاہتے ہیں کہ آپ بھی فیشن کریں؟"

"فیشن پرست تو نہیں ہیں' لیکن ان کا دل چاہتا ہے کہ جب یہ گھر آئیں تو میں انہیں تیار ملوں اور شادی کے شروع دنوں میں ساڑھی پہننے کی بہت فرمائش کرتے تھے' مگر اب ایسا نہیں ہے' اب سب چلتا ہے۔ (قہقہہ۔۔۔) تھوڑی پرانی ہوگئی ہوں اس لیے۔"

"شادی کے فائدے ہیں یا نقصان ہیں؟"

"فائدے ہیں' نقصان کوئی نہیں ہے' ایک اچھا لائف پارٹنر مل جاتا ہے' پیارے پیارے بچے مل جاتے ہیں' اپنی ایک فیملی بن جاتی ہے تو نقصان تو بالکل بھی نہیں ہے۔"

"شادی کے لیے لڑکی کا خوب صورت ہونا کتنا ضروری ہے اور کیا عمر ہونی چاہیے؟"

"خوب صورتی کا تو کچھ نہیں کہہ سکتی' یہ تو نصیب کی بات ہوتی ہے اور لڑکی کی عمر بیس یا بائیس سال اور لڑکے تو تیس کے بھی ہوں تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"اور آخر میں بتائیں کہ انہوں نے کمرے میں آکر کیا کہا تھا اور اس انٹرویو کے ذریعے آپ کچھ کہنا چاہیں گی؟"

"میں ان سے کوئی بات نہیں چھپاتی' سب باتیں کہہ دیتی ہوں' ویسے یہ بہت اچھے شوہر ہیں' اپنی ماں کے بہت اچھے بیٹے ہیں اور بچوں کے لیے بہت اچھے باپ ہیں۔

کمرے میں آکر انہوں نے I Love You کہا تھا اور ہاں یہ بتاؤں کہ میں انہیں وسیم کہتی ہوں اور گھر میں بھی سب ان کو وسیم ہی کہتے ہیں؟"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے انٹرویو کا اختتام کیا۔

سرورق کی شخصیت

ماڈل	علینہ
میک اپ	روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافر	موسیٰ رضا

دستک دستک دستک

شاہین رشید



محمد قوی خان

"آج کل آپ کو مختلف ڈراموں میں دیکھ رہے ہیں۔۔۔ بہت اچھا لگتا ہے آپ سینئرز فنکاروں کو دیکھ کر۔"

"محبت ہے آپ کی۔"

"آپ کا شمار اب لیجنڈ اداکاروں میں ہوتا ہے۔ لوگ تو ہاتھوں ہاتھ لیتے ہوں گے آپ کو؟"

"بالکل لیتے ہیں۔ لوگ بہت پیار کرتے ہیں۔ محبت سے پیش آتے ہیں۔ بس اگر قدر نہیں کرتی تو ہماری یہ حکومت اور حکومت کے ادارے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ ہم تو صرف عوام کے لیے لیجنڈ ہیں۔ حکومت ہمیں کوئی اہمیت نہیں دیتی۔ حکومت کی کوئی تقریب ہو اور ہماری ضرورت ہو تو ہمیں دعوت نامہ تو آجاتا ہے' مگر ٹکٹ نہیں ملتا۔ اب جیسے گزشتہ سال پی ٹی وی ایوارڈ کی تقریب تھی۔ کہا' آپ آئیے۔۔۔ بھئی! کیسے آتے' پیسے لگتے ہیں۔ اتنا نہ ہوا کہ لیجنڈ اداکار کو ایک ٹکٹ ہی بھیج دیں۔"

"ایوارڈز تو ماشاءاللہ بہت ملے ہوں گے آپ کو؟"

"بالکل۔۔۔ ماشاءاللہ بہت ملے ہیں۔ تم یقین کرو بی بی! کہ میرے گھر میں تمہیں ایوارڈز کا انبار نظر آئے گا۔"

"ناانصافیوں پر غصہ آتا ہے؟"

"بہت غصہ آتا ہے۔ عمر کے ساتھ ساتھ غصہ بڑھتا جاتا ہے۔ مگر میرے غصے میں کمی آگئی ہے۔ پہلے میں غصے میں بہت توڑ پھوڑ کرتا تھا۔ مگر اب خاموشی اختیار کرلیتا ہوں۔ درگزر کرتا ہوں۔ کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔"

"ڈپریشن کا شکار ہوتے ہیں؟"

"بہت ہوتا ہوں۔ اپنے دل کی بات کسی سے شیئر نہیں کرتا۔ تنہائی میں اپنے اللہ سے اور اپنے آپ سے باتیں کرتا ہوں۔ کبھی کبھی روتا بھی ہوں۔ مگر کسی کے سامنے رونا پسند نہیں کرتا۔ شاید یہ میری ایک بڑی

خامی ہے۔"

"ملک کے حالات دیکھ کر دکھ ہوتا ہے؟"

"دکھ؟ بہت چھوٹا لفظ ہے۔ بہت رونا آتا ہے، بہت ڈپریشن ہوتا ہے۔ اب یہ ملک اپنا ملک ہی نہیں لگتا۔ جان ہتھیلی پہ آگئی ہے لوگوں کی۔ کب مسلے اور کچلے جائیں۔ کچھ پتا نہیں ہے۔ اللہ اس ملک کی حفاظت کرے، بندوں نے تو بہت ہی مایوس کیا ہے۔"

"قسمت اور حالات انسان کے اختیار میں ہوتے ہیں؟"

"نہیں! میرے خیال سے نہیں۔ ویسے میں قائل دونوں کا ہوں۔ کیونکہ تقدیر میں جو لکھا ہوتا ہے، ہم اس سے ناواقف ہوتے ہیں۔ لہٰذا لکھے کو پانے کے لیے تدبیر کرتے ہیں، اس لیے ناکامی اور کامیابی کا فیصلہ اوپر والا کرتا ہے اور ہمیں اوپر والے کے فیصلے کو دل سے قبول کرلینا چاہیے۔"

"بالکل ٹھیک کہا آپ نے۔ اپنی زندگی سے خوش ہیں؟"

"بہت.... اللہ سے جو مانگا ملا۔ الحمدللہ! بہت خوش قسمت انسان سمجھتا ہوں اپنے آپ کو۔"

عظمیٰ طاہر

"کیسی ہو عظمیٰ.... بہت دنوں کے بعد تم سے بات ہو رہی ہے، کہاں مصروف رہتی ہو؟"

"بس! آپ کو پتا ہی ہے کہ ہماری کیا مصروفیات ہوتی ہیں۔ وقت کی پابندی تو ہمارے یہاں ہوتی نہیں، جس کی وجہ سے وقت بہت ضائع ہوتا ہے۔"

"تو تم بھی اسی وقت آیا کرو، جب کام شروع ہو۔"

"مسئلہ یہ ہے کہ اگر ہم وقت کی پابندی نہ کریں تو ناراض ہو جاتے ہیں۔ اس لیے ہمیں تو وقت کی پابندی کرنی ہی پڑتی ہے۔"

"پہلے کے مقابلے میں اب تم اسکرین پہ بہت کم نظر آتی ہو۔ دل بھر گیا ہے یا گھریلو مصروفیات کچھ زیادہ ہو گئی ہیں؟"

"گھریلو مصروفیات تو خیر ہیں ہی۔ وہ تو زندگی کا لازمی حصہ ہیں۔ ہاں! کام کے معاملے میں ہی تھوڑی سی چوزی ہو گئی ہوں۔ ہر کردار قبول نہیں کرتی۔ بس وہ ہی کردار لیتی ہوں، جو مشکل ہوں اور جن میں اپنی صلاحیتیں دکھانے کا موقع ملے۔"

"تمہاری بہن اور تم جب اس فیلڈ میں آئیں تو اتنے چینلز نہیں تھے۔ کام بھی نہیں تھا، مگر پھر بھی تم دونوں نے بہت شہرت کمائی۔ تب کے اور اب کے ماحول میں کچھ فرق نظر آیا؟"

"فرق تو آیا ہے۔ اب ماحول پہلے سے بہتر ہو گیا ہے۔ اب زیادہ پڑھے لکھے لوگ آگئے ہیں اور کام اتنا بڑھ گیا ہے کہ سب کو کام مل رہا ہے۔ اس لیے کھینچا تانی والا ماحول ذرا کم ہو گیا ہے، ورنہ جب ہم دونوں بہنیں اس فیلڈ میں آئی تھیں تو ہمیں اور نئی دیگر لڑکیوں کو بہت ڈرایا جاتا تھا۔ لوگ ان کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ شکر ہے کہ ہم نے اپنے آپ کو ان برے لوگوں سے بچا کر رکھا، کیونکہ ہم تو ویسے بھی اس فیلڈ میں شوقیہ نہیں، بلکہ مجبوری کے تحت آئے تھے۔"

"مجبوری میں اس فیلڈ میں کیوں؟"

"بس.... اس فیلڈ میں آنے کا موقع مل گیا، ورنہ شاید ہم کہیں اور جاب کر رہے ہوتے۔ اصل میں امی کا بیوٹی پارلر تھا۔ امی کی ہی ایک دوست میری بہن صائمہ کو ٹی وی اسٹیشن لے گئیں۔ وہاں منظور مگسی صاحب سے تعارف کرایا۔ انہوں نے صائمہ کو ایک ڈرامے میں کاسٹ کیا، صائمہ کو ناظرین نے بہت پسند کیا اور یوں راستے ہموار ہوتے گئے۔ ڈراموں کی آفرز بھی آنے لگیں صائمہ کے ساتھ چونکہ میں بھی ہوتی تھی تو پھر مجھے بھی آفرز آنی شروع ہو گئیں پھر کام کا سلسلہ چل پڑا اور آج میں آپ کے سامنے ہوں صائمہ تو شادی کر کے ملک سے باہر چلی گئی۔"

"والدہ نے اعتراض تو نہیں کیا، جب تم اس فیلڈ میں آئیں؟"

"نہیں! بالکل نہیں۔ والدہ نے بہت کو آپریٹ کیا۔ زمانے کی اونچ نیچ سمجھائی۔ ان کی اچھی تربیت کی



وجہ سے ہی تو ہمیں کامیابی ملی ہے۔"

"فارغ اوقات میں کیا کرتی ہو؟"

"کچھ نہیں.... گھر کی ذمہ داریاں پوری کرتی ہوں اور ماں کے ساتھ زیادہ وقت گزارتی ہوں۔"

رامس تنویر خان

"کیا حال ہیں اور کیا مصروفیات ہیں؟"

"جی! ٹھیک ٹھاک.... دو تین پروجیکٹس پہ کام کروا رہا ہوں اور یہ ناولز آپ کے ہی ڈائجسٹ کے مقبول ناول ہیں۔ ان میں ایک رفعت سراج کا "شہر یاراں" ہے، جو کہ اپنے وقت کا مقبول ترین ترین ناول تھا۔ اس کی ڈرامائی تشکیل انور سجاد صاحب بہت پہلے کر چکے ہیں، لیکن چونکہ وہ رائٹر کی مرضی کے بغیر ہوئی تھی، اس لیے اس میں بہت ساری چیزیں رہ گئی تھیں۔ اس طرح رخسانہ نگار کے "زندگی ایک روشنی" پہ کام ہو رہا ہے۔"

"کہتے ہیں کہ میڈیا کی جاب بہت پرکشش ہوتی ہے اور کام کرنے کا مزا آتا ہے؟"

"ہاں! میڈیا کے لیے یہ تصور ہے کہ بہت پرکشش جگہ ہے اور جو ٹی وی پہ نظر آرہا ہے وہ بہت آسانی سے آرہا ہے اور اس پر تبصرہ کرنا کہ "یہ اچھا ہے" یہ برا ہے" بہت آسان ہوتا ہے جبکہ ایسا نہیں ہے۔ آج کل ناولوں پہ ڈرامے بنانے کا ٹرینڈ چل گیا ہے لیکن ان کو سلیکٹ کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ پہلے یہ تھا کہ کسی بھی مقبول ناول پہ ڈراما بناتے ہوئے ہم بہت فخر محسوس کرتے تھے اب ہم ایسا کرتے ہوئے ڈر جاتے ہیں، کیونکہ اب لوگ ہماری کاوش کو داد دینے کے بجائے اس میں کیڑے نکالنا شروع ہو جاتے ہیں کہ ناول میں ایسا تھا، ویسا تھا۔ ناول کی دنیا ایک الگ دنیا ہے۔ ناول میں آپ پلک جھپکنے میں ہیرو کو امریکا پہنچا دیتے ہیں، لیکن ڈرامے میں ہیرو کو امریکا پہنچانے میں ہمیں کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں، یہ کسی کو معلوم نہیں ہوتا.... تو اس لحاظ سے میڈیا پر کام کرنا اتنا آسان نہیں یعنی میڈیا کی جاب ایک مشکل جاب ہے۔"

"آج کل سینئر رائٹرز اس بات پہ بہت اعتراض کرتے ہیں کہ ڈائجسٹ میں لکھنے والی ڈراما نگار بن گئی ہیں، تمہارے خیال میں کیا ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا؟"



''ایک بہت ہی مشہور ڈراما نگار نے کہا کہ ڈائجسٹ کی خواتین رائٹرز نے ڈراموں کو صرف کچن کی ٹیبل تک محدود کردیا ہے۔ میں ان کی بات سے اتفاق نہیں کرتا' کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو پھر ''میری ذات ذرہ بے نشاں' ہم سفر' میرے قاتل میرے دل دار' طائر لاہوتی دل دیا دہلیز' زندگی گلزار ہے'' جیسے ڈرامے مقبول نہ ہوتے۔ ان سب کے علاوہ اور بھی مثالیں دے سکتا ہوں۔ یہ سب وہ ناولز ہیں جو خواتین ڈائجسٹ ہی میں شائع ہوئے ہیں اور بے حد مقبول بھی ہوئے ہیں' ان رائٹرز نے اپنی خوب صورت تحریروں سے نام کمایا ہے۔ اگر ہم اپنے سینئرز ڈراما نگاروں کے ڈرامے دیکھیں تو ان کے موضوعات کافی محدود ہوتے تھے' جبکہ اب ایسا نہیں ہے' آج کل کے ڈرامے تو بہت نصیحت آموز ہوتے ہیں۔ ڈائجسٹ کی رائٹرز نے ذہنوں کو کھولا ہے ''میری ذات ذرہ بے نشان'' کے ذریعے ''میں عبدالقادر ہوں'' کے ذریعے ''ہم سفر'' کے ذریعے اور بے شمار دیگر ڈراموں کے ذریعے۔''

''اسکرپٹ ایڈیٹر اور کونٹینٹ ہیڈ کا کام کیا ہوتا ہے اور ناولز کا پہلے خود مطالعہ کرتے ہیں؟''

''اسکرپٹ ایڈیٹر کا کام یہ ہوتا ہے کہ آپ کا باس آپ کو پورا پروجیکٹ دے دیتا ہے کہ یہ اسکرپٹ ہے' اس کو پڑھیں اور ایڈیٹنگ کریں' جبکہ کونٹینٹ ہیڈ کا کام مختلف چینلز سے ان ٹچ رہنا ہے۔ جیسے ہمارے پاس کوئی چیز ہے تو ہم چینلز والوں سے ڈسکس کرتے ہی کہ یہ ناول ہے' یہ کاسٹ ہوگی۔ آپ اس کے بارے میں کیا کہتے ہیں اور جہاں تک ناولز کے مطالعے کی بات ہے تو میرے بارے میں ماہا ملک کہتی ہیں میں ناولز کا انسائیکلوپیڈیا ہوں' کیونکہ مجھے تمام ناولز کہانی' ٹائٹلز اور کرداروں کے ناموں کے ساتھ یاد ہوتی ہیں۔ جب کسی ناول پہ کام کرنا ہوتا ہے تو سرسری سا پڑھ کر ہی مجھے یاد آجاتا ہے کہ اس کی اسٹوری کیا ہے۔''

''تم جس فیلڈ میں ہو' اس کے لیے تعلیم کا ہونا ضروری ہے یا یہ خداداد صلاحیتیں ہوتی ہیں؟''

''میرے خیال سے یہ خداداد صلاحیت ہوتی ہے۔ آپ نہ کسی کو انگلی پکڑ کر لکھنا سکھا سکتے ہیں اور نہ ہی لکھوا سکتے ہیں۔ لکھنا جتنا مشکل کام ہے' اس سے کہیں زیادہ لکھوانا مشکل کام ہے۔ ہر رائٹر کی اپنی ایک سوچ ہوتی ہے' تو کسی کو یہ بتانا کہ آپ کی تحریر میں یہ خامی ہے' ایک آرٹ ہوتا ہے' جو مجھے پہلے نہیں آتا تھا' مگر اب میں دو' تین سالوں میں خاصا پالش ہوگیا ہوں۔ اس کے لیے میں نے کوئی تعلیم حاصل نہیں کی۔ بس خداداد صلاحیت اور قسمت اچھی ہونی چاہیے۔ میری قسمت اچھی ہے کہ آج میں اس مقام پر ہوں۔ میں نے بابر جاوید کے پاس کام کرکے بہت سیکھا ہے۔''

''کچھ رائٹرز کو تم سے شکایتیں بھی ہیں کہ تم ان کا آئیڈیا دوسری رائٹرز کو دے کر اسکرپٹ لکھواتے ہو اور کبھی کبھی تو پورا اسکرپٹ ہی دوسرے کے نام سے دلوادیتے ہو اس میں کتنی صداقت ہے؟''

''میرے بارے میں یہ بات میں سمجھ سکتا ہوں کہ کہاں سے آئی ہوگی۔ ہوتا یہ ہے کہ کہانی کوئی بھی نئی نہیں ہوتی۔

اب جیسے دو بہنوں کی کہانیاں پچھلے دنوں بہت چلیں۔ تو کہانی تو ایک جیسی ہوسکتی ہے۔ مگر اس کا ٹریٹمنٹ ان کو الگ رنگ دیتا ہے۔ میں نے کبھی بھی ایسا نہیں کیا کہ کسی کا آئیڈیا یا اسکرپٹ کسی دوسری رائٹر کو دے دیا ہو' بلکہ میں نے تو ہمیشہ نئے رائٹرز کی حوصلہ افزائی کی ہے اور بہت سے نئے رائٹرز متعارف کروائے ہیں۔ اسی لیے مجھے ''رائٹرز کا علمبردار'' بھی کہا جاتا ہے۔ میں سب سے پہلے رائٹرز سے کہانی کا خلاصہ منگواتا ہوں۔ اگر وہ خلاصہ ہماری سمجھ میں آتا ہے تو پھر ہم بات کو آگے بڑھاتے ہیں' چونکہ کہانیاں ایک جیسی ہوتی ہیں' لہٰذا رائٹرز کو لگتا ہے کہ یہ تو ہماری چیز تھی۔''

''سنا ہے کہ نئی رائٹرز اگر خود سے کہیں کہ ہمارے ناول پہ کام کریں تو آپ انہیں لفٹ نہیں کراتے۔ ایسا ہے؟''

''نہیں! ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔ ہاں! شروع میں ایسا ضرور ہوتا ہوگا' کیونکہ شروع میں اتنا کام نہیں تھا' مگر اب ایسا نہیں ہے۔ اب تو ہمیں اچھی کہانی کی تلاش رہتی ہے۔ بس یہ ہے کہ رائٹر فوری ریپلائی کی امید نہ رکھا کریں۔ میرا اپنا کانسیپٹ دو سال سے اپروو ڈ پڑا ہے' مگر میرے پاس اس پر کام کرنے کے لیے ٹائم ہی نہیں ہے۔''

''یہ بتاؤ! کہ کس ڈرامے کی ریٹنگ زیادہ ہوتی ہے' مطلب کون سے موضوعات ہوں تو کوئی ڈراما ہٹ ہوجاتا ہے؟''

''جس ڈرامے میں عورت پر ظلم ہوگا' وہ روئے گی' اس کی ریٹنگ زیادہ ہوگی۔ اس لیے ''اک تمنا لاحاصل سی'' بہت زیادہ پاپولر ہوا۔''

''کچھ اپنے بارے میں بتاؤ۔''

''میرا نام تنویر احمد شیخ ہے' لیکن میں ''رامس تنویر'' لکھتا ہوں۔ بنیادی طور پر ہم میمن ہیں۔ گزشتہ سال شادی ہوئی جو کہ ارینج میرج ہے اور بہت اچھی زندگی گزر رہی ہے۔ میری تاریخ پیدائش 13 اکتوبر 1989ء ہے۔ وہ اسلامی تاریخ کے لحاظ سے بارہ ربیع الاول کا دن تھا۔ ہم تین بہن' بھائی ہیں۔ بڑی بہن ڈاکٹر ہے۔ پھر میں ہوں۔ میرے بعد ایک چھوٹا بھائی ہے' جو زیر تعلیم ہے۔ ''محبت آبلہ کرب'' کے عنوان سے میری ایک کتاب بھی چھپ چکی ہے۔ یوں میرا ایک دیرینہ خواب پورا ہوا' اب ایک ناول کی تیاری ہے۔''





خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
shuaamonthly@yahoo.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں۔
آپ کی عافیت، سلامتی اور خوشیوں کے لیے دعائیں۔
اللہ تعالیٰ آپ کو، ہم کو اور ہمارے پیارے وطن کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ آمین۔

پہلا خط کراچی سے مسز نیر سلطانہ کا ہے انہوں نے بہت اہم مسئلہ پر قلم اٹھایا ہے۔ لکھتی ہیں۔

ہوش سنبھالتے ہی امی کو رسالے اور ڈائجسٹ پڑھتے دیکھا ہے، ان کی پیدائش اندرون سندھ کے ایک گاؤں کی ہے، امی نے گاؤں سے ساتویں کلاس تک پڑھا ہے حالات کی وجہ سے وہ اپنی تعلیم جاری نہیں رکھ سکیں۔ امی نے ہم پانچوں بہن بھائیوں کو پڑھایا ہے۔ قرآن پاک بھی امی سے پڑھا ہے اور وہ قرآن پاک کی تعلیم اپنے علاقے کے تمام بچوں کو مفت فراہم کرتی ہیں۔ میرے ابو معمولی ملازم اور بالکل ان پڑھ تھے، میں نے بی اے کیا ہے پھر نرسنگ کا کورس کیا ہے۔ ایک بہن بینک میں منیجر ہے۔ دو بھائی انجینئر ہیں۔ یہ سب امی کی محنت اور دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ زندگی کے شب و روز میں اور تمام تر مصروفیات کے باوجود ڈائجسٹ سے اور پڑھنے سے تعلق اسی طرح قائم و دائم ہے۔ میرے شوہر بھی سرکاری ملازم ہیں۔ میں بھی ایک سرکاری اسپتال میں بطور نرس ملازمت کر رہی ہوں۔

رسالہ میں آنے والے تمام خطوط اور ان کے تبصرے ضرور پڑھتی ہوں اور شاید اسی وجہ سے میں نے آج تک تبصرے کا خط نہیں لکھا کیونکہ ہر قسم کا تبصرہ اور اس پہ آپ کا جواب بھی مل جاتا ہے۔ اس لیے کبھی ضرورت نہیں پڑی۔

اب خط لکھنے کی وجہ دو ناول ہیں۔ ایک تو سلسلہ وار خواتین ڈائجسٹ میں ناول "زمین کے آنسو" کا یہ جملہ "اسپتال میں دوائیوں کی مخصوص بُو یا کاؤنٹر پر تیز لپ اسٹک لگائے گپیں اڑاتی نرسوں کے سوا کچھ نہ تھا۔" دوسرا ناول "آشنا ہیں تیرے قدموں سے" کا یہ جملہ "آپ کا مریض ڈسچارج ہو گیا ہے۔" کرخت چہرے والی نرس نے آکر اعلان کیا۔

بیشتر کہانیوں میں نرسز کو کچھ ایسا ہی بتاتے ہیں۔ بدتمیز، بدمزاج یا صرف نرسز کو اپنے ساتھی ورکرز سے گپ شپ لگاتے ہوئے.... یہ تمام جملے پڑھتے ہوئے مجھے بحیثیت نرس بہت افسوس ہوتا ہے۔ ڈراموں میں بھی نرسز کا صرف منفی پہلو ہی دکھایا جاتا ہے۔ میں خود ایک نرس ہوں اور میں یہ جانتی ہوں کہ نرسز کو پاکستان میں کن مشکلات کا سامنا ہے، وہ کتنی محنت سے اپنا کام سرانجام دیتی ہیں۔ ایسا تو آفسز اور اسکولوں میں بھی ہوتا ہے۔ بناؤ سنگھار وہ خواتین بھی خوب کرتی ہیں اور گپیں بھی لڑاتی ہیں۔ نرس کا سنگھار صرف سفید یونیفارم اور جوڑے میں کسے ہوئے بال ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہلکی سی لپ اسٹک لگانے کی اجازت بھی صرف کورس مکمل کرنے والی نرسز کو ہوتی ہے کسی قسم کی جیولری پہننا بھی منع ہوتا ہے تیز میک اپ کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ میری تمام رائٹرز سے گزارش ہے۔ وہ نرسز کے لیے ایسے الفاظ استعمال نہیں کریں۔ نرسز کی مشکلات دوسرے اداروں میں کام کرنے والی خواتین سے دگنی ہوتی ہیں۔

آپ کے توسط سے میں تمام رائٹرز سے اور خاص طور پر عمیرہ احمد سے یہ گزارش کروں گی۔ وہ ایک نرس کی کہانی لکھیں جو لوگوں کو بتائے کہ نرس بن کر وہ دوسری مخلوق نہیں بن جاتی ہے۔ اس کے جذبات و احساسات بھی عام خواتین جیسے ہی ہوتے ہیں۔

ج: عزیز بہن! سب سے پہلے تو آپ کی امی کو مبارک باد کہ انہوں نے محنت مشقت کر کے آپ سب بہن بھائیوں کو تعلیم دلائی اور آپ بہن بھائی آج اپنے پیروں پر کھڑے ہیں۔ آپ نے جس مسئلہ کی جانب توجہ دلائی ہے، وہ واقعی اپنی جگہ بہت اہم ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اب تک ہمارا جن نرسوں سے واسطہ پڑا ہے ہم نے انہیں ڈاکٹروں سے زیادہ نرم مزاج اور محنت سے مریضوں کی دیکھ بھال کرنے والا پایا۔ اگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو نو عمر اور نئے ڈاکٹروں سے زیادہ پرانی اور تجربہ کار نرسوں کو معلومات ہوتی ہیں لیکن جس طرح پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں اس طرح ساری نرسیں بھی ایک جیسی نہیں ہوتیں۔ ممکن ہے کہ کچھ نرسوں کا رویہ مریضوں کے ساتھ اچھا نہ ہو لیکن اس کے لیے سب نرسوں کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

ہمیں افسوس ہے کہ کچھ ایسے جملے شائع ہوئے جس سے آپ کی دل آزاری ہوئی لیکن اکثر کہانیوں میں نرسوں کا بہت مثبت پہلو بھی پیش کیا جاتا ہے۔ ہمیں نمرہ بخاری کی وہ کہانیاں بھی یاد ہیں جن کے مرکزی کردار نرسیں تھیں اور انہوں نے ان کا مثبت پہلو اجاگر کیا تھا۔ ہم آئندہ خیال رکھیں گے کہ اس قسم کے جملے شائع نہ ہوں۔

مسرت الطاف احمد نے کراچی سے لکھا ہے۔

اس ماہ کا ٹائٹل بہت ہی شاندار تھا۔ برائٹ سی دلہن دیکھ کر دل خوش ہو گیا "دیوار شب" کی آخری قسط ہو گی لیکن پلیز عالیہ جی ہر کردار کے ساتھ بھرپور انصاف کریں کیوں کہ ہم نے جویا، معاذ اور خیام کی خوشیوں کے لیے بہت انتظار کیا ہے اینڈ بھی اتنا ہی خوبصورت ہو جتنا پورا ناول۔ "ایک تھی مثال" دوسری قسط پڑھ کر اچھا لگا۔ اس بار مکمل ناول "محبت گمشدہ میری" میں شافع کا کردار ایک آنکھ نہیں بھایا۔ شادی کے تین سال بعد بھی بیوی کے ہوتے ہوئے اب بھی دل نشیں میں انٹرسٹڈ ہونا پسند نہیں آیا۔ "جنت کے پتے" اپنی مثال آپ ہے۔ پلیز نمرہ جی! جہان اور حیا کے ساتھ اب کچھ بھی برا نہ ہو۔ اس بار ناولٹ سب ایک سے بڑھ کر ایک تھے "دیمک زدہ محبت" کی پہلی ہی قسط بہت متاثر کن تھی۔ ہر ایک کردار قابل تعریف تھا۔ "میری ذات سے تیری ذات" شیریں ملک نے بہت ہی خوبصورت تحریر لکھی۔ صفیہ کا بات کرنے کا انداز اس کا اسٹائل سب کچھ زبردست تھا۔ "شاہان، شنزا، شہرین" بہت ہی فنٹاسٹک ناولٹ تھا۔ موضوع انٹرسٹنگ اور دل کو چھو لینے والی اور طرز تحریر بھی خوبصورت تھا۔ اس بار افسانوں میں رابعہ افتخار کا ناول "چوری" دل کے بہت قریب محسوس ہوا۔ بہت ہی متاثر کن تحریر تھی۔

ج: مسرت! ہمیں افسوس ہے کہ پچھلے ماہ آپ کا خط شامل نہ کر سکے۔ تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ۔

عمارہ، مدیحہ، اقصیٰ، سمیعہ اور نمرہ نے اوکاڑہ سے لکھا ہے۔

قلم اٹھانے کی وجہ نمرہ احمد ہیں "جنت کے پتے" اس ناول نے ہمیں ہلا کر رکھ دیا۔ چھوٹی سی عمر میں اتنی زیادہ ناج۔ کیا کمال کرتی ہیں۔ ہم اوکاڑہ کے ایک نواحی گاؤں کے رہائشی ہیں۔ ہمارے گاؤں میں ہر سہولت موجود ہے۔ "ایک تھی مثال" کچھ خاص نہیں لگی۔ "محبت گمشدہ میری" پڑھ کر تو مزا ہی آ گیا۔ شاہان، شنزا اور شہرین پڑھا تو رونا ہی آ گیا۔ باقی سلسلے بھی بہت عمدہ ہیں۔ اب کچھ اپنے بارے میں۔ ہمارا جوائنٹ فیملی سسٹم ہے ہم تین فیملیز بہت زیادہ ہنسی خوشی ایک دوسرے کے ساتھ رہتے ہیں اور روایتی قسم کی لڑائی تو کبھی دیکھی ہی نہیں ہے اپنے گھر میں۔

ج: عمارہ، مدیحہ، اقصیٰ، سمیعہ اور نمرہ! یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ سب لوگ مل جل کر پیار سے رہتی ہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

نازیہ اشتیاق چوہدری نے گاؤں پوٹھ ٹلہ جوگیاں سے لکھا ہے۔

سب سے پہلے اپنے پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں کو پڑھا اور خوشبو کی طرح محسوس کیا۔

نمرہ احمد کے ناول "جنت کے پتے" ویل ڈن نمرہ جی! اس قدر خوبصورت ناول۔ کیا آپ ترکی گئی ہیں؟ آپ کو اتنی معلومات کہاں سے ملتی ہیں۔ اُمِ مریم طیفور کے ناول "ہرجائی قصائی" کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ زبردست کامیڈی۔

اس ماہ ٹائٹل بہت زبردست ہے۔ باقی سارے سلسلے بھی ٹھیک تھے۔ آپی! میرا گاؤں بہت بہت خوبصورت ہے اور میرا دل کرتا ہے میں آپ سب قارئین شعاع کے تمام ممبرز اور انیقہ انا کو اپنے گاؤں میں بلاؤں۔ پچھلے ماہ میرے ایک بہت سویٹ کزن حسن چوہدری کی شادی ہوئی لاہور میں۔ اس میں شرکت نہیں کرسکی۔ میں شعاع کے توسط سے ان سے معذرت کرتی ہوں۔

ج نازیہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آپ کی معذرت ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔ لیکن اچھی بہن! یہ کالم معذرت' افسوس یا مبارک باد کے لیے نہیں ہے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

فوزیہ ثمروٹ اور طیبہ عمران نے گجرات سے لکھا ہے۔

سب سے پہلے صائمہ چوہدری کی تحریر پڑھی۔ کافی پرکشش ناول ہے۔ اسٹوری کے مین کردار سکینہ اللہ دتا کی باتیں اچھی لگی ہیں۔ جمیلہ مائی کا اللہ پاک پر اعتماد' یقین اچھا لگا۔ سکینہ کی فلسفہ بھری باتیں کہانی کی جان ہیں۔ جمیلہ مائی جیسے سادہ دل لوگوں سے دنیا کا حُسن قائم ہے۔

ناولٹ "شاہان' شہزا' شہرین" پر بے تحاشا پیار آیا حالانکہ کہ شہرین غاصب تھی۔ مگر جان کی بازی ہار دی شہرین نے اور شاہان حیدر کے دل میں اپنی جگہ بنا گئی۔

محبت گمشدہ میری ساری کہانی مزے دار تھی مگر اسٹوری کا اینڈ اچھا لگا۔ افسانوں میں "رشک چمن" بیسٹ تھا۔ چوری رابعہ افتخار کی تحریر اچھی تھی۔ شادی کے بعد لڑکی کا ہر مان ہر دعوا میکے سے ختم ہوجاتا ہے کیا۔ مجھے تو

حیرت ہے ترنم کی ماں پر' اس نے اپنی ہی بیٹی کو بے ایمان ٹھہرادیا۔ صدف آصف کی اسٹوری بھی اچھی تھی۔ "ایک تھی مثال" بشریٰ کی ساس پہلے کیا کم تھی جلی کٹی سنانے کو جو نند صاحبہ کی ساس بھی دل جلانے میں شامل ہوگئیں۔ بندھن میں اگر آپ ثمینہ پیرزادہ اور عثمان پیرزادہ کا انٹرویو کریں تو اچھا لگے گا۔

ج فوزیہ جی! آپ نے تمام کہانیوں پر بہت اچھا اور تفصیلی تبصرہ کیا۔ بہت شکریہ۔ طوالت کی بنا پر آپ کا پورا خط شائع نہیں کرسکتے۔ مجبوری ہے۔

آپ کی فرمائش نوٹ کرلی گئی ہے' جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

عائشہ خان ٹنڈو محمد خان سے لکھتی ہیں۔

خوبصورت سرورق کے ساتھ شعاع میرے ہاتھ میں ہے۔ منجھی ہوئی پرانی رائٹرز تو اپنی جگہ تعریف کے قابل ہیں مگر اس مرتبہ میں نے سوچا کہ نئی رائٹر پر زیادہ تبصرہ کیا جائے... سب سے پہلے صدف آصف کا ارادوں کی شکست پڑھا... واہ بھئی صدف کمال کردیا۔ بہت اچھی تھی کہانی۔ یہ ادا ہے فرحانہ ناز ملک کا بھی اچھا لگا۔ چوری رابعہ افتخار کا بھی بہت پسند آیا۔ رشک چمن بھی اچھا لگا' ہیروئن کافی خود پسند لگی۔ اندیشہ ہائے عنبرین اعجاز بس ٹھیک لگا۔ مگر یہ ہے کہ ہر انسان کو اللہ نے بنایا ہے ہمیں کسی میں نقص نہیں نکالنا چاہیے۔ بہرحال ایک دو جملوں کی وجہ سے پوری کہانی کو برا نہیں کہہ سکتے۔ "دیوار شب اور جنت کے پتے" اگلے مہینے سے ختم ہوجائیں گے یہ پڑھ کر دل اداس ہوگیا۔ ایک انسیت سی ہوگئی تھی۔

"ایک تھی مثال" بہت زبردست ناول ہے بالکل بھی بورنگ نہیں۔

باقی یہ کہ آمنہ زریں کا تبصرہ پچھلے ماہ کارگل کے متعلق پڑھا تھا ہم جیسے لوگ حقیقت سے ناواقف ہوتے ہیں۔ موٹی موٹی اور مہنگی مہنگی کتابیں خرید کے پڑھ نہیں سکتے اور لائبریری یہاں دستیاب نہیں... اس لیے شعاع کا یہ سلسلہ ہمیشہ دیتے رہیے گا۔ ہمیں اس سے معلومات ہوتی ہیں۔

دیوار شب کا ایک جملہ جو بہت پسند آیا۔ صفحہ نمبر 249 پر تھا۔ "ابا نے اپنے حصے میں آیا ایک اور چراغ روشن کردیا تھا۔"

ج پیاری عائشہ! تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ۔ اس میں شک نہیں کہ عوام تک سچائی پہنچ ہی نہیں پاتی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ عوام سچائی جاننا بھی نہیں چاہتے۔ عوام کی اکثریت سچائی سے زیادہ اپنی سوچ اور اپنے رائے پر یقین رکھتی ہے خواہ وہ رائے غلط ہو یا سچ۔

نوال افضل گھمن گجرات سے لکھتی ہیں

تیکھے نقش' پنکھڑی نما باریک ہونٹ اور ماہر بیوٹیشن کے ہاتھوں کا خوبصورت کمال اور خاص طور پر ستواں ناک اف مائی گاڈ... یہ تھا شاندار سا سرورق ہمارے لاڈلے شمارے شعاع کا...

پچھلے دنوں ترکی جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں کے منظر اور بازار خاص طور پر استقلال اسٹریٹ کا نقشہ واقعی ویسا ہے جس طرح نمرہ احمد نے کھینچا... ترکش عوام بہت مہذب ہیں۔ بہت صاف ستھرے لوگ جو اپنے استعمال کے جوتے بھی اپنے گھروں سے باہر اتار کر داخل ہوتے ہیں۔ عالیہ بخاری جی کو دیوار شب پر یعنی اختتام سے پہلے ہی مبارکباد۔ ناولٹ بھی اچھے تھے۔ صائمہ اکرم جی کا دیمک زدہ محبت اور خاص طور پر شیریں ملک جی کا بھی...

ج پیاری نوال! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔

افسانے ابھی پڑھے نہیں۔ پڑھ کر ہی رائے دی جاسکتی ہے۔

شاہ جہاں گل' وجیہہ کنول' گلستان اور کرن نے لکھا ہے۔

ہمارے گھر میں ہماری امی' بھابھی' چار بہنیں "خواتین اور شعاع" کی پرانی قاری ہیں۔ ہماری دادی ہمیں کتابوں میں گم دیکھ دیکھ کر چڑتی ہیں اور چڑ کر کسی دن خوب سناتی بھی ہیں۔ امی کہتی ہیں "اماں میرا ایک ہی تو شوق ہے اور آپ کے خود کے کتنے شوق ہیں۔ محلے میں اپنی سہیلیوں کی طرف جاتی رہتی ہیں۔ موسمی شربت بناتی ہیں خود ہی پیتی ہیں۔ جڑی بوٹیوں کے تجربے کرتی ہیں۔ کروشیے کا کام کرکے اپنی ہی دوستوں میں بانٹتی ہیں۔"

میں بیچ میں بول پڑتی ہوں "امی! وہ اماں کے شوق نہیں' مجبوریاں ہیں۔" یہ نوک جھونک سارا دن چلتی رہتی ہے۔ زندگی کا حسن اسی میں تو ہے۔

فروری کے شمارے میں سب سے پہلے میں نے "جنت کے پتے" پڑھی آئندہ ماہ آخری قسط پڑھ کر دل دھک سے رہ گیا۔ اتنی پیاری تحریریں جلد ختم ہوجائے گی؟ ہم سب اداس ہیں۔ سعدیہ عزیز اتنے گیپ کے بعد آئیں بہت اچھا لگا... بہت زبردست تھیں ان کی دونوں تحریریں (خواتین اور شعاع میں)

"سب مایا ہے" کے بعد سعدیٰ حمید کہاں غائب ہیں اور نزہت شبانہ حیدر "میری آنکھ میں جو یہ رات ہے" کی جیسی کہانیاں دوبارہ کیوں نہیں لکھ رہیں۔ اور آپی میں نے آپ کو اپنا اک افسانہ ارسال کیا تھا وہ آپ تک پہنچا ہے؟

ہم گاؤں میں رہتے ہیں اور گاؤں کی زندگی بہت زیادہ خوبصورت ہوتی ہے۔ یہاں ہم موسموں کی شدت... اسی حساب سے کھانے... ملنا ملانا... شادیوں کے دن... دکھوں میں شراکت داری... غرض کہ ہر چیز کو بہت قریب سے محسوس کرتے ہیں۔ کبھی اس ماحول سے تنگ نہیں ہوتے۔ کبھی گھبراتے نہیں۔

سائرہ رضا بہت اچھا لکھتی ہیں۔ مجھے ان کی ہر تحریر پسند ہے اور خاص کر ان کے بھائی کی شادی کی خوشی جو ہم سے شیئر کی تھی۔ ہماری طرف بھی شادیوں کی تقریبیں اور رسمیں بہت رنگین ہوتی ہیں۔ پریارو! ہم رائٹر کہاں ہیں کہ ایسا کچھ لکھ بھیجیں۔ اور آپ کو پتا ہے رسالہ خریدنے کے لیے امی ہماری دادی کو ہی بھیجتی ہیں۔ ہاہاہا... وہ چڑتی ہیں۔ بڑبڑاتی ہیں مگر لے بھی آتی ہیں۔ مغرب کی نماز پڑھ کر امی' دادی کے ساتھ شعاع کی اچھی اچھی باتیں شیئر کرتی ہیں اور دادی... ہیں واقعی یوں بھی ہوتا ہے؟ ارے واہ یہ تو بہت اچھی بات ہے... کیا بات ہے یوں بھی ہوتا ہے دنیا میں... تم یہ باتیں کہاں پڑھتی ہو؟ امی خواتین اور شعاع کا نام لیتی ہیں اور دادی چپ... ہم سب ہنسی میں شروع...

ج شاہ جہاں' وجیہہ کنول' گلستان اور کرن! آپ کا خط پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ آپ سب لوگ مل جل کر ہنسی خوشی رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کا خیال رکھتے ہیں' بزرگوں کا احترام اور چھوٹوں کا خیال پاکستانی معاشرے کا حقیقی عکس یہی ہے۔

سعدیٰ حمید چوہدری اور نزہت شبانہ حیدر تک آپ کا پیغام پہنچا رہے ہیں۔

شاہ جہاں! آپ کی کہانی دلچسپ انداز میں لکھی گئی ہے جملے اچھے ہیں لیکن اس کہانی کو دوبارہ لکھیں۔ آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے لیکن آپ نے کہانی پر توجہ نہیں دی۔ موضوع پر توجہ دیتے ہوئے دوبارہ لکھیں۔

ڈاکٹر سمعیہ عبدالواحد اور ڈاکٹر خنساء امتیاز نے ایبٹ آباد سے لکھا ہے۔

پورا مہینہ انتظار کے بعد مارچ کا شمارہ ملا، پڑھ کر بہت مایوسی ہوئی۔ "دیوار شب" ایسی کہانی ہے جس نے پورے پانچ سال گزارے لیکن کبھی بھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم اس سے بور ہوئے ہوں۔

"جنت کے پتے" کی اس قسط میں کہانی کو خوامخواہ بے جا طوالت کا شکار کیا گیا۔ اس ناول کی پچھلی تمام اقساط ایسی تھیں کہ پورا مہینہ کہانی ہمیں اپنے سحر میں جکڑے رکھتی تھی۔ مصباح نوشین کی کہانی پڑھ کر ہم یہ بات سمجھنے سے بالکل قاصر رہے کہ آخر اس کہانی میں رائٹر کا مقصد کیا تھا۔

رسالے میں سے مزاح کا عنصر بہت ہی کم ہو گیا ہے۔ نہ تو ازمیربٹ کے خاندان کی لڑکیوں کی بدحواسیاں پڑھنے کو ملتی ہیں اور نہ ہی جوادی اور شبلی کے چٹکلے۔

راشدہ رفعت ایک اچھی لکھاری ہیں، جو ہلکا پھلکا مزاح کا عنصر لے کر آتی ہیں لیکن وہ بھی آج کل پتا نہیں کہاں گم ہیں۔ راحت جبیں کی خوبصورت منظر نگاری کو بھی ہم بہت مس کر رہے ہیں۔ انٹرویوز وغیرہ میں کسی علمی و ادبی شخصیت سے بھی کبھی ملاقات کروائیں۔ شوبز کے لوگوں سے اب اکتاہٹ ہوتی ہے۔

"خوبصورت بنیے" کے صفحات بھی اگر زیادہ ہو جائیں تو بہت اچھا رہے گا۔

ج سمعیہ اور خنساء! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ شعاع اس ماہ آپ کی پسند کے معیار پر پورا نہ اتر سکا۔ ہم اسے مزید بہتر بنانے کی کوشش کریں گے۔

راشدہ رفعت کا مکمل ناول شامل ہے۔ ثمرہ بخاری کی تحریر بھی آپ جلد پڑھ سکیں گی۔ عفت سحر پاشا نے بھی جلد لکھنے کا وعدہ کیا ہے۔

چکوال سے عندلیب نے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں۔

شعاع میں لکھنے والی تمام رائٹرز بہت اچھا لکھتی ہیں۔ کنیز نبوی سے کہیں کہ سندھ کے کلچر کی جھلک دکھلا دیں۔ ماہا ملک کہاں غائب ہو گئی ہیں۔ شعاع کی بہت سی کہانیاں میرے ذہن میں نقش ہیں۔

ج عندلیب! ہمیں افسوس ہے کہ آپ کے پچھلے خط شامل نہ ہو سکے۔

کنیز نبوی کی کمی ہم بھی محسوس کر رہے ہیں۔ انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ جلد آپ کے لیے مکمل ناول لکھیں گی۔

نبیلہ ملک نے چوٹالہ سے لکھا ہے۔

آپی پلیز! شاہد آفریدی کا انٹرویو شائع کریں۔ جنت کے پتے بہت بہترین جا رہا ہے۔ باقی سب افسانے بھی بہترین تھے۔

ج نبیلہ! شعاع کی بزم میں خوش آمدید۔ نمرہ احمد تک آپ کی تعریف پہنچا رہے ہیں۔ آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کیجیے گا۔

رابعہ بصری، فاطمہ اور سعدیہ نے ہری پور ہزارہ سے لکھا ہے۔

خطوط کے بعد دوڑ لگائی "جنت کے پتے" کی طرف تو اسے پڑھنے کے بعد بہت خوشی ہوئی یہ جان کر کہ حیا اور جہان سلامت ہیں۔ اس سے زیادہ اچھا ناول ہم نے بھی نہیں پڑھا۔ اور ہاں ٹائٹل بہت زبردست تھا۔ ستمبر کے بعد اب مارچ میں شعاع کا ٹائٹل سب سے اچھا لگا۔ مصباح نوشین نیا نام ہے۔ "دیوار شب" میں نبیل کا انجام پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ ہم راحت جبیں کے موسموں کو بہت مس کرتے ہیں۔ ہمیں ثمرہ بخاری کے جوادی اور شبلی بہت یاد آتے ہیں۔ ہمیں تنزیلہ ریاض کی غیر معمولی تحریریں نہیں بھولتیں۔ ہمیں فارحہ ارشد بہت یاد آتی ہیں اور بھی بہت سی رائٹرز ہمیں یاد آتی ہیں اور ہم پرانے شمارے نکال کر ان سے اپنا دل بہلا لیتے ہیں مگر پلیز ان کو واپس لائیے اور فاخرہ جبیں سے "میرے گمشدہ" جیسا کوئی ناول پھر سے لکھوائیں۔

ج رابعہ، فاطمہ اور سعدیہ! یہ ساری مصنفین آپ کو ہی نہیں ہمیں بھی بے حد یاد آتی ہیں۔ ثمرہ بخاری کے جوادی اور شبلی ہمارے بھی پسندیدہ کردار ہیں۔ ثمرہ سے جب بھی بات ہوتی ہے ہم ان کرداروں پر کہانی لکھنے کو کہتے ہیں۔ فارحہ ارشد تو نہ جانے کہاں کھو گئی ہیں۔ فون نمبر بھی تبدیل کر لیا ہے۔ رابطہ ہی نہیں ہو پاتا۔ فاخرہ ہر بار وعدہ کرتی ہیں پھر شاید مصروفیات مہلت نہیں دیتیں۔ اس لیے لکھ نہیں پاتی ہیں۔ تنزیلہ نے پاکستان کیا چھوڑا ہمیں بھی بھول گئیں۔ ہم ان سطور کے ذریعے ان سب تک

آپ کا پیغام پہنچا رہے ہیں۔

کوٹلی سے ماریہ اشرف نے لکھا ہے۔

ایک طرف ہم کہہ سکتے ہیں "ہنر زندگی ہے شعاع" اور دوسری طرف یہ کہنا بھی بے جا نہ ہو گا "زندگی اور شعاع لازم و ملزوم"۔

ج پیاری ماریہ! بہت شکریہ شعاع کی تعریف کا۔ اچھا ہوتا کہ آپ اس کی تحریروں کا بھی ذکر کر دیتیں۔

ثمینہ صائم مظفر گڑھ سے لکھتی ہیں۔

رابعہ افتخار کی کہانی "چوری" نے دل کو چھو لیا۔ آج کل کے ماحول میں جو بیٹی اپنے ماں باپ کے گھر جا کر رہتی ہے وہ یوں ہی مجرم کہلاتی ہے۔ آپ کو اتنی اچھی اور سچی کہانی لکھنے پر بہت بہت مبارک ہو رابعہ افتخار! اور آج جب خط لکھ رہی ہوں تو میں آپ بتاتی چلوں کہ میں آپ کی کتنی پرانی قاری ہوں۔ میری عمر تقریباً" 39 سال ہے۔ مجھے خواتین اور شعاع ڈائجسٹ پڑھتے ہوئے تقریباً" 23 سال ہو گئے ہیں۔ آج میں چھ بچوں کی ماں ہوں اور میرا بڑا بیٹا سیکنڈ ایئر میں ہے۔ شادی کے بعد میرے شوہر میرے کہنے پر مجھے خود ہی لا کر دینے لگے جب سے اب تک شاید ہی میں نے کوئی رسالہ مس کیا ہو شعاع اور خواتین کا۔ تمام قسط وار کہانیاں مجھے تقریباً" حفظ ہیں۔

بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں شعاع اور خواتین میں اس انداز سے لکھی ہوتی ہیں کہ انسان اس پر عمل کر کے اپنی اور اپنے قریب کے لوگوں کی زندگی آسان بنا سکتا ہے۔ آج کل نمرہ احمد کا ناول آیا ہوا ہے "جنت کے پتے" انتہائی خوبصورت ناول۔ امت الصبور کو میرا اسلام۔ ان کے نام پر ہی میں نے اپنی بیٹی کا نام رکھا ہے امت الایمان اور آج میری بیٹی ماشاء اللہ 9 سال کی ہے۔ میرا خط بہت لمبا ہو گیا ہے لیکن پھر بھی میں بتاؤں کہ ٹائٹل بہت خوبصورت تھا۔ کیا نمرہ احمد اور عمیرہ احمد بہنیں ہیں اور فائزہ افتخار اور رابعہ افتخار بہنیں ہیں؟

ج پیاری ثمینہ! اتنی طویل مدت سے خواتین اور شعاع کی مستقل قاری ہیں۔ یہ جان کر بہت خوشی ہوئی۔ اپنے شوہر کا بھی ہماری طرف سے شکریہ ادا کر دیں کہ وہ باقاعدگی سے ہر ماہ دونوں شمارے لا کر دیتے ہیں۔ فائزہ افتخار اور رابعہ افتخار بہنیں نہیں ہیں۔ اسی طرح عمیرہ احمد اور نمرہ احمد میں بھی کوئی رشتہ نہیں ہے۔

سمندری سے زہرہ علوی نے لکھا ہے

دس سال الفاظ ڈھونڈے اپنے اس حسین ہم سفر کے لیے اور کبھی دس لفظ بھی نہ لکھ پائی، مگر اتنا ضرور کہوں گی کہ خطوط کی اس روایت کو صرف آپ نے ہی زندہ رکھا ہوا ہے، ورنہ انٹرنیٹ موبائل اور ٹیلی فونک دور میں اس کام کے لیے وقت کہاں۔

"جنت کے پتے" اس ماہ بھی زبردست رہا۔ "ایک تھی مثال" یہ شروع سے تو بہت زبردست ہے۔ "دیوار شب" کی یہ قسط بھی ہمیشہ کی طرح بہت اچھی تھی۔ آپ پلیز خیام اور ربیعہ کا ملن ضرور کروائیے گا۔ افسانوں میں سب سے زیادہ "چوری" اچھا لگا۔ ہمارے معاشرے میں یہ بات عام ہے کہ شادی کے بعد لڑکی اپنے ہی گھر میں پرائی ہو جاتی ہے۔ اتنا اچھا افسانہ لکھنے پر میں "رابعہ افتخار" جی کو مبارک باد پیش کرتی ہوں۔

ج پیاری زہرہ! اتنی طویل مدت کے ساتھیوں کے لیے بہت مرصع اور دقیق الفاظ میں جذبوں کے اظہار کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آپ سادہ سے الفاظ میں اپنی رائے کا اظہار کر دیتیں، ہمارے لیے بہت کافی تھا۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

مسکان اور عائشہ وہاڑی سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

اس بار ٹائٹل بہت اچھا لگا۔ خاص طور پر ماڈل کا میک اپ اور جیولری۔ "دیوار شب" کی میں نے ساری قسطیں تو نہیں پڑھیں، البتہ میں نے جتنی بھی قسطیں پڑھیں بہت زبردست تھیں۔ "ایک تھی مثال" اچھا جا رہا ہے۔ شیریں کا ناولٹ بہت اچھا لگا۔ سحرش بانو کا "شاہان، شہزا اور شہرین" ویسے تو اچھا تھا پر اینڈ پر آخری جملہ اچھا نہیں لگا، کیونکہ جو اس دنیا سے رخصت ہو جائے، اس کا دنیا والوں سے ہر ناتا ٹوٹ جاتا ہے۔ تمام افسانے بھی اچھے لگے۔ محمد حفیظ کا انٹرویو شائع کریں۔

ج مسکان اور عائشہ! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ یہ بالکل حقیقت ہے کہ جو اس دنیا سے رخصت ہو جائے۔ اس کا دنیا سے ہر ناتا ٹوٹ جاتا ہے۔ البتہ دنیا میں جو لوگ ان سے محبت کرتے ہیں، وہ انہیں یاد کرتے ہیں۔ کہانی میں جو لکھا گیا، اس سے یہ مفہوم نکالنا غلط ہے کہ ان کا دنیا سے

تعلق برقرار رہتا ہے۔ محمد حفیظ کے انٹرویو کی فرمائش نوٹ کرلی ہے، جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

جام پور سے شمع مسکان نے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

سرورق کو دیکھ کر آمد بہار کا خیال ذہن کی اسکرین پر روشن ہوا۔ حسب معمول سب سے پہلے حمد و نعت پڑھیں۔ ناولز میں سب سے پہلے "جنت کے پتے" پڑھا۔ نمرہ جی پرفیکٹ انداز میں اسے اختتام کی جانب لا رہی ہیں۔ عالیہ جی کے ناول "دیوار شب" میں نبیل کا انجام خوب کیا۔ بس زری پر ٹوٹی قیامت کا بہت افسوس ہوا۔ گیتی اور خیام کے ملاپ پر ہماری آنکھیں جہاں نم ہوئیں وہیں دل میں خوشی کی کرنیں پھوٹتی محسوس ہوئیں۔ خیام کا ربیعہ سے ذومعنی بات کرنا (بے اختیاری میں ہی سہی) بہت پسند آیا۔ "ایک تھی مثال" کی یہ قسط بس ٹھیک ہی لگی۔ سوری رخسانہ آپی! مجھے آپ کا یہ ناول ابھی کچھ اسپیشل نہیں لگا۔ مصباح نوشین "محبت گمشدہ میری" ناول بہت زبردست تھا۔ اس ناول میں سب سے زیادہ نقصان دل نشین کا ہی ہوا۔ اس نے اپنا اعتماد، اعتبار ٹوٹتے دیکھا۔ مگر شاید وہ بھول گئی کہ ہمارے مذہب میں لڑکی اور لڑکے کی دوستی کی اجازت نہیں ہے۔ صائمہ اکرم کی "دیمک زدہ محبت" زبردست تحریر ہے۔ سحرش بانو کی تحریر "شاہان اور شہرین" نے تو مجھے بے تحاشا رلا دیا۔ افسانے سارے ہی اچھے تھے۔ "رشک چمن" میں ماریہ اور سعد کی نوک جھونک بہت مزا دے گئی۔ "بندھن" میں عائشہ بخش نے اپنی طرح سادہ سے ہی جوابات دیے۔ بہت ہی معصوم ہیں ہماری یہ پیاری سی نیوز کاسٹر، جو اپنے شوہر کے پہلے جملے کو شادی کے ایک سال میں ہی بھول گئیں۔ میری طرف سے کنیز نبوی کو دوسری بیٹی کی مبارک باد۔

ج شمع! تفصیلی تبصرے کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ مصنفین تک آپ کا تبصرہ اور کنیز نبوی تک مبارک باد ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔ امید ہے، آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

انوشہ نے کنری سے لکھا ہے

شعاع سے وابستگی کو چھ سال کا عرصہ بیت گیا۔ بلاشبہ شعاع ایک معیاری رسالہ ہے۔ اس ماہ کا رسالہ بھی ہمیشہ کی طرح زبردست لگا۔ رخسانہ نگار کا ناول "ایک تھی مثال" بہت اچھا لگا۔ باقی سب تحریریں بھی بہت اچھی تھیں۔ پیار کے "بندھن" میں عائشہ بخش کو دیکھ کر خوشی ہوئی اور "شاعری سچ بولتی ہے" میں نجل باجوہ کا انتخاب پسند آیا۔

ج پیاری انوشہ! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ اتنا مختصر تبصرہ ہے، آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کیجیے گا۔

سدرہ بتول ملتان سے تشریف لائی ہیں، لکھا ہے

اس ماہ کا ٹائٹل بہت خوب صورت تھا اور کہانی تو ایک سے بڑھ کر ایک تھی۔

ہمارا دل کرتا ہے "جنت کے پتے" کبھی ختم نہ ہو۔ کہانی کی قسطیں ہوں ہزار اور ہر قسط میں لائن ہوں ہزار۔ "شاہان اور شہرین" زبردست تھی۔ خاص طور پر وہ لائن "تم اپنی محبت کا ہر رنگ آزماؤ، میں نفرت کا داؤ آزماتا ہوں، فاتح وہی ہوگا، جس کی جیت ہوگی۔" بہت اثر انگیز تھا۔ فرحانہ ناز کا "ادا ہے یا شرارت" بھی اچھا تھا۔ "رشک چمن" اور سارے افسانے بہت اچھے تھے۔ عائشہ عمر سے انٹرویو بھی اچھا لگا اور پلیز! سائرہ رضا سے کہیں کوئی اچھا سا ناول لکھیں۔ "دیوار شب" کی جگہ عمیرہ احمد، نگہت عبداللہ یا فرحت اشتیاق کا کوئی ناول شروع کردیں تو مزا آجائے گا۔ "محبت گمشدہ میری" بہت اچھا ہے اور پلیز شہزاد رائے کا انٹرویو شائع کریں۔

ج سدرہ! آپ کا خط لیٹ ملا۔ اس لیے شامل نہ کرسکے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔

ناولٹ



آسیہ رزاقی

صرف اتنی سی بات

دل میں جذبوں کی فراوانی' سرخوشی اور آنکھوں میں شوق کی دنیا بسائے کمرے میں داخل ہوا تھا۔ ہاتھ میں لیے اٹیچی کو زمین پر رکھ کر آگے بڑھا ناہید اٹھ کر بیٹھ گئی حیران حیران۔

"السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام کیسی ہو؟" وہ مسکراتا ہوا آگے بڑھا اور شوخی سے اس کا سر پکڑ کر ہلانے لگا۔

"اتنی کمزور کیوں ہو رہی ہو؟ کیا کچھ کھانے کو نہیں ملتا؟ یا میری یادیں راتوں کو جاگ کر دن میں آنسو بہا کر گزارتی ہو؟"

ناہید جھینپ گئی۔ حیا کا رنگ رخسار کو گلابی کر گیا۔

"نہیں تو وہ....."

"کیا مجھے بالکل یاد نہیں کرتی تھیں؟ اچھا میں ہی پاگل تھا کہ رات دن تمہارے تصور میں دل کو بہلاتا رہا۔ تسلیاں دیتا رہا کہ بھئی ذرا صبر صبر۔"

وہ پلنگ پر بیٹھنے لگا۔ ابھی پورے طور پر بیٹھا بھی نہ تھا کہ باہر سے امی کی آواز آئی۔

"انور کہاں رہ گئے۔ بیٹا! اماں سے اچھی طرح مل تو لو۔"

انور بوکھلا گیا۔ بیٹھنے کا ارادہ ترک کر کے فوراً "آیا امی" کہتا ہوا باہر چلا گیا۔ ناہید بیٹھی سوچتی رہ گئی۔ باہر جائے یا یہیں انتظار کرے۔

دیر رات تک گپ شپ کی آوازیں آتی رہیں۔ ایک بار اٹھ کر دروازے تک گئی بھی۔ صحن میں سب بیٹھے تھے۔ انور نے دیکھ لیا۔ فوراً بلایا۔

"آجاؤ ناہید!" وہ شاید اسی کی منتظر تھی مگر اس کے قدم بڑھانے سے پہلے نصرت نے کہا۔

"لو جی وہ ہمارے ساتھ بیٹھنا کب پسند کرتی ہیں۔ اس پورے گھر میں ان کو تو بس اپنا کمرہ سب سے زیادہ پیارا ہے۔"

ناہید' نصرت سے ڈرتی تھی۔ وہ باہر نکلتے نکلتے اپنی جگہ رک گئی اور پلنگ پر جا کر بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ پیر ٹھنڈے ہونے لگے۔ اب نصرت اور چچی اماں میری شکایتیں کریں گی۔ سوچ کر ہی خوف زدہ ہو گئی۔ وہ ان



کی کسی بات کا جواب نہیں دے پاتی۔ اسی لیے وہ لوگ بے خوبی سے اس کا مضحکہ اڑاتے۔ کم ہمت تو وہ ہمیشہ سے تھی مگر یہاں آکر تو تھوڑا بہت اعتماد جو تھا وہ بھی نصرت کی تیز نظروں کٹیلے جملوں نے کہیں دور بھگا دیا تھا۔

چچی اماں بھی تو نصرت کی ہر شکایت پر گردن ہلا کر اسی کا ساتھ دیتی تھیں۔ انہوں نے کبھی ناہید کو اس قابل سمجھا ہی نہیں کہ پاس بٹھا کر بات ہی کرلیں۔ اس کے سلام کا جواب بھی منہ میں ہی چبا لیتیں۔ ناہید کو دونوں ہی نظرانداز کرکے اس کی رہی سہی ہمت پست کردیتیں۔

اسی گھر کا ایک حصہ سرور بھائی کے پاس ہے۔ وہ اس گھر کے بڑے بیٹے ہیں۔ مگر ناہید کی بدقسمتی کہ ان کی شادی ناہید کی ماموں زاد بہن سے ہوئی۔ جو سرور کی امی کو منظور نہ تھی۔ مگر سرور بھائی اڑ گئے۔ سلطانہ ان کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی تھیں۔ سرور بھائی کو پسند آگئیں۔ بڑے معرکے سے سرور بھائی نے جنگ جیتی اور سلطانہ آپا کو بیاہ لائے۔ ایک تو یہ شادی چچی اماں کی مرضی کے خلاف ہوئی۔ پھر یہ کہ سرور بھائی کی پسند۔ یونیورسٹی میں ساتھ پڑھنے کی وجہ سے ہوئی۔ چچی اماں بڑی بہو سے نالاں۔ بیٹے سے ناراض۔ درمیان کے کمرے کا دروازہ بند اور باہر دوسرا گیٹ سرور بھائی نے بنوالیا۔

چچی اماں بہو کی فتح اور اپنی ہار کو کسی طرح برداشت نہیں کرسکیں۔ جب ناہید اور انور کی شادی کا ذکر ہوا۔ سلطانہ آپا نے مخالفت کی تھی گو کہ، چچی اماں تو اس شادی سے بھی ناخوش تھیں مگر سلطانہ آپا کی مخالفت نے ان کو آگ بگولہ کردیا۔ شادی تو ہوگئی مگر ساس بہو میں مزید خلیج گہری ہوگئی۔ اب تو سلطانہ آپا ادھر آتی بھی نہیں۔ کبھی آہی جاتی تھیں تو ساس کی جانب سے سلطانہ آپا کے ساتھ ناہید کو بھی تلخ ترش سننا پڑتی تھیں۔ کبھی سرور بھائی آکر اسے اپنے ساتھ لے جاتے یا اختر پیچھے پڑجاتا تو وہ اس کے ساتھ چلی جاتی۔ چچی اماں کی زبان خراب تھی۔ مگر دل کی وہ اتنی بری

نہ تھیں۔ کبھی کبھار ناہید سے میٹھے لہجے میں بات کرہی لیتی تھیں۔ دراصل وہ کانوں کی کچی تھیں اور نصرت ان کے کان بھرنا خوب جانتی تھی۔ پتہ نہیں نصرت کو اس سے کد کیوں تھی۔ وہ جن نظروں سے ناہید کو دیکھتی۔ جس لہجے میں بات کرتی۔ اس سے ناہید کی عزت نفس مجروح ہوجاتی۔ ہر وقت اعتراض نکتہ چینی۔

ناہید نصرت سے خوف زدہ رہتی۔ یہ بھی ڈر تھا کہ وہ انور کو اس کے خلاف نہ ورغلائے۔ اماں کو تو اپنا حامی بنا ہی لیتی تھی۔

دراصل نصرت نے اپنی عزیز سہیلی کو بھابھی بنانے کا پختہ ارادہ کررکھا تھا۔ سہیلی کو بھی امید دلادی تھی۔ جو انور کو بہت پسند کرتی تھی اور تھی بھی ایک دولت مند گھرانے کی۔ اس کے باپ کی شان شوکت۔ امیرانہ ٹھاٹ باٹ نصرت ہی نہیں اماں جان بھی مرعوب تھیں۔ مگر جو سوچا تھا۔ وہ ہو نہیں سکا۔ سرور چچا جان کی بیماری کا سن کر ملتان گئے۔

چچا جان تو کئی سال سے صاحب فراش تھے۔ بے چارے کے معاشی حالات بھی بہت خراب تھے۔ چچی جان ایک مشہور اسکول میں پڑھاتی تھیں۔ اسکول کے کینٹین کی انچارج بھی تھیں۔ چچا جان نے سرور کو اپنے بھائی کا خط دکھایا۔ سرور کے والد نے وفات سے پہلے انہیں یہ خط لکھا تھا۔ اس میں اپنے دو بیٹوں کے لیے ان کی دونوں بیٹیوں کا رشتہ طلب کیا تھا۔ چونکہ لڑکیاں ابھی کم سن تھیں اور ان کے بیٹے بھی زیر تعلیم تھے۔ پھر موت نے مہلت ہی نہ دی کہ ارادے کو عملی جامہ پہناتے۔ سرور نے اپنی پسند کو زندگی کا ساتھی بنا لیا۔

ناہید بی اے کرچکی تھی۔ شبنم بھی ایف اے کرنے کے بعد بی اے کے داخلے کی تیاری کررہی تھی۔ چچا جان زندگی سے مایوس اور بیٹیوں کے مستقبل کے لیے فکر مند تھے۔ سرور کی آمد نے انہیں موقع فراہم کیا کہ وہ بھائی کا خط دکھا کر اپنی فکر کا اظہار کریں۔ گو کہ ان کی بیگم کو اعتراض تھا۔ وہ اپنی جیٹھانی کی

بدمزاجی سے واقف تھیں۔ دراصل سرور کی والدہ کو ہر کسی سے نالاں اور ناخوش رہنے کی عادت تھی۔ صبر اور برداشت ان میں تھی ہی نہیں۔ ان کے معاشی حالات بھی دیور سے بہتر تھے مگر انہیں دیورانی کا اعلا تعلیم یافتہ ہونا بھی ناگوار تھا۔ ان کے سلیقے سے بھی وہ خائف تھیں۔ کم آمدنی میں وہ گھر اور بچوں کو صاف ستھرا رکھتیں۔ خود بھی ہمیشہ بہترین لباس میں نظر آتیں۔ یہ جو جٹھانی کے دل جلانے کا سبب تھا۔

ان کے خراب رویے، بے رخی اور اکھڑپن سے بیزار ہوکر وہ ملتان آگئیں۔ جہاں ان کا میکہ تھا۔ اتفاق سے ناہید کے ابا کو اچھی جاب بھی مل گئی۔ وہ جٹھانی سے دور آگئیں مگر بڑے بھیا اور بچوں سے دوری ہمیشہ انہیں تکلیف دیتی۔ برسوں میں کبھی کسی خاندان کی شادی یا کسی کے انتقال پر لاہور جانا ہوتا۔ تب ہی سب سے ملاقات ہوتی۔

سرور کبھی کبھار آجاتا۔ اسے چچا سے بہت محبت تھی۔ پھر یہ بھی اتفاق ہوا کہ سرور کی شادی ان کی بھتیجی سے ہوگئی۔ سرور کا ملتان چکر لگتا رہتا۔

سلطانہ ان کی بھتیجی تھی۔ جٹھانی کو یہ بات بھی بری لگی، جس دیورانی کو بھی کسی قابل نہ سمجھا۔ زچ کرکے لاہور سے بھگادیا۔ اس کی اپنی بھتیجی بہو بن کر گھر میں دندنائے۔ یہ ان کی برداشت سے باہر تھا۔ اسی لیے انہیں سلطانہ میں کوئی خوبی نظر نہ آتی تھی۔ وہ سرور کو اس کے خلاف بھڑکاتی تھیں۔ شکائتیں کرتیں۔ مگر سرور کو اس نے کیا گھول کر پلا دیا تھا کہ اسے کچھ نظر نہ آتا۔

وہ بیوی اور ماں کے رشتے کی اہمیت جانتا تھا۔ اسی لیے دونوں کی حرمت کو بڑی سمجھ اور قرینے سے نبھا رہا تھا۔ روز روز کی تلخیوں سے عاجز آکر گھر تو الگ کرلیا۔ مگر نہ ماں کو چھوڑا۔ نہ ہی بیوی سے شکوہ کیا۔ ماں اور بہن کی ناراضی کی وجہ سے واقف تھا۔

سرور کی میانہ روی کو اماں تو بے حسی، سلطانہ کا جادو قرار دے کر انور، اختر کو بھی اپنا حمائتی بنانے پر کمربستہ تھیں۔ اختر تو ان کے قابو سے باہر تھا۔ البتہ انور ان کے دکھ کا شریک بن گیا۔

بے چاری اماں کو بڑے بیٹے سے کتنی امیدیں تھیں۔ جو سلطانہ بھابھی نے اپنی چالاکی سے ملیامیٹ کردیں۔ اس نے خود سے عہد کیا تھا کہ وہ اماں کی ہر امید اور خواہش پوری کرے گا اور بیوی کو اتنا سر پر نہیں چڑھائے گا کہ وہ ماں بیٹے کے درمیان فریق بن جائے۔ اماں کی ہربات کو درست سمجھ کر وہ سلطانہ سے بدگمان تھا۔ بھائی سے بھی شکوہ تھا کہ انہوں نے گھر الگ کرلیا۔ بیوی کے کہنے سے۔ مگر اماں کی خوشی کے لیے کوئی قدم نہ اٹھایا۔ نہ ان کی شکایت دور کرنے کی کوشش کی۔

انور کی ملازمت اچھی تھی۔ وہ اپنی جاب سے مطمئن تھا۔ پھر اس کا تبادلہ حیدر آباد کردیا گیا۔ بہت بے دلی سے وہ وہاں گیا۔ اسے گھر والے بہت یاد آتے۔ اماں کا لاڈ پیار سرور بھائی کی محبت، اختر سے دوستی تھی۔ اس کی دوری بھی محسوس ہوتی۔ لیکن روزی کا معاملہ تھا۔

سرور نے بہت سمجھایا تھا کہ یہ تو ایک ہی ملک کی دوری ہے لوگ روزی کی خاطر دوسرے ملک بھی چلے جاتے ہیں۔ برسوں کے بعد اپنوں سے ملنا ہوتا ہے۔ تم کسی بھی سرکاری چھٹی پر آسکتے ہو۔ بددلی سے کام نہ کرنا۔ دل لگاؤ محنت کرو۔ ترقی کی کوشش کرتے رہو اور وہ ان کی نصیحت پر عمل کررہا تھا۔

سرور نے ملتان سے آکر ابا مرحوم کا خط اماں کو دکھایا۔ چچا کی علالت اور بے چارگی کا ایسا نقشہ کھینچا کہ اماں بھی پسیج گئیں۔ دیورانی سے کتنی بھی مخاصمت سہی۔ دیور سے کوئی شکایت نہ تھی۔ دیور ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ مگر ان کی بیٹی کو قبول کرنا۔ بہت دل گردے کی ضرورت تھی۔

سرور سے ان کو کتنی بھی شکایت ہو۔ مگر وہ گھر کا بڑا بیٹا تھا۔ ان کی کفالت کا ذمے دار تھا۔ انور نے تو ایک سال سے ملازمت کی تھی۔ باپ کے بعد سرور ہی ساری ذمے داری اٹھا رہا تھا۔ اس نے انور کو لکھ دیا تھا کہ چھٹی لے کر آئے اور شادی اس کی چچا کے گھر ہی

ہو گی۔

اماں کو سرور نے مجبور کیا۔ "چچا کی زندگی میں ہی یہ شادی ہونی چاہیے۔ ان کی زندگی کا چراغ گل ہونے والا ہے۔"

اماں نے مجبور ہو کر اقرار کیا۔ وہ سرور کی خفگی برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔ مگر سلطانہ اس شادی کے خلاف تھی۔ وہ ناہید کی کم ہمتی اور کمزور طبیعت سے واقف تھی۔

اماں کو معلوم ہوا تو بہت غصہ آیا۔ سلطانہ کی ضد میں بھی انہوں نے یہ ضروری سمجھا اور بارات لے کر ملتان پہنچ گئیں۔ دیورانی کو گلے لگایا۔ تسلی دی ناہید کو بہو بنا کر لاہور لے آئیں۔ ناہید کی شادی کے چند روز بعد اس کے والد نے دنیا کو خیرباد کہا۔ ناہید اور انور اماں کو لے کر ملتان گئے۔ انور کی چھٹیاں کم تھیں۔ دو دن رہ کر وہ واپس آ گئے۔ نہ ادھر سے کوئی بھاری جہیز ملا۔ نہ ادھر سے ہی قابلِ ذکر بری کا اہتمام ہوا۔

ناہید کی امی تو اپنی ملازمت کے علاوہ سلائی وغیرہ کر کے ضروریات پوری کرتی تھیں۔ ان کے بھائی بھی مدد کرتے تھے مگر وہ بھائی سے مدد لینا پسند نہیں کرتی تھیں۔ پھر بھی انہوں نے کچھ نہ کچھ تیاری کر رکھی تھی۔ اپنے سلیقے اور سمجھ داری سے بیٹیوں کو تعلیم تربیت کے علاوہ اہم ضروری اشیا اکٹھی کرتی رہتی تھیں۔ مگر انور کی اماں کے پاس سلیقہ تھا نہ احساس۔ انہیں تین بیٹوں کی ماں ہونے کا فخر تھا۔ وہ اسی فخر میں مگن رہتی تھیں۔

ناہید کا جہیز کم مگر ضرورت کی اشیاء سے مزین تھا۔ مگر نہ فرنیچر نہ انور کو لاکھوں کی سلامی ملی۔ ماں بہن کو قلق رہا۔ نصرت کی سہیلی سے شادی ہوتی تو جہیز سے گھر بھر جاتا۔ ماں بہن کو سونے کے سیٹ ملتے۔ خاندان میں کتنی عزت اور واہ واہ ہوتی۔ افسوس' نصرت کے دل پر تو چوٹ لگی تھی۔ وہ ناہید سے محبت کجا اس کی عزت بھی کس طرح کرے۔ وہ سہیلی بھی طعنے دیتی تھی۔

شادی کے بعد چھٹی ختم ہونے پر انور ناہید کو ملتان لے گیا۔ دو دن چچی جان اور شبنم کی تالیفِ قلب کی خاطر رکا۔ پھر حیدر آباد روانہ ہو گیا۔ وہ سادہ دل اور نیک نفیس انسان تھا۔ قسمت سے بیوی بھی نیک معصوم اور سہمی طبیعت کی ملی۔ وہ سرور کا ممنون احسان تھا۔ جس کے مجبور کرنے پر یہ شادی ہو سکی تھی۔

ناہید سلطانہ بھابھی جیسی تیز نہ تھی۔ یہ اس کا خیال تھا اور وہ مطمئن بھی تھا کہ ناہید اماں اور نصرت کے ساتھ بہتر طور پر گزر کر لے گی۔ اس نے ناہید کو یہی سمجھا دیا تھا کہ ہر حال میں اسے اماں اور نصرت کو اہمیت دینی ہے۔ ان کے ساتھ بہت خوشگوار تعلقات رکھنے ہیں۔

اور جب گیا انور اب آیا بھی تو ایک جھلک دکھا کر صحن میں ماں بہن کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھا۔ کھانے کے وقت بھی انور متوقع نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا تو اختر نے کہا۔

"بھابھی رات کو کھانا نہیں کھاتیں۔"

نصرت نے فوراً" کہا۔ "روز نہیں کھاتیں۔ آج بھیا کی وجہ سے ہی آ جائیں۔ جب سے یہ آئے ہیں۔ وہ کمرے میں ہی بیٹھی ہیں۔ بھیا نے بلایا۔ تب بھی نہیں آئیں۔"

"تم سے ڈرتی ہیں۔ اس لیے باہر نہیں آئیں۔" اختر نے سادگی سے کہا۔

"اوئی اللہ میں کیا بھوت چڑیل ہوں۔" برا مان گئی نصرت۔

"درایں چہ شک۔ بھابھی کے لیے اس سے بھی زیادہ ڈراؤنی۔ ہر وقت تو تم ان پر نکتہ چینی کرتی ہو گھور گھور کر دیکھتی ہو۔ اعتراض کرتی ہو۔"

"امی! دیکھیں ناں۔ اختر بھائی کو۔" نصرت معصوم فریادی بن گئی۔

"اختر! چپ رہو۔" اماں نے ڈانٹا۔

"کیوں چپ رہوں تاکہ بھیا کو پتا نہ چلے کہ یہاں ان کی بیوی کے ساتھ آپ لوگوں کا کیا رویہ ہے؟ بھئی نہ میں بھیا سے ڈرتا ہوں۔ نہ بھابھی کو ڈراتا ہوں اس لیے۔ میں تو بولوں گا۔" اختر منہ پھٹ تھا۔

"بس چپ۔" اماں تلملا گئیں۔ "تمہاری ایسی ہی باتوں اور حمایت نے اسے اتنا مغرور کر دیا ہے کہ وہ کسی کو کچھ سمجھتی ہی نہیں۔"

"اماں جان! آپ نصرت کی زبان استعمال نہ کریں۔ جان کی امان پاؤں تو سوال کروں؟ آپ بھی تو انہیں ایک کمترین لونڈی باندی سے زیادہ اہمیت نہیں دیتیں۔ پھر وہ کسی کو کیا سمجھیں؟ نصرت کو ان کی چال میں' زبان میں' ہر انداز میں عیب نظر آتے ہیں۔ ان کے ساتھ بھی وہی سلوک ہو رہا ہے۔ جو سلطانہ بھابھی کے ساتھ ہوتا تھا۔"

غصے میں اماں کا رنگ بدل گیا۔ نصرت نے منہ چھپا کر رونا شروع کر دیا۔

انور نا سمجھی کے عالم میں اختر کو دیکھ رہا تھا۔ جو آرام سے کھانا کھا رہا تھا۔

"بھیا! آپ کھانا کھائیں۔ ابھی تو پہلا دن ہے۔ آپ روز ہی ان کے بارے میں ایسی ایسی باتیں سنیں گے۔ جو کسی طرح بھی حلق سے نہیں اتریں گی۔ اپنے ہاضمے کا بندوبست کر لیں اور بلکہ یوں کریں۔ اس کان سنیں۔ اس کان سے نکال دیں۔ جیسا کہ میں کرتا ہوں تو تب ہی میرا ہاضمہ درست ہے۔ دیکھیں کھا رہا ہوں۔"

ناہید کا تو نیند سے برا حال تھا مگر وہ زبردستی جاگ رہی تھی۔ چار ماہ بعد انور آیا تھا۔ اسے سوتا دیکھ کر ناراض نہ ہو جائے۔ خود جو گھنٹوں سے خوش گپیوں میں مگن تھا۔ پھر بوا اس کے لیے دودھ لے کر آئیں تو انہوں نے بتایا کہ سب کھانا کھا رہے ہیں۔ بوا روز اسے دودھ کا گلاس دے جاتی تھیں۔ اور تاکید کے ساتھ کہ گلاس دھو کر رکھ لینا۔ صبح کسی وقت لے جاؤں گی بوا ہمدرد تھیں۔

کرسی پر بیٹھے بیٹھے کمر اکڑ گئی۔ پیر سن ہونے لگے۔ لیٹنے کو دل چاہتا تھا مگر وہ سونا نہیں چاہتی تھی۔ رسالہ ہاتھ میں لیے بیٹھی اونگھ رہی تھی۔ بارہ بجے رات کو انور نے قدر رنجہ فرمایا۔ برداشت کی حد غصے اور جھلاہٹ کے کناروں سے ملنے لگی۔

"ہیلو کیا ہو رہا ہے؟ ابھی تک جاگ رہی ہو؟"

"سو جانا چاہیے تھا؟" وہ چڑ گئی۔ "بھلا یہ کیسا سوال ہے؟"

"ہاں دراصل کھانے کے بعد ٹہلنے نکل گیا۔ باہر بھائی جان سے ملاقات ہو گئی ان کے ساتھ گھر چلا گیا۔ بھابھی سے گپ شپ کرتا رہا وقت کا اندازہ ہی نہیں ہوا۔" وہ صفائی پیش کر رہا تھا۔

"آپ ..... بھائی جان کے گھر جاتے ہیں؟" وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

"ہاں کیوں؟ نہیں جانا چاہیے؟ ارے بھئی وہ بھی اپنا گھر ہے۔"

"مگر میں نے تو سنا ہے کہ ..... آپ ناراض ہیں اور سلطانہ آپا سے خفا۔ اسی لیے ان کے گھر نہیں جاتے..."

"جس نے یہ کہا غلط کہا۔ وہ میرے بڑے بھائی ہیں۔ میں ان کی کوئی بات ٹالتا نہیں۔ جس طرح تم سے شادی کے لیے ان ہی نے کوشش کی تھی۔ بھابھی سے خفا تو نہیں ہو سکتا میں۔ عزت کرتا ہوں ان کی۔ کسی بات سے اختلاف ہو سکتا ہے۔"

انور اسے بہلا رہا تھا یا بات ٹال رہا تھا۔ ناہید چپ ہو گئی۔

"رات کو کھانا کیوں نہیں کھاتیں؟"

"بھوک نہیں لگتی۔"

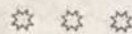
"آج میری خاطر آ جاتیں۔"

"بلایا تھا آپ نے؟" سوال تھا یا شکوہ۔

"گھر کے ہر فرد کو مدعو نہیں کیا جاتا۔ خود کو مہمان سمجھنا چھوڑ دو۔ سب کے ساتھ گھل مل کر رہو۔ اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔" انور اس کے پاس بیٹھ کر اسے سمجھا رہا تھا۔

"آج دل تو چاہتا تھا کہ سب کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاؤں۔ نہ بھی کھایا جائے تو صرف پانی ہی پی لوں۔ مگر شرم آئی کہ سب کیا سوچیں گے۔ اس کے علاوہ جو موجود نہ ہو۔ اسے آواز دے کر بلایا جاتا ہے' کھانے کے لیے آپ نے مجھے اس قابل سمجھا ہی نہیں۔"

آواز بھاری ہوگئی انور شرمندہ ہوگیا۔
"بیگم صاحبہ! دراصل ...... مجھے بھی شرم آرہی تھی۔" وہ بہلانے لگا۔ "سب کہیں گے۔ کیسا زن مرید ہے۔ بیوی کی خوشامد کررہا ہے۔ حالانکہ وہ تو کھانا کھاتی ہی نہیں۔"
ناہید کو ہنسی آگئی۔ "اتنی سی بات سے کوئی زن مرید ہوجاتا ہے؟"
"ہو بھی سکتا ہے اور تم کو اندازہ نہیں کہ تم کس قدر کمزور ہوگئی ہو۔ رات کا کھانا ضرور کھانا چاہیے۔ طبی نقطۂ نظر سے بھی اور حدیث میں بھی ہے کہ دن کو چاہے نہ کھاؤ۔ مگر رات کو ضرور کھاؤ۔ پتہ ہے۔ رات کو فاقہ کرنے سے بڑھاپا بہت جلد آجاتا ہے۔ مجھ پر رحم کرو۔ میں بوڑھی بیوی کے ساتھ ذرا بھی اچھا نہیں لگوں گا' کبھی بچوں کے ساتھ پارک میں گئے تو لوگ کہیں گے۔ ان بڑی بی کا شوق دیکھو۔ بہو کو گھر بٹھا کر خود پوتے پوتیوں کے ساتھ چہلیں کررہی ہیں۔"
ناہید نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ "اوئی اللہ! توبہ اتنا خوفناک نقشہ۔"
"اچھا چلو اٹھو۔ کچھ کھالو۔ تھوڑا سا میرے کہنے سے۔"
انور کو اس کی صحت کی فکر ہورہی تھی۔ کیا کھلتا گلاب سارنگ چھوڑ کر گیا تھا اور اب سورج مکھی ہوگیا تھا۔ گالوں کی ہڈیاں بھی نکل آئی تھیں۔ چہرے پر نقاہت تھی۔ یہ وہ ناہید نہ تھی۔ پژمردگی اور بددلی نمایاں تھی۔
انور کی آمد سے دل کی کلی کھل گئی تھی مگر وہ اسے ظاہر بھی نہیں کرسکتی تھی۔ صبح تو اس کی طبیعت بے حد نڈھال رہتی تھی۔ بستر سے اٹھنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ بوا ہی ناشتہ دے جاتی تھیں۔



اب انور کی خاطر وہ اس کے ساتھ ناشتہ کرنے لگی تھی۔ نصرت کی کٹیلی نگاہوں کو نظرانداز بھی کردیتی۔ اختر کے ڈر سے نصرت کچھ بولتی نہیں تھی۔ ورنہ دل تو بہت چاہتا کہ حسب سابق ناہید کو اوقات یاد دلادے۔
سوکھی سڑی لکڑی۔ میرے اتنے ہینڈسم بھائی کو چھین لیا۔
انور جس طرح اس کا خیال رکھ رہا تھا۔ صبح شام فروٹ کھلاتا پابندی سے دودھ کا مگ لاکر دیتا اور جب تک ناہید سب کچھ ختم نہ کرلیتی۔ اپنی جگہ سے ہلتا نہ تھا۔
"ارے یہ نخرے اس سوکھی چوہیا کے بھیا چلے جائیں۔ پھر مزا چکھاؤں گی اماں صحیح کہتی ہیں۔ یہ بہوئیں آتے ہی شوہروں کو کیا گھول کر پلادیتی ہیں کہ وہ ماں بہن کو بھول ہی جاتے ہیں۔ یہ وہی بھیا صاحب ہیں نا جو کہتے تھے میں بھائی جان نہیں ہوں۔ ماں اور بہن سے بڑھ کر بیوی نہیں ہوسکتی۔ سنوں گا اس کی عمل اس پر کروں گا جو آپ کہیں گی اور اب کیا ہورہا ہے۔ ناہید کے ساتھ کمرے میں گھسے رہتے ہیں۔ یا انہیں لے کر کہیں چلے جاتے ہیں۔ ان کی کمزوری کے بیان ہوتے ہیں۔ لو کیا ہم نے انہیں کمزور کردیا ہے۔ خود ہی جل جل کر سوکھ رہی ہیں۔ ایک وہ بوا مل گئی ہیں ہمدرد خیرخواہ۔ ہر دم ان کی خوشامد میں یہ کھالو' وہ پی لو آرام کرلو لیٹ جاؤ توبہ کرتی کیا ہیں وہ۔ بس صبح کا ناشتہ بنادیا۔ کمروں کی جھاڑ پونچھ کردی۔ کبھی شام کی چائے کے ساتھ رول سموسے یا کیک بنادیا۔
ہاہ ثروت ہوتی ہنستی بولتی چلبلی۔ فیشن ایبل سب کے ساتھ مذاق کرتی۔ کبھی فلم دیکھنے جاتی تو مجھے ساتھ لے جاتی۔ کسی فنکشن میں جاتی تو میں ساتھ ساتھ۔ کتنا مزا آتا۔ اس کے بھائی بھی کتنے اسمارٹ ہیں۔ شاید کسی کو میں پسند آجاتی۔"
نصرت کا اب بھی ثروت سے ملنا جلنا تھا۔ وہ ثروت سے ناہید کا مقابلہ کرتی اور ثروت کو ناہید کی باتیں بتاتی اپنی اس سے نفرت کا ذکر کرتی۔
"تمہاری وجہ سے وہ مجھے بالکل پسند نہیں۔ سچ ثروت! بڑا افسوس ہے مجھے۔ مگر میرا بس نہ چلا۔ اصل میں بھائی جان...؟"
وہ سرور پر اس بے جوڑ شادی کی ذمے داری ڈال کر

منہ بنالیتی۔ ثروت کے لیے رشتوں کی کیا کمی تھی۔ اس کے کتنے ہی رشتے آئے ہوئے تھے۔ مگروہ بھی نصرت کی باتوں سے متاثر ہو جاتی' انور کی بد قسمتی پر اسے بھی افسوس ہو تا۔ وہ انور کو پسند کرتی تھی۔ اس کی خوب صورتی' بلند قامتی اور شائستگی کئی بار سامنا ہوا۔ مگر انور نے نظر اٹھا کر اس سے بات نہ کی۔ یہ شرافت اور بلند کرداری اسے اور کہیں نظر نہ آئی۔

☼ ☼ ☼

سلطانہ نے دبی زبان سے انور سے کہا کہ وہ ناہید کو ڈاکٹر کے پاس لے جائے۔ ڈاکٹر کی ہدایات کے مطابق ناہید کو عمل کرنے پر مجبور کرے۔ بہت کمزور ہو گئی ہے۔ اور یہ کوئی اچھی علامت نہیں۔

"میں ایک بار لے گئی تھی۔ ڈاکٹر نے جو دوائیں لکھی تھیں۔ میں نے خود لا کر اسے دیں۔ مگر اس نے استعمال نہیں کیں۔"

"بھابھی! آپ بھی چلیں۔ مجھے تو کسی ڈاکٹر کا پتہ نہیں ہے۔" انور گھبرا گیا۔

"میں ضرور جاتی۔ مگر اماں کو میرا عمل دخل پسند نہیں۔ اس دن بھی انہوں نے ہم دونوں کو..... خیر چھوڑو میں ٹائم لے کر تمہیں بتا دیتی ہوں۔"

سلطانہ نے ڈاکٹر شہناز سے ٹائم لے لیا۔ انور کو بتا دیا۔

نصرت نے صبح ہی انور سے کہہ دیا تھا کہ اسے ثروت کے گھر جانا ہے۔ "اختر بھائی تو لے کر نہیں جائیں گے۔ آپ مجھے اس کے گھر چھوڑ آئیں۔ وہ مجھے واپس پہنچا دے گی۔ آپ سے مل بھی لے گی بہت یاد کرتی ہے آپ کو۔"

دوپہر کو بھابھی نے بلا کر شام چھ بجے ناہید کو کلینک لے جانے کا کہا۔ نصرت کو پروگرام معلوم ہوا۔ تو وہ بھنا گئی۔

"واہ' ان کی بیگم کی بیماری اتنی اہم ہو گئی۔ میں نے صبح ہی بتا دیا تھا۔"

"میں تیار ہو گئی ہوں بھیا! چلیں مجھے چھوڑ آئیں۔"

ڈھیٹ بن کر کہہ دیا۔

"اوہو! لیکن اس وقت تو..... ٹائم لے لیا ہے ڈاکٹر سے۔ ناہید کو دکھانا ہے اور بڑی مشکل سے ٹائم دیا ہے اس نے' بہت مصروف ڈاکٹر ہے۔ ورنہ میں..... اچھا ایسا کرو۔ آج ملتوی کر دو۔ کل لے جاؤں گا تمہیں۔"

انور کو افسوس بھی تھا کہ نصرت کی ذرا سی فرمائش بھی پوری نہیں کر سکا۔ نصرت کے چہرے کے تاثرات بھی اسے پسند نہیں آئے۔

ڈاکٹر شہناز نے مفصل معائنہ کیا۔ ناہید کو ڈانٹا بھی کہ وہ اپنا بالکل خیال نہیں کرتی۔ انور کو بھی سمجھایا۔ خون کی کمی' کیلشیم کی کمی اور بھی کئی قسم کی کمی ہائی بلڈ پریشر۔ بہت زیادہ احتیاط۔ مکمل آرام کم از کم ایک ماہ کوئی کام نہ کریں۔ آرام اور صرف آرام۔ انجکشن پابندی سے لگوائیں۔ ٹانک استعمال کریں۔ زیادہ چلنے پھرنے سے گریز۔ صرف رات کو کھانے کے بعد ہلکی پھلکی چہل قدمی کی اجازت دی۔

انور پریشان ہو گیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ناہید ناطاقتی کی اس منزل پر ہو گی۔ شاید سلطانہ نے اسی لیے اسے ساتھ جانے پر مجبور کیا تھا کہ وہ ناہید کی حالت سے واقف ہو جائے۔ گھر آ کر اس نے اماں کو ڈاکٹر کی ہدایت اور احتیاط آرام کے بارے میں بتایا۔ اماں کو نہ جانے کیوں غصہ آ گیا۔ ہاتھ میں پکڑا سروتہ زور سے زمین پر دے مارا۔ اس سروتے کی انہیں بہت قدر تھی۔ کسی دوست سے رام پور انڈیا سے منگوایا تھا۔

انور نے حیرت سے یہ منظر دیکھا۔ اماں تو اس سروتے کو سب سے چھپا کر رکھتی تھیں۔ کسی کو دیتی نہ تھیں کہ اوٹ پٹانگ چیز کاٹنے سے خراب ہو جائے گا اور اب..... اس کے زمین پر پٹخنے سے دو حصے ہو گئے تھے۔ اماں کی آواز اور ان کا اشتعال اس پر بھی زیادہ۔

"بس رہنے دو یہ نخرے' ڈاکٹر کے پاس جاؤ گے تو وہ کیا کہہ دے گا کہ بی بی تم صحت مند ہو۔ نہ جی نہ۔ وہ تو مریض بنا کر رہے گا۔"

"اماں جی! مگر یہ تو دیکھیں....."

"اے بس چپ رہو۔ یہ چونچلے ہم نے دیکھے نہ کیے۔ سنا تم جیسا بد ہو۔ جس کو مل جائے اس کے تو عیش ہوں گے ہی۔ آج کل کی لڑکیوں سے اللہ پناہ میں رکھے۔ میاں گھر پہنچے کہ بیماریوں کی فہرست سنا دی اور وہ چل پڑے مٹی کے مادھو ڈاکٹر کے پاس بھلا بتاؤ کون سی مشقت بہو بیگم کو کرنی پڑتی ہے یہاں جو آرام کی ہدایت دی گئی ہے۔ مجھے کیا سنانے آئے ہو۔ سناؤ بڑی بھابھی کو۔ ان کی ماں ممتا اچھلتی ہے۔ ہم نے بھی بچے پیدا کیے ہیں۔ کبھی ڈاکٹر کو نہیں دکھایا۔ پانچ وقت ڈٹ کر کھایا۔ صحت مند بچے پیدا کیے۔ جب کھانے کی جگہ دوائیں نگلی جائیں گی تو یہ تو ہو گا۔ ہمارا کیا ہے۔ بتاؤ بی بی کو ہتھیلی کا چھالہ۔ کر دو تعمیل' شرم نہ حیا۔"

انور تو سٹپٹا کر گھر سے ہی نکل گیا۔ ناہید پر منوں بوجھ آ گرا۔ شرم غیرت۔ ندامت پچھتاوے اور شرمندگی نے حواس غائب کر دیے۔

نصرت مسکراتی رہی۔ خوب ہوا۔ اس نے ہی رو رو کر ماں کو بھائی بھاوج کے خلاف اکسایا تھا۔ ناہید مرے مرے قدموں سے اپنے کمرے میں آ گئی۔ انور کا کچھ پتا نہ تھا۔ دوائیں رپورٹ نسخے اماں کے پلنگ پر ہی رہ گئے۔ اختر اس وقت موجود نہ تھا۔

ناہید بستر پر لیٹ کر رونے لگی۔ کیا یہ غلطی تھی؟ کیا اسے علاج کی ضرورت نہ تھی؟ یا انور کے ساتھ جانے سے اماں خفا ہو ئیں۔ انور نہیں تو پھر کون؟ رات ہو گئی انور نہیں آیا۔ اختر آ گیا اور لگا شور مچانے۔

"بھابھی! بھابھی! چلو بھائی جان کی طرف چلتے ہیں۔ وہاں محفل جمی ہوئی ہے۔ بس آپ کی کمی ہے اور میری۔"

ناہید دروازے پر کھڑی ہو گئی۔ وہ خوف زدہ تھی۔ بھائی جان کے گھر جانے سے چچی اماں ناراض ہوتی تھیں۔ اور ابھی جو معرکہ ہو چکا تھا اس کی تلخی اس کے ذہن پر خوف کی شکل میں موجود تھی۔

"چلیں ناں بھئی۔ بھیا وہیں گئے ہیں۔ بلا رہے ہیں آپ کو۔"

"زبردستی کیوں کر رہے ہو۔ انور خود کیوں نہ لے کر گئے۔ قاصد بھیجا ہے۔"

اختر نے اماں کی بات سنی ہی نہیں۔ آگے بڑھ کر ناہید کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ "آؤ نا چلو۔"

"ہوش میں رہ لڑکے۔" اماں نے پھر ڈانٹا۔ "زبردستی کیوں کر رہا ہے۔ بڑا بھابھی کا ہمدرد۔ انور دیکھ لے تو کیا سوچے۔"

"کیا مطلب؟ کیا سوچے؟" اختر نے مڑ کر ماں کو دیکھا۔

"ارے بھئی ہاتھ کیوں پکڑ رہا ہے۔ جوان ہو گیا۔ عقل نہ آئی۔"

"ہاتھ پکڑنے میں کیا گناہ ہے۔ اپنی سگی چچا زاد چھوٹی بہن کا ہاتھ پکڑا ہے۔ اپنی سگی بھابھی کا ہاتھ۔ جس کا درجہ ماں کے برابر ہوتا ہے۔ آپ کی سمجھ میں مگر رشتوں کا احترام ہے ہی نہیں۔"

"رشتوں کی خبر ہے۔ جبھی کہہ رہی ہوں۔ سمجھا رہی ہوں۔ انور برا مان سکتا ہے۔ اس کی بیوی کو کھینچ رہا ہے۔ پگلا۔"

"آپ کا وہ رشتے کا بھانجا فراز آتا ہے۔ نصرت کا ہاتھ پکڑ کر دروازے تک جاتا ہے۔ آپ نے اسے تو کبھی منع نہیں کیا کیوں؟"

"وہ' وہ اور بات ہے۔" اماں سٹپٹا گئیں۔

اختر نے ناہید کا ہاتھ چھوڑا نہیں۔ ناہید گھبرا گئی تھی۔ کچھ دیر پہلے جتنی شرمندگی اٹھا چکی تھی۔ اب اس میں اضافہ ہو گیا۔ مگر اختر سے وہ جیت نہ سکی اور اس کے ساتھ ہولے ہولے چلتی ہوئی لان کے راستے سرور کے گھر آ گئی۔ صحن میں سلطانہ' سرور' انور بیٹھے تھے۔ ناہید پلنگ پر بیٹھ گئی۔ وہ بہت تھک گئی تھی۔ اختر انور کی کرسی کے ہتھے پر جا بیٹھا۔

"اماں بہت خفا ہو رہی تھیں۔" اختر نے اعلان کیا۔ "مگر میں بھابھی کو لے ہی آیا۔ کچھ ہوا ہی تبدیل ہو۔ ماحول کا اثر بھی صحت کے لیے اچھا ہوتا ہے۔ کیوں بھائی جان!"

"اماں کیوں خفا ہو رہی تھیں؟" انور کا لہجہ بھی ڈرا ڈرا تھا۔

"عادت ہے ان کی نصرت کے احکام کی بہت پابند ہیں امی جان ہماری کہہ رہی تھیں ایک تم ہی ہمدرد ہو بھابھی کے اور یہ لقب تو ہمیں بھابھی جان کی حمایت میں بھی مل چکا ہے۔ کیوں بھابھی جان؟"

سلطانہ پلنگ پر ناہید کے پاس بیٹھ گئیں۔

"ڈاکٹر کے پاس گئی تھیں کیا کہا۔ دوائیں دی ہوں گی۔ استعمال کرنا لاکر مجھے دکھائیں کہاں ہیں؟"

"وہ...... وہ اماں کے پلنگ پر۔" ناہید کے حلق میں گولہ سا اٹک گیا۔

"اماں کے پلنگ پر؟"

سلطانہ لمحے میں سمجھ گئیں۔ ناہید سہمی ہوئی لگی۔ انور نے تو کچھ بتایا ہی نہیں۔ سلطانہ کو بھی لحاظ آیا۔ پوچھتے ہوئے۔ وہ اسے تسلی دینے لگیں۔

"کوئی بات نہیں بس آرام کرو۔ زیادہ اٹھنے بیٹھنے کی ضرورت نہیں۔ میں بوا کو سمجھا دوں گی۔ وہ صبح آکر ناشتہ بھی بنا دیا کریں گی۔"

سلطانہ بہن تھیں۔ انہیں ناہید کی صحت کی بہت فکر تھی۔ یہ بھی سمجھتی تھیں کہ ناہید بہت کمزور فطرت کی ہے۔ سیدھی سادی اور نیک اور یہاں گو اسے کوئی کام تو نہیں کرنا پڑتا تھا مگر ساس نند کی تلخ ترش باتیں سن کر ہی کڑھتی رہتی تھی۔ ڈرتی رہتی تھی کہ انور کو بھی اگر اس کی طرف سے بدظن کر دیا گیا تو؟ اسی لیے صبر اور برداشت سے خاموشی سے وقت گزار رہی تھی۔ بوا نے آکر اختر انور سے کہا۔

"کھانا لگ گیا ہے۔ بیگم صاحب بلا رہی ہیں۔"

اختر نے کہا۔ "ابھی تو آئے ہیں ہم۔ تھوڑی دیر سے آئیں گے صبر کرو۔"

"بیگم صاحبہ ناراض ہوں گی میاں! کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا۔" بوا کو یہی کہنا تھا۔

"ہونے دو۔ انہیں ہر وقت ایک یہی کام ہوتا ہے۔ ناراض ہونا۔ ڈانٹنا اب تو عادت سی ہو گئی ہے ہم کو۔ کسی دن ان کی ناراضی سننے کو نہ ملے تو زندگی میں کمی محسوس ہوتی ہے۔"

انور نے کھڑے ہو کر کہا۔ "اچھا باتیں نہ بناؤ چلو۔"

"مجھے بھوک نہیں ہے اور بھابھی تو کھاتی ہی نہیں ہیں۔ یہاں کی پرفضا خوش کن ہواؤں سے صحت کو کیسی تازگی محسوس ہو رہی ہے۔ بھابھی کو اس بند کمرے کی قید سے نکال کر لایا ہوں۔ کچھ دیر تو لطف اندوز ہونے دیں۔"

ناہید بھی کھڑی ہو گئی۔ انور نے کچھ کہا ہی نہیں۔ سلطانہ اور سرور بھی خاموش رہے۔

"ہم تو یہیں کچھ کھا پی لیں گے۔ بھابھی جان کیا پکایا ہے؟" اختر اب سلطانہ کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ناہید چپ چاپ انور کے پیچھے چل دی۔ بوا کو سلطانہ نے پکار کر بلا لیا۔ ناہید نے دروازے تک پہنچ کر مڑ کر دیکھا۔ سلطانہ بوا کو اندر لے جا رہی تھیں۔ اختر کی غیر موجودگی کا نصرت نے فائدہ اٹھایا۔ انور سے شکوہ کرنے لگی۔

"اتنے دن بعد آئے ہیں بھیا! ہمیں اکیلا چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ سچی دل چاہتا ہے ہر وقت آپ سامنے بیٹھے ہوں۔ مگر آپ اپنے کمرے میں یا بھائی جان کے گھر گھسے رہتے ہیں۔ اور ہم یعنی میں دونوں جگہ نہیں جا سکتی۔ غصہ آتا ہے مجھے آپ کی بے نیازی پر۔"

نصرت یاد دہانی کرانا چاہتی تھی۔ انور شادی سے پہلے کہتا تھا۔ ماں بہن سے بڑھ کر اور کوئی نہیں ہوتا۔

"کیوں تم دونوں جگہ کیوں نہیں جا سکتیں۔" انور نے حسب توقع سوال کیا۔

"بھائی جان کو اپنے گھر میرا وجود پسند نہیں۔ کیونکہ ان کی بیگم کو میں گوارا نہیں۔ آپ...... کے کمرے میں ناہید بھابھی سے اجازت لینا پڑے گی۔ جو مجھے گوارا نہیں۔"

"اجازت گھر والوں کو کسی کمرے میں جانے کے لیے اجازت کی کیا ضرورت ہے؟"

"کیا کسی نے منع کیا ہے؟"

"خیر اتنی بھی جرأت کسی میں نہیں کہ مجھے منع کر سکے۔" نصرت منہ بگاڑ کر ترشی سے بولی۔ "مگر...... آخر رویہ تو دیکھنا پڑتا ہے۔ اپنی عزت اپنے ہاتھ ہوتی ہے۔"

"میں...... میں نے تو کبھی کچھ کہا نہیں۔" ناہید گھبرا گئی۔ انور کے چہرے پر جو سرخی آگئی تھی۔ وہ اسے ڈرانے کے لیے کافی تھی۔

"خیر کہنے نہ کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ بے وقوف میں نہیں ہوں۔" نصرت انور کی شہ پا کر شیر ہو گئی۔ "تمہارے انداز پہچانتی ہوں۔ بھائی جان کے گھر تم اپنی بہن سے ہدایت لے کر آتی ہو۔ کیا سب احمق ہیں۔ جو تمہارے رابطوں کو نہ جان سکیں۔ خیر جی۔ ہمیں تو اپنے بھیا سے غرض ہے۔ تم جانو تمہاری بہن۔"

انور کی تیوری پر بل تھے۔ وہ خاموشی سے کھانا کھا رہا تھا۔ وہ ان معاملات سے گریز چاہتا تھا۔ اس کی خاموشی ناہید کے لیے سوہان روح تھی۔ تو نصرت کے لیے بھی فکر کا موجب۔ اس نے اماں کو ٹھوکا دیا۔

"ہم تو بھیا۔ بس اتنا جانتے ہیں کہ گھر میں سب شیر شکر ہو کر رہیں۔" اماں لقمہ چبانے کے ساتھ الفاظ بھی چبا رہی تھیں۔ "ایک ہی نند ہے۔ ہم عمر ہے دوستی ہونی چاہیے تھی۔ مگر ناہید کو کسی سے تعلق نہیں۔ ان کی ماں نے یہی تربیت دی ہے کہ سسرال سے الگ تھلگ رہو۔ خود وہ بھی یہاں سے اسی لیے میکے جا بسیں۔ یہاں تو پوری سسرال تھی۔ ان کو ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانی تھی۔ سو بنا لی۔ ہم چپ رہے۔ میں اسی وجہ سے اس شادی کے خلاف تھی۔ مگر میاں کی وصیت پر عمل کرنا بھی ضروری تھا۔ سو چپ رہی۔ سو چپ رہی۔ سلطانہ بھی میاں کو لے کر الگ ہو گئیں۔ ان کی خوشی چاہتی تھی ایسی بہوئیں آئیں کہ سب سے مل جل کر رہیں۔ چلو اپنے نصیب میں یہی تھا۔ اب اگر یہ بھی سلطانہ کے مشورے پر الگ رہنا چاہیں۔ تو ہم نے پہلے کیا کر لیا تھا۔ اب بھی صبر کر لیں گے۔ یہ تو تمہاری لیاقت اور سعادت مندی پر منحصر ہے کہ تم کیا فیصلہ کرتے ہو۔ ہم تو تم لوگوں کے ٹکڑوں پر پل رہے ہیں۔"

اماں کا لہجہ دردناک اور سوگوار تھا۔ انور بے چین ہو گیا۔ ناہید کے پیر کانپنے لگے۔ آنکھیں بھر آئیں۔ بات کو کہاں سے کہاں لے گئی تھیں چچی اماں۔

"مگر اماں! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ نہ ہی ناہید ایسا چاہتی ہے۔ ہم تو آپ سے الگ رہ ہی نہیں سکتے۔ بھائی جان بھی اسی گھر میں رہتے ہیں۔ آپ ایسا کیوں سوچتی ہیں۔"

انور اماں کو تسلی دینے لگا۔

"میں یا ناہید الگ کیسے رہ سکتے ہیں آپ کے بغیر۔ اگر چاہتا تو میں ناہید کو اپنے ساتھ ہی لے جاتا۔ مگر میں نے بہتر سمجھا کہ یہ آپ کے پاس رہے۔ میرا ابھی کبھی نہ کبھی یہاں ٹرانسفر ہو جائے گا۔ تو کیا میں کوئی الگ گھر لوں گا۔ نہیں اماں! ایسا سوچیں بھی نہیں آپ ناہید کو بہو کیوں سمجھتی ہیں۔ وہ آپ کی اپنی بیٹی ہے۔ بھتیجی ہے۔ آپ بڑی ہیں۔ اسے سمجھا سکتی ہیں اگر غلطی ہو تو ڈانٹ لیں۔ کون منع کرے گا؟ شام کو آپ نے اتنا ڈانٹا۔ میں یا ناہید کچھ بولے؟ حالانکہ بات یہ ہے کہ میں دور رہتا ہوں۔ مگر ناہید کی ذمے داری مجھ پر ہے۔ اگر وہ بیمار ہے۔ اسے کسی چیز کی ضرورت ہے۔ تو میں اس کی دیکھ بھال کا ذمے دار ہوں۔ آپ نہیں آپ بزرگ ہیں۔ نصیحت کر سکتی ہیں۔ غلط کام سے روک سکتی ہیں۔ اگر ناہید بدتمیزی کرے تو بے شک آپ کو حق ہے۔ جس طرح چاہیں سزا دیں۔ مگر اماں! خدا کے لیے آپ مجھے فریق نہ بنائیں۔ میں آپ کا بیٹا ہوں اور بس مجھ پر حکم چلائیں میں تابع دار ہوں اور جہاں تک بھائی جان بھابھی جان کا تعلق ہے۔"

انور نے رک کر ماں کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"اب میرا یہی خیال ہے کہ انہوں نے جو مناسب سمجھا وہ کیا اور یہی بہتر تھا۔ وہ گھر سے کہیں گئے تو نہیں ر آپ کے پاس آتے ہیں۔ آپ سے محبت کرتے ہیں۔ اپنی فیملی کے ساتھ سکون سے رہتے ہیں۔ مجھے تو پہلے کے بھائی جان اور ان کے بھائی جان میں کوئی فرق نہیں لگا۔ وہ خوش ہیں۔ آرام سے ہیں۔ یہ ہم سب کے لیے کافی نہیں؟ بلاوجہ اعتراض کی گنجائش نہیں ہے۔ آپ اور نصرت بھی ایسا رویہ رکھیں۔ جیسے آپ بھی خوش ہیں اور ان کے الگ ہونے سے کوئی فرق

نہیں پڑا۔ ٹھیک ہے ناامی جان؟"
اماں سر جھکائے سنتی رہیں۔ بات ختم ہو گئی تھی۔ ناہید اب اٹھ کر جانا چاہتی تھی۔ اس نے انور کی طرف دیکھا۔ انور نے اس کی تھکی ہوئی حالت دیکھ کر گردن ہلا کر کہا۔
"ناہید! تم اب جاؤ۔ ڈاکٹر نے جو ہدایت دی ہے۔ اس پر عمل کرنا۔ دوائیں کہاں ہیں۔ ابھی سے کورس شروع کر دو اور اپنا خیال رکھا کرو۔ یہ سامنے میز پر شاید تمہاری دوائیں ہی ہیں۔"
ناہید نے بھی دیکھ لیا تھا۔ وہ دواؤں کا پیکٹ اٹھا کر دروازے کی طرف چلی۔ اسی وقت نصرت بھی اٹھ کر آگے بڑھی۔ انور، اماں کی جانب متوجہ تھا۔ اس نے دیکھا نہیں۔ اسے محسوس ہوا کہ نصرت نے ناہید کے ساتھ ہی کمرے سے نکلنے کی کوشش کی اور ناہید کی چیخ اور زمین پر گرنے کا دھماکہ سن کر وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا تھا۔ ناہید زمین پر گری ہوئی تھی اور نصرت اس پر جھکی ہوئی کہہ رہی تھی۔
"ہائے اللہ گر گئیں۔ میں نے تو دھکا نہیں دیا تھا بچی۔"
انور نے آگے بڑھنا چاہا تھا مگر اماں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا۔
"بیٹھو تم کھانا کھاؤ ایسے ڈرامے تو ہوتے رہتے ہیں۔ پھر بھی دیکھ لینا کبھی۔"
اماں پر کسی بات کا اثر نہ ہوا تھا۔ انور نے محسوس کیا کہ ناہید کا رنگ بالکل سفید ہو گیا۔ ساس کی بات سن کر اس نے بمشکل خود کو سنبھال کر اٹھایا اور بہت دھیرے دھیرے باہر نکل گئی۔ انور سے کچھ کھایا نہیں گیا۔ نصرت نے واپس آتے ہوئے کہا۔
"بغیر کچھ کھائے جا رہی تھیں۔ میں نے انہیں روکنا چاہا تو مجھے دھکا دیا اور خود ہی گر گئیں۔ توبہ بڑا غصہ ہے بھئی۔"
"غصہ نہ ہو گا۔ ماں باپ دونوں کی طرف سے ورثے میں اور کیا ملا ہے؟"
"مگر اماں! آپ کی یہ بہت بری عادت ہے کہ نصیحت کرنے بیٹھ جاتی ہیں۔ جب معلوم ہے کہ اگلے کو یہ پسند نہیں۔" نصرت نے کن اکھیوں سے بھائی کو دیکھا۔
جو لقمہ ہاتھ میں پکڑے گم صم بیٹھا تھا۔
"میں نے نصیحت کب کی۔ میں نے تو بیٹے کا فضیحتہ سنا ہے۔ لو بھلا مہینوں بعد میرا بچہ گھر آیا۔ میری تو کوئی فریاد نہ سنی۔ بیوی اور بھابھی کے ہی گن گانے لگا۔ یہ اوقات ہے ماں کی اب۔" انور اپنے احساسات کیونکر ظاہر کرے۔ وہ پشیمان بیٹھا تھا۔ تب ہی بوا نے اندر آ کر اماں کے کانوں میں کھسر پسر کی۔
نصرت نے کہا۔ "اماں کیا بات ہے؟"
"ہونا کیا؟" اماں بگڑ کر بولیں۔ "جاؤ انور! تمہاری بیگم نے طلب کیا ہے تمہیں۔ سہلاؤ جا کر انہیں۔ تم نے ہی سر پر چڑھایا ہے۔ بھگتو خود ہی۔"
انور کو غصہ بھی آ رہا تھا۔ بے بسی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے برآمدے میں پہنچ کر اماں سے کہا۔
"ٹھیک ہے میری وجہ سے سب کچھ ہو رہا ہے۔ تو میں چلا جاتا ہوں۔ آپ مطمئن رہیں۔ اب میں کچھ نہیں بولوں گا۔"
بوا نے آ کر اس سے کہا۔ "میاں سنیے۔"
"بھاگ جاؤ۔" جھلا کر کہا۔
"میاں! دلہن کو ذرا دیکھ لیتے۔ حالت خراب...!"
"میں کہہ رہا ہوں۔ بوا تم جاؤ۔"
"اللہ رحم کر۔" بوا نے ہاتھ ملتے ہوئے آسمان کی جانب دیکھا اور سرور کے گھر کی طرف دوڑیں اور دو منٹ بعد ہی سلطانہ گھر کے درمیانی بند کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئیں۔ گھبراہٹ چہرے سے ظاہر تھی۔
"انور! میں آنا نہیں چاہتی تھی اس موقع پر مگر بوا نے جو کچھ بتایا ہے میں پریشان ہو گئی۔ میں صرف انسانی ہمدردی کے خیال سے آئی ہوں۔ کوئی رشتہ اس میں حائل نہیں۔ بوا نے بتایا کہ اماں جان کچھ سننے پر تیار نہیں اور ناہید۔ وہ بہت کمزور ہے انور! پلیز اس کی زندگی چاہتے ہو تو فوراً لیڈی ڈاکٹر کو بلا کر لاؤ۔"

"بھابھی! خیریت تو ہے؟ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟"
"اللہ خیر کرے۔ میرا خیال ہے کہ... سیریس معاملہ ہے۔ ناہید کو اتنی احتیاط تو کرنا چاہیے تھی۔ اسی لیے بیڈ ریسٹ بتایا تھا شہناز نے... گرنے سے اندرونی چوٹ لگنے کا خدشہ۔ اچھا میں شہناز کے نام پرچہ لکھ دیتی ہوں۔ تم فوراً جاؤ۔ ہماری گلی کے پچھلے حصے میں۔ سبز رنگ کا گیٹ ہے۔ شہناز کو میرا پرچہ دکھانا۔"
سلطانہ نے کمرے میں جا کر ایک کاغذ پر کچھ لکھا۔ انور نے اندر آ کر ناہید کو عجیب کیفیت میں دیکھا۔ اذیت سے اس کا چہرہ نیلا سا ہو رہا تھا۔ اسے شاید سانس لینے میں بھی دقت ہو رہی تھی۔ وہ کرسی پر گڑی مڑی سی پڑی تھی۔ انور نے اس کا ہاتھ پکڑا تو اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ آنسوؤں کی برسات اور بے بسی بس یہی دیکھا تھا اس نے۔ اس کو پرچہ دیا۔
"فوراً" بھاگو میں ناہید کے پاس ہوں۔"
سلطانہ کی عجلت اور بوکھلاہٹ انور واقعی بھاگتا ہوا گیا۔ شہناز واقعی سلطانہ بھابھی کی عزیز دوست تھی۔ وہ ایک لمحہ لگائے بغیر اپنا بیگ اٹھا کر اس کے ساتھ چل پڑی۔ اس نے کوئی سوال نہیں کیا۔ گھر میں آتے ہی وہ انور کے اشارے پر ناہید کے پاس چلی گئی۔
انور کے دل پر کوئی چھریاں چلا رہا تھا۔ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اماں کو میری کسی بات پر یقین نہیں۔ انہیں ناہید سے نفرت ہے۔ نصرت کو بھی نفرت ہے۔ نصرت نے ناہید کو دھکا دیا تھا۔ اب تصور کی آنکھ سے گزرا ہوا واقعہ دیکھا۔ ہاں نصرت تیزی سے اس کی طرف بڑھی اور اس کے دھکے سے مگر کیوں؟
کمرہ بند تھا اندر سلطانہ اور شہناز نہ جانے کیا کر رہی تھیں۔ بوا ایک دو بار اندر گئیں پھر باہر آئیں۔ اماں کے کمرے میں گئیں۔ انور ان سے پوچھ نہ سکا کہ کیا ہو رہا ہے۔ اختر ابھی گھر آیا تھا۔ انور سے پوچھنے لگا۔ انور نے مختصر بتا دیا۔
"بھیا! آپ کا خیال بالکل درست ہے۔ نصرت یہ حرکت کر سکتی ہے۔ وہ... بہت کینہ رکھتی ہے۔ مگر اماں اس کو کچھ سمجھاتی ہی نہیں۔ بلکہ اس کی شہ پر خود بھی خیر چھوڑیں اللہ سے دعا کریں۔ ناہید بھابھی کو کوئی نقصان نہ ہوا ہو۔"
اختر کیا کہہ رہا ہے۔ نصرت کو ناہید سے نفرت کیوں ہے۔ وہ کینہ رکھتی ہے۔ مگر کس لیے؟
شہناز نے انور سے کہا۔
"میں نے ٹریٹمنٹ دی ہے۔ مگر بہتر ہے کہ آپ انہیں ہاسپٹل لے جائیں۔ چند ٹیسٹ ضروری ہیں۔ ایکسرے بھی بہت ضروری ہے۔ دیر نہ کریں۔ ورنہ نتیجہ... آپ خود ذمے دار ہوں گے۔ ذرا سی بے احتیاطی سنگین نتائج کا سبب بن سکتی ہے۔ زیادہ فکر کی ضرورت نہیں۔ پہلی بار ایسا ہو بھی جاتا ہے۔ بس آپ انہیں فوراً" اسپتال لے جائیں۔"
شہناز تو چلی گئی۔ انور نے اندر جا کر ناہید کو دیکھا۔ شاید اسے انجکشن لگا دیا تھا۔ مگر وہ بے جان مجسمے کی طرح بستر پر پڑی تھی۔
سلطانہ نے چپکے سے کہا۔
"انور! شہناز تاکید کر گئی ہے۔ فوراً" ہاسپٹلائز کے لیے گرنے سے اندرونی چوٹ آئی ہے۔ خطرناک ہو سکتی ہے۔ میں 'میرا اس معاملے میں دخل دینا اماں کو شاید پسند نہ آئے۔ تم 'تم اماں سے کہو۔ وہ ساتھ چلی جائیں۔ بہت ضروری ہے۔ اماں بزرگ اور تجربہ کار ہیں۔ تمہارے کہنے سے مان جائیں گی۔ میرا جانا... مناسب نہیں۔ فکر تو رہے گی۔ مگر کیا کروں؟"
انور کے کہنے سے پہلے بوا اماں کے پاس جا کر حال بتا چکی تھیں۔ ڈاکٹر کی تاکید بھی وہ کمرے میں پہنچا تو اماں زور زور سے چلا رہی تھیں۔
"میرے پاس کیا لینے آئی ہو۔ میں ہوتی کون ہوں۔ بہن کو بلا لیا۔ بس میری کیا ضرورت؟ ڈاکٹر بھی آ گئی۔ مشورے ہو گئے۔ اب میں کون؟ ڈاکٹر خدا ہے۔ اس کے حکم کی تعمیل ضروری ہے۔ مجھے کیوں بتا رہی ہو؟ نہ میں اسپتال جاؤں گی۔ نہ اسے وہاں جانے کی اجازت دوں گی۔ سارے مرد ڈاکٹر ہوتے ہیں۔ ہماری بھی عزت ہے۔ کہہ دو سلطانہ سے وہ ہیں حقیقی ہمدرد۔

جو چاہیں کریں۔ لو بھئی ڈرامے پر ڈرامے ہو رہے ہیں۔ ہم نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے۔ ساری چکر بازی جانتے ہیں ارے بابا! بہوؤں کا بھی کیا دوش۔ جب اپنے ہی سکے کھوٹے نکلے۔"

انور ٹھٹک گیا۔ اماں! اماں ایسی سنگدل تو نہ تھیں۔

"اماں! آپ ایک بار آکر دیکھ تو لیں۔ پھر آپ جو کہیں گی وہی ہو گا۔"

اس نے اماں سے لجاجت سے کہا تھا۔ مگر اماں کو سلطانہ کی آمد کی خبر سے جو دکھ پہنچا تھا وہ اتنا کم نہ تھا۔

"بھئی میں کون کس سلسلے میں آکر دیکھوں۔ کیا دیکھا نہیں کبھی تم دیکھ لو۔ وہ تمہاری بھابھی ہیں نا انہیں دکھاؤ۔"

"اماں! آپ میری بزرگ ہیں میری ماں ہیں۔ خدا کے لیے میرے بچے کی خاطر۔ اماں! ڈاکٹر خطرہ بتا گئی ہے پلیز اماں!"

"گھنٹہ بھر سے تو بھاگ دوڑ ہو رہی ہے۔ بہن آ گئیں۔ ڈاکٹر آ گئی۔ کسی نے مجھ سے کہا۔ مجھے بلایا؟ اے بھئی، بہن جو ہمدردی کریں گی ساس نہیں کر سکتی۔"

انور گم صم کھڑا تھا۔ یہ بھی نہ بولا کہ بوا بتانے آئی تو تھیں۔ آپ نے سنا ہی نہیں۔ اختر نے اندر آکر کہا۔

"بحث کا وقت نہیں ہے بھیا۔ ایک زندگی خطرے میں ہے۔ یہاں شکوے شکایات کا دفتر کھلا ہے۔ سنگ دلی اور بے حسی کی حد ہے۔"

"ایک تم ہو ہمدرد ایک وہ ہیں۔" اماں کو غصہ تو تھا اور بھی چڑ گئیں "بے غیرتی کی حد ہے کہ دیور کھڑے ہو کر بھاوج سے ہمدردی کر رہا ہے۔ ہم بے حس اور سنگدل ہیں۔ بس تم ہو انسان۔ کرتے رہنا بیویوں کی چاپلوسی۔ اسی لیے بیٹے پیدا کیے تھے۔ ہائے میرا فخر۔ میرا غرور ایسا مٹی میں مل گیا۔"

اماں چیخ رہی تھیں۔ اختر برابر حجت کر رہا تھا۔ برآمدے میں سلطانہ ہاتھ مل رہی تھیں۔ اماں، انور کو گم صم دیکھ کر اور بھی تلملا گئیں۔ وہ ناہید اور سلطانہ کے گٹھ جوڑ کو بے نقط سنا رہی تھیں، جنہوں نے ان سے ان کے سعادت مند بیٹے چھین لیے تھے۔ "یہ جادو گرنیاں۔ چالاک عورتیں۔ ارے شوہروں کو مٹھی میں کر لیا۔ ماں کو بھلا دیا بیٹوں نے۔"

انور سہم گیا۔ میں بدل گیا کیا؟ ماں کی کون سی خدمت سے منہ موڑا؟ کیا بیوی سے محبت کرنا جرم ہے؟ ناہید کی جان کیا اتنی سستی ہے کہ اسے یونہی چھوڑ دیا جائے۔ اس نے تو ہمیشہ ماں کی عزت کی۔ کب ان کے خلاف ہوا؟ یہ اماں کیا کہہ رہی ہیں؟

اس کے ذہن میں جھکڑ سے چل رہے تھے۔ اسے ہر چیز سے نفرت ہونے لگی کیا فائدہ..... سب کچھ بے کار، فضول، خدمت، محبت، احساس فرض، کسی چیز سے کچھ حاصل نہیں۔ ماں، بیوی، دونوں کے فرائض نبھانے چاہیے۔ لیکن کچھ حاصل نہ ہوا۔ نہ معلوم کب اور کیسے وہ اپنے کمرے سے اٹیچی اٹھا لایا اور چپ چاپ گھر سے نکل گیا۔ میں ہی اس تنازعے کی وجہ ہوں۔

قریب قریب بے ہوش ناہید یونہی آنکھیں بند کیے پڑی تھی۔ سلطانہ، بوا اس سے محو گفتگو تھیں۔ اختر، اماں سے جھگڑ رہا تھا۔ کسی نے اسے باہر جاتے نہیں دیکھا۔ ٹیکسی فوراً" مل گئی۔ گھر، گلی، محلّہ دور ہوتا گیا۔

کئی دن تو وہ عجیب سی کیفیت سے گزرتا رہا۔ ملتان میں آفس کا کچھ کام تھا۔ لگے ہاتھوں وہ بھی کر لیا۔ غصہ، رنج، بے بسی نے اس کو پورے طور پر حصار میں لے لیا تھا۔ ابھی کئی چھٹیاں باقی تھیں۔ ضائع ہو گئیں۔ ایک ہفتے بعد آفس گیا۔ کن ارمانوں کو دل میں بسائے چھٹیاں لے کر گھر گیا تھا۔ ہوا کیا؟ ناہید کو بہت زیادہ کمزور پایا۔ سوچا تھا ناہید کو حیدر آباد لا کر کسی دوست کے گھر رکھے گا۔ پھر کراچی لے جائے گا۔ سیر کرائے گا اور پھر..... ناہید کو لاہور پہنچا دے گا مگر اماں نے کہا تھا۔

"وہ پہلی بار ہے۔ اس لیے ناہید سے کھایا نہیں جاتا۔ فکر نہ کرو۔"

وہ خاموش رہا۔ وہ ہمیشہ خاموشی سے کام لیتا تھا۔ اماں کو اس سے بہت امیدیں تھیں۔ سرور کے الگ ہونے پر انہوں نے اپنی خفگی کے ساتھ اس سے بھی

عہد لیا تھا اور اس نے وعدہ کیا کہ وہ ایسی کوئی حرکت نہیں کرے گا جس سے اماں کو تکلیف پہنچے۔ یا ان کی حق تلفی ہو۔ شادی کے بعد بھی اس نے پوری کوشش کی کہ ناہید سے زیادہ اماں کو وقت دے۔ انہیں کوئی شکایت نہ ہو کہ وہ بیوی کے ساتھ ہی چپکا رہتا ہے۔ ناہید کمرے میں انتظار کرتی رہتی۔ وہ اماں سے خوش گپیوں میں مصروف رہتا۔ اگر ناہید بھی آکر بیٹھنا چاہتی تو نصرت کے ذرا سے جملے سے گھبرا جاتی۔ اماں کی پوری تعمیل کر کے بھی۔ وہ ہی برا بنتا۔ اماں کا خیال تھا کہ سلطانہ اس کے کان بھرتی ہیں۔ ناہید بھی چالاکیاں دکھاتی ہے۔ مگر وہ کسی طرح اماں کو یقین نہ دلا سکا کہ سلطانہ نے کبھی کوئی ایسی بات اس سے نہیں کی۔ اماں کے مفروضوں کو جھٹلانا ایک نئے تنازعے کی بنیاد بن جاتی۔ اس لیے وہ چپ ہو جاتا۔

وہ اب پچھتا رہا تھا۔ ناہید کو جس حال میں چھوڑ کر آیا تھا۔ کیا یہ بزدلی نہ تھی۔ لیکن اماں کو کسی طرح راضی کرنا اس کے اختیار میں نہ تھا۔

آفس میں اختر کا خط آیا تھا۔ مفصل حالات یہ تھے کہ اختر لڑ جھگڑ کر اپنی ذمے داری پر ناہید کو اسپتال لے گیا۔ بڑی منت خوشامد کے بعد سلطانہ بھابھی ساتھ گئیں۔ کیونکہ ناہید کی حالت دم بدم بگڑ رہی تھی۔ اماں نے انور کے خفا ہو کر جانے کا سارا الزام ناہید اور سلطانہ پر ڈال کر اختر کو نافرمانی کی سزا میں گھر سے نکل جانے کا حکم سنا دیا۔ ناہید پر گھر آنے کی پابندی لگا دی۔ اختر تو اماں کی گالیاں کھا کر بھی زبردستی گھر جاتا رہا ویسے وہ سرور کے گھر پر رہتا ہے۔

مگر سرور نے درمیان کا دروازہ کھول دیا ہے۔ تاکہ اماں کو تنہائی کا احساس نہ ہو۔ لیکن جب ناہید کو اسپتال سے ڈسچارج کیا گیا اور اختر اسے لے کر گھر آیا۔ تو اماں نے اسے گھر میں داخل ہونے سے روک دیا۔ ناہید نے بہت معافی مانگی خوشامد کی۔ روتی رہی کمزوری کی وجہ سے اسے چکر آگیا۔ وہ گر گئی۔ اماں دروزہ بند کر کے چلی گئیں۔ اختر غصے اور پریشانی میں ناہید کو لے کر ملتان گیا۔ اسے میکے چھوڑ آیا۔ اب جب سے اختر آیا ہے اماں اور نصرت اس پر رکیک الزام لگا رہی ہیں۔ اختر اب سرور کے ساتھ بھی نہیں رہ سکتا۔ وہ کسی دوست کے ساتھ رہتا ہے اور اماں نے آرڈر جاری کر دیا ہے کہ اب ان کی زندگی میں ناہید اور اختر گھر نہیں آسکتے۔

اختر فون کرتا رہا مگر انور ملا نہیں۔

ناہید ملتان میں ہے۔ ابھی تک اتنی کمزور ہے۔ بے سروسامانی کی حالت میں ملتان پہنچی ہوگی۔ چچی جان نے کیا سوچا ہوگا۔ پتہ نہیں ناہید نے وہاں سب کو کیا بتایا ہوگا۔ انور کے بارے میں کیا کہا ہوگا؟ پتہ نہیں اس کا اب کیا حال ہے۔ او خدا! چچی جان کو اس کے اس بیماری کی حالت میں وہاں پہنچنے پر پریشانی ہوتی ہوگی۔ اس کی واپسی ناہید کے لیے کتنی اذیت کا سبب بنی ہوگی۔

عجلت اور جلال کی کیفیت میں اٹھایا ہوا ہر قدم پچھتاوا بن کر لپٹ جاتا ہے۔ میں اپنی ماں کو ہی نہ منا سکا۔ انہوں نے اپنی زندگی دے کر پرورش کی تھی۔ میں نے ان کا کون سا حق ادا کیا۔ کچھ نہیں، نہ میں بیوی کے ساتھ انصاف کر سکا۔ میں اتنا نکما کمزور ہوں۔ مجھ سے زیادہ پر اعتماد تو اختر ہے۔ بھائی جان نے بھی ماں اور بیوی کے درمیان توازن کا اہتمام کیا۔ نہ جانے انہوں نے بھی کیا کچھ نہ برداشت کیا ہوگا۔ اماں ان کی غیر موجودگی میں ہی ان کے خلاف بولتی ہیں۔ سلطانہ بھابھی کو تو ہمیشہ انہوں نے حقیر اور کمتر سمجھا۔ شادی کے بعد سے ہی وہ بھابھی پر جانے کیا کیا الزام لگاتی تھیں۔ اماں بدمزاج تو تھیں مگر اتنی ہٹ دھرم بھی ہو سکتی ہیں یہ کیسے مانا جائے۔ انہیں اپنے بیٹوں کی خوشی کا بھی خیال نہیں۔ کیا تمام عورتیں ساس بن کر ایسی ہی سخت گیر ہو جاتی ہیں؟ سوچ سوچ کر خود ہی پریشان اور پشیمان ہوتا رہا۔ آخر یہ کشیدگی پیدا ہی کیوں ہوئی؟

ناہید پر اس کے چلے جانے کا کتنا اثر ہوگا۔ وہ بہت ہی کمزور دل اور سہمی ہوئی سی لڑکی ہے۔ میں نے اسے کیا دیا؟ صرف جدائی بے یقینی پوری رات بے سکون گزری۔

بے دلی سے آفس گیا۔ وہاں ایک خوشخبری منتظر

تھی۔ ملتان آفس سے اس کا بلاوا آیا تھا۔ وہاں جو وہ کام کر کے آیا تھا۔ اسے سراہا گیا تھا اور اسے پھر وہاں جانا تھا۔

☼ ☼ ☼

ملتان میں ہلکی خنکی سی تھی۔ خوشگوار موسم۔ دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے گیٹ کی گھنٹی پر ہاتھ رکھا۔ دروازہ شبنم نے کھولا اور اسے دیکھ کر اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"آ..... آپ السلام علیکم دولہا بھائی۔ خوش آمدید۔"

وہ شوخ تھی۔ انور نے اس کے سر پر چپت رسید کی۔

"اے دولہا بھائی کس کو کہا؟ میں تمہارا بھائی ہوں۔ تمہارا اپنا بھائی جان سمجھیں؟"

"جی سمجھ گئی۔ تشریف لائیے۔ آئے تو ہیں آپی کی وجہ سے اور احسان رکھ رہے ہیں کہ میرے بھائی جان ہیں۔"

"ارے بابا! میں تو آفس کے کام سے آیا ہوں۔ کسی کی وجہ سے نہیں۔"

"اچھا؟ تو پچھلے مہینے بھی تو آپ آفس کے کام سے آئے ہوئے تھے۔ تب آپی نہیں آئی تھیں۔ آپ کیوں نہیں آئے یہاں؟" آگے پیچھے وہ دونوں گھر کے اندر داخل ہوئے۔

"اچھا تو خبر مل گئی۔ دراصل......"

"بہانا نہیں چلے گا۔ کئی دن رہے تھے آپ ہوٹل میں۔ دراصل میری سہیلی کے بھائی نے آپ کو شادی پر دیکھا تھا۔ آج کل وہ ہوٹل کی مینجمنٹ سے متعلق ہیں۔ وہیں انہوں نے آپ کو پہچانا اور حیران ہوئے کہ آپ ہمارا گھر ہوتے ہوئے ہوٹل میں کیوں ٹھہرے؟ آپی دیکھیں، میں آپ کے لیے کیسا انمول تحفہ لائی ہوں۔"

شبنم سے بحث لاحاصل تھی۔ اس نے شکر ادا کیا کہ اس نے پھر جواب طلبی نہیں کی۔ ناہید اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔

چچی جان بہت خوش ہوئیں۔ انہوں نے خود ہی اسے ناہید کی کمزوری اور علالت کے بارے میں بتایا۔

"میں تو اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس قدر نقاہت اور کمزوری۔ پھر بھلا سفر کرنے کی ضرورت کیا تھی اور سنو دونوں دیور بھاوج ٹرین میں سوتے رہے۔ اور کوئی مسافر ان کا سارا سامان لے کر رفوچکر ہو گیا۔ انہیں خبر ہی نہ ہوئی۔ یہ تو حال ہے لاپروائی کا۔" انور سمجھ گیا۔ یہ اختر کی گڑھی ہوئی داستان ہے۔ گھر والوں کو مطمئن کرنے کے لیے۔

"اس حال میں سفر کرنا بالکل مناسب نہ تھا۔ مگر آج کل کی لڑکیوں میں بے صبری بہت ہے۔ بڑی بھابھی کو چاہیے تھا کہ انہیں سفر سے منع کرتیں۔"

چچی جان مسلسل ناہید کی غلطی پر شکوہ کناں تھیں ان کی باتوں سے ہی انور کو معلوم ہوا۔ جب ناہید آئی ہے۔ بچے کو ضائع ہوئے کئی دن ہو گئے تھے۔

"بھئی پہلی دفعہ میں ایسا ہو بھی جاتا ہے۔ تجربہ ہوتا نہیں کود پھاند کی ہوگی۔ چلو خیر۔ اللہ اور دے گا۔ سمجھاتی رہتی ہوں۔ مگر اس کے آنسو تھمتے ہی نہیں۔ کھاتی پیتی بھی نہیں کہ کچھ طاقت آئے۔ اب تم ہی سمجھاؤ۔"

انور کو دھکا سا لگا۔ اختر نے تو اس بارے میں کچھ لکھا نہیں تھا۔ کیا اس لیے کہ اس خبر سے انور کو دکھ پہنچے گا؟! اختر واقعی حساس ہے۔

رات کو ناہید کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ وہ یوں بلک رہی تھی جیسے کوئی ماں جوان اولاد کے مردے پر روئے۔ انور کو کچھ کم دکھ نہ تھا۔ مگر پھر اندازہ ہوا۔ اسے بچے کے ضائع ہونے سے زیادہ اماں کا سلوک رلا رہا تھا۔

"انہوں نے مجھے گھر میں داخل ہونے نہیں دیا۔ میں نے کیا کیا تھا بھلا؟ میں تو ہسپتال جانا ہی نہیں چاہتی تھی۔ بے ہوشی کی حالت میں لے گئے مجھے اختر بھائی اور سلطانہ آپا۔ میرا کیا قصور تھا؟ پھر کہاں جاتی میں۔ اختر بھائی سے کہتی رہی کہ یہیں پڑی رہوں گی دروازے کے باہر۔ کبھی تو چچی اماں کھول دیں گی

دروازہ گمر میں چکرا کر گر پڑی تو اختر بھائی بچ مجھے خبر ہی نہ ہوئی اور امی کو میں نے کچھ نہیں بتایا۔ کیا بتاؤں؟" وہ بے بسی کی تصویر بنی ہوئی تھی۔ انور اسے بہلاتا رہا۔

"سو جاؤ تم۔"

"مجھے نیند بھی تو نہیں آتی۔" وہ معصومیت سے بولی۔ "سوچتی رہتی ہوں کہ..... چچی اماں نے مجھے گھر نہیں جانے دیا۔ تو کہاں جاؤں گی۔ یہاں کب تک رہوں گی؟ اور سب لوگ..... کیا سوچیں گے؟ آپ، آپ بھی تو مجھے چھوڑ کر چلے گئے تھے؟ کیوں؟"

سر اٹھائے وہ اسے دیکھ رہی تھی۔ انور کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ وہ اسے تھپکتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ نیند کی گود میں بے خبر ہو گئی۔

انور کی موجودگی نے ناہید کی صحت پر مثبت اثر ڈالا۔ اب وہ سوتی بھی تھی۔ مسکراتی بھی تھی۔ انور نے اسے اپنی محبت کا یقین دلا دیا تھا۔ مگر اسے تو چچی اماں کی ناراضی کی فکر تھی۔

"جب تک تم پہلے جیسے گول گپا نہیں ہو جاتیں۔ تمہیں یہیں رہنا ہے۔ میں پھر جب آؤں گا۔ تمہیں لاہور لے جاؤں گا۔ فکر نہ کرو۔ اب میری سمجھ میں آ گیا ہے کہ اماں کو کیسے منانا ہے۔ دعا کرو کہ میرا ٹرانسفر لاہور کا ہو جائے۔ ممکن ہے ملتان کا ہی ہو جائے۔ یہاں سب میرے کام سے بہت خوش ہیں۔"

انور سمجھا بجھا کر حیدر آباد آ گیا۔ اختر کا خط آیا رکھا تھا۔ اسے دوبئی میں ایک اچھی جاب مل رہی ہے۔

"بھائی جان تو متامل ہیں۔ مجھے آپ کے مشورے کی ضرورت ہے۔" اس نے لکھا تھا۔ اختر خود بھی اس جاب کے لیے رضامند تھا۔ انور نے فوراً" سرور کو فون کیا۔

"بھائی جان اختر سے کہیے دوبئی کی جاب اس کے لیے اچھی ہے۔ تامل نہ کرے۔ صحیح وقت پر مثبت قدم اٹھانا مستقبل میں کامیابی کی دلیل ہے۔ میں سو فیصد متفق ہوں۔"

سرور سے بات کر کے اسے بڑا سکون ہوا۔

اگلے دن اماں کا خط ملا۔ بڑے شوق سے لفافہ چاک کیا۔ اماں نے اس کی خطائیں معاف کر دی ہوں گی۔ ناہید کو بلانے کا لکھا ہو گا۔ آخر تو اماں کب تک ناراض رہیں گی۔ مگر خط پڑھ کر اس کی توقع پر پانی پھر گیا۔ اماں کی خفگی پہلے سے زیادہ بڑھ چکی تھی۔ انہوں نے لکھا تھا۔

"میری مرضی اور اجازت کے بغیر ناہید اسپتال گئی۔ وہاں سے اختر کے ساتھ کہیں چلی گئی۔ ہمیں پتا نہیں کہ وہ دونوں کہاں رہتے ہیں؟ بے غیرتی اور ڈھٹائی کا مظاہرہ کرنے والی ایسی لڑکی کی ہمارے گھر میں جگہ نہیں۔ خاندان میں تھو تھو ہو رہی ہے۔ تم میرے بیٹے ہو اور میرا حکم ہے کہ اس ننگ خاندان کو فوراً" طلاق دے دو۔ کیونکہ میں ایسا چاہتی ہوں۔ ورنہ میں تمہیں بھی صبر کر لوں گی۔ نصرت کا رشتہ آیا ہے اور میں اس کی شادی میں تم تینوں کی موجودگی ضروری سمجھتی ہوں۔ مگر اس سے پہلے تم ناہید سے چھٹکارا حاصل کر لو۔ وہ اب ہمارے خاندان کے لائق نہیں رہی۔"

تمہاری اماں

انور بدحواس ہو گیا۔ یہ نفرت کی کون سی قسم ہے۔ کیا اماں اتنی بدگمان ہو سکتی ہیں؟ انہیں اپنی اولاد پر بھی بھروسہ نہیں۔ اماں کو اس غیظ و غضب کے اظہار پر کس نے مجبور کیا۔ اور کیوں؟ صرف ناپسندیدگی؟ نہیں اگر ایسا ہی تھا تو پہلے ہی منع کر دیتیں وہ ناہید سے شادی نہ کرتا۔ اگر وہ خود ملتان میں ناہید سے مل نہ آتا۔ اگر اختر اسے پہلے ہی مطلع نہ کر چکا ہوتا۔ اگر وہ

اس نے میز پر سر ڈال دیا۔ اف کس امتحان میں ڈال دیا اماں نے۔ جس الزام کے تحت فرمائش کی تھی وہ بے بنیاد تھا۔ بغیر تحقیق بغیر ثبوت اتنا بڑا بہتان۔

ناہید اماں اور نصرت سے کیوں ڈرتی تھی؟ کیا وہاں بھی اسے دھمکی دی جاتی تھی؟ صبر، برداشت تو اس میں بہت تھی۔ وہ اپنی ماں سے سسرال کے معاملات چھپا سکتی ہے۔ تو انور سے اس کی ماں، بہن کے سلوک کو بھی چھپاتی ہو گی۔ اب کس طرح اس معاملے کو سلجھائے۔ اماں کی بدگمانی اور شکوک کیسے دور ہوں گے؟

ایسے ہی جاہلانہ طور طریقے ہوتے ہیں۔ جس سے خاندانوں میں تفرقہ پڑتا ہے۔ طلاقیں ہوتی ہیں اور پھر ساری عمر کے پچھتاوے۔

پھر کہتے ہیں۔ ہم نے غصے میں یہ الفاظ کہہ دیے۔ ہم نے فلاں کے بہکانے سے طلاق دے دی تھی۔ اب غلطی کا احساس..... شاید وہ بھی ان مردوں میں سے ہوتے ہوں گے۔ جو اماں کے حکم پر سر جھکا دیتے ہیں۔ یہ سوچے بغیر کہ اس بے قصور لڑکی کی زندگی پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔ اگر اختر سب کچھ لکھ چکا نہ ہوتا۔ وہ ناہید سے نہ ملا ہوتا۔ شاید اماں کی بات پر یقین کر کے وہی کرتا۔ جو جاہل ماؤں کے سعادت مند احمق بیٹے کرتے ہیں۔ پہلی فرصت میں طلاق۔ بے قصور لڑکی کو اس کی وفاؤں کی سزا؟

اچانک اسے احساس ہوا۔ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ اماں کے لیے پہلی بار اس نے جاہل کا لقب اختیار کیا۔ کیا واقعی؟ اماں نے محض جہالت کے سبب ناہید سے نفرت اختیار کی چچی جان کی ضد میں؟ انہیں سلطانہ بھابھی اسی لیے ناپسند تھیں کہ وہ چچی جان کی بھتیجی تھیں تو ناہید تو ان کی بیٹی ہے۔

خود ہی ناہید کے لیے گھر کے دروازے بند کیے اور پھر انور کو اس کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کی۔ انہیں واقعی اپنے بیٹے کا گھر اجاڑ کر خوشی ہو گی؟ یہ کون سا جذبہ ہے۔ کیسا انتقام ہے؟ کیا بھائی جان سے مشورہ کروں؟ نہیں یہ میرا اپنا مسئلہ ہے۔ مجھے ہی حل کرنا ہے۔ ماں اور بیوی دونوں انصاف کی طلب گار ہیں۔ اماں کو دیورانی سے نفرت تھی۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔ لیکن اتنی سی بات کے لیے وہ بیٹے کی خوشی چھین لیں گی؟ یہ کیسا انصاف ہے؟

ناہید کا اسپتال جانا اس کا اتنا بڑا جرم بن جائے گا کہ وہ ہر انتہائی قدم اٹھا لیں گی۔ وہ گھر میں پڑے پڑے مر جاتی۔ ایسا چاہتی تھیں آپ اماں! آپ کیسی ماں ہیں۔ اولاد والے تو دوسری ماؤں کا بھی احساس کرتے ہیں۔ آپ ایک جوان اولاد کو اپنی ضد کی بھینٹ چڑھا کر کون سی خوشی حاصل کرتیں، چچی جان سے نفرت کا یہ اظہار نہیں اماں۔ آپ ایسا نہیں کر سکتیں۔ اگر اس وقت اختر نہ ہوتا۔ میں نے تو بزدلی سے میدان چھوڑ دیا تھا۔ یہ اختر تھا۔ جس نے ناہید کی مدد کی اس کا ساتھ دیا۔ اس پر بھی الزام؟ یہ کیسی ممتا ہے؟

☼ ☼ ☼

چھٹی لے کر وہ پھر ملتان آ گیا۔ الجھا الجھا پریشان۔ اس کی کیفیت ناہید سے چھپی نہ رہی۔ مگر وہ اسے کچھ نہ بتا سکا۔

"آپی! آپ بھائی جان کے آنے پر حیران کیوں ہیں؟" شبنم تعجب سے دیکھ رہی تھی۔ "آپ کی محبت میں آئے ہیں۔ کچے دھاگے سے بندھے آئے ہیں سرکار آپ کے۔"

"کچے نہیں، بہت مضبوط دھاگے سے باندھا ہے تمہاری بہن نے۔"

"جی تب ہی تو پریشان پریشان نظر آ رہے ہیں۔ آپی کو لے جانے کے لیے آئے ہیں؟ لے جائیں جناب حیدر آباد کی چوڑیاں تو مجھے بھی بلاتی ہیں۔ ہائے وہ ریشم گلی کی بل کھاتی گلیاں۔ پہاڑی راستے ایک بار گئی ہوں دس بار جانے کی خواہش ہے۔"

"ضرور، ضرور۔" انور کے دل میں بھی خواہش بیدار ہوئی۔ کاش ایک بار تو ناہید کو حیدر آباد کی سیر کرا دوں۔ چند دن ہی رہنا پڑے۔ یہ تو طے تھا کہ اماں کی یہ نئی فرمائش ناممکن العمل تھی۔ دل دماغ اس کے خلاف تھے۔ اماں سے بات کرنے کے لیے لاہور جانا پڑے گا اور ناہید کو بھی جانا ہو گا۔ اس کی تسلی اسی طرح ممکن ہے۔ رات وہ ناہید کو سمجھاتا رہا۔ اماں کے خط کے ذکر کو چھپا لیا۔ ورنہ وہ نہ جانے کیا کر بیٹھتی۔

صبح صبح سلطانہ بھابھی ہنستی مسکراتی آ گئیں۔

"ہائیں، انور تم یہاں؟"

"اور ہائیں بھابھی جان۔ آپ یہاں؟ یہ کیا ماجرا ہے؟" انور حیران ہو گیا تھا۔ کیونکہ سلطانہ بیٹھتے ہوئے بتانے لگیں "میں ناہید کی طرف سے فکر مند تھی پتا تو چل گیا تھا کہ یہ صاحبہ یہاں ہیں۔ مگر ایسی مصروفیت

تھی کہ گھر سے نکل نہ سکی۔ اب بھی ایک دوست کی شادی کا بہانہ کر کے آئی ہوں۔ گجرات میں رہتی ہے وہ۔" سلطانہ آنکھ دبا کر شرارت سے مسکرا دیں۔

"تمہارے بھائی یہاں آنے کی اجازت ہرگز نہ دیتے۔ دو تین دن کا کہہ کر آئی ہوں۔ کیونکہ آج مہندی کل شادی پرسوں ولیمہ۔ کیا سمجھے اور ہاں ناہید! نے بتایا کہ تم آتے ہوئے ٹرین پر سامان بھی چوری کروا آئیں؟ اتنی بے خبری؟ آفت کیا تھی جو بیماری کی بھی پروانہ کی تم نے۔"

"میں بھی یہی کہہ رہی تھی۔" ناہید کی امی نے سلطانہ کے ہاں میں ہاں ملائی۔ "ذرا صحت بہتر ہوتی تو سفر کر لیتیں۔ بھلا بتاؤ۔ راستے میں کچھ ہو جاتا۔ اپنا نقصان خلق کی ملامت۔"

"وہی تو ہوا۔ اچھا پھپو۔ چھوڑیں اس بات کو۔ اب تو خاصی صحت مند نظر آ رہی ہیں محترمہ لگتا ہے میکے کا پانی راس آ گیا ہے۔ وہاں تو میں تو ڈرتی رہتی تھی کہ کچھ ہو نہ جائے۔"

"جو بھی ہو۔ مگر شادی شدہ بیٹیاں سسرال میں ہی آباد رہیں تو ماں باپ کو خوشی ہوتی ہے۔"

چچی جان دل گرفتہ سی ہو گئیں۔ وہ تو اسکول چلی گئیں۔ سلطانہ بھی اماں ابا کے گھر چلی گئیں۔ رات کو آئیں۔ ناہید وہاں کے حالات معلوم کرنے کے لیے بے چین تھی۔ "سلطانہ آپا! مجھے بتائیں۔ چچی اماں تو بہت بگڑی ہوئی تھیں۔ اختر بھائی نے انہیں سمجھایا تو ہو گا۔"

"ناہید! اماں نے تمہارے خلاف بہت سخت محاذ بنایا ہوا ہے۔ تمہارے فرار کی داستان پورے خاندان میں مشہور کر دی ہے انہوں نے۔ اختر کو ہمارے پاس بھی رہنے نہیں دیا۔ وہ کسی دوست کے ساتھ رہتا ہے۔ اس پر بھی اماں کو بہت غصہ ہے۔ تمہیں پتہ ہے۔ اختر خوشامد تو کر نہیں سکتا۔ وہ بھی ان ہی کا بیٹا ہے اور اب تو اسے بہت اچھی جاب مل رہی ہے۔"

"سلطانہ آپا! آپ کو بھی..... کون سے تمغے ملنے تھے۔ میں جانتی ہوں۔ میں آپ کی زندگی میں مزید زہر گھولنا نہیں چاہتی تھی۔ اختر بھائی نے بھی کہا کہ اماں آپ سے بے حد ناراض ہیں۔ میری ہمدردی کی وجہ سے..... شاید بھائی جان کو بھی میرے ساتھ ہاسپٹل جانے پر انہیں اعتراض تھا۔" ناہید اس وقت کی یاد سے اداس ہو گئی۔

"ہاں تھا مگر انہیں تمہاری اس وقت کی پوزیشن کا علم نہ تھا۔ انہوں نے بھی اماں کو سمجھانا چاہا۔ مگر اماں کا ریموٹ کنٹرول نصرت کے ہاتھ میں ہے اور نصرت مجھے پسند نہیں کرتی۔ میری وجہ سے تم بھی ہدف بن گئیں۔"

دونوں بہنیں باتیں کر رہی تھیں۔ انور اور شبنم کے آنے سے دونوں خاموش ہو گئیں۔

"یہ دیورانی جٹھانی کیا منصوبے بنا رہی ہیں چپکے چپکے۔" شبنم ڈپٹ کر بولی۔ "بھائی جان ذرا ان کی سرگوشیوں سے باخبر رہا کریں۔ یہ آپ کے خلاف بھی محاذ کھول سکتی ہیں اور بے چاری ساس نند کے خلاف بھی گٹھ جوڑ کر سکتی ہیں۔ توبہ توبہ اسی لیے کہتے ہیں کہ دیورانی جٹھانی کا اتفاق بھی خطرناک ہوتا ہے۔"

سلطانہ نے شبنم کا کان پکڑ کر پاس بٹھا لیا۔ "اچھا اور یہ کہنے والے کون ہیں؟"

"سیانے سیانے ہی ایسی دور کی کوڑی لاتے ہیں۔" شبنم نے کان چھڑایا۔

"تو پھر ہم بھی کم سیانے نہیں۔" سلطانہ ناہید کی طرف دیکھ کر پھر شبنم کے سر پر ہاتھ رکھ کر مسکرائیں۔

"تم جیسی نٹ کھٹ کو دیورانی نہ بنایا تو نام بدل دینا میرا۔ پھر تم ہمارے ساتھ کس کے خلاف محاذ کھولو گی..... اس؟" ناہید اور انور ایک دوسرے کو دیکھ کر سلطانہ کی طرف متوجہ ہو گئے۔

شبنم کھڑی ہو گئی۔ کمر پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

"آہا ہا ان خیالوں میں نہ رہیں۔ مجھے کیا باؤلے کتے نے کاٹا ہے۔ جو میں آپ کے گٹھ جوڑ کا حصہ بنوں گی۔ میرا تو ایک رشتہ آیا ہوا ہے۔ امی غور کر رہی ہیں۔"

"ہمارے پاس بھی بہترین رشتہ ہے۔ ہم تو غور بھی کر چکے۔ فکر بھی ذکر بھی۔"

سلطانہ تو یوں کہہ رہی تھیں جیسے وہ ناہید اور انور سے ذکر کر چکی ہوں۔ حالانکہ وہ دونوں ہی حیران نظر آ رہے تھے۔

"بھابھی جان کیا کہہ رہی ہیں آپ؟" انور پر حیرت نے حملہ کر دیا تھا۔ وہ تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا اور چچی جان بھی شاید یہ رشتہ پسند نہ کریں۔ اور اماں؟ اماں کو کیوں بھول رہی ہیں۔"

"انور کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ بھول گئے اپنے ابا کا خط جس میں دو بیٹوں کے لیے پھپھو کی دونوں بیٹیوں کا رشتہ مانگا تھا انہوں نے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم اس مطالبے کی تجدید کریں۔"

"اور اختر.... اس سے پوچھا ہے؟"

"وہی تو لے کر آیا ہے مجھے۔ خوشامد کر کے۔ خود وہاں منہ چھپائے بیٹھے ہیں حضرت اماں کے گھر۔"

"سلطانہ آپا! اختر بھائی آئے ہیں؟"

ناہید کی تو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا' وہ اس بارے میں کیا بولے۔ جو شوشہ سلطانہ آپا نے اچانک چھوڑا تھا۔ وہ اس پر غور کر رہی تھی اور مسکرا رہی تھی۔ شبنم باہر چلی گئی۔ وہ بھی مسکرا رہی تھی۔ انور دونوں بہنوں کو مسکراتا دیکھ کر کشمکش و پیچ میں پڑ گیا۔

"اور.... اماں؟ اماں تو یہ سن کر.... شاید سب کو عاق کر دیں گی۔" انور نے آہستہ سے کہا۔

"آپ اختر بھائی کو لے آئیں۔" ناہید انور کی بات سن کر بھی مطمئن نظر آ رہی تھی۔

"بھئی وہ فی الحال میرے ابا جان کو کمپنی دے رہا ہے۔ ابا جان تو اس سے بہت متاثر ہیں اور اس رشتے سے انہیں بہت خوشی ہو رہی ہے۔ پھپھو پر رشتہ منظور کرنے پر دباؤ ڈالیں گے اور اختر' اختر یہاں حوصلہ افزا صورتِ حال کے بعد انٹری دیں گے۔ انور فی الحال تو میں چاہتی ہوں کہ تم ناہید کو لاہور لے جاؤ۔ اماں کچھ بھی کہیں۔ تمہیں اپنی بیوی کی عزت و حرمت بحال کرنے کے لیے ان کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ماں کے فرائض کے ساتھ۔ بیوی کے حقوق بھی تم پر واجب ہیں۔"

"میں اماں کو قائل نہیں کر سکتا بھابھی! وہ بہت ضدی اور ہٹ دھرم ہیں۔"

"تو پھر سن لو وہ ناہید کو طلاق دلوانے کا عہد کر چکی ہیں۔ سارے خاندان میں مشہور ہو چکا ہے یہ قصہ۔ اس معاملے میں اختر کی دخل اندازی اور بھی خرابی کا باعث ہو گی۔ میں دراصل اسی لیے یہاں آئی ہوں سوچا تھا۔ تمہیں حیدر آباد سے بلوا کر بات کروں گی۔ تم یہیں مل گئے۔ میں جانتی ہوں اماں نے ناہید پر بہت شرمناک الزام لگایا ہے۔ اپنے غصے اور ضد میں انہوں نے اختر کا بھی خیال نہیں کیا۔ اسے بھی ملوث کر دیا۔ یقین تو کوئی نہیں کر رہا۔ مگر ماں کی طرف سے لگایا ہوا الزام سوچنے پر مجبور تو کر سکتا ہے۔ تم صرف تم ناہید کی معصومیت کی گواہی دے سکتے ہو۔"

انور سر جھکائے بیٹھا ہونٹ کاٹ رہا تھا۔ ناہید رونے لگی۔ آنسو تواتر سے بہہ رہے تھے۔ شبنم جوان لوگوں کے لیے چائے لا رہی تھی۔ دروازے کے باہر ہی دم بخود کھڑی ہو گئی۔ سن کر اوسان خطا ہو گئے۔ یہ کیسی بات سنی تھی اس نے۔

اس کی معصوم پاک دامن۔ شرم و حیا کی پتلی بہن پر ایسا شرمناک الزام۔

سلطانہ دونوں کو چھوڑ کر باہر نکلیں تو شبنم کو افسردگی کے عالم میں کھڑا دیکھا۔ یقیناً" اس نے سن لیا ہو گا۔ سلطانہ اس کا ہاتھ پکڑ کر دوسرے کمرے میں گھس گئیں' تاکہ اسے صحیح صورتِ حال سے آگاہ کر دیں۔ وہ پھپھو کو کچھ نہ بتا دے اندر انور اور ناہید مسئلے کے حل کے لیے عقل لڑا رہے تھے۔

ناہید اب کھل کر شکوہ کر رہی تھی۔

"مجھے جان کنی کی حالت میں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ یہ حیثیت ہے میری؟ اسی لیے چچی اماں اور نصرت مجھے جھڑکتی اور ذلت کرتی تھیں۔ وہ جانتی تھیں۔ آپ میرے معاملے میں میری حمایت نہیں کریں گے۔ اسی لیے' اسی لیے اب مجھے ذلت کی آخری حد تک پہنچانا چاہتی ہیں وہ اور اب بھی آپ.... انہی کا حکم مان لیں گے۔"

وہ روئے جا رہی تھی۔ انور کی جان پر بن گئی۔

"اب ایسا نہیں ہو گا ناہید!" انور مضبوط لہجے میں بولا۔ "یہ معاملہ ایسا نہیں کہ میں اپنی زندگی ان کے اشارے پر قربان کر دوں۔ تم میری زندگی ہو۔ میری روح ہو۔ میرا حال مستقبل سب کچھ۔ میں اتنی بڑی قربانی نہیں دے سکتا۔ میں اپنے ہاتھوں اپنی خوشیاں لٹا نہیں سکتا۔ لیکن میں اماں کو مجبور بھی کیسے کروں؟ میں نے ہمیشہ ان کے ہر حکم کی تعمیل کی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔ چار مہینے سے یہاں پڑی ہوں۔ جانتی ہوں آپ کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ کاش! ابا نے مجھے کنویں میں دھکا دے دیا ہوتا۔ مر جاتی تو اچھا تھا۔ روز روز مرنے سے ایک بار مرنا بہتر تھا۔"

"مگر آپی! یہاں ہمارے آس پاس کسی کے گھر کنواں بھی تو نہیں ہے۔"

شبنم اور سلطانہ ساتھ ہی آئیں۔ ناہید روتے روتے ہنس پڑی۔ شبنم چہرے پر پریشانی طاری کیے ہوئے تھی۔ مگر اس کی آنکھیں روشن تھیں۔

"ناہید! اٹھو رونا دھونا بند کرو۔ آنسو کسی مسئلے کا حل نہیں ہوتے۔ بہادر بنو اور ڈٹ جاؤ اپنے حق کے لیے۔ تمہارا کوئی جرم نہیں تو سزا کیوں ملے؟ ہم سب ہیں لڑنے کے لیے۔ تمہیں بھی ہمت کرنی چاہیے۔"

سلطانہ ناہید کو سمجھا رہی تھیں' ساتھ ہی انور پر بھی خفا ہوئیں جس کی کمزوری نے حالات خراب کیے۔

"تم ناہید کو حیدر آباد لے جاؤ۔ سمپل۔"

"حیدر آباد میں.... میں خود ایک کمرے میں اپنے کولیگ کے ساتھ رہتا ہوں۔ ناہید کو کہاں رکھوں گا۔"

"بھئی.... میرے ماموں کا گھر ہے وہاں۔ وہ خود شارجہ میں ہیں۔ ان کی بیوی بچے حیدر آباد میں ہیں۔ وہ خود چاہتے ہیں کہ کوئی چھوٹی فیملی ان کے ایک پورشن میں آجائے۔ ممانی کی تنہائی ختم ہو جائے۔ ماموں بھی بے فکر ہو جائیں۔ ابا سے کہا ہے ماموں نے۔ ابا نے خود یہ تجویز دی ہے۔"

"اور مجھے بھی ریشم گلی کے چکر لگانے کی آسانی ہو گی۔" شبنم نے دخل دیا۔

"ٹھہر جاؤ تم۔" سلطانہ نے کہا۔ "دیکھنا تمہیں کہاں بھجواتی ہوں میں۔ تمہارے شاپنگ کے شوق نے پھپھو کو عاجز کر دیا ہے اور پھپھو ہیں کہاں؟ جاؤ شبنم! پھپھو کو بلا کر لاؤ۔ ابا کی طرف ہی ہوں گی۔"

شبنم کے جانے کے بعد سلطانہ نے انور کو ایک اور خبر سنائی۔

"اماں نے تمہاری شادی بھی طے کر رکھی ہے۔ تابندہ کے ساتھ۔ تمہاری اوکاڑے والی خالہ کی بیٹی کے ساتھ۔"

انور اچھل پڑا۔ "کیا بات کرتی ہیں بھابھی! تابندہ مجھ سے چار سال بڑی ہے۔"

"اچھا.... اگر چھوٹی ہوتی؟ کر لیتے اس سے.... تابندہ کو سرور کے لیے منتخب کیا تھا اماں نے مگر وہ مجھ سے کر کے بری الذمہ ہو گئے۔ تابندہ کی دو شادیاں ہوئیں۔ دونوں ناکام۔ اب وہ بھائیوں کے گھر پر ہے۔ اماں کو اس پر بہت ترس آتا ہے۔ اس لیے تمہیں ان کا حکم ماننا ہو گا۔"

"میں.... ناہید کو حیدر آباد لے جاتا ہوں۔" اس نے عجلت میں فیصلہ کیا۔ گھبرا رہا تھا۔

"سلطانہ آپا!" ناہید جو ابھی تک اس نئی خبر کے شاک سے سنبھلی نہیں تھی۔ ایک دم بولی۔ "وہ تابندہ؟ وہ تو بہت موٹی ہیں۔ ان کے ساتھ کیسی لگیں گی؟"

سلطانہ اور انور دونوں ہنس دیے۔

کچھ دیر بعد شبنم کی باہر سے آواز آئی۔ "سلطانہ آپا! بھائی جان کھانا لگا رہی ہوں میں۔"

"میں نے کہا تھا پھپھو کو بلا لاؤ۔"

"بلا لائی۔ بلکہ ماموں کو بھی بلا لائی۔ ممانی نماز پڑھ رہی ہیں۔" اندر آکر شبنم نے ان سب کو باہر نکالا۔ میز پر کھانا رکھا تھا۔ شبنم کے ہاتھ میں سلاد کی پلیٹ تھی۔ اس نے سلطانہ سے کہا۔

"اور میں آپ کے دیور کو بھی بلا لائی۔ آنہیں رہے تھے شرما رہے تھے۔ بڑی مشکل سے منہ پر رومال رکھ کر آئے ہیں۔ دیکھ لیں۔"

ناہید کی امی نے آنکھیں نکالیں۔ "ہوں ہوں۔ کیا بدتمیزی ہے شبنم۔"

"بدتمیزی؟ نہیں تو یہ سلاد ہے۔"

اس نے پلیٹ میز پر رکھی۔ سلطانہ اور ناہید' اختر کو دیکھنے لگے' جو ہاتھ دھو کر آرہا تھا۔ اور رومال سے منہ پونچھ رہا تھا۔ سلطانہ مسکرا کر ناہید کو دیکھنے لگیں۔ اختر' انور سے سلام دعا کر رہا تھا۔ شبنم نے سرگوشی میں سلطانہ کے کان میں کہا۔

"بردکھوے کے لیے لوگ یونہی آتے ہیں منہ پر رومال رکھ کر۔ متوقع سسرال میں ہیں نا؟"

سلطانہ نے تھپڑ دکھایا اور مطمئن ہو کر کھانا کھانے لگیں۔ یہ لڑکی اختر کے ہی قابل ہے۔ کھانے کے بعد ماموں چلے گئے۔ سلطانہ اور اختر کو روک لیا گیا۔

سلطانہ نے پھپو کو بتایا۔ "انور ناہید کو حیدر آباد لے جارہے ہیں۔"

"کیوں؟" وہ کچھ حیران ہو گئیں۔ "ناہید کو لاہور جانا چاہیے۔ میں سمجھ رہی تھی انور اسے لاہور لے جانے کے لیے آئے ہیں۔"

سلطانہ نے اختر کو دیکھا۔ اختر نے انور کو۔ وہ گردن جھکا کر رہ گیا۔ ناہید دوپٹے کا کونا موڑتی رہی۔ اختر کے اشارے پر سلطانہ نے پھپو سے کہا۔

"دراصل میں ایک خاص مقصد کے لیے آئی ہوں۔ یہ اختر کا معاملہ ہے۔ مجھے اختر پر پورا یقین ہے۔" پھر انہوں نے اختر کے لیے شبنم کا رشتہ طلب کیا۔

"مگر۔۔۔ تم کیوں؟ سلطانہ یہ کام بڑی بھابھی کا ہے۔ تم اختر کی بھابھی ہو۔ میں تمہارے کہنے سے اتنا بڑا فیصلہ کیسے کر سکتی ہوں؟"

"پھپو! انور کے ابا نے خط میں اپنے دو بیٹوں کے لیے آپ کی دونوں بیٹیوں کا رشتہ مانگا تھا۔ میں اس کی یاد دہانی کرا رہی ہوں۔ اپنی طرف سے تو کچھ نہیں کہتی۔"

"پھر بھی۔ یہ بڑی بھابھی کی ذمے داری ہے۔ ناہید کا رشتہ لینے وہی آئی تھیں' سرور کے ساتھ اور اس وقت ناہید کے ابا بھی زندہ تھے۔ میں نے دخل نہیں دیا۔ یہ بڑوں کے کام ہوتے ہیں۔ چھوٹوں کے نہیں۔ بڑے جب بڑا کام کرنے پر آتے ہیں تو وہ ہی ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اچھے برے کو جاننا بگڑتے کام درست کرنا ان ہی کی فہم و فراست پر منحصر ہوتا ہے۔ تم جو کچھ کہہ رہی ہو۔ اس سے بڑی بھابھی کو اختلاف ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے انہوں نے اختر کے لیے کچھ اور سوچ رکھا ہو۔"

"ہماری اماں جان کو کام بگاڑنے میں مہارت حاصل ہے۔ فہم و فراست کے معنی ان کو معلوم نہیں۔" یہ اختر تھا۔ اس کا لہجہ بھی اکھڑا اکھڑا تھا۔ "میرے لیے سوچنے کا ان کے پاس وقت ہی کہاں ہے۔"

"پھر بھی ماں سے زیادہ اولاد کی بہتری کے لیے کون کوشش کر سکتا ہے۔" وہ کچھ سوچنے لگیں۔

"اولاد کو خود کوشش کرنی چاہیے۔" اختر نے جلدی سے کہا۔ "اپنی قسمت کا فیصلہ اپنی بہتری کا راستہ خود تلاش کرنا چاہیے۔"

"نہیں بیٹا! ماں باپ کے فیصلے تجربے اور مشاہدے کا نچوڑ ہوتے ہیں۔"

"تو۔۔۔ چچی جان میں ابا کے فیصلے کا نتیجہ ہی تو جاننا چاہتا ہوں۔"

"دیکھو اتنی عجلت میں کوئی فیصلہ کرنا میں مناسب نہیں سمجھتی' سرور اور بڑی بھابھی سے بات کرنے کے بعد۔ بھائی سے مشورہ کروں گی۔" چچی جان کی سوئی بڑی بھابھی پر اٹکی ہوئی تھی۔

سلطانہ نے مجبوراً انہیں حالات سے آگاہ کیا اور یقین دلایا کہ اماں تو ہرگز ایسا نہیں چاہیں گی۔ یہاں سرور آکر بات کر سکتے ہیں۔ ناہید پر گزرنے والی قیامت کا سن کر وہ انتہائی پریشان ہو گئیں۔

"مجھے شک تو ہوا تھا۔ جس حال میں یہ آئی میرے لیے اس کو سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر کے سپرد کر کے اللہ کے حضور دعائیں کرتی رہی۔ سنو سلطانہ! ناہید کا رشتہ اس کے باپ نے کیا تھا۔ میں اب کوئی رسک نہیں لوں گی۔ بیٹیاں بہت نازک ہوتی ہیں انور! میری دعا ہے کہ اس بار تمہارے ہاں لڑکی پیدا ہو۔ تم

بیٹی کے باپ بنو گے اس وقت تم کو احساس ہو گا۔ بیٹی کی آنکھ سے ٹپکا ایک آنسو ماں باپ کے سینے کا ناسور بن جاتا ہے اور میری معصوم صابر بیٹی تو جس دن سے آئی اس کے آنسو ہی نہیں تھمے۔ میں سمجھ تو گئی تھی کہ اس کے پیچھے کوئی بڑا واقعہ ہے۔ مگر اس نے بتایا نہیں۔ میں نے کریدا نہیں کہ جو یہ چھپانا چاہتی ہے۔ چھپا ہی رہے۔ شادی شدہ بیٹیوں کے سسرالی معاملات میں ماؤں کی دخل اندازی حالات خراب کر دیتی ہے۔ اس لیے چپ چاپ موقعے کا انتظار کرتی رہی کہ یہ کچھ کھل کر مجھے اعتماد میں لے گی۔ پھر انور کی آمد نے میرے کئی اندیشے ختم کیے۔ مگر اب شبنم کو قربان نہیں کروں گی۔ یوں بھی دوبئی کے پاکستانی اسکول میں میرا تقرر ہو گیا ہے۔ دو سال کے لیے۔ میں چلی جاؤں گی۔"

وہ آنسو پونچھ رہی تھیں۔

"پھپو! حوصلہ کریں۔ یقین کریں۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ فی الحال شبنم اور اختر کا نکاح ہو جائے۔ ناہید کے لیے مضبوطی ہو گی۔ اسے شبنم سے قوت ملے گی۔ پھر ہم اماں کو مجبور کر سکیں گے۔ ورنہ اماں تو انور کی سعادت مندی پر فخر کرتی ہیں۔ لیکن انور' ناہید کو حیدر آباد لے جائیں اور اختر' شبنم کا نکاح۔ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"سلطانہ آپا! آپ کے جرائم میں ایک اور ناکردہ جرم کا اضافہ۔" ناہید بولی۔

"ارے بھئی۔ میرا کوئی ذکر نہیں۔ میں تو گجرات گئی ہوئی ہوں۔" سلطانہ نے پہلو بچایا۔

"یہ گڈے گڑیا کا کھیل نہیں ہے سلطانہ!" چچی جان بہت افسردہ تھیں۔ یوں بھی شبنم کا ایک رشتہ آیا ہوا ہے۔ لڑکا دوبئی میں ہے۔ یہ بھی وہیں چلی جائے گی۔ مجھے بھی اطمینان رہے گا۔"

"بالکل بالکل چچی جان۔ لڑکا دوبئی میں ہی ہو گا۔" اختر نے فوراً کہا۔ "فکر نہ کریں۔"

"مجھے تو تم نے ایک نئی فکر میں مبتلا کر دیا ہے۔" چچی جان آہستہ آہستہ بول رہی تھیں۔ شاید ان سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔ "بڑی بھابھی بہت ضدی ہیں۔ ان کے فیصلے بے لچک ہوتے ہیں۔ میں نے ان کے ساتھ کافی وقت گزارا ہے۔ اگر وہ طے کر چکی ہیں ناہید سے چھٹکارے کی تو بیٹا کبھی نہ کبھی وہ کسی نہ کسی طور کسی بھی بہانے سے یہ کام کر کے رہیں گی۔ یہ بھی انور کی سعادت مندی کے طفیل اور جب یہ قیامت گزرنی ہی ہے تو اختر اور شبنم بھی کیا کر سکیں گے۔ میں تو بہت کمزور ہوں۔ میری ضد بحث میں اگر ایسا ہوا تو۔"

انور بے چین ہو کر آگے بڑھا۔ ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی آمیز لہجے میں بولا۔ "چچی جان کچھ نہیں ہو گا۔ میں یقین دلاتا ہوں۔ میں ہرگز ایسا نہیں کروں گا مجھے۔"

"نہیں بیٹا! تم مجھے نہیں خود کو یقین دلا سکو تو اچھا ہے۔ آج تک جو کچھ بھابھی نے چاہا کر کے دکھایا۔ لڑکیوں کے نصیب تو بھنور کی طرح ہوتے ہیں۔ چکراتے ہیں اور پھر کسی ساحل سے ٹکرا جاتے ہیں اور ناہید تو بہت ہی آسان ہدف ہے۔ میں تو کہتی ہوں۔ جو بھی ہونا ہے ہو جائے۔ میں۔ برداشت کر لوں گی۔ میں نے اسے آگ کے شعلوں کے حوالے کر دیا اور گل گلزار کی توقع کرتی رہی۔ پاگل ہی تھی میں میری معصوم بچی۔ اس کے ساتھ تم جو چاہو کرو۔ کبھی زبان نہیں کھولے گی۔ کچھ شکوہ نہیں کرے گی۔ تم' تم اپنی سعادت مندی کے سبب اسے جب بھی طلاق دو گے۔۔۔ میں صبر شکر کے ساتھ قبول کر لوں گی کہ یہ ہی اس کا نصیب ہے' کم از کم اسے ساری زندگی کی اذیت تو سہنا نہیں پڑے گی۔ آگ کے شعلوں سے تو نجات مل جائے گی۔ آزاد ہو جائے گی وہ۔۔۔"

چچی جان زور زور سے رو رہی تھیں۔ سلطانہ دم بخود انہیں دیکھ رہی تھیں۔ ناہید نے ماں کے گلے میں ہاتھ ڈال دیا۔ وہ کچھ سمجھا رہی تھیں۔

"نہیں بیٹا! تم خود کو ہر حادثے کے لیے تیار رکھو۔ اس گھر میں تمہیں عزت ملے گی نہ محبت' انور بہت جلد پسپا ہو جاتے ہیں۔ مجھے اندازہ ہے۔ وہ تمہیں کوئی حق نہیں دلوا سکتے۔ ہاں بڑی بھابھی نے جو ارادہ کر لیا ہے وہ ہو کر رہے گا۔"

چچی جان کا حال خراب ہو رہا تھا۔
اختر نے انور کو دیکھا۔ وہ ہونٹ چبا رہا تھا۔ شاید اپنے احساسات کا اظہار نہ کر سکنے کی بے بسی تھی۔ چچی جان کے ساتھ ناہید بھی رو رہی تھی۔ اختر نے ایک دم آگے بڑھ کر چچی جان کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور دبنگ مضبوط لہجے میں بولا۔
"چچی جان! آپ بس کریں۔ میں آپ کے آنسو برداشت نہیں کر سکتا۔ خدا کی قسم! جب...... بھیا ناہید کو طلاق دیں گے تو میں میں خود آپ سے درخواست کروں گا۔ میں دوں گا عزت احترام محبت سارے حقوق ادا کروں گا۔ آپ کیوں فکر کرتی ہیں۔ میں آپ کا بیٹا بن کر...... آپ کی ساری توقعات پوری کروں گا۔"
اور نہ جانے انور پر کیسی بجلی گری۔ چمک کر اٹھا۔ ایک آگ تھی جس نے انور کے وجود کو بھسم کرنے کی کوشش کی تھی۔ کسی بے پناہ طاقت نے اسے اپنی جگہ سے اچھال دیا تھا۔ وہ ایک غراہٹ کے ساتھ اختر پر جھپٹا۔ بلکہ ٹوٹ پڑا۔ تھپڑ، مکے، گھونسے وہ جیسے پاگل ہو گیا تھا۔ اختر خاموشی سے پٹ رہا تھا۔ پھر چچی جان نے اٹھ کر انور کو پکڑ لیا۔ ان کو بہت غصہ آ رہا تھا۔
"کیوں بھئی! تمہیں اس قدر جوش کیوں آ گیا۔ تم کیا سمجھتے ہو۔ تم طلاق دے دو گے تو میری بیٹی پوری زندگی یونہی گزار دے گی۔ کیا اسے تمہارے دیے ہوئے زخموں کو ہی کریدتے رہنا ہو گا۔ نہیں میرے بچے! میں اس کی دوسری شادی کروں گی اور دکھادوں گی بڑی بھابھی کو۔ میں اپنی بچی کے لیے خوشیاں حاصل کر کے رہوں گی۔ خواہ کہیں سے بھی۔ وہ اختر بھی ہو سکتا ہے۔ تم سے زیادہ مضبوط اور پر اعتماد اور یہ میرا انتقام بھی ہو سکتا ہے۔"
چچی جان مشتعل تھیں اور سلطانہ حیران تھی۔ اس کی اتنی نرم گفتار شائستہ پھپو آج انتقام کے لیے...... اختر کو استعمال کرنے پر تیار تھیں۔ یہ مزاج کی تبدیلی تھی یا غصے کی زیادتی یا بے بسی کی انتہا۔
"ناہید! اٹھو ہم ابھی جائیں گے۔" اچانک انور نے بھی مشتعل لہجے میں کہا۔
"کہاں؟" ناہید تو جیسے تیار بیٹھی تھی۔
"سوال نہیں۔ جہاں میں جاؤں گا۔ تم کو وہیں جانا ہے۔" آج انور کے تیور بھی بدلے بدلے تھے۔
"مگر میں لاہور جاؤں گی۔ اپنے گھر۔" وہ بھی اکڑ رہی تھی۔
"میری اماں کو نیچا دکھانے کے لیے؟"
"نہیں اپنی ذات پر سے الزام کی کالک مٹانے کے لیے۔"
"آپی ٹھیک کہہ رہی ہیں بھائی جان!" شبنم اپنی امی کو بانہوں میں لیے بیٹھی تھی۔
"بہتر یہی ہے کہ آپ سب لاہور جائیں۔ پھر جو بھی فیصلہ ہو امی! آپ آپی کو بھائی جان کے ساتھ جانے کی اجازت دے دیں۔ بھائی جان خود سنبھال لیں گے سارے معاملات۔ بہت مضبوط دھاگے سے باندھا ہے آپی نے انہیں اور خدا کے لیے یہ رونا دھونا بند کریں۔ کچھ آنسو میری رخصتی کے لیے بھی بچا کر رکھ لیں۔" شبنم شوخ تو تھی۔ مگر معاملہ فہم بھی تھی۔
"توبہ آپ نے تو پرانی ٹریجڈی فلموں کو بھی مات کر دیا۔ میں تو مشکل سے ہنسی ضبط کر رہی تھی۔ مگر یہ آنسو بہت طاقت ور ہوتے ہیں۔ دیکھیں بھائی جان! میرا تو دوپٹہ بھیگ گیا۔" شبنم بسورتے ہوئے آنچل دکھانے لگی۔
اختر آگے آ کر انور سے لپٹ گیا۔ "بھیا معاف کر دیں میری گستاخی۔" انور جھینپ رہا تھا۔ مگر پھر اس کے سر پر چپت رسید کر کے ہنس دیا۔
"شکر ہے۔" شبنم نے کہا۔ "ملکۂ جذبات اور شاہِ جذبات سب نارمل ہو گئے۔ میں تو ڈر رہی تھی کہ میرا دوبئی کا یہ والا چانس بھی گیا۔ ریشم گلی تو دور چلی گئی تھی۔"
سلطانہ کو ہنسی آ گئی۔ "شبنم بہت پٹو گی۔ اچھا پھپو! میری خطا معاف کر کے میرے مطالبے پر غور کر لیں۔ آج تو میری سہیلی کا شادی ہے۔ کل تک نہ پہنچی تو میرے میاں سمجھیں گے۔ میں اختر کے ساتھ نکل گئی۔

"اختر بھائی! اُف! خدا کی بندی اب تو بھائی کہنا چھوڑ دو۔ نکاح ہوتے ہوتے رہ گیا اسی وجہ سے۔" اختر بھی نارمل ہو چکا تھا۔ "چچی جان میرا خیال ہے۔ ہم سب ہی صبح چلے جاتے ہیں۔ میں مگر پھر آؤں گا۔ اماں کو لے کر۔"

چچی جان کے ہونٹوں پر بھی ہنسی بکھر گئی۔ "ویسے اختر! تم بھی بہت تیز ہو اور سلطانہ تم بھی ڈھیٹ، ٹھہو دیکھنا کرتی کیا ہوں میں۔"

ایک رنجیدہ ساعت گزر گئی تھی۔ غم ناک واقعہ نئی امیدوں نئے وعدوں کی کرنیں سمیٹے فضا میں تحلیل ہو گیا۔ ابھی فیصلے باقی تھے۔ مگر امیدیں جوان اگلا سورج ان سب کو سفر کے لیے تیار دیکھ رہا تھا۔

اختر مستقل چچی جان کے گلے سے لپٹا سرگوشیاں کر رہا تھا۔

"اب چلو مستقبل کے دولھا میاں! ٹرین ہمارا انتظار نہیں کرے گی۔"

سلطانہ نے اختر کو کھینچا۔ اپنا بیگ اٹھا لیا۔ اختر نے بیگ لے کر کہا۔

"اپنا بوجھ مجھے دے دیں بھابھی! آسانی سے اٹھا سکتا ہوں۔"

"کس کس کا بوجھ اٹھاؤ گے اختر تھک جاؤ گے۔" سلطانہ سنجیدہ ہو گئیں۔

ٹیکسی میں بیٹھنے کے بعد سلطانہ نے کہا۔ دیکھو بھئی میں تو گجرات سے آؤں گی۔ اس لیے کچھ پہلے پہنچوں گی۔ تم لوگ اِدھر اُدھر گھومتے ہوئے گھر پہنچنا۔ ناہید نے گلشن اقبال پارک نہیں دیکھا۔ اسے وہاں لے جانا۔ میرے میاں کو ذرا بھی شک ہوا تو میری شامت آجائے گی۔"

"آپ کا خیال ہے میں بھائی جان سے کچھ چھپا سکوں گا؟" اختر نے ڈرایا۔

"کیا کہا؟ پھر سے کہنا۔" سلطانہ نے تھپڑ دکھایا۔

"یہی کہوں گا کہ گجرات گئے تو وہاں کوئی شادی وادی نہیں ملی۔ ارے نہیں جو سچ ہے۔ وہی کہوں گا کہ ہم ملتان...؟"

"بہت مار کھاؤ گے میرے ہاتھ سے اختر!"

"اختر مار کھانے کے لیے ہی آیا ہے دنیا میں ادھر بھیا نے کم دھنائی کی تھی؟"

اختر کے لہجے میں شکوہ تھا۔

"تم جو بکواس کر رہے تھے۔ چچی جان نے روکا نہ ہوتا تو میں تمہارا اگلا دبا دیتا۔"

"آپ کی غیرت جگانے اور ہمت بڑھانے کا اس کے سوا اور کوئی حل جو نہ تھا۔ شکر ہے آپ اس وقت سر جھکا کر نہیں بیٹھ گئے۔ حسبِ روایت! اب دیکھنا ہے کہ اماں کے سامنے آپ کا کیا رویہ ہوتا ہے۔ کیوں بھابھی!" اختر شوخ ہوا۔ "وہ تابندہ بیگم...!"

"خبردار ایک لفظ نہ بولنا اب۔" انور جھلا رہا تھا۔ سلطانہ اور ناہید ہنس رہی تھیں۔ اختر کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا۔ مگر اسٹیشن آگیا۔ ٹیکسی رک گئی۔

☼ ☼ ☼

اب نیا سفر شروع ہوا۔ اندیشے فکر بے چینی خوف مگر اختر مطمئن تھا۔ صرف انور ہی پریشانی میں ہونٹ کاٹ رہا تھا۔ سلطانہ اور ناہید سرگوشیوں میں پروگرام طے کر رہی تھیں۔

لاہور پہنچ کر وہ سب ایک دوسرے سے نظر چرانے لگے۔ مگر ایک ہی ٹیکسی کر کے ساتھ ہی گھر کے لیے روانہ ہوئے۔

"وہ اچھا نہ تھا کہ میں تمہیں لے کر حیدر آباد چلا جاتا؟" انور حقیقت کا سامنا کرنے سے گھبرا رہا تھا۔

"اب جو ہو سو ہو۔" سلطانہ نے کہا اور سب ٹیکسی سے اتر کر ایک ساتھ گھر میں داخل ہوئے۔ دھڑکتے دل اور خوف کے سائے۔

مگر یہ کیا سامنے ہی کرسی پر سرور براجمان تھے۔ ساتھ میں اماں ان کے کندھے سے لگی بیٹھی تھیں۔ ہنس رہی تھیں اور ان لوگوں کو دیکھتے ہی اٹھ کر آگے بڑھیں۔ ناہید اور سلطانہ طے شدہ پروگرام کے مطابق ساس سے لپٹ گئیں۔ اماں نے انور کو بھی سمیٹ لیا۔ اختر کھنکار کر بولا۔

"میں بھی ہوں۔ آسکتا ہوں؟"

اماں نے اسے بھی گھسیٹ لیا۔ سلطانہ نے اماں کے کندھے سے سر چپکائے چپکائے کہا۔

"دیکھیں اماں! یہ میں ہوں جو انور اور ناہید کو منا کر لائی ہوں۔ انور تو ناہید کو لے کر جانے پر اصرار، نہ گھر نہ ٹھکانہ مگر حیدر آباد جانا۔"

"بھابھی جان! آپ بھول رہی ہیں۔ آپ تو گجرات گئی ہوئی تھیں۔" اختر نے لقمہ دیا۔

سلطانہ نے زبان دانتوں تلے دبالی۔ توبہ کے انداز میں ایک ہاتھ سے گال پیٹنے کان پکڑنے لگیں۔ کیونکہ دوسرا ہاتھ اماں کے کندھے جکڑے ہوئے تھا۔ لگے ہاتھوں اسی ایک ہاتھ سے اختر کو تھپڑ جڑ دیا۔

"میں کیا دنیا میں سب سے مار کھانے کے لیے پیدا ہوا ہوں؟" وہ چیخا۔ اماں نے لاڈ سے کہا۔ "چھوٹے سب سے مار ہی کھاتے ہیں۔" اماں سے الگ ہو کر سب وہیں برآمدے میں بیٹھ گئے۔ اماں نے کہا۔

"سفر سے تھکے ہوئے ہو۔ منہ ہاتھ دھو کر آؤ میں کھانا لگواتی ہوں۔ بوا کھانا گرم کرو۔"

اماں تو یوں بدل گئی تھیں جیسے بادل سرک جائے چاند سے۔ انور حیرتوں کے سمندر میں گم تھا۔ یہ اماں کا کون سا روپ ہے؟ وہ کھانے کے لیے اٹھے تو سلطانہ نے ہی سرور سے اشارے میں اماں کے بدلتے رویے کے بارے میں پوچھا۔ دونوں گھروں کے درمیان بند دروازے بھی کھلے ہوئے تھے۔ یعنی اب پھر حسبِ سابق وَن یونٹ ہو گیا تھا۔

"تمہیں کیا بتاؤں۔ کل صبح نصرت کی ایک سہیلی آئی تھی۔ وہ اپنی تابندہ موٹی ہے نا اس کی پرانی یعنی سابقہ سسرال کی۔ شاید نند یا دیورانی تھی۔ اس نے تابندہ کے بارے میں ایسے انکشاف کیے کہ اماں تو خوف زدہ ہو گئیں۔ تابندہ نے ساس سسر، دیور نند سب کے خلاف محاذ بنا رکھا تھا اور تعویذ لا کر گھر میں ہر جگہ چھپائے۔ بدزبانی اور گالی گلوچ تو روزمرہ کا وتیرہ تھا۔ نند کی تو پٹائی بھی کر دیتی تھی۔ یہ تو پہلی سسرال کا معاملہ تھا۔ دوسری جگہ تو اس نے اور بھی کارنامے کیے۔ ساس نند کو ملازمہ کی طرح مخاطب ہوئی تھی۔ بس اللہ معاف کرے۔ اس کے قصے سنانے سے سوائے گناہ کے اور کچھ نہیں حاصل ہو گا۔ تب ہی سے اماں توبہ کیے جا رہی ہیں اور اب ان کا خیال ہے کہ ان کی دونوں بہوئیں تو ہیرا ہیں۔ اور یہ ان کے اعلا تعلیم اور بہترین تربیت کا نتیجہ ہے۔ اب تو وہ تیسری بہو بھی اسی خاندان سے لانے کا ارادہ کر رہی ہیں۔" سرور کے انکشافات جاری تھے کہ اختر چلا اٹھا۔

"ہیں؟ ہیں؟ کیا مطلب کس خاندان کون میں نہیں کروں گا۔"

سرور نے کان پکڑ کر اسے پاس بٹھایا۔ "بچو جی کرو گے تو تم بلکہ تمہارے اچھے۔ آخر ملتان جا کر تم نے جھک تو نہیں مارا ہو گا۔ شبنم ہماری متفقہ چوائس ہے۔ کہو قبول ہے۔"

اختر کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس نے نعرہ لگایا۔

"قبول ہے قبول ہے۔"

"او بے وقوف! تین دفعہ قاضی کے سامنے کہنا۔" انور نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔ اماں اور نصرت آگئیں۔ کھانا شروع ہوا۔ سرور نے اماں کو مخاطب کیا۔

"اماں! میں نے تابندہ والا قصہ انہیں سنا دیا ہے۔"

اماں محجوب ہو گئیں۔ آنچل سے منہ چھپا کر منہ میں کچھ بدبدا کر رہ گئیں۔ ان کے شرمانے کی ادا بڑی دلچسپ تھی۔ سلطانہ کو ہنسی آگئی۔

"ہنس رہی ہو؟" سرور نے ڈپٹ کر کہا۔ "ابھی بتا دوں کہ چچی جان کے فون نے کیا کمال دکھایا ہے تو رونے بیٹھ جاؤ گی۔"

"امی کا فون؟ پھپو کا فون؟" سلطانہ اور ناہید کے منہ سے بیک وقت نکلا۔ اب اماں ہنس رہی تھیں۔ اور سب ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

"ہاں چچی جان کا فون رات کو ایک بجے آیا تھا۔" سرور نے اطمینان سے کہا۔

"اماں سے بات کرنا چاہا۔ کوئی خاص بات تھی۔ تب ہی ایک بجے فون کیا تھا انہوں نے۔ شکر ہے کہ اماں جاگ رہی تھیں اور پتہ ہے چچی جان نے کیا کہا۔ اماں سے شکوہ کر رہی تھیں کہ انہوں نے بچوں کو کھلی چھٹی دی ہوئی ہے۔ جس کا جو جی چاہتا ہے کرتا ہے۔ کہہ رہی تھیں۔ آپ بڑی ہیں۔ آپ کو بڑے پن نے جو اختیار دیا ہے۔ اس کو استعمال کریں۔ بچوں پر نگاہ رکھیں۔ اپنی نگرانی کے حصار میں رکھیں۔ ناہید کو اس قدر نقاہت کے باوجود آپ نے ملتان آنے کی اجازت دی۔ مجھے اس کا گلہ ہے اور سلطانہ تم کو بھی انہوں نے تنقید کا نشانہ بنایا۔ کہ تم اماں کی قائم مقامی کے فرائض انجام دے رہی ہو۔ تمہیں اماں نے کھلی چھوٹ دی ہوئی ہے۔ چچی جان نے کہا کہ آپ بڑی ہیں میری بھی بزرگ ہیں۔ آپ سب کو اپنے احکام کا پابند کریں۔ مجھے بھی آپ جو حکم کریں گی۔ میں ان پر عمل کروں گی۔ بچے نا تجربہ کار ہوتے ہیں۔ خود کو عقل مند سمجھتے ہیں۔ عقل تو ہوتی ہے تجربہ نہیں۔ اس لیے آپ ان سب کی بہتری کے جو فیصلے کریں گی۔ وہ انہیں ماننا ہو گا۔ یہ آپ کا حق ہے۔"

سرور نے سب کو فاتحانہ نظروں سے دیکھا۔ وہ سب ہکا بکا سرور کو دیکھ رہے تھے۔

"اور ہاں۔ ان کی باتوں پر اماں کو اتفاق ہے۔ اسی لیے اماں بہت خوش ہیں۔ انہیں اپنی دیورانی کی فہم و فراست پر فخر ہے۔ اماں کا خیال ہے چچی جان کو اتنا صحیح خیال ان کی تعلیم کی وجہ سے آیا ہے۔ اب اماں کا اور میرا ابھی فیصلہ ہے کہ نصرت جو میٹرک کر کے گھر بیٹھی ہے اور اس کے دماغ میں کیڑے پل رہے ہیں۔ ان کا تدارک اس کی آگے تعلیم ہی کر سکے گی اور سلطانہ تم اس کے کالج داخلے کی ذمہ دار ہو اور تم اس کو ٹیوشن بھی دو گی۔ تاکہ وہ اپنی کمی پوری کرے۔ اماں کے خیال میں تم سب سے زیادہ قابل لائق اور سمجھ دار ہو۔"

کہہ کر سرور نے ہنس کر سلطانہ کو چپت رسید کی۔

"اب خوش۔"

سلطانہ نے فوراً" اٹھ کر اماں کے سامنے سر جھکا دیا۔ اماں نے بھی شفقت کے مظاہرے میں تھپکی دی

"اور ہاں' اماں کا ایک آرڈر یہ ہے کہ انور حیدر آباد جا کر کسی چھوٹے موٹے گھر یا پورشن کا انتظام کر کے ناہید کو بلا لیں۔ جب جہاں ٹرانسفر ہو گا۔ ناہید' انور کے ساتھ رہے گی ورنہ انور کے بگڑ جانے اور بے راہ رو ہونے کے چانس ہیں۔"

"اور میں..... میرا کوئی ذکر نہیں۔" اختر احتجاجاً چلایا۔

"تم..... دبئی جاؤ اور بس جب آؤ گے پھر شادی

سب تالیاں بجا رہے تھے اماں کے گن گا رہے تھے اور انور حیران صرف یہ سوچ رہا تھا۔

صرف اتنی سی بات؟ محض چچی جان کے اماں کی بزرگی کے اعتراف نے اماں کی کایا پلٹ دی۔ محض ایک فون نے؟ میدان کا منظر بھی بدل دیا۔ چچی جان کی فہم و فراست زندہ باد' واقعی ہم سب نا تجربہ کار ہیں۔ اتنی سی بات سمجھ نہ سکے۔



صدف آصف

دو کی کہانی

"ہا....ہا.... زندگانی.... بس دو کی کہانی ہے' ہمارے پلے جوانی بھر یہ فلسفہ حیات نہ پڑا' مگر جب خود پر گزری تو جانا۔ جاتی عمر کے ساتھ یہ بات سمجھ میں آئی۔"

رہنما آپا نے پان کی گلوری بنا کر نفاست سے منہ میں رکھی اور حسب عادت باآواز بلند سوچتے ہوئے ٹھنڈی آہیں بھرنے لگیں۔ جب سے ان کے بچے اس گھر کو چھوڑ گئے تھے' انہیں خود سے باتیں کرنے کی عادت پڑ گئی تھی۔ سامنے آرام دہ کرسی پر جھولتے ارشد خالو نے اخبار پاس بچھے تخت پر رکھتے ہوئے انہیں معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔ نورینہ کو لگا کہ انہوں نے آپا کو بڑے آرام سے کچھ جتایا ہے' مگر کیا؟

وہ ان دونوں کے درمیان قائم خاموش رابطوں کی زبان سمجھنے سے قاصر تھی' ارشد خالو کی نگاہوں کی تپش سے آپا جھینپ کر کچھ شرمندہ سی نظر آرہی تھیں۔ نورینہ نے ان کی سرخی مائل دمکتی رنگت کو پُراشتیاق نگاہوں سے دیکھا' جو دوپہر کے اجالے میں چمک اٹھی تھی۔ موسم کیسے بدلتا ہے اس نے خالہ کے چہرے کے بدلتے رنگوں سے جانا تھا۔

اچانک کچھ سوچتے سوچتے ان کا چہرہ سفید سا پڑ گیا۔ بڑی بڑی آنکھیں بن بادل برسات کی طرح برسنے کو تیار ہو گئیں۔ انہوں نے آسمانی ململ کے دوپٹے سے اپنی گلابی متورم آنکھوں کو چپکے سے پونچھ ڈالا' جیسے وہ اپنا غم سب سے چھپا لینا چاہتی ہوں۔ پان کی لالی نے ان کے نازک ہونٹوں کے کٹاؤ کو اور خوب صورت بنا دیا تھا' جو شدت غم سے کپکپانے لگے تھے۔ مگر خالو نے ان پر نگاہ غلط انداز بھی نہ ڈالی اور سر جھٹک کر وضو کے لیے بڑھ گئے۔

"رہنما آپا! آپ کیا چاہ رہی ہیں۔ میں سمجھی نہیں؟" نورینہ کے دل میں خالو کی بے اعتنائی پر ان کے لیے شکایتیں جاگ اٹھیں' اسی لیے ان کی دل جوئی کے لیے سوال پوچھ بیٹھی۔ وہ آسمانی کرتے اور چوڑی دار پائجامے میں ہمیشہ کی طرح بڑی شان دار لگ رہی تھیں۔ ان کی کالی لمبی چوٹی سے اب سفیدی جھلکنے لگی تھی۔ خون کا رشتہ اپنی جگہ لیکن وہ غیر معمولی طور پر نورینہ کو اپنی جانب مائل رکھتی تھیں۔ آپا سب باتیں بھلائے جلدی جلدی مٹر کی پھلیوں سے دانے نکالنے لگیں جیسے دنیا میں اس سے اہم کوئی کام نہیں۔

آج نورینہ نے ان سے مٹر گوشت کی فرمائش کی تھی' انہیں بھی اپنی اس معصوم بھانجی سے بہت محبت تھی' جو ہر چھٹیوں میں ان کی تنہائیاں بانٹنے اسلام آباد سے کراچی چلی آتی تھی۔ وہ اس کی شکل میں اپنی گمشدہ محبتوں کو تلاشتی تھیں۔

"بس بیٹا! بعض باتیں عمر بھر کے تجربے کے بعد ہی سمجھ میں آتی ہیں' ہاہا.... کیسی عجب بات ہے ناکہ جوانی میں وقت ہمارے پیچھے بھاگ رہا ہوتا ہے' مگر ہم اپنی خواہشوں کے تعاقب میں رفتار اتنی بڑھا لیتے ہیں کہ وہ ہم تک پہنچ نہیں پاتا اور بڑھاپے میں ہماری رفتار اتنی سست ہو جاتی ہے کہ ہم اس کے تعاقب میں ہی پورے ہو جاتے ہیں۔"

انہوں نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہتے ہوئے چھلکے سمیٹے۔ گلابی پیروں میں کالے کھسے ڈالے اور دروازے کے پاس دھرے کچرے دان میں ڈالنے چلی گئیں۔

کون کہہ سکتا ہے یہ پانچ جوان بچوں کی اماں جان ہیں' ابھی بھی اپنی عمر سے دس سال چھوٹی نظر آتی ہیں۔ نورینہ ان کے پھرتی سے اٹھتے قدموں اور کام کرتے ہاتھوں کو دیکھ کر سوچ رہی تھی۔ وہ کھانا پکانے کچن میں جا چکی تھیں۔ نورینہ تخت پر دراز نرم گرم دھوپ کا لطف اٹھا لینے لگی۔ دروازے پر کھٹکا ہوا۔ سستی سے پیر ہلاتی نورینہ نے دروازہ کھلنے کی آواز پر مڑ کر دیکھا۔ خالو مسجد جانے کے لیے دروازے سے باہر نکل رہے تھے۔ سفید ہوتے گھونگریالے بال' فربہی مائل جسم' ہاتھ میں چھڑی' سفید کرتا پائجامے میں ان کا کالا رنگ کچھ اور نمایاں ہو رہا تھا۔

"ان کی تو لگتا ہے توے سے بحث چل رہی ہے' وہ کہتا ہے میں کالا ہوں' اور خالو کہتے ہوں گے کہ میں زیادہ کالا ہوں۔"

نورینہ نے شرارت سے سوچا' پھر اپنے آپ کو گھرکا۔



اسے اپنی کالج کی اسلامک ہسٹری کی استانی صالحہ خاتون یاد آگئیں، جو ہمیشہ کہتی تھیں کہ "ہم ہمیشہ انسان کی اس خامی کا مذاق کیوں اڑاتے ہیں جو اس کی اپنی پیدا کردہ نہیں ہوتی، ایسی برائیوں پر کیوں نہیں انگلی اٹھاتے، جو اس کی اپنی خواہشوں کے باعث جنم لیتی ہیں، جیسے بدعنوانی، بے ایمانی، چغل خوری، رشوت ستانی وغیرہ، اگر ہم ان خامیوں پر ببانگ دہل انگلی اٹھانے لگیں، تو شاید معاشرے سے کچھ برائیوں کا خاتمہ ہوجائے۔"

ان کی بات یاد کرکے نورینہ نے آسمان کی سمت دیکھا اور اپنے گال پیٹ ڈالے۔

☼ ☼ ☼

ایسا نہیں تھا کہ بڑھاپے میں آکر ارشد خالو معمولی صورت کے ہوگئے تھے۔ ان کی جوانی بھی کچھ مثالی نہیں تھی، جب وہ رہنما آپا جیسی حسن کی مورت کے ساتھ چلتے تو "پہلوئے حور میں لنگور" والی مثل صادق آتی۔ شادی کے وقت خالو کی ایک ہی خوبی ان کی تمام خامیوں پر حاوی ہوگئی تھی۔ وہ تھی، ان کی مضبوط حیثیت، وہ ایک کامیاب وکیل تھے۔ اپنے والدین کے اکلوتی اولاد تھے۔ ان کے گھرانے میں سب ہی گہری سانولی رنگت کے حامل تھے، اوپر سے گھنگریالے بال افریقی ہونے کا تاثر پیدا کرتے۔ جب ہی ان کی والدہ کی خواہش تھی کہ ان کی بہو گوری چٹی اور خوب صورت ہو تاکہ پوتا پوتی گورے پیدا ہوں۔ رہنما آپا کو دیکھتے ہی وہ لٹو ہوگئیں۔

ادھر رہنما آپا کے ماں باپ کے لیے بھی بیٹی کی نازک مزاجی مسئلہ بنی ہوئی تھی، اپنی سمجھ کے مطابق تو انہوں نے بہتر فیصلہ کیا کہ یہاں بیٹی کی شادی ہوگئی تو کم صورت پیسے والا داماد پاؤں دھو دھو کر پیے گا۔ انہوں نے بیٹی سے پوچھے بغیر ہی ہاں کردی۔ وہ بیٹی کے حسن پرست مزاج کو بچپنا سمجھتے رہے۔ وہ جو گھر میں کالی بلی رکھنے کو تیار نہ ہوتی تھی۔ شادی کی پہلی رات ہی انہوں نے شوہر کو افریقی کا خطاب دے کر مسترد کردیا۔

یہ جانے بغیر کے اس افریقی کا دل کتنا گداز ہے۔

☼ ☼ ☼

"رہنما آپا۔"

نورینہ نے بچپن سے یہ نام بارہا سنا، ان کی سلیقہ مندی، نرم دلی، خوب صورتی، نیکی اور ہمدرد طبیعت کے ڈھنڈورے پورے خاندان میں پٹے ہوئے تھے، مگر ان کی عادت کے بارے میں صرف نورینہ کو خبر تھی۔ وہ تھی ان کی خود پسندی یا اپنے حسن پر ناز مگر وہ اپنی اس عادت کو دنیا سے چھپا کر رکھتی تھیں۔ کہنے کو تو وہ اس کی بڑی خالہ تھیں مگر ماں کے منہ سے رہنما آپا سن سن کر وہ بھی انہیں اسی نام سے پکارنے لگی۔ وہ اسے بچپن سے ہی بہت اچھی لگتی تھیں۔ وہ جب بھی اسلام آباد آتیں، ان کے کمرے میں سوتی۔ اس کی چھٹیاں ہوتیں تو وہ ضد کرکے کراچی بھاگ آتی، اسی لیے وہ ان کے خاندان کے بارے میں سب سے زیادہ جانتی تھی۔ یہ گھر پہلے خوب بھرا پرا تھا۔ خالہ کے چار بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ نورینہ چونکہ ان سب سے عمر میں چھوٹی تھی اس لیے جب بھی یہاں آتی ان سب کا کھلونا بنی رہتی۔

خالہ کے سب سے بڑے بیٹے کا نام ریحان تھا۔ وہ ڈاکٹر بننے کے بعد ایف آر سی ایس کرنے برطانیہ چلے گئے، پھر انہوں نے وہیں سیٹل ایک پاکستانی نژاد فیملی کی لڑکی عروبہ سے شادی کرلی، خالہ یہاں روتی رہ گئیں۔ بڑے بیٹے کی شادی کے حوالے سے انہوں نے بڑے بڑے خواب دیکھ رکھے تھے۔ بیٹے نے چھوٹی چھوٹی خوشیاں بھی نہیں دیں۔ ریحان کے لیے اپنا مستقبل ماں کے آنسوؤں سے اہم تھا۔ سو ہر سال آنے کے وعدے وعید ہوتے مگر پھر کوئی مجبوری آڑے آجاتی۔ اسی دوران ان کے یہاں ایک بیٹا اور ایک بیٹی بھی ہوگئی۔ رہنما آپا پوتا پوتی دیکھنے کے لیے تڑپتی رہیں، وہ نہ آئے۔

اتنے سالوں میں بس ایک بار ہی ہفتے بھر کے لیے فیملی کے بغیر پاکستان آئے، وہ بھی ان کو پاکستان میں

منعقدہ عالمی ڈاکٹروں کے ایک سیمینار میں حصہ لینا ضروری تھا۔ دن بھر مصروف رہتے، صرف رات کو سونے گھر آتے تو اتنے تھکے ہوتے کہ ماں کی آدھی باتیں سنتے سنتے ہی سو جاتے رہنما آپا پوری رات بیٹے کے سرہانے بیٹھی ان کے دلکش نقوش کو آنکھوں کے ذریعے دل میں اتارتی رہتیں صبح ان کے جاگنے سے قبل آنسو پونچھتی ہوئی کمرے سے باہر آجاتیں۔ ان دونوں گرمیوں کی چھٹیوں میں نورینہ یہاں آئی ہوئی تھی۔ اسے ریحان بھائی کا یہ لاپروا انداز بالکل نہ بھاتا شاید سرد ملک میں رہنے کے باعث ان کے جذبات بھی سرد ہوچکے تھے۔

☼ ☼ ☼

رہنما آپا اس حقیقت کو اب اچھی طرح جان چکی تھیں کہ بہو کا پورا خاندان یوکے میں آباد ہونے کی وجہ سے اسے پاکستان آنے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ شاید میکے والوں کی کشش ہی عروبہ کو پاکستان کھینچ لاتی، پھر بیٹے کو بھی گھر والوں سے زیادہ پاؤنڈز کی کشش نے اپنے حصار میں لیا ہوا تھا۔

جاتے جاتے انہوں نے ایک غضب ڈھایا کہ اپنا لیپ ٹاپ چھوٹے بھائی فرحان کے حوالے کر گئے اور بھائی کو تاکید کی کہ اماں ابا سے اسکائپ پر پوتا پوتی کی بات کرواتے رہنا۔ فرحان ایم بی اے کے آخری سال میں تھا۔ نیٹ پر اماں ابا کی تو کم بات ہوتی مگر عروبہ کی بہن طوبیٰ جو کہ زیادہ تر بہن کے گھر ہی پائی جاتی تھی اس سے فرحان کی اتنی دوستی ہوئی کہ بیوی کے دباؤ ڈالنے پر پہلے ریحان نے بھائی کو ایجوکیشنل ویزے پر اپنے پاس بلایا پھر چھ مہینے میں ہی سالی اور بھائی کی شادی کروادی۔

رہنما آپا ایک بار پھر ہاتھ ملتی رہ گئیں۔ بڑے بھائیوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے چھوٹوں نے بھی باہر جانے کے لیے پر پرزے نکالنے شروع کردیے۔ دو بھائیوں کے بھیجے گئے پاؤنڈز کی وجہ سے زندگی میں اتنی آسودگی آگئی تھی کہ وہ یہاں بھی تعلیم مکمل کرسکتے تھے، مگر خواہشات کی تو کوئی حد نہیں ہوتی، وہ بھائیوں پر

زور ڈالنے لگے کہ انہیں بھی اپنے پاس بلالیں، یوں ان کے کاغذات بھی برطانیہ بھیج دیے گئے، اب صرف وہاں سے بلاوے کا انتظار تھا۔

عروبہ اپنے گھر میں خوش تھی۔ فرحان طوبیٰ کی محبت میں پاگل تھا، ان لڑکیوں کے دور اندیش والدین دامادوں کی فرماں برداری سے بہت خوش تھے۔ ان کا کوئی بیٹا نہیں تھا۔ ابھی عروبہ کی چار بہنیں شادی کے لیے باقی تھیں، اسی امید پر والدین کے مشورے سے ان دونوں بہنوں نے شوہروں پر زور ڈالنا شروع کردیا اور خوشی خوشی دونوں دیوروں کو یوکے بلانے کی تیاری کرنے لگیں۔ انہیں پتا تھا، کہ اب پردیس میں اچھے اور شریف لڑکوں کا کال ہے، تو پھر وہ اتنے اچھے شوہروں کے بھائیوں کو ہاتھ سے کیوں جانے دیتیں۔

بیٹوں پر بس نہ چلا تو رہنما آپا نے ان حالات میں یہ ہی مناسب جانا کہ اکلوتی بیٹی کے فرض سے دونوں بھائیوں کی موجودگی میں ہی سبکدوش ہوجائیں۔ سندس ابھی فرسٹ ایر میں ہی آئی تھی۔ بھائیوں کی طرح اسے بھی اعلا تعلیم حاصل کرنے کا جنون تھا، وہ جب بھی فون یا اسکائپ پر بھابھی یا بھائیوں سے بات کرتی، اپنے مستقبل کے حوالے سے بڑی پرجوش ہوجاتی، وہ بھی باہر جاکر تعلیم مکمل کرنا چاہتی تھی۔ ایسے میں رہنما آپا نے اپنی دور پرے کی خالہ زاد بہن نصرت کے بیٹے کا رشتہ قبول کرکے گویا گھر میں ایک نئی جنگ کی بیل داغ ڈال دی، جس میں ایک فریق ساری اولاد اور دوسری فریق وہ خود تھیں، شوہر ہمیشہ کی طرح غیر جانب دار۔

لڑکا وکیل تھا۔ گو عمر میں سندس سے بڑا تھا مگر اس کا لاہور کے پوش علاقے میں ذاتی گھر تھا۔ دیکھا بھالا خاندان تھا۔ عدیل ایک خاندانی تقریب میں شرکت کے لیے کراچی آیا ہوا تھا، جہاں رہنما آپا کی فیملی بھی مدعو تھی۔ وہ سندس کی خوبصورتی کے آگے گھٹنے ٹیک بیٹھا، جو فیروزی فراک اور گلابی پائجامے میں اپنے ملکوتی حسن کی شعاعیں بکھیرتی ماں کے پہلو سے لگی بیٹھی تھی۔ عدیل نے گھر جاتے ہی ماں کا گھٹنا

پکڑلیا۔ "اگر شادی کروں گا تو رہنما خالہ کی بیٹی سے ورنہ زندگی بھر کنوارا رہوں گا۔" نصرت نے گھبرا کر دوسرے دن ہی صبح صبح فون کرکے بھانجی کا رشتہ طلب کرلیا۔ انہیں خود بھی اپنی من موہنی سی بھانجی بہت بھاتی تھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ لاہور جانے سے قبل بات طے کرجائیں اور دو مہینے میں واپس آکر شادی کرلیں۔

گھر میں جاری چپقلش انتہاؤں کو پہنچ گئی تھی، مگر رہنما آپا جن کو ہر موڑ پر بیٹوں نے مایوس کیا تھا، بیٹی کی نافرمانی برداشت نہ کرسکیں۔ سندس نے بھوک ہڑتال کی، سب سے بات چیت بند کردی، مگر جان چھڑکنے والی ماں اس معاملے میں جیسے پتھر بن گئی۔ انہوں نے کسی کی ایک نہ چلنے دی اور شادی کی تاریخ ٹھہرادی۔ شوہر جوان کے معاملات میں دخل اندازی کے مجاز نہ تھے، ان سے بھی لاڈلی بیٹی کی آنکھوں میں آنسو نہ دیکھے گئے اور وہ اس بارے میں کئی دنوں تک بیوی کو سمجھاتے رہے، مگر انہوں نے زندگی میں انہیں کبھی درخور اعتنائی نہیں سمجھا تھا، جو اب یہ بات مانتیں۔

سندس آنکھوں میں اپنے خوابوں کی کرچیاں لیے میکے کی دہلیز سے کیا گئی اس گھر کا رستہ ہی بھول گئی۔ کبھی مہینوں میں آتی تو ماں کے آگے پیچھے گھومنے کے باوجود وہ باپ سے ہی جڑی بیٹھی رہتی۔ عدیل کی سنگت میں مسرور رہنے کے باوجود اس کا دل ملال سے خالی نہ تھا، جس کا ذمہ دار وہ ماں کو سمجھتی تھی۔

عرفان اور مہران بھی سندس کی شادی کے چھ مہینے بعد یوکے پرواز کرگئے۔

☼ ☼ ☼

"خالو! یہ دو کی کہانی کیا ہے؟"

آج بہت دنوں بعد رہنما خالہ بازار گئیں تو نورینہ دو کپ چائے بنا کر خالو کی لائبریری میں چلی آئی۔

"بس۔۔۔ بٹیا! یہ وہ کہانی ہے جو اب جا کر رہنما کی سمجھ میں آئی ہے۔ مگر کیا فائدہ جب جوانی نہ رہی۔ ارمان بھی ختم ہوگئے، بس اب تو زندگی کا چل چلاؤ ہے۔" ارشد خالو کا لہجہ ٹوٹے کانچ کی طرح چٹخا ہوا تھا۔

"بتایئے نا۔۔۔ خالو مجھے سننا ہے۔" نورینہ نے چائے کا کپ ان کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے لاڈ سے پوچھا۔

"میری بدصورتی کو رہنما نے انا کا مسئلہ بنالیا، شادی کے بعد کئی سالوں تک اس نے کبھی میری طرف دیکھ کر بات نہیں، میں اسے اتنا ناپسند تھا کہ وہ جب بھی مجھے مخاطب کرتی، اس کی نظریں کہیں اور ہوتیں۔ ایک بات بتاؤں بٹیا۔۔۔ آپ کو کسی کی نفرت اتنی تکلیف نہیں دیتی جتنا کسی کا نظرانداز کرنا برا لگتا ہے، خصوصاً جب یہ حرکت ایسا شخص کرے جو آپ کے لیے جاں سے بڑھ کر ہو۔ دنیا کی نظر میں ہم ایک خوش باش جوڑا تھے۔ مگر ہمارے درمیان کچھ بھی نہ تھا۔ بس حقوق و فرائض کی ادائی تھی۔ پھر ہمارے بچے ہوگئے، رہنما تو جیسے ان کی دیوانی ہوگئی۔ حیرت ہے، باپ سے نفرت اور بچوں سے اتنی محبت۔ یہ بھی شاید اس لیے تھا کہ سارے بچوں نے تمہاری خالہ کی خوب صورتی چرائی تھی۔ کوئی مجھ پر نہیں پڑا تھا۔" وہ ہلکا سا مسکرائے۔

"ایک اور عجیب سی بات بتاؤں، جب بھی تمہاری خالہ ماں بننے والی ہوتیں، میں نمازوں میں دعا کرتا کہ بچے کو سیرت کا حسن میرا اور صورت کا حسن رہنما کا ملے۔ میں ڈرتا تھا کہ میرا کوئی بچہ اگر مجھ پر چلا گیا تو شاید وہ بھی رہنما کی محبت سے محروم ہوجائے گا، مگر میرے اللہ نے میری ایک ہی دعا قبول فرمائی۔ سارے بچے نہ صرف خوب صورتی بلکہ مزاج میں بھی ماں پر پڑے تو اپنے بچوں کے لیے جیسے دیوانی ہوگئی تھی۔ میں نے بڑی جہد کے بعد اس کی تھوڑی بہت توجہ حاصل کی تھا، اب اس سے بھی گیا۔ وہ مجھے مسلسل نظرانداز کرتی۔ والدین اس کے رویے پر کڑھتے کڑھتے دنیا سے چلے گئے، مگر وہ نہ سدھری۔ اب رہنما کے لیے میدان صاف تھا۔ وہ کبھی کبھی زیادتی کی انتہاؤں کو چھو جاتی، اگر میں شفقت پدری سے مجبور ہو کر اپنے بچوں کو پیار کرنا چاہتا تو وہ غیر محسوس طریقے سے انہیں کہیں اور مصروف کردیتی، میرے کالے ہاتھوں میں بچوں کے گورے ہاتھ دیکھ کر ایسی کوئی بات کہہ دیتی کہ میں کلس کر رہ جاتا۔ آہستہ آہستہ اس نے بچوں کی روٹین ایسی بنادی کہ میں جب گھر میں داخل ہوتا تو وہ سو چکے ہوتے یا پڑھنے گئے ہوتے، اس طرح اس نے بچوں کو بھی مجھ سے دور کردیا تھا۔ اگر میری جگہ کوئی اور مرد ہوتا تو اب تک ہم دونوں کے راستے جدا ہوچکے ہوتے، پر ایسا نہیں ہوا۔ جانتی ہو کیوں؟"

انہوں نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے نورینہ سے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلادیا۔

"آپ کی رہنما آپا کے لیے بے انتہا محبت۔" اس نے شرارت سے کہا۔

"نہیں۔۔۔ میرے بچوں سے میری تشنہ محبت۔۔۔ میں جانتا تھا کہ وہ اپنی ماں کے بغیر نہیں رہ سکتے اور میں ان سب کے بغیر۔ یوں زندگی کی گاڑی چلتے چلتے اب آخری اسٹیشن تک پہنچ گئی۔ جانتی ہو اس نے ساری زندگی بچوں کو مجھ سے دور رکھنے کی کوشش کی اور اب اس بڑھاپے میں آکر وہ سب مجھ سے خود رابطے میں رہتے ہیں۔" انہوں نے افسردگی سے سر تھام لیا۔

"اچھا اور پورے خاندان میں جو خالہ کے لیے آپ کی محبت کے چرچے ہیں۔ وہ کیا ہیں؟" نورینہ نے پہلی بار خالو سے بے تکلف ہوتے ہوئے سوال کر ڈالا۔

"وہ تو شاید شادی کی پہلی رات ہی مرگئی تھی۔ جب رہنما نے کھلے الفاظ میں میری بدصورتی کا احساس دلاتے ہوئے مجھے بتایا کہ وہ مجھ سے کتنی نفرت کرتی ہے اور یہ شادی اس کی مرضی کے خلاف ہوئی ہے۔"

نورینہ کو یوں لگا جیسے خالو کی آنکھیں دور خلاؤں پر لکھی ماضی کی دکھ بھری داستانیں پڑھ ہی ہوں۔ اس کا دل دکھ سے بھر گیا۔ وہ تو ہمیشہ خالو کو ولن سمجھتی آئی تھی، جنہوں نے اس کی خوب صورت خالہ کی آنکھوں میں اداسیاں بھردی تھیں مگر یہاں تو کہانی ہی الٹی نکلی۔ ضروری نہیں کہ ہمیشہ مرد ہی ظالم ہو، کہیں عورت بھی اس پر ظلم ڈھاتی ہے، مرد کی بے وفائی کے قصے تو بہت سنے تھے، مگر آج نورینہ کے سامنے ایک مرد "وفا کی تصویر" بنا کھڑا تھا۔ نورینہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

"اوہ۔۔۔ اصل بات تو رہ گئی۔۔۔ یہ دو کی کہانی کیا ہے؟" نورینہ نے ماحول بدلنے کے لیے شگفتہ لہجے میں پوچھا۔

"بڑی آسان سی بات ہے، دنیا میں اللہ نے دو دو کے جوڑے بنائے ہیں، پہلے دو ہوتے ہیں، پھر تین، چار، پانچ۔۔۔ پھر کیا ہوتا ہے کہ سب جوان ہو کر اپنی اپنی منزلوں کی جانب چل دیتے ہیں، پھر پانچ۔۔۔ چار ہوتا ہے۔۔۔ اس کے بعد چار سے تین ہوتے ہیں، آخر میں دو ہی اکیلے رہ جاتے ہیں، جیسے میں اور رہنما ہوگئے ہیں۔ یہ تقریباً ہر دوسرے گھر کی کہانی ہے۔"

انہوں نے وضاحت کی تو نورینہ نے سر ہلادیا۔ تاہم رہنما آپا کا اس عمر میں آکر ارشد خالو کی جانب پلٹنا نورینہ کے مشاہدے میں تھا، مگر اب شاید خالو کے دل سے چاہے جانے کی خواہش ہی ختم ہوگئی تھی۔ اب خالہ ان کی منتیں کر کر کے تھک چکی تھیں۔ مگر وہ بیوی کی طرف پلٹتے ہی نہیں تھے۔ اب وہ جس ذات کی طرف متوجہ ہوچکے تھے۔ اس کے بعد انہیں کسی اور کی حاجت رہی ہی نہیں تھی۔

اذان کی آواز پر وہ بے قرار ہو کر مسجد کے لیے گھر سے نکل گئے۔ سر پر دوپٹے کا آنچل رکھتی، نورینہ انہیں عقیدت بھری نظروں سے دیکھتی رہی۔



ناولٹ

صائمہ اکرم چوہدری

دیمک زدہ محبت

سکینہ جمیلہ مائی اور اللہ دتا کمہار کی اکلوتی بیٹی ہے' جو شادی کے سترہ سال بعد پیدا ہوئی اور چودہ برس کی عمر میں کبڑے پن کی بیماری میں مبتلا ہو گئی۔ پانچ سال لگا تار علاج کے بعد بیت المال والوں نے اسے سرکاری اسپتال میں پرائیویٹ کمرا دلوادیا۔ جہاں ڈاکٹر خاور اس کا مفت علاج کررہے ہیں۔ عام سی شکل و صورت والی سکینہ' ڈاکٹر خاور کو پسند کرنے لگتی ہے۔ سکینہ کی آواز بہت خوب صورت ہے' تاہم ڈاکٹر خاور اسے صرف اپنی پیشنٹ سمجھتے ہیں۔

ماہم منصور حسین ترین سائیکولوجسٹ ہے۔ اور اپنا ذاتی کلینک چلاتی ہے۔ رامس علی اس کا مریض ہے۔ ماہم بلا کی حسن پرست ہے۔ اس کی دوست عائشہ قدرے کم صورت ہے۔ عائشہ کا بھائی موحد رحیم' ماہم کو پسند کرتا ہے مگر سوات آپریشن میں اس کی دونوں ٹانگیں ضائع ہو جانے کے سبب ماہم اس سے کھنچ جاتی ہے۔ ماہم کی بڑی بہن ثمن' عائشہ کے کزن انصر کی بیوی ہے اور ڈیننسٹ ہے۔

رامس علی اپنے نفسیاتی عارضے کی وجہ سے خودکشی کی کوشش کرتا ہے۔

۲ دوسری قسط



وہ رامس کے ساتھ ایف نائن سیکٹر میں واقع فاطمہ جناح پارک میں موجود تھی۔ موسم بہت سہانا تھا۔ فضا میں موتیا کے پھولوں کی بھینی بھینی سی مہک تھی۔ اپنی خودکشی کے واقعے کے بعد وہ پہلی دفعہ ماہم کے ساتھ گھر سے باہر نکلا تھا۔ اس لیے اس کی طبیعت کا اضطراب اور بے چینی اس کے ساتھ چلتے ہوئے ماہم کو اچھی طرح محسوس ہو رہا تھا۔ فوری ٹریٹمنٹ ملنے سے اس کی حالت تو سنبھل گئی تھی۔ لیکن اس کی اس حرکت نے اس کے پورے گھر کو خوف زدہ کردیا تھا۔

پچھلے ایک ہفتے سے ماہم کسی سائے کی طرح اس کے ساتھ تھی۔ اوپر سے جواد انکل اسے امریکہ سے کال کرکے بار بار رامس کا کیس اچھی طرح ہینڈل کرنے کی تلقین کررہے تھے۔ اب تو خیر رامس کی ماہم کے ساتھ اچھی خاصی دوستی اور بے تکلفی ہوگئی تھی۔ اس لیے وہ اس کی آمد پر بے زاری اور کوفت کا اظہار نہیں کرتا تھا۔ وہ واحد لڑکی تھی، جس نے اس سے خودکشی کرنے کی وجہ نہیں پوچھی تھی۔ وہ اس قدر سادہ انداز سے اس سے چھوٹی چھوٹی باتیں کرتی تھی کہ رامس کو کبھی کبھار لگتا کہ وہ سائیکولوجسٹ ہونے کا بس ڈراما ہی کررہی ہے۔

اس دن موسم غضب کا تھا۔ ٹھنڈی ہوا بادلوں کے ساتھ اٹکھیلیاں کرتے ہوئے بڑے مست انداز کے ساتھ چل رہی تھی۔ موسم اچھا ہونے کی وجہ سے وہ زبردستی اسے اپنے ساتھ ایف نائن پارک میں لے آئی تھی۔

گلابی رنگ کے سوٹ میں وہ سرتاپا قیامت ڈھا رہی تھی۔ ایک تو لباس کی کارگزاری، اوپر سے اس کے دل کو چھو لینے والے نقوش، وہ سادگی میں بھی غضب ڈھاتی تھی۔ اس وقت اپنے شانوں پر آتے گھنے سلکی بال کھولے ہلکی سی لپ اسٹک میں بھی وہ دمک رہی تھی۔ وہ اپنی راج ہنس جیسی گردن اٹھائے دلچسپی سے ادھر ادھر لوگوں کو دیکھ رہی تھی۔

اس کے ساتھ سنگ مرمر کے بینچ پر بلیک جینز پر اسکائی بلیو شرٹ میں ملبوس رامس کی وجاہت عام سے حلیے میں بھی جھلک رہی تھی۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی اور بادامی آنکھوں میں رت جگے کی کیفیت نمایاں تھی، وہ کئی راتوں سے ٹرینکولائزر لینے کے باوجود نہیں سو پا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں وحشت اور چہرے پر عجیب سا خوف تھا۔

"کیا ہوگیا ہے، ریلیکس ہوکر بیٹھو نا۔" ماہم نے دلکش مسکراہٹ سے اسے قدرے فاصلے پر لاتعلقی سے بیٹھے دیکھ کر شرارتاً" کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں۔" اداسی اس کے سارے وجود پر خیمہ زن تھی۔ وہ تھوڑا سا قریب ہوا تو اس کے لباس سے اٹھنے والی بھینی بھینی پرفیوم کی خوشبو ماہم پہ خوش گوار تاثر چھوڑ گئی۔

"پرفیوم تو بہت زبردست لگا رکھا ہے۔" وہ ایسے ہی بے معنی باتوں سے گفتگو کا آغاز کرتی تھی۔

"بھائی کا ہے۔" اس کے سادہ سے جواب پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کے موتیوں کی لڑی جیسے سفید دانتوں سے نظر چراتے ہوئے اس نے قدرے ناراضی سے کہا۔

"اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے۔" اس کی روشن آنکھوں میں ہلکی سی جھنجلاہٹ ابھری تھی، جسے ماہم نے صاف نظرانداز کیا تھا۔

"ایک تو تم فوراً" لڑکیوں کی طرح ناراض ہوجاتے ہو چھوٹی چھوٹی باتوں پر۔" ماہم ایک دفعہ پھر ہنسی۔

"اور تم لڑکوں کی طرح جو بات دل میں آئے، فوراً" کہہ دیتی ہو۔" اس کا جوابی حملہ ماہم کو اچھا لگا تھا۔

"کیوں، نہیں کہنی چاہیے کیا؟" اس کی آنکھوں سے ایک دفعہ پھر شرارت چھلکی تھی، وہ خاموش رہا تھا۔

"رامس! تم ماڈلنگ کیوں نہیں کرتے، ریئلی تم ماڈلنگ کے لیے بالکل فٹ ہو۔" وہ ماہم کے اس بے تکے مشورے پر سخت حیران ہوا۔

"مجھے ایسے فضول کام پسند نہیں۔" اس نے فوراً" ناگواری کا اظہار کیا۔

"پھر کیا کام پسند ہے، وہ بتادو۔" اس نے قطعاً" برا نہیں مانا تھا بلکہ پہلے سے زیادہ دلچسپی سے پوچھنے لگی۔

"میں کچھ بھی نہیں کرسکتا، میں بس اتنا جانتا ہوں۔" وہ بالکل ایک روٹھے ہوئے بچے کی طرح بولا تھا، ماہم مسکرائی۔

"دیکھو رامس! تم ایک بالکل نارمل انسان ہو، بس ڈپریشن کے بعد والے فیز سے گزر رہے ہو۔ میں مانتی ہوں کہ یہ بھی ایک ذہنی بیماری ہے اور ہمارے معاشرے کا المیہ ہے کہ ہم جسمانی بیماریوں کے لیے تو بہت دھڑلے سے ڈاکٹرز کے پاس جاتے ہیں، لیکن کسی سائیکولوجسٹ یا سایکاٹرسٹ کے پاس جاتے ہوئے ہم اپنے دائیں بائیں دیکھنے لگتے ہیں کہ کوئی ہمیں دیکھ تو نہیں رہا۔ جیسے تمہارا کہنا تھا کہ تم میرے کلینک نہیں آؤ گے اصل میں تو اس رویے کا علاج کرنے کی ضرورت ہے۔" بڑی سنجیدہ بات بڑے ہلکے پھلکے لہجے میں کہتے ہوئے اس نے اپنے اوپر جھکے ہوئے درخت سے جھولتی ایک چھوٹی سی شاخ بھی توڑلی تھی۔

رامس نے الجھ کر اس کے چہرے کے دلکش نقوش کو دیکھا۔ وہ لاپروائی سے ہاتھ میں پکڑی شاخ سے زمین پر اگی گھاس پر لکیریں کھینچ رہی تھی۔ وہ بظاہر لاپروا تھی، لیکن اس کا تمام تر دھیان اپنے ساتھ بیٹھے رامس کی طرف تھا۔

"میں لوگوں سے ڈرتا نہیں ہوں۔" رامس نے خفگی بھرے انداز میں کہا۔ ماہم نے مسکرا کر اسے دیکھا، جو کیاری میں لگے گل داؤدی کے پھولوں پر نظریں جمائے قدرے رخ موڑے لاتعلقی سے بیٹھا ہوا تھا۔

"اگر لوگوں سے نہیں ڈرتے تو پھر میرے کلینک کیوں نہیں آتے؟" ماہم نے اس کے لہجے سے ذرا بھی متاثر ہوئے بغیر ہنس کر کہا۔ اس کے چہرے پر بڑا نرم سا تاثر تھا، جو اس کی دلکشی کو مزید بڑھا رہا تھا۔ رامس نے بڑی مشکل سے اپنی نگاہیں اس کے چہرے سے ہٹائی تھیں۔

"بس میرا دل چاہ رہا تھا کہ آج تم سے کہیں باہر ملوں۔" اس کی معصوم تاویل پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ رامس کو یوں لگا جیسے کسی ویران مندر میں بہت سی گھنٹیاں بج اٹھی ہوں۔ وہ اس کے ساتھ بیٹھا اپنے سامنے بچوں کو کرکٹ کھیلتا ہوا بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

"ڈیڈی کی ڈیتھ سے پہلے میں بھی بہت اچھا فاسٹ باؤلر تھا۔ اپنے کالج کو اکثر میچ میں نے ہی جتوائے تھے۔"

"ہوں... گڈ! تم اب کیوں نہیں کھیلتے؟" ماہم نے چونک کر اس کو دیکھا۔ اس کی ٹھوڑی کے پاس تل تھا۔

"پتا نہیں۔" اس نے لاپروائی سے کندھے اچکائے۔

"مجھے لگتا ہے کہ ہر وہ کام جو میں پہلے کرتا تھا، اب نہیں کرسکتا۔" اس کے لہجے میں عجیب سی بے چارگی تھی۔ وہ اب بے بسی سے اپنے دونوں ہاتھ مسل رہا تھا۔ ماہم نے بڑی توجہ سے اس کی اس حرکت کو دیکھا تھا۔

"دیکھو رامس! تم جس ذہنی کیفیت میں مبتلا ہو، اس کو نفسیات کی زبان میں پوسٹ ٹرامیٹک اسٹریس ڈس آرڈر کہتے ہیں۔ اس میں انسان کو تکلیف دہ واقعات ہر وقت بے چین رکھتے ہیں اور اس کی نہ صرف نیند ڈسٹرب ہوتی ہے، بلکہ بھوک بھی ختم ہوجاتی ہے اور وہ ہر وقت مضطرب رہتا ہے۔ اس کا کچھ بھی کرنے کو دل نہیں چاہتا، لیکن تمہیں اس فیز سے نکلنا ہے۔ ورنہ اپنی زندگی تباہ کرلو گے۔" اس نے خلوص دل سے اسے دوبارہ سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

"میں اس فیز میں سے کیسے نکل سکتا ہوں؟ مجھے ہر طرف خون نظر آتا ہے۔ مجھے ڈیڈی کی کراہیں رات کو سونے نہیں دیتیں، میں ان کی تکلیف کا مداوا نہیں کرسکا، یہ احساس مجھے ہر وقت بے چین رکھتا ہے۔" وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام کر بے بسی سے بولا تھا۔

"یہ ایک مشکل کام ضرور ہے، لیکن ناممکن

نہیں۔" ماہم نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر اپنائیت بھرے انداز سے کہا۔ اس نے چونک کر ماہم کو دیکھا۔

"دیکھو رامس! انسان کی زندگی میں بہت سے نشیب و فراز آتے ہیں اور انسان کو اس کا مقابلہ ہمت سے کرنا چاہیے، لیکن افسوس کہ یہ انسان کی کم ہمتی ہے کہ وہ آسودگی میں تو بہت اطمینان سے رہتا ہے، لیکن تھوڑی سی تکلیف آئے تو اس کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں اور وہ ذہنی دباؤ کا شکار ہو کر ہاتھ پیر چھوڑ دیتا ہے۔" اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے وہ ایک دوست کی طرح اسے سمجھا رہی تھی۔

"لیکن ماہم! یہ ایک چھوٹا سا واقعہ نہیں ہے کہ جس کو میں آسانی سے بھول جاؤں۔" وہ جیسے الفاظ تلاش کرتے ہوئے بولا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بے بسی بھی تھی اور نمی بھی۔ وہ اب ایک چھوٹے سے بچے کو آئس کریم کھاتا دیکھ رہا تھا، کبھی اس کے چہرے پر بھی ایسے ہی بے فکری ہوتی تھی۔

"تم یہ یقین کرلو، تقدیر اٹل ہے۔ ان کی موت ایسے ہی لکھی تھی اور ایسے ہی آنی تھی، اللہ پر یقین سکون دے گا، ورنہ تم خود بھی اذیت میں رہو گے اور انہیں بھی رکھو گے جو تم سے محبت کرتے ہیں۔" ماہم نے اپنائیت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔

"تم نے کبھی اپنی ماما کا چہرہ دیکھا ہے؟" وہ نرمی سے بولی "سب سے زیادہ نقصان تو ان کا ہوا ہے۔ تم اور تمہارے بڑے بھائی تو اپنی شادی کے بعد نئے رشتوں میں نئی خوشیوں میں کھو جاؤ گے۔ مگر وہ تو زندگی کے سفر میں بالکل تنہا ہو گئی ہیں، جب انہوں نے تم لوگوں کی خاطر خود کو سنبھال لیا تو کیا تم ان کے لیے ایک نارمل لائف میں نہیں آسکتے؟" وہ بہت توجہ سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔

"لیکن یقین کرو کہ میں ایسا جان بوجھ کر نہیں کرتا۔" وہ بالکل بچوں کی طرح اپنی صفائی دے رہا تھا۔

"مجھے معلوم ہے رامس!" وہ ہلکا سا مسکرائی۔

"مگر اب تم خود کو مصروف کرو اور نئے سرے سے زندگی کا آغاز کرو، اپنے لیے نہیں، اپنی ماما کے لیے، اپنے بھائی کے لیے۔" ماہم کی باتوں سے اس کے چہرے کا اضطراب خاصا کم ہو گیا تھا۔ وہ اب کھل کر مسکرا رہا تھا۔

"تمہاری! ماما اور بھائی صرف تمہارے لیے یہاں اسلام آباد میں شفٹ ہوئے ہیں۔ ان کی محبت کا مزید امتحان نہ لو۔ اپنے آپ کو ضائع مت کرو پلیز۔" ماہم کی باتوں نے اس پر خاطر خواہ اثر کیا تھا۔ وہ اب آسمان پر روئی کے گالوں کی طرح اڑتے بادلوں کو دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

"واٹ اے بیوٹی فل کپل!" سامنے بنے فٹ پاتھ پر ہنستی کھلکھلاتی لڑکیوں نے رک کر تبصرہ کیا، ماہم نے ان کے اس کمنٹس پر دوستانہ انداز سے ہاتھ ہلایا اور رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے شوخ لہجے میں پوچھا۔

"ہم دونوں میں سے زیادہ خوب صورت کون ہے؟" ماہم کی شوخی پر رامس نے بوکھلا کر اسے دیکھا۔

"دونوں....." وہ کھلکھلا کر ہنسیں۔ انہوں نے گرم گرم پاپ کارن کا لفافہ ماہم کی جانب بڑھایا، اس نے بے تکلفی سے مٹھی بھر لی ان دونوں لڑکیوں میں سے ایک نٹ کھٹ لڑکی نے انگلی کے اشارے سے کہا۔

"یہ زیادہ ہینڈسم ہیں۔" اپنی طرف اس کا اشارہ دیکھ کر رامس کا چہرہ خفت سے سرخ ہوا تھا۔

"لولی" وہ رامس کے خفت زدہ چہرے اور گڑبڑانے پر محظوظ ہو رہی تھیں۔

"ایسٹرن گائے۔" ان دونوں کی ہنسی تھمنے میں ہی نہیں آرہی تھی۔

"یہ تو زیادتی ہے میرے ساتھ۔" وہ مصنوعی ناراضی سے بولی، لیکن حقیقت یہ تھی کہ اسے بھی رامس کا انداز بہت لطف دے رہا تھا۔ افسردہ ہونے کی بڑی کامیاب اداکاری کر رہی تھی۔ وہ لڑکیاں ہنستے ہوئے آگے بڑھ گئی تھیں۔

"یہ لو، میری طرف سے زیادہ ہینڈسم ہونے کی خوشی میں آئس کریم کھاؤ اور موجیں اڑاؤ۔"

"تم بہت خوب صورت ہو ماہم!" وہ اس کے صبیح چہرے کے دلکش نقوش کو دیکھتے ہوئے بڑے جذب سے بولا۔ وہ اس کی بات پر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"میں سوچ رہا ہوں کہ مجھے کوئی جاب وغیرہ کرلینی چاہیے۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"ویری نائس....." ماہم نے خوش گوار احساس کے ساتھ اس کا پرعزم چہرہ دیکھا۔

"میں نے یہ بھی سوچا ہے کہ مجھے نئے سرے سے اپنی زندگی کا آغاز کرنا چاہیے۔"

"ویٹس گریٹ۔" ماہم کو حقیقتاً" خوشی تھی۔

رامس اسے دیکھتا رہا، خوشی کے احساس نے اس کے چہرے پر روشنی سی بکھیر دی تھی۔ اس کی آنکھوں میں مچلتے جذبے دیکھ کر وہ ایک لمحے کو ٹھٹکی تھی۔

"ماہم! مجھ سے شادی کرو گی؟" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ اس کی بات سن کر ماہم کا دماغ بھک کرکے اڑا۔ وہ ششدر سی اسے دیکھتی رہ گئی۔ وہ انتہائی پراعتماد انداز سے براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ ماہم کو پہلی دفعہ اپنے اس مریض سے خوف محسوس ہوا تھا۔

"تم مذاق کررہے ہو نا؟" اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے بات کو ہنسی میں اڑانے کی کوشش کی تھی۔

"نہیں بہت سنجیدہ ہوں اور میں واقعی تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں ماہم منصور!" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بڑے پراعتماد انداز سے بولا تھا۔



بارش کیا... اچھا خاصا طوفان تھا۔

اس وقت بے موسم کی بارش تیز ہوا کی سنگت میں پوری قوت کے ساتھ برس رہی تھی۔ وہ آج صبح سے بالکل خاموش تھی اور اپنے کمرے کی واحد کھڑکی سے انتہائی صدمے سے برگد کے سوکھے درخت کو دیکھ رہی تھی۔ ایک طوفان اس کے اندر بھی آیا ہوا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ بھی کسی دن اسی برگد کے درخت کی طرح سوکھ جائے گی۔ اسی وقت بجلی کڑکی اور بادل زور سے گرجے۔ جمیلہ مائی نے آگے بڑھ کر کھڑکی کا پردہ ہٹا کر کھڑکی ہی بند کردی تھی۔

"کیا ہے اماں! پہلے ہی اندر باہر ہر طرف حبس ہے۔" وہ سخت بے زاری سے بولی۔ اس نے اپنے تکیے کے پاس پڑا شیشہ اٹھا کر فرش پر پھینک دیا۔ جمیلہ مائی اپنی بیٹی کی رگ رگ سے واقف تھیں۔ انہیں معلوم تھا کہ اسے اس قدر غصہ کیوں آرہا ہے۔ انہوں نے دانستہ اس کی اس حرکت کو نظر انداز کیا تھا۔ اکلوتی اولاد سے محبت بھی بندے کو بہت کمزور کردیتی ہے۔

سکینہ کو خود بھی نہیں معلوم تھا کہ صبح نو بجے ڈاکٹر خاور کے ساتھ ڈاکٹر زویا کو اپنے کمرے میں دیکھ کر اسے اتنا غصہ کیوں آیا تھا۔ اس کے اندر باہر بھانبڑ سے جل اٹھے تھے۔

ڈاکٹر زویا نے کسی بات پر ہنستے ہوئے ڈاکٹر خاور کے بازو پر اپنا ہاتھ رکھا تھا اور جتنی محبت سے وہ اس کے چہرے کو دیکھ رہے تھے، سکینہ کو یوں لگ رہا تھا کہ وہ جلتے کوئلوں پر ننگے پاؤں کھڑی ہو۔

"اللہ نظر بد سے بچائے، ماشاء اللہ چاند سورج کی جوڑی لگ رہی تھی۔" سکینہ کو نہ جانے کیوں لگا تھا کہ اماں نے یہ بات سراسر اسے سنانے کے لیے کہی ہے۔ تب ہی اس نے سخت صدمے کی کیفیت سے اماں کو دیکھا تھا۔

"سکینہ پتر! مخمل میں کبھی ٹاٹ کا پیوند نہیں لگتا۔"

"دل یہ باتیں کب سمجھتا ہے۔ مجھے بتا، کس زبان میں اپنے دل کو سمجھاؤں، میں پاگل تھوڑی ہوں، اپنی اوقات پہچانتی ہوں، میں اللہ دتا کمہار کی کبڑی بیٹی ہوں۔" اس نے اپنا مذاق خود اڑایا۔

اس کے چہرے پر پھیلی بے بسی اور مایوسی سے جمیلہ مائی کے دل کو کچھ ہوا۔ "میری بچی بہت صابر ہے۔" اس کا دل بھر آیا تھا۔ اس نے بمشکل دل سے اٹھتے جوار بھاٹے کو آنسوؤں کی صورت میں باہر نکلنے سے روکا تھا۔

"اماں! تو گواہ ہے پچھلے آٹھ سالوں میں، میں نے کبھی اللہ سے شکوہ نہیں کیا کہ اس نے مجھے چودہ سال

صحت و تندرستی بھی تو دی تھی۔ میں نے کہاں کہاں نہیں دھکے کھائے، جب لاہور والے ڈاکٹروں نے میرا مزید علاج کرنے سے انکار کر دیا، میرے اندر پھر بھی طاقت تھی، صرف یہ سوچ کر کہ میرا رب کہتا ہے مایوسی کفر ہے، لیکن اب اس نے مجھے جس آزمائش میں ڈال دیا ہے، مجھے اس چیز پر اللہ سے گلہ ہے۔" وہ بلک بلک کر رو رہی تھی۔

"نہ میری جند، اللہ سوہنے سے گلہ نہیں کرتے۔" جمیلہ مائی ایک دم ہی خوف زدہ ہوئی تھیں۔

"اماں! خدا کی قسم یہ میرے بس کی بات نہیں۔" جمیلہ مائی فق چہرے کے ساتھ اسے دیکھ رہی تھیں۔

"اماں! کھڑکی کھول دے نا۔" اس نے روتے ہوئے التجا کی تو جمیلہ مائی کے دل پر آرا سا چلا۔ انہوں نے آگے بڑھ کر کمرے کی کھڑکی کھول دی تھی۔ تازہ ہوا کے جھونکوں نے اندر کے حبس کو کچھ کم کیا تھا۔ وہ اپنی بھولی بیٹی کو کیا سمجھاتیں کہ وہ یہ کھڑکی کیوں بند کرتی ہیں۔ ڈاکٹر زویا کو ڈاکٹر خاور کے ساتھ پارکنگ کی طرف جاتے دیکھ کر جتنی اذیت اس کے چہرے پر پھیلتی تھی، وہ جمیلہ مائی کا کلیجہ جلا جاتی تھی اور اگلے کئی گھنٹوں تک وہ خوف زدہ انداز سے سکینہ کی شکل دیکھتی رہتیں کہ اسے کچھ ہو ہی نہ جائے۔

ڈاکٹر خاور اس کی ہمت بڑھاتے اور اپنے مکمل تعاون کا یقین دلاتے دلاتے اللہ جانے کب اس کے دل کا دروازہ کھول کر بڑے دھڑلے سے اندر داخل ہو گئے تھے۔ جس رات اسے اس بات کا ادراک ہوا، وہ بہت روئی تھی اور اگلی کئی راتیں اس نے خود سے جنگ کرتے ہوئے گزاری تھیں۔ وہ جو زندگی سے لڑنے آئی تھی، اپنے دل سے ہار بیٹھی تھی۔ جسم تو معذور تھا ہی وہ دل کو بھی معذور کر بیٹھی۔ اب اس اپاہج دل کو لے کر وہ کہاں جاتی؟ اس نے منہ کے بل گرا دیا،

"اس پر بھی اماں کہتی ہے کہ شکر کر۔"

کچھ دن سے اسے اپنے علاج سے کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ گاؤں سے ابا ملنے آیا تو اسے اس قدر کمزور دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ گھنٹوں چپ بیٹھی رہتی اور کھڑکی سے باہر برگد کے سوکھے درخت کو دیکھتی رہتی۔ اس کے چہرے پر بس چند منٹوں کے لیے تازگی آتی، جب ڈاکٹر خاور صبح راؤنڈ پر آتے، لیکن اب وہ بھی نہ جانے کیوں اس کے ساتھ ذرا محتاط ہو کر بات کرتے تھے۔ ان کی یہ لاتعلقی دیمک کی طرح سکینہ اللہ دتا کے وجود کو کھا رہی تھی۔

"اماں! میں خوب صورت کیوں نہیں ہوں؟" اس دن اس نے شیشہ دیکھتے ہوئے سخت رنجیدہ لہجے میں اماں سے پوچھا۔ اس نے ابھی اپنے کمرے کی کھڑکی سے ڈاکٹر زویا کو ڈاکٹر خاور کے ساتھ جاتے دیکھا تھا۔ افسردگی کی ایک بھاری دیوار دل پر آن گری تھی اور اس نے پچھلے دس منٹوں میں بلاشبہ کوئی پندرہ دفعہ شیشہ دیکھا تھا اور ہر دفعہ دیکھنے پر پہلے سے زیادہ مایوسی کا شکار ہوئی تھی۔

"کملی نہ ہو، کون کہتا ہے کہ میری دھی خوب صورت نئیں اے۔" اماں نے دل ہی دل میں دعا پڑھ کر اس کے ماتھے پر پھونک ماری۔

"اماں! تیرے علاوہ ساری دنیا کہتی ہے۔" اس کے انداز میں اکتاہٹ اور بے دلی کا عنصر نمایاں تھا۔ وہ اب دانستہ طور پر کھڑکی سے باہر دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔

"میری دھی دا دل تے شیشے و رگوں روشن تے چمکیلا اے۔" اماں نے اس کے ماتھے کا بوسہ لیا۔

"میری بھولی ماں! دلوں کے چمکیلے پن کو کون دیکھتا ہے۔ لوگ اجلے جسم اور خوب صورت چہروں کے پیچھے ہی بھاگتے ہیں۔" وہ زہر خند لہجے میں بولی تھی۔

"پتر! اب اتنا بھی اندھیر نہیں مچا، ابھی بھی کچھ لوگ اجلے دلوں سے پیار کرتے ہیں۔" اماں نے میز سے لکڑی کا فریم اٹھاتے ہوئے سادہ سے انداز سے کہا تھا۔ لکڑی کے فریم کے ساتھ ہی ایک سفید اور گلابی رنگ کی کریم زمین پر گری۔ جسے گرتے دیکھ کر سکینہ کا رنگ فق ہوا۔

"نی سکینہ! اے کی اے؟" اماں نے ٹیوب اٹھا کر اس کی آنکھوں کے آگے کی۔

"پتا نہیں اماں!" اس نے دانستہ اپنے لہجے کو لاپروا بنایا۔ اسی وقت ایک نرس اس کے بخار کی ریڈنگ لینے اندر آئی تو اماں نے وہی ٹیوب اس کے آگے لہرا دی۔

"پتر اے کی اے۔ سکینہ دی کوئی دوائی تے نہیں اے نا؟" وہ نرس ٹیوب دیکھ کر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"خالہ جی! یہ رنگ گورا کرنے والی کریم ہے۔ یہ تیری دھی نے مجھ سے پرسوں بازار سے منگوائی تھی۔" نرس کی چلتی زبان دیکھ کر سکینہ کا دل چاہا کہ وہ تھرمامیٹر اپنے منہ سے نکال کے اس کے منہ میں ڈال دے۔

"رنگ گورا کرنے کی... سکینہ نے منگوائی سی۔" اماں نے حیرانی سے سکینہ کو دیکھا، جس نے اماں کے غضب سے بچنے کے لیے فوراً" آنکھیں بند کر لی تھیں۔



"کیا...؟" عائشہ کے منہ سے نکلنے والی بے ساختہ چیخ پر ماہم کے ہاتھ سے چھری گرتے گرتے بچی۔

وہ دونوں اس وقت ماہم کے کچن میں شلف پر بے شمار سبزیاں رکھے چائنیز بنانے کے لیے کٹنگ کرنے میں مصروف تھیں کہ ماہم نے اسے رامس کے پروپوزل کا بتایا۔ جسے سنتے ہی عائشہ اپنے منہ سے نکلنے والی بے ساختہ چیخ پر قابو نہیں پا سکی تھی۔

"اس آٹے کی بوری کا دماغ ٹھیک ہے جو تمہیں پرپوز کرنے بیٹھ گیا؟" عائشہ کو مردوں کی سفید رنگت سخت بری لگتی تھی۔ اس کے اس طرح کہنے پر ماہم کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔ اس کے یوں ہنسنے سے اس کے دائیں گال پر بننے والا ڈمپل اور خوب صورت لگنے لگا تھا۔

"قسم سے ایش! ایسے لگ رہا ہے کہ جیسے تم سبزیاں نہیں رامس کی گردن کاٹ رہی ہو۔" اس کے شرارتی انداز پر عائشہ نے مصنوعی غصے سے اسے گھورا۔

"ہزار دفعہ کہا ہے کہ میرا نام مت بگاڑا کرو، تم جیسی جاہل کو علم ہی نہیں کہ میرا نام کتنی محترم ہستی کے نام کی مناسبت سے رکھا گیا ہے۔ خالصتاً" اسلامی نام ہے میرا۔" اس نے قدرے خفگی سے کہا، پھر اس کا موڈ دیکھ کر فوراً" بات بدلی۔

"اچھا بتاؤ تم نے پھر رامس علی درانی کو پھر کیا جواب دیا؟" وہ کندھے جھٹک کر لاپروائی سے بولی۔

"ایسی بات کا جواب صرف خاموشی ہی ہو سکتی تھی۔ ایسی صورت میں جب آپ کو یہ بھی پتا ہو کہ اگلا بندہ آپ کا مریض ہے اور اس کی ذہنی حالت بھی ایسی نہیں کہ وہ اپنے مستقبل کا کوئی اہم فیصلہ کر سکے۔"

"فرض کرو کہ اگر وہ بالکل ٹھیک ہوتا، اسے کوئی نفسیاتی مسئلہ درپیش نہ ہوتا اور وہ عام سے حالات میں تم سے ملتا تو کیا تم اس کا پروپوزل قبول کر لیتیں؟" عائشہ نے اسے سنجیدگی سے دیکھا۔

"آئی ڈونٹ نو یار! تمہیں پتا ہے نا کہ میں کتنی متلون مزاج واقع ہوئی ہوں، اس لیے اپنے بارے میں بھی کچھ وثوق سے نہیں کہہ سکتی۔" وہ عجیب انداز میں مسکرائی۔ "میں چونکہ حسن پرست واقع ہوئی ہوں۔ اس لیے ہو سکتا ہے کہ اس کا پروپوزل قبول کر لیتی۔"

اس کی اس بونگی دلیل پر عائشہ نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا۔

"تم اتنی زیادہ بیوٹی کونشس کیوں ہو آخر؟" عائشہ نے الجھ کر اس کے بے داغ سراپے کو دیکھا تھا، کہیں بھی کچھ کمی نہیں تھی۔

"پتا نہیں یہ چیز میری فطرت میں شامل ہے۔ مجھے اس پر کوئی اختیار نہیں۔" وہ ہنستے ہوئے کچن میں رکھی ڈائننگ ٹیبل کی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی تھی۔ "خوب صورتی کس بندے کو متاثر نہیں کرتی۔"

"سب کو کرتی ہے، لیکن ہر ایک کا پیمانہ اور پرکھنے کا انداز مختلف ہوتا ہے۔ کسی کو ظاہری خوب صورتی اور کسی کو باطن کی اچھائی زیادہ اچھی لگتی ہے۔" اس کی دلیل پر وہ استہزائیہ انداز سے ہنسی اور ایک دفعہ پھر چولہے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

"یہ سب کتابی باتیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ لوگ ظاہری خوب صورتی کے پیچھے ہی لپکتے ہیں۔ جو چیز

دیکھنے میں ہی نہ اچھی لگے، کس کے پاس اتنا وقت ہے کہ اس کی خوبیاں ڈھونڈتا پھرے۔" اس کے مذاق اڑاتے انداز پر عائشہ کو جھٹکا لگا تھا۔ کئی لمحوں تک وہ کچھ بھی نہیں بول پائی تھی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی پلیٹ میز پر رکھ دی۔

"اگر یہ بات ہے تو پھر میں تو اتنی خوب صورت نہیں، تم نے مجھے اپنی فرینڈز لسٹ میں کیسے شامل کر رکھا ہے؟" عائشہ کی بات پر سبزیاں فرائی کرتے ہوئے ماہم نے حق دق انداز سے اسے دیکھا۔ اس پر نگاہیں ٹکائے، بہت عجیب سے تاثر کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔

"میرا دل کر رہا ہے کہ اس قدر گھٹیا، فضول اور انتہائی نامعقول بات کرنے پر تمہیں اسی چھری سے قتل کر دوں۔ تمہیں ذرا بھی شرم نہیں آئی ایسی بے ہودہ بات کرتے ہوئے۔" وہ سخت خفا نظروں سے عائشہ کو دیکھ کر بولی۔ "تم نے کیا مجھے کوئی ذہنی مریض سمجھ رکھا ہے، جس کے دماغ پر ہر لمحہ صرف خوب صورتی سوار رہتی ہو۔ یا میں کوئی بچی ہوں جسے برے بھلے کی پہچان نہیں۔ میں بھی ایک عام انسان ہوں۔ میرے اندر بھی کوئی کمزوری ہو سکتی ہے۔ لیکن کیا میں واقعی تمہیں اتنی گھٹیا لگتی ہوں کہ میں تمہارے معاملے میں بھی کوئی ایسی فضول بات سوچوں گی۔" عائشہ شرمندہ سی ہو گئی۔

"اور تمہیں کس احمق نے کہا ہے کہ تم خوب صورت نہیں ہو۔" اس نے چھری شیلف پر پھینکی تھی۔

"تمہیں پتا ہے ایش! تمہاری سب سے بڑی خوب صورتی تمہارا پراعتماد انداز ہے۔ تمہاری ذہانت، سچائی اور تمہارا کھرا پن ہے۔ مجھے اگر ظاہری خوب صورتی متاثر کرتی ہے تو میں ان خوبیوں پہ بھی مرتی ہوں۔ جو تمہارے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں"۔ ماہم کے لہجے سے تلخی کے ساتھ ساتھ سچائی بھی جھلک رہی تھی۔

"اب باقی سارا چائنیز کھانا تم اکیلے بناؤ گی، یہ تمہاری سزا ہے۔" اس نے ایپرن اتارتے ہوئے عجیب سی سزا سنائی۔ عائشہ نے ہکابکا انداز سے شیلف پر پڑے سبزیوں کے ڈھیر کو دیکھا۔ جبکہ ماہم بہت آرام سے ڈائننگ کرسی پر بیٹھی لاپروائی سے گاجر کھا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

کرم مانگتی ہوں، عطا مانگتی ہوں
الٰہی میں تجھ سے دعا مانگتی ہوں

وہ انتہائی جذب اور عقیدت سے لبریز لہجے میں نعتیہ اشعار پڑھ رہی تھی۔ اس کا ایک ایک لفظ درد سے بھرا تھا۔ رات کے اس پہر اس کی آواز کمرے کی کھلی کھڑکی سے باہر کاریڈور تک جا رہی تھی۔ جمیلہ مائی آنکھیں بند کیے اپنی بیٹی کی آواز کے سحر میں گم تھیں۔ انہیں معلوم ہی نہیں تھا کہ بہت سے بے آواز آنسو اس کی بیٹی کے گالوں پر پھسل رہے تھے۔

"سکینہ! تم ٹی وی پر ہونے والے نعتیہ مقابلے میں حصہ کیوں نہیں لیتیں؟" اگلی صبح ڈاکٹر خاور نے اس کی فائل چیک کرتے ہوئے اچانک کہا تو وہ چونک گئی۔ اس کی آنکھوں میں سخت تحیر دیکھ کر انہوں نے وضاحت کی۔

"بھئی! میں رات آپریشن تھیٹر سے فارغ ہو کر یہاں سے گزر رہا تھا تو تمہاری آواز نے پھر میرے پاؤں جکڑ لیے۔ مجھے سسٹر فاطمہ نے بھی کہا کہ سکینہ کی آواز میں بہت سوز ہے۔" وہ آج کافی دن کے بعد اس سے پرانے دوستانہ انداز میں مخاطب تھے، ورنہ پچھلے کچھ عرصے سے انہوں نے اس سے بات کرنا بالکل چھوڑی ہوئی تھی۔ وہ کافی زیادہ مصروف تھے اور صبح راؤنڈ بھی جلدی جلدی کرتے تھے۔

"بھئی! میں آپ سے مخاطب ہوں۔" ڈاکٹر خاور نے اس کے آگے چٹکی بجائی تو وہ ایک دم ہی حقیقت کی دنیا میں آگئی تھی۔ اس نے شرمندگی سے سر جھکا لیا تھا۔

"میں کہہ رہا تھا کہ میرا دوست ایک اسلامی چینل کا مالک ہے۔ وہ اپنے چینل پر کسی آل پاکستان نعتیہ مقابلے کا تذکرہ کر رہا تھا۔ مجھے اچانک تمہارا خیال آگیا۔" وہ اب تفصیل سے اسے بتاتے ہوئے غور سے دیکھ رہے تھے۔ وہ کافی کمزور کمزور سی لگ رہی تھی۔

"میں تو کسی بھی مقابلے میں حصہ لیے بغیر ہی آؤٹ ہوں ڈاکٹر! جانے دیں۔" اس کا استہزائیہ انداز ڈاکٹر خاور کو بالکل بھی اچھا نہیں لگا تھا۔ انہوں نے تاسف بھرے انداز سے اسے دیکھا۔ جس میں تبدیلی کا عمل بہت تیز رفتاری سے آیا تھا۔

"آپ مجھے مایوس کر رہی ہیں سکینہ۔" ڈاکٹر خاور کے لہجے میں اس قدر سنجیدگی تھی کہ سکینہ کے دل کی دھڑکنیں ایک دم ہی بے ترتیب ہوئی تھیں۔ وہ کچھ لمحے کھڑے اسے دیکھتے رہے، ان کے چہرے کے نقوش کچھ تن سے گئے تھے اور پھر وہ کچھ بھی کہے بغیر بڑی سرعت سے کمرے سے نکل گئے۔

وہ سکینہ اللہ دتا سے ناراض ہو گئے تھے۔ یہ بات اس کے دل کا سکون لمحے بھر میں غارت کر گئی تھی۔ اسے لگا کہ کمرے کی ہر چیز ہی اس سے خفا ہو گئی تھی۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا اعصاب پر بوجھ بڑھتا جا رہا تھا۔ جب اس کی برداشت کی انتہا ہو گئی تو وہ بے بسی سے ہچکیاں لے کر رونے لگی۔

"اے بتو رانی! بڑے ڈاکٹر صاحب پھیرا لگا گئے؟" اماں کینٹین سے دو چائے کے کپ اور ایک پلیٹ میں پیلے پیلے رس کیک رکھے ہانپتی کانپتی اندر داخل ہوئیں اور اسے خاموش دیکھ کر انہوں نے بالکل درست اندازہ لگایا۔ آج کل وہ ڈاکٹر خاور کے جانے کے بعد ایسے ہی گم صم ہو جاتی تھی۔

"اماں! ہزار دفعہ کہا ہے کہ مجھے یہ بتو نہ کہا کر، ڈوئے کی طرح میرے سر میں لگتا ہے۔" اس نے کہیں کا غصہ کہیں نکالا تھا۔ اس کے بری طرح چڑنے پر جمیلہ مائی نے اب حیران ہونا چھوڑ دیا تھا۔

"تجھے تو آج کل ہر گل ہی زہر دی پڑی لگدی اے پتر، تے فیر میں کی بولنا چھڈ دیاں؟" جمیلہ مائی نے چائے کی لمبی چسکی لی۔

ان کی بات پر اس نے جھنجھلا کر دیوار کی طرف منہ کر لیا۔ جمیلہ مائی کا دل اس کے اس انداز پر دکھ سے بھر گیا تھا۔ انہوں نے چائے کا کپ ادھورا ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ اب سکینہ کے لب پر نظر جمائے کسی گہری سوچ میں تھیں۔

☼ ☼ ☼

وہ سائیکولوجسٹ ماہم منصور کی زندگی کا ایک اور دلچسپ لیکن پیچیدہ کیس تھا۔

اٹھائیس سالہ ثنائلہ زبیر کا شمار ادب کی دنیا میں بہترین اور بہت مشہور رائٹر کی حیثیت سے ہوتا تھا۔ اس نے اپنا پہلا ناول صرف سترہ سال کی عمر میں لکھا تھا۔ اس ناول نے مقبولیت کے بے پناہ ریکارڈ توڑتے ہوئے ثنائلہ کو صف اول کی لکھاریوں میں لا کھڑا کیا تھا۔ اپنے نو سالہ کیریر میں وہ بے شمار کتابوں کی مصنفہ، ایک بلند پایہ شاعرہ کے طور پر ادبی حلقوں میں اپنا ایک مقام بنا چکی تھی، لیکن اسے خود ذاتی طور پر "نثر" کا میدان پسند تھا۔ وہ اب شاعری کو چھوڑ کر بس نثر کی طرف ہی راغب ہو چکی تھی۔

وہ ایک عجیب سی اداس شام تھی۔ جب اسے کلینک کے استقبالیہ پر موجود لڑکی نے ثنائلہ کے آنے کی اطلاع دی تھی۔ ماہم نے اسے بالکل بھی انتظار نہیں کروایا تھا۔

"پتا نہیں مجھے یہاں آنا چاہیے تھا کہ نہیں، لیکن میں آگئی ہوں۔" ماہم نے سیاہ شلوار قمیص میں ملبوس ایک عام سے نقوش کی حامل لڑکی کو اپنے کلینک میں آتے دیکھا۔ اس کے چہرے پر تذبذب کے آثار تھے۔ وہ کلینک آتو گئی تھی، لیکن بہت زیادہ کشمکش و پیچ کا شکار تھی۔ اپنے مریضوں کی طرف سے ایسا رویہ ماہم کے لیے نیا نہیں تھا۔

"جب آگئی ہیں تو یہ سب باتیں چھوڑیں۔ ویسے میرے تصور میں آپ اتنی کم عمر نہیں تھیں۔" ماہم کے لہجے کی شگفتگی اور بے تکلفی نے ثنائلہ کو بڑی خوش گوار سی حیرت میں مبتلا کیا۔ اس نے اپنے سامنے بیٹھی بلا کی حسین لڑکی کو دیکھا، وہ کہیں سے بھی

سائیکولوجسٹ نہیں لگ رہی تھی۔ اس کے لہجے میں نرمی اور دوستانہ پن نمایاں تھا۔

"میں سب سے پہلے وضاحت کردوں کہ میں کسی بھی طرح سے کم عمر نہیں ہوں' اٹھائیس سال عمر لڑکیوں کے لیے ایک معنی رکھتی ہے۔" ثنائلہ کے لہجے کی سنجیدگی پر ماہم مسکرائی اور خوش گوار لہجے میں کہا۔

"میرے خیال میں تو بڑھاپا ایک ذہنی کیفیت کا نام ہے' جب آپ بیس اکیس سال کی عمر میں خود کو بوڑھا سمجھنے لگیں تو آپ بوڑھے ہوجاتے ہیں۔ لیکن اگر آپ ساٹھ ستر سال کی عمر میں بھی ذہنی طور پر خود کو توانا محسوس کریں تو بڑھاپا نام کی کوئی چیز آپ کے قریب بھی نہیں پھٹکتی۔" ماہم نے ایک دلکش مسکراہٹ کے ساتھ اپنے سامنے بیٹھی تخلیق کار کو دیکھا تھا۔ جس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔

"آپ بہت حیران کن شخصیت کی حامل خاتون ہیں۔" اس نے اعتراف کرنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ ماہم اس کی بات پر بے ساختہ ہنسی تھی۔

"مجھے تو بس اتنا پتا ہے کہ ایک مشہور و معروف مصنفہ میرے روبرو ہے' جس کے لفظوں کے پیچھے ایک دنیا پاگل ہے۔ جو لفظوں سے ایسا سحر قائم کرتی ہے کہ لوگ اس کی کشش سے نکل ہی نہیں پاتے۔ جس کے کرداروں پر حقیقت کا گمان ہوتا ہے' جس کا تخیل انتہائی طاقت ور ہے۔ میں اپنی دوست عائشہ کو بتاؤں گی تو وہ تو حیران ہوجائے گی۔ وہ آپ کی تحریروں کی دیوانی ہے۔" ماہم نے ریوالوانگ چیر گھماتے ہوئے بظاہر اس سے گفتگو کا لیکن اندرون خانہ اپنے کام کا آغاز کردیا تھا۔ اپنی تعریف پر ثنائلہ کے چہرے پر پھیلنے والے رنگ بڑے فطری تھے' لیکن اگلی ہی بات پر وہ فوراً" خوف زدہ ہوگئی۔

"پلیز! آپ میرے یہاں آنے کا کسی سے ذکر مت کیجیے گا' آپ کو اندازہ نہیں کہ لوگ رائی کا پہاڑ بنانے میں کمال رکھتے ہیں۔" وہ ٹشو پیپر سے اپنے چہرے پر آنے والا نادیدہ پسینہ صاف کرتے ہوئے ایک دم گھبرائی تھی۔

"ڈونٹ وری ثنائلہ۔" ماہم نے فوراً" اسے تسلی دی۔ یہ ڈر' خوف بھی اس کے لیے نیا نہیں تھا۔

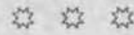
"مگر آپ یہ خوف اپنے ذہن سے نکال دیں۔ آپ سمجھیں کہ آپ ایک مصنفہ کی حیثیت سے مجھے ملنے آئی ہیں اور اپنے کسی کردار کی ذہنی الجھنوں کو سلجھانا آپ کا مقصد ہے اور یہ ہی بات آپ ان لوگوں کو بتائیں گی جن سے آپ کی شناسائی ہو اور کبھی اتفاق سے یہاں آتے جاتے ٹاکرا ہوجائے۔" ماہم نے اس کی الجھن کا بہت عمدہ حل نکالا تھا۔ اس بات سے ثنائلہ کے چہرے پر اطمینان اور سکون کے گمشدہ رنگ بڑی سرعت کے ساتھ واپس آئے تھے۔

"ہم باقی باتیں بعد میں کریں گے' آپ پہلے یہ بتائیں کہ آپ کا اپنا سب سے پسندیدہ ناول کون سا ہے؟" ماہم نے بچوں سے اشتیاق سے پوچھا۔

"وہ تو میں بھی بعد میں بتاؤں گی' پہلے آپ یہ بتائیں کہ آپ ناول پڑھتی ہیں؟" ثنائلہ کے تجسس بھرے انداز پر ماہم کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "اچھا تو آپ کو لگ رہا ہے کہ میں آپ کے ساتھ کوئی ڈرامے بازی کررہی ہوں۔ آپ اپنے کسی بھی ناول کی اسٹوری مجھ سے پوچھ سکتی ہیں۔"

"نہیں' میرا مقصد یہ نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ آپ اتنی زیادہ مصروف رہتی ہیں کہ آپ کے پاس کہاں ان ناولز اور افسانوں کے لیے وقت ہوگا۔" اس کی وضاحت پر ماہم ایک دفعہ پھر مسکرادی۔

ثنائلہ کی ستائشی نظریں ماہم کے لیے نئی نہیں تھیں۔ اسے معلوم تھا کہ لوگ اس کی ظاہری خوب صورتی کے بعد اس کے دوستانہ انداز کے شیدائی ہیں۔ عام سی باتوں سے شروع ہونے والی گفتگو تین گھنٹوں تک جاری رہی۔ اس دوران ثنائلہ اپنے ذہن کی تمام گرہیں ایک ایک کرکے کھولتی گئی۔



"یہ کیا ہے؟" ڈاکٹر خاور نے سخت تعجب اور حیرانی سے لفافہ دیکھا تھا۔ جو انہیں ابھی ابھی سسٹر ماریہ نے دیا تھا۔

"سر یہ کمرا نمبر آٹھ کی مریضہ سکینہ نے خصوصی طور پر دیا تھا کہ آپ تک پہنچادوں۔" سسٹر ماریہ نے ڈرتے ڈرتے وضاحت دی۔ "آئی ایم سوری سر! وہ بہت زیادہ منت اور واسطہ دے رہی تھی اور پھر میں اکثر اس سے نعتیں سننے اس کے کمرے میں چلی جاتی ہوں' اس لیے ایک اچھا تعلق قائم ہونے کی وجہ سے مجھ سے انکار نہیں ہوپایا۔"

"اٹس او کے سسٹر ماریہ!" ڈاکٹر خاور کو سکینہ کی بچکانہ حرکت پر خفت تو ہوئی تھی' لیکن انہوں نے مسکرا کر جواب دیا تھا۔

"میں بہت شرمندہ ہوں' آپ مجھ سے ناراض نہ ہوں۔"

سسٹر ماریہ کے باہر جاتے ہی انہوں نے لفافہ کھولا تو اندر سکینہ کی سادہ سی لکھائی میں لکھا یہ جملہ پڑھ کر وہ مسکرادیے۔

"کیا ہوگیا خاور صاحب! کون سا زعفران کا کھیت دیکھ لیا ہے جو یوں چپکے چپکے مسکرائے جارہے ہیں؟" ڈاکٹر زویا جو ابھی ابھی ان کے کمرے میں آئی تھیں۔ ان کو اکیلے بیٹھے ہنستے دیکھ کر خوش گوار حیرت کا شکار ہوئیں۔

"یہ کیا ہے؟" ڈاکٹر خاور نے کاپی کا وہ صفحہ ان کی جانب بڑھایا تو وہ دیکھ کر جی بھر کر حیران ہوئیں۔

"کچھ نہیں مائی ڈیر! یہ روم نمبر آٹھ کی مریضہ سکینہ کا معذرت نامہ ہے۔" انہوں نے ہنستے ہوئے جواب دیا لیکن ان کی بات پر ڈاکٹر زویا کے چہرے پر پھیلنے والی ناگواری بھی ان کی زیرک نگاہوں سے چھپ نہیں سکی تھی۔

"یہ اس نے رقعہ بازی کب سے شروع کردی؟ مجھے تو آپ کی یہ مریضہ عجیب سی لگتی ہے' آپ پتا نہیں کیوں اسے اتنی زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔" ڈاکٹر زویا کا موڈ ایک دم ہی خراب ہوگیا تھا' حالانکہ وہ بہت اچھے موڈ کے ساتھ ڈاکٹر خاور کے ساتھ کافی پینے آئی تھیں۔

"کم آن زویا... اصل میں کاظمی کے چینل پر کوئی نعت کمپیٹیشن ہورہا ہے' میں نے سکینہ سے حصہ لینے کو کہا' لیکن وہ ان دنوں شدید قنوطیت کا شکار تھی' اس نے مجھے خاصا روڈلی انکار کردیا۔ اس کے بعد میں دو دن راؤنڈ پر نہیں جاسکا اور وہ بے وقوف لڑکی سمجھی' میں اس سے خفا ہوں۔" انہوں نے سادگی سے جواب دیا۔ مگر ڈاکٹر زویا کے دلکش چہرے کے زاویے ابھی تک بگڑے ہوئے تھے۔

"اور جہاں تک سکینہ کو اہمیت دینے کی بات ہے تو میں اپنے ہر مریض کو ایسے ہی اہمیت اور توجہ دیتا ہوں۔ آپ کو نہ جانے کیوں یہ بات عجیب لگی ہے' حالانکہ آپ تو مجھے شروع سے جانتی ہیں۔" ڈاکٹر خاور کا انداز ہنوز سا تھا۔ وہ کافی بنانے کے لیے اب الیکٹرک کیٹل میں پانی ڈال رہے تھے۔

"آپ کو شروع سے جانتی ہوں' اس لیے تو مجھے یہ بات بہت عجیب لگی ہے' کیونکہ وہ واحد پیشنٹ ہے جس کو آپ بکس لاکر دیتے ہیں۔ اس کو اس کی بیماری کے متعلق باتیں بتاتے ہیں۔ صبح و شام اس کی پروگریس پوچھتے ہیں۔ ایسے میں وہ کسی خوش فہمی کا شکار ہوجائے تو اس میں اس کا تو کوئی قصور نہیں نا۔" ڈاکٹر زویا نے وہ سادہ سا کاغذ بڑی بے دردی سے میز پر اچھالا تھا۔ ڈاکٹر خاور نے ہکا بکا انداز کے ساتھ اپنے سامنے بیٹھی لڑکی کو دیکھا' جو ان کی بہترین دوست ہونے کا دعوا کرتی تھی۔

"آپ مانیں یا نہ مانیں' محترمہ نے یہ اپنی طرف سے لو لیٹر ہی لکھا ہے۔" ڈاکٹر زویا کے تلخ لہجے پر سرجن خاور چونکے۔

"استغفراللہ...! زویا یہ کہاں سے آپ کو لو لیٹر لگ رہا ہے۔ آپ بھی بعض دفعہ کمال کرجاتی ہیں۔" ان کے انداز میں ہلکی سی ناگواری کی جھلک پاکر ڈاکٹر زویا کچھ بے چین ہوئیں۔ وہ ڈاکٹر خاور کے والد کے بہترین دوست کی بیٹی تھیں۔ دونوں انگلینڈ میں اکٹھے ہی پڑھے تھے۔ دونوں میں کافی بے تکلفی اور اچھی

انڈر اسٹینڈنگ تھی۔ وہ بھی کچھ عرصہ پہلے ہی پاکستان شفٹ ہوئی تھیں اور ڈاکٹر خاور کی درخواست پر ان کا وارڈ جوائن کیا تھا۔

"ڈاکٹر زویا کیا آپ مجھے اس قدر کمزور کردار کا آدمی سمجھ رہی ہیں۔ آپ کے خیال میں کیا میں اپنی مریضہ کے ساتھ فلرٹ کر رہا ہوں؟" ان کے دوٹوک انداز پر اور خصوصاً" لہجے میں موجود بڑی واضح ناراضی پر ڈاکٹر زویا کے ہاتھ پیر پھولے تھے۔

"آئی ایم سوری۔!" ڈاکٹر زویا نے معاملے کو ختم کرنے کے لیے فوراً" معذرت کی تھی۔

"آپ کے خیال میں آپ کے سوری کے الفاظ کیا میری اس تکلیف کا مداوا کر سکتے ہیں۔" وہ بڑی سرعت سے کمرے سے نکل گئے۔

☼ ☼ ☼

"موحد میرا بہترین دوست ہے۔"

آج اچانک ہی ماہم کی ایک بات یاد آتے ہی اس پر قنوطیت کا دورہ پڑا تھا۔ ماما پچھلے ایک ہفتے سے آمنہ آنی کے پاس کینیڈا گئی ہوئی تھیں۔ ان کے ہاں بیٹا ہوا تھا اور عائشہ اپنی ایگزیبشن کی تیاریوں میں مگن تھی۔ ایسے میں موحد رحیم کے پاس کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ اب تو اس کے دوست بھی اس سے کترانے لگے تھے۔

"موحد اپنی وہیل چیر کو گھسیٹتا ہوا باہر لے گیا تھا۔ سامنے لان میں اتنے خوشنما پھول کھلے ہوئے تھے مگر پھر بھی اس کے دل کے آنگن میں ہر سو ویرانی چھائی ہوئی تھی۔

"غلط کہتے ہیں لوگ کہ بہار کے آتے ہی دل کے موسم بدلنے لگتے ہیں۔" ایک زہر میں بجھی ہوئی بات نے اس کے ذہن کا احاطہ کیا تھا۔

"ساری دنیا ہی خود غرض اور مطلبی لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔" اس کے اندر باہر ہر طرف تلخی میں لپٹا مایوسی کا دھواں تھا، جس میں اسے ہر چہرہ ہی بدنما لگ رہا تھا۔ زندگی اسے بہت عجیب موڑ پر لے آئی تھی۔

وہ موحد رحیم تھا جسے ہارس رائیڈنگ اور کار ریسنگ کا جنون تھا۔ وہ لیفٹیننٹ جنرل عبدالرحیم کا وہ خوبرو اور وجیہہ اکلوتا بیٹا تھا جس کے قدموں کے نیچے روز کئی لڑکیوں کے دل ٹوٹتے تھے۔ وہ ایک شان استغنا کے ساتھ ان پر نگاہ ڈالے بغیر ماہم منصور کی زلفوں کا اسیر ہوا تھا۔ اب اسی ماہم منصور کے پاس اپنے اس بہترین دوست کے لیے کوئی ٹائم نہیں تھا۔ وہ ساری دنیا کی نفسیاتی گتھیاں سلجھاتے سلجھاتے اپنے ایک دوست کو بری طرح الجھا گئی تھی۔

وہ موحد رحیم جو ہمیشہ فاتح کہلاتا تھا۔ ہر سال اس کے پاس نئی اسپورٹس کار ہوتی تھی۔ اس نے اپنے شوق سے فلائنگ بھی سیکھی تھی۔ اسے جمود سے نفرت تھی اور اس لیے وہ ہر لمحہ متحرک رہتا تھا مگر اب تو پورا سال ہو گیا تھا۔ اس نے گھر سے باہر کی دنیا نہیں دیکھی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ اس کے جسم کو زنگ لگ گیا ہے۔

اس کا حلقہ احباب خاصا وسیع تھا۔ بعض دفعہ ماہم اور عائشہ صرف اس لیے اس سے لڑ پڑتی تھیں کہ وہ گھر آنے کے بعد بھی سیل فون کانوں سے چپکائے ادھر ادھر گھومتا رہتا تھا، لیکن اب اس کے سیل پر کئی کئی دن تک کسی دوست کی کال نہیں آتی تھی۔ وہ دن میں کئی بار اٹھا کر چیک کرتا، لیکن اسکرین ہمیشہ خالی ملتی۔

"لگتا ہے اب تو ماما اور پاپا کو بھی مجھ سے محبت نہیں رہی۔ ماما نے بھی آج پورے دن میں اسے کوئی کال نہیں کی تھی۔" وہ ساری ہی دنیا سے بدگمان تھا اور یہ بدگمانی اس کا حق تھی، کیونکہ آج اس کا برتھ ڈے تھا اور اس کے سب ہی احباب کو بھولا ہوا تھا۔

"اگر کسی کو میری پروا نہیں تو مجھے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔" اس کی آنکھوں کے کنارے خوامخواہ ہی بھیگے تھے۔

"فرق نہ پڑتا تو کیا تم اس طرح بیٹھے سب کو یاد کر کے سوگ منا رہے ہوتے؟" اس کے اندر سے کوئی ہنس کر اس کا مذاق اڑا رہا تھا۔

"کاش کہ ساری دنیا ہی مایا کیلنڈر کے مطابق ختم ہو جاتی اور یہ منحوس، اجاڑ اور ویران دن دیکھنے سے بچ جاتا۔" ابھی ابھی ایک اور زہریلی سوچ نے اس کا دامن پکڑا تھا۔

"کاش کہ اس بم دھماکے میں میرا آدھا جسم نہ بچتا۔ میرے گھر والے مجھے شہید سمجھ کر خود کو تسلی دے لیتے۔ اس طرح روز کے مرنے سے تو بچ جاتا۔" موحد نے آنکھیں بند کیں تو ایک اور بدنما سوچ نے اس کی انگلی پکڑ لی۔ وہ اگلے دس منٹ تک بالکل ساکت بیٹھا اپنے آپ سے لڑ رہا تھا۔ جب کوئی ہلکے سے اس کے کان کے پاس گنگنایا۔

"ہیپی برتھ ڈے ڈیئر موحد!"

اس نے جھٹکے سے آنکھیں کھولیں تو اپنے سامنے ماہم اور عائشہ کو دیکھ کر وہ ہڑبڑا سا گیا۔

"فار گاڈ سیک موحد! منہ تو بند کر لو، مکھیوں کی ایک فوج تمہارے منہ کی طرف خطرناک ارادوں کے ساتھ آ رہی ہے۔" ماہم کے خبردار کرنے پر اس نے بڑی سرعت سے اپنا منہ مضبوطی سے بند کیا تھا اور اس کی اس بے ساختہ حرکت پر ماہم کی ہنسی ایک فوارے کی صورت میں منہ سے نکلی تھی۔

"اچھا بس کرو، میرے معصوم بھائی کا مذاق اڑا رہی ہو۔" عائشہ نے بہت محبت سے اپنے سے دو سال بڑے بھائی کے گلے میں بانہیں ڈال کے اپنی دوست کو دیکھا۔ جس کا چہرہ ہنسی کی زیادتی سے سرخ ہو رہا تھا۔ وہ اس لمحے اس قدر دلکش لگ رہی تھی کہ موحد کے ساتھ عائشہ کے لیے بھی اس کے چہرے سے نگاہ ہٹانا دشوار ہو رہا تھا۔

"یہ تم دونوں ایسے لوفروں کی طرح کیوں گھور رہے ہو مجھے۔" اسے ان دونوں کی محویت کا بڑی جلدی احساس ہو گیا تھا۔ اس لیے کمر پر ہاتھ رکھ کر بڑے لڑاکا انداز سے ان دونوں کو گھورا۔

"ہم دیکھ رہے تھے کہ تم ہنستے ہوئے ضرورت سے زیادہ احمق کیوں لگتی ہو۔"

"واقعی موحد ایسا ہی ہے؟" وہ اپنی بڑی بڑی بادامی آنکھیں پھیلائے اس ادا سے موحد کو دیکھ رہی تھی کہ اس کے لیے اپنا دل ہی سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔

"تم لوگ اپنی لڑائی بند کرو اور یہ بتاؤ کہ میری سالگرہ کا کیک کہاں ہے۔" موحد کی بات پر عائشہ نے زوردار چیخ ماری تھی۔

"اوہ مائی گاڈ! میں نے اوون میں کیک بیک ہونے کے لیے رکھا تھا۔" وہ کسی گولی کی طرح اڑتی ہوئی کچن کی طرف بھاگی۔

"آرام سے جاؤ، تمہارا بلیک فارسٹ کیک اب تک تو کالا پتھر بن چکا ہوگا، سنبھال کر رکھ لینا، سر پھوڑنے کے کام آئے گا۔" ماہم نے اسے بلند آواز میں چھیڑا۔

"ماہم! تم بہت بدل گئی ہو۔" موحد نے اسے آنکھوں کے ذریعے دل میں اتارتے ہوئے ہلکا سا شکوہ کیا تھا۔ وہ چونکی۔ اس کی ستواں ناک میں ہیرے کی لونگ موحد نے بڑے غور سے دیکھی تھی، یہ اس نے پچھلے سال ماہم کی سالگرہ پر اسے گفٹ کی تھی۔

"میں نہیں بدلی موحد! تم ضرورت سے زیادہ حساس ہو گئے ہو۔" ماہم نے اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے سنجیدگی سے اس کی تصحیح کی۔

"ہر سال سب سے پہلے تم مجھے برتھ ڈے وش کرتی تھیں۔ تمہیں کیا پتا صبح بارہ بجے سے اب تک کوئی ایک ہزار دفعہ اپنے سیل فون کو چیک کر چکا ہوں کہ شاید تمہارا کوئی میسج یا کوئی کال آئی ہو اور مجھے پتا نہ چلا ہو۔" اس کی زبان سے زیادہ آنکھیں بول رہی تھیں، جن میں ہلکا ہلکا سا دکھ تیر رہا تھا۔

"مجھے یقین ہے کہ تم نے ایسا ہی کیا ہوگا اور مجھے یہ بھی پتا ہے کہ اس عرصے میں ہزاروں دفعہ تم بدگمان بھی ہوئے ہو گے، دل میں شکووں کی ایک فصل بھی کھڑی کر لی ہوگی۔ زہریلی سوچوں کے کئی درخت بھی تمہارے دل کی سرزمین پر اگ آئے ہوں گے اور تم نے ان کو خوب پانی دیا ہوگا ہے نا۔" وہ اس کے بالکل سامنے دونوں بازو سینے پر باندھے بڑی گہری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"تم ایسا کیوں کرتے ہو موحد؟" اس کے لہجے میں ہلکی سی ناراضی جھلکی۔ "ایک لمحے میں بدگمانی کی عینک سے دیکھ کر سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیتے ہو۔ ہماری تم سے محبت کیا اتنی کمزور اور ناپائیدار ہے، جو تمہیں فوراً "دھندلی نظر آنے لگتی ہے؟"

"تم پلیز مجھ سے کسی اور کی بات مت کرو' آج صرف اور صرف اپنی محبت کی بات کرو۔ میری سماعتوں نے بہت عرصے سے کوئی خوب صورت لفظ نہیں سنا۔ میرے دل کی بنجر زمین پر کافی دنوں سے کوئی پھول نہیں کھلا۔" موحد نے بڑے بے بس انداز سے اسے دیکھا جو یک ٹک اسے دیکھے جارہی تھی۔

"موحد! ہم بہت اچھے دوست ہیں۔" وہ ہلکا سا گلا کھنکھار کر بولی۔

"فار گاڈ سیک ماہم! مجھے دھوکا مت دو۔ ہمارے درمیان ایک سال پہلے تک اس دوستی سے بڑھ کر بھی بہت کچھ تھا۔ ہم نے لفظوں میں اسے ڈھالنے کی اگر ضرورت نہیں سمجھی تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم کچھ سمجھتے بھی نہیں تھے۔ گھنٹوں ہماری سیل فون پر گفتگو رہتی' تم اور عائشہ ایسے ہی بھاگ بھاگ کر ہر ویک اینڈ پر مجھ سے ملنے ایبٹ آباد نہیں آتی تھیں۔ ہمارا سارا سوشل سرکل جانتا تھا کہ تمہارے اور میرے درمیان کچھ خاص ہے۔" وہ آج نہ جانے کیوں پھٹ پڑا تھا۔ ماہم کے چہرے پر ناگواری کی ایک ہلکی سی لہر دوڑی تھی۔

"تم کیا چاہتے ہو موحد؟" وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ خطرناک سنجیدگی سے دوٹوک انداز میں اس سے پوچھ رہی تھی۔

"تمہیں چاہتا ہوں اور اس گمشدہ چاہت کی تلاش میں ہوں جو شاید میری وہیل چیر کے نیچے آکر کچلی گئی ہے۔" اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور وہ اب اپنی وہیل چیر پر تیز تیز ہاتھ مارتا ہوا اسے اندر لے کر جارہا تھا۔ ماہم وہیں کھڑی اس کے جملے کی تلخی کو فضاؤں میں تحلیل ہوتے دیکھ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"اماں! یہ آخر ابا کے ساتھ مسئلہ کیا ہے؟" سکینہ نے ہاتھ میں پکڑا ڈائجسٹ تپائی پر رکھتے ہوئے جھنجلا کر کہا تھا۔

"ہن کی ہو گیا؟" جمیلہ مائی نے بیٹی کے بے زار چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے قدرے نرمی سے پوچھا۔

"اماں! یہ ابا آج کل جب بھی یہاں آتا ہے اپنے ساتھ اس بیر کے منہ والے جاجی کو کیوں لے آتا ہے۔ زہر لگتا ہے مجھے۔" سکینہ کی بات پر جمیلہ مائی کا منہ ہکا بکا رہ گیا۔

"نی سکینہ! تیرا دماغ ٹھیک ہے پتر! تیرے چاچے کا اکو اک پتر اے جاجی' ایک تو وہ تیرے ابے کے ساتھ اتنا لمبا سفر کر کے آتا ہے' ورنہ پنڈ سے اسلام آباد کا سفر وہ بڈھی جان اکیلا کیسے کرے؟ اوپر سے نواب زادی کے مزاج ہی نہیں ملتے۔" جمیلہ مائی نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے بڑی خفگی سے کہا تھا۔ اس کی بات پر سکینہ کا مزاج سوا نیزے پر پہنچ گیا تھا۔

"اماں! تو نے اور ابے نے قسم کھا رکھی ہے کہ جو چیز سکینہ کو بری لگے گی وہ تو ضرور کرنی ہے۔" وہ سخت بدگمان تھی۔

جمیلہ مائی نے ناک پر انگلی رکھ کر سخت تعجب سے بیٹی کا برہم چہرہ دیکھا۔

وہ کچھ لمحوں کے لیے بالکل چپ کر گئی۔

"بس اماں! مجھے وہ اچھا نہیں لگتا۔ اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں ڈھیروں ڈھیر سرمہ ڈال کے آجاتا ہے۔" اس کی بات پر جمیلہ مائی نے اپنے اندر اٹھتی اشتعال کی لہر کو بڑی مشکل سے دبایا تھا۔

"سکینہ پتر ایک گل کی تو مجھے اج سمجھ لگ ای گئی اے۔" جمیلہ مائی کی بات پہ سکینہ نے اماں کا سنجیدہ چہرہ دیکھا۔ اس کی سوالیہ نظروں کے جواب میں اماں نے بڑے سرد لہجے میں جواب دیا۔

"جب سے تو نے اللہ کے بنائے لوگوں میں نقص نکالنے شروع کیے ہیں نا' تب سے لوگوں نے بھی تیرا زیادہ مذاق اڑانا شروع کردیا ہے۔ یہ اللہ کی سزا ہے تیرے لیے۔ جب تو لوگوں کو بیر کے منہ والا اور اللہ کی

بنائی آنکھوں کو نکی نکی کہہ کر مذاق کرے گی تو تجھے بھی اللہ سے شکوہ کرنے کا کوئی حق نہیں۔"

جمیلہ مائی کی اس قدر تلخ' کڑوی اور سچی بات پر سکینہ بالکل ہی ہکا بکا ہو گئی۔ اس کے چہرے کی رنگت فق ہو کر اور سانولی لگنے لگی تھی۔ اسے اماں سے اس قدر صاف گوئی کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ اس کی آنکھوں میں شکوے کے ساتھ ساتھ موٹے موٹے آنسو دیکھ کر جمیلہ مائی کا دل کچھ موم ہوا' لیکن وہ اس کی بہتری کے خیال سے آنکھیں بند کر کے تسبیح کرنے لگیں۔ جبکہ بہت سے بے آواز آنسو سکینہ کی آنکھوں سے بہنے لگے۔



"او مائی گاڈ!" عائشہ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

اس نے سخت تحیر سے سامنے ٹریڈ مل پر تیزی سے بھاگتی ماہم کو دیکھا تھا۔ بلیو ٹریک سوٹ میں اونچی سی پونی بنائے سفید جوگرز کے ساتھ وہ پچھلے تیس منٹ سے الیکٹرک ٹریڈ مل پر بھاگ بھاگ کر ٹماٹر کی طرح سرخ ہو رہی تھی۔ وہ اپنی صحت اور فٹنس کے معاملے کی بلا کی محتاط تھی اور ہر روز ایک گھنٹہ بلاناغہ ایکسر سائز اس کی زندگی کا بہت عرصے سے معمول تھا۔ کبھی کبھی عائشہ اس کا ساتھ دیتی تھی' لیکن پھر تھک ہار کر کاؤچ پر بیٹھ کر اس سے باتیں کرتی رہتی تھی۔ آج کل رامس کسی جاب کے انٹرویو کے لیے کراچی گیا ہوا تھا۔ اس لیے ماہم کی باتوں میں اس کا ذکر کم ہی ہوتا تھا۔

"تم نے کیا بتایا کہ مشہور و معروف ادیبہ ثنائلہ زبیر تمہارے پاس آئی تھیں۔" عائشہ سخت تجسس سے اس کی ٹریڈ مل کے پاس آن کھڑی ہوئی تھی۔ اس کا تجسس اور اشتیاق ماہم کو مسکرانے پر مجبور کر رہا تھا۔ وہ اپنی سارے دن کی روداد جب تک عائشہ کو نہیں سنا لیتی تھی۔ اسے سکون نہیں آتا تھا۔

"یار! مجھے یقین نہیں آرہا کہ اتنی اچھی مصنفہ کو بھی کوئی مسئلہ ہو سکتا ہے۔"

"کیوں وہ انسان نہیں؟" ماہم کا سانس پھولا ہوا تھا۔

"انسان تو ہیں' لیکن اتنے ذہین لوگ جو اپنی تحریروں میں ہزاروں لوگوں کے ذہنوں کی گتھیاں سلجھاتے ہیں' ان کو کیا مسئلہ ہو سکتا ہے۔"

"ہوتے تو انسان ہی ہیں نا۔ کوئی بھی انسان کامل نہیں ہو سکتا۔ اس میں کوئی نہ کوئی کمزوری ہوتی ہے۔ یہ ہم جیسے لوگ ہیں جو ان کے بلند و بالا بت تراش لیتے ہیں۔" وہ ہنستے ہوئے عائشہ کا مذاق اڑا رہی تھی' جس نے آگے بڑھ کر ٹریڈ مل کا سوئچ آف کر دیا تھا۔

"مشین کیوں بند کر دی؟" وہ سخت خفگی سے عائشہ کو دیکھ رہی تھی' جس کے چہرے پر کمال کی بے نیازی تھی۔

"کچھ خوف خدا کرو' اتنی سے زائد کیلوریز تم برن کر چکی ہو۔ اب اور کتنا گھوڑوں کی طرح بھاگو گی۔ شرافت سے نیچے اترو۔ پتا نہیں تمہیں اور ثمن آپی کو کس چیز کا کمپلیکس ہے' جو ہر وقت خود کو کبھی پارلر' تو کبھی جم میں اور کبھی گھر میں وختا ڈالے رکھتی ہو۔" عائشہ سخت بے زاری سے بولی تھی۔

"یار! ثمن آپی سے یاد آیا کہ انہیں ایک بڑے اچھے چینل سے ایک شو کی آفر آئی ہے اور وہ سنجیدگی سے اس کو قبول کرنے کے بارے میں سوچ رہی ہیں۔" ماہم نے تولیے سے منہ صاف کرتے ہوئے عائشہ کو بتایا۔

"واٹ؟" عائشہ کو سن کر ہی سخت شاک لگا تھا۔

"ثمن آپی کو کیا ضرورت پڑی ہے ان فضولیات میں پڑنے کی' اچھا خاصا اپنا کلینک چلا رہی ہیں اور پھر انفر بھائی کیا ان کو اجازت دے دیں گے؟" عائشہ کو تو سن کر ہی بہت عجیب لگا تھا۔ ان کے خاندان میں دور دور تک کوئی شوبز میں نہیں تھا اور اسے پتا تھا کہ اس کی خالہ کے گھر میں یہ بات سخت ناپسند کی جائے گی۔

"یار! ان فضولیات سے لوگ آج کل جتنا پیسہ بنا رہے ہیں وہ کسی اور ذریعے سے نہیں بن سکتا۔ مجھے تو اس میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں لگتی۔" ماہم نے

پائن ایپل جوس گلاس میں انڈیلتے ہوئے صاف گوئی سے کہا تھا۔

"میرے خیال میں پیسے کی تو انصر بھائی کے خاندان میں بھی کوئی کمی نہیں۔ پھر ثمن آپی کا اپنا کلینک ہی اتنا زبردست چل رہا ہے۔" عائشہ نے جوس کا گلاس پکڑتے ہوئے ماہم کو یاد دلایا تھا جو خود بھی بڑی نزاکت سے ایک ایک گھونٹ کر کے جوس پی رہی تھی۔

"پیسہ تو جتنا بھی ہو کم ہی ہوتا ہے اور تمہیں پتا تو ہے کہ ہم دونوں بہنوں کا لائف اسٹائل ہی ایسا ہے کہ ہم ہر چیز میں سب سے آگے نظر آنا چاہتے ہیں۔ ماما پاپا نے ہماری پرورش اسی اسٹائل سے کی ہے۔" ماہم کے فخریہ انداز پر عائشہ نے تاسف بھرے انداز سے اسے دیکھا تھا۔

"سارے ہی والدین اپنے بچوں کو اپنی اپنی بساط کے مطابق ناز و نعم سے پالتے ہیں لیکن انسان کو اپنی خواہشات کے پیچھے نہیں بھاگنا چاہیے یہ دوڑ بہت جلد تھکا دیتی ہے۔" عائشہ کی بات پر ماہم کھلکھلا کر ہنسی۔

"یار! تم بھی اپنی پسندیدہ رائٹر کی طرح بہت اوکھی باتیں کرتی ہو۔" ماہم نے ٹشو سے اپنا منہ صاف کرتے ہوئے اس کا مذاق اڑایا تھا۔

"پسندیدہ رائٹر نے کون سی مشکل بات کہہ دی جو ایک ذہین و فطین سائیکولوجسٹ کو سمجھ نہیں آ رہی ہے؟" وہ بھی کون سا کسی سے کم تھی اس کے طنزیہ انداز پر ماہم بے ساختہ ہنسی۔

"مائی گاڈ ایش! تم نے کیسے ظالم سسرال والوں کی طرح مجھے طعنے دینے شروع کر دیے۔" اس کی بات پر عائشہ نے مسکراتے ہوئے جوس کا خالی گلاس ٹرے میں رکھا۔

"ثنائلہ زبیر دیکھنے میں کیسی لگتی ہیں؟ ان کی تصویر کبھی بھی کہیں شائع نہیں ہوئی۔" عائشہ کی سوئی ابھی بھی اپنی پسندیدہ مصنفہ میں اٹکی ہوئی تھی۔ جن سے ملنے کا اسے بہت اشتیاق تھا۔ اس کی بات پر ماہم نے برا سا منہ بنایا تھا۔

"ستائیس اٹھائیس سال کی انتہائی عام سی لڑکی ہے موٹے موٹے سے نین نقش اور قد کے لحاظ سے وزن بھی بڑھا ہوا ہے۔ اگر تم مائنڈ نہ کرو تو سادہ سے الفاظ میں اس کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ بہت خوب صورت الفاظ تخلیق کرنے والی ایک عام سی لڑکی ہے لیکن لفظوں کا استعمال بڑی مہارت اور دلکشی سے کرتی ہے۔"

"واقعی! وہ عام سی شکل و صورت کی حامل ہیں؟" عائشہ کو سخت تعجب ہوا تھا۔

"ہاں ڈریس سینس تو بالکل نہیں ہے۔" ماہم کو اچانک یاد آیا تھا۔ "آج کل کے دور میں کون شلوار قمیص پہنتا ہے۔ محترمہ نے تنگ پائنچوں کے ساتھ گھٹنوں کے اوپر تک آتی قمیص پہن رکھی تھی۔" ماہم نے ہنستے ہوئے ان کا مذاق اڑایا تو عائشہ کو سخت برا لگا تھا۔

"خیر اب شلوار قمیص پہننے والے کو ہم دقیانوسی تو نہیں کہہ سکتے۔ یہ تو ہر ایک کی پسند ناپسند ہوتی ہے۔ ان کو یہ درویشوں والے لمبے چوغے اور ٹراؤزر نہیں پسند ہوں گے۔" عائشہ نے ان کی حمایت لیتے ہوئے موجودہ دور کے فیشن پر بھی طنز کر دیا۔ اس کی بات پر ماہم ہنس پڑی تھی۔

"اور ایک بات... تمہاری پسندیدہ مصنفہ کے ساتھ مسئلہ بھی بہت عجیب و غریب ہے۔" ماہم بڑے جوش کے ساتھ اٹھ کے بیٹھی۔ عائشہ نے چونک کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"اچھا وہ کیا؟" عائشہ نے اس کا تجسس سے بھرپور چہرہ دیکھا۔

"وہ بہت خوب صورت الفاظ کے ساتھ بہت پیارے کردار تخلیق کرتی ہیں۔ میں نے ان کی اپائنٹمنٹ کی تاریخ کے بعد صرف اور صرف ان کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے ان کے کچھ ناول پڑھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ انتہائی محبت کے ساتھ اپنی کہانیاں تحریر کرتی ہیں۔" ماہم کے ستائشی انداز پر عائشہ بے ساختہ مسکرا دی۔ اپنی پسندیدہ رائٹر کے لیے

اس کی پسندیدگی عائشہ کو اچھی لگی تھی۔

"تم نے ان کا ناول "محبت روح کا درماں" پڑھا ہے؟" ماہم نے تجسس بھرے انداز میں پوچھا تو عائشہ نے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا۔

"وہ ہی نا جس کا ہیرو سکندر شاہ ہے جو کسی یونانی دیوتا کی طرح وجیہہ اور خوب صورت ہوتا ہے؟" عائشہ نے یاد دلایا۔

"ہاں ہاں وہ ہی اسی کا تو سارا مسئلہ ہے۔" ماہم پراسرار طریقے سے مسکرائی۔

"کیوں کیا ہوا؟" عائشہ اس کی مسکراہٹ پر الجھ سی گئی۔

"سکندر شاہ ایک فرضی کردار تھا۔ جسے اس ناول کی مصنفہ نے بہت محنت توجہ اور لگن کے ساتھ تخلیق کیا تھا۔ ان کا یہ ناول تین سال تک ایک ڈائجسٹ میں چلتا رہا اور اس نے مقبولیت کے کئی ریکارڈ توڑ دیے ہیں نا؟"

ماہم کی بات پر اس نے تائیدی انداز سے سر ہلایا اور بڑے غور سے اسے دیکھا جو مسلسل مسکرا رہی تھی۔

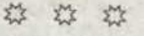
"ہاں تو پھر مسئلہ کیا ہے؟"

"مسئلہ یہ ہے کہ اس ناول کی مصنفہ کو اپنے ناول کے اس فرضی کردار کے ساتھ محبت ہو گئی ہے۔" ماہم کی بات پر عائشہ کا دماغ بھک کر کے اڑا اور منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ وہ سخت بے یقینی سے ماہم کا مسکراتا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟" عائشہ کا تعجب اور حیرانی کم ہونے میں ہی نہیں آ رہی تھی۔

"اس بات نے ثنائلہ صاحبہ کی پوری زندگی کو ڈسٹرب کر کے رکھ دیا ہے۔ وہ شدید پریشانی کا شکار ہیں اور ان سے اب ایک لفظ بھی نہیں لکھا جا رہا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ میری پروفیشنل زندگی کا ایک اور دلچسپ اور حیران کن کیس ہو گا۔" ماہم نے لاپروائی سے کہا اور اپنے سیل فون پر رامس کے آئے ہوئے میسج کو غور سے پڑھنے لگی جس نے کراچی سے اسے لکھ کر بھیجا تھا۔

"کبھی شبوں کے اداس آنگن میں یاد اترے
یا چاندنی اپنے بال کھولے
کواڑ کے روزنوں سے جھانکے
کتاب کھولو تو میرا عکس جھلملائے
ستارہ پلکوں پر جگمگائے
کبھی جو کمرے کی کھڑکیوں سے ہوا کا جھونکا
گلاب رت کی نوید لائے
تو جان لینا
میں تمہیں یاد کر رہا ہوں"



"اچھا تو کیا آپ واقعی نعت کمپٹیشن میں حصہ لے رہی ہیں؟" ڈاکٹر خاور اگلے دن کچھ جونیئرز ڈاکٹرز کے ساتھ راؤنڈ پر تھے۔ جب اس کے کمرے میں آتے ہی انہوں نے سکینہ کو مخاطب کیا۔

"جی ڈاکٹر صاحب! اب میں آپ کو ناراض بھی تو نہیں کر سکتی نا۔" اس کی آنکھوں میں چمکتے جگنوؤں سے ڈاکٹر خاور نے بمشکل نظریں چرائی تھیں۔ یہ لڑکی اب انہیں چونکانے لگی تھی۔ انہیں ڈاکٹر زویا کے اندازوں کی درستی پر یقین آتا جا رہا تھا۔

وہ باقی لوگوں کی موجودگی کو خاطر میں لائے بغیر ٹکٹکی باندھے انتہائی عقیدت سے انہیں دیکھنے میں محو تھی۔ اس کی محویت کو جونیئر ڈاکٹرز نے بطور خاص نوٹ کیا تھا اور دانستہ گلا کھنکھار کر ایک دوسرے کو بڑا بامعنی سا اشارہ بھی کیا تھا۔ ان کی آپس کی اس آنکھوں کی گفتگو کو جمیلہ مائی نے محسوس کر کے کوفت سے پہلو بدلا تھا۔

"پھر میں آپ کا نام لکھوا دوں نا؟" ڈاکٹر خاور کی ساری توجہ اس کی فائل کی طرف تھی جس میں تازہ ترین ٹیسٹ کی رپورٹس موجود تھیں۔

"رہنے دیں ڈاکٹر صاحب! یہ کملی کہاں ٹی وی شی وی میں نعتیں پڑھے گی۔ وہاں جا کر اس کے ہاتھ پیر پھول جائیں گے اور ایویں اپنا تماشا بنوا لے گی۔" جمیلہ مائی نے فوراً کہا اور دبے دبے انداز کے ساتھ سکینہ کو بھی مقابلے میں حصہ نہ لینے کا اشارہ کیا تھا۔

جسے سکینہ نے صاف نظرانداز کر کے خفگی سے پہلو بدلا تھا۔

"کیوں بھئی... یہ کیوں کنفیوژ ہو گی۔" ڈاکٹر خاور فائل سائیڈ میز پر رکھتے ہوئے مسکرائے۔

"ڈاکٹر صاحب اس کو اتنی عقل کہاں؟ اس نے اپنے پنڈ اور اسپتالوں کے علاوہ کون سی دنیا دیکھی ہے۔" جمیلہ مائی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اپنا موقف کس طرح سے بیان کرے۔

"ایسی بات تو نہ کریں۔ ماشاء اللہ سکینہ خاصی پُراعتماد لڑکی ہے۔ پھر میں خود ساتھ لے کر جاؤں گا اور پروگرام میں بھی شامل ہوں گا تو کیا مسئلہ ہے۔" ڈاکٹر خاور کی بات پر سکینہ کے چہرے پر خوشی کے بڑے بے ساختہ رنگ جھلکے تھے۔

جمیلہ مائی نے سخت پریشانی سے ڈاکٹر خاور کا سنجیدہ چہرہ دیکھا تھا، وہ کوشش کے باوجود بھی ایک لفظ بھی نہیں بول پائیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا وہ کس طرح اپنی نادان بیٹی کے ہاتھوں سے نکلتے دل کو سنبھالے۔

"اپنی اچھی سی تیاری رکھو، میں پروگرام کی باقی تفصیل پوچھ کر تمہیں بتادوں گا۔" ڈاکٹر خاور اپنی بات مکمل کر کے باہر نکلے تو جمیلہ مائی نے سخت ناراضی سے اپنی بیٹی کا پُرجوش چہرہ دیکھا تھا۔ جو اس کی ناراضی سے بے خبر کہہ رہی تھی۔

"اماں! مجھے ایک نیا جوڑا بنوا دے نا۔ وہاں ٹی وی کا پروگرام تو سارے پنڈ والے دیکھیں گے، میرے پاس تو ایک بھی ڈھنگ کا سوٹ نہیں۔"

"دیکھ سکینہ! تیری بیماری کی وجہ سے اپنا گھر بار چھوڑ کر سارے جہاں کے سامنے بیٹھنا ہماری مجبوری ہے۔ اللہ ایسی مجبوری کسی دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ اب تو اتنا نیک کام اتنے سارے نامحرموں کے سامنے کرنے جائے گی۔ تجھے پتا ہے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے تو عورت کی آواز کے پردے کا بھی حکم دیا ہے۔" جمیلہ مائی نے انتہائی رنجیدہ لہجے میں اپنی نادان بیٹی کو یاد دلایا تھا۔

"کیا ہے اماں! دنیا چاند پر چلی گئی ہے اور تو بتا نہ کون سے زمانے کی باتیں کر رہی ہے۔" سکینہ کے چہرے اور لہجے میں بے زاری ہی بے زاری تھی۔ جمیلہ مائی نے تاسف بھری نظروں سے اپنی اکلوتی اولاد کو دیکھا۔

"ماں ہونے کے ناتے تجھے سمجھانا مجھ پر فرض ہے۔" جمیلہ کا اطمینان قابل دید تھا۔

"کیوں، میں کوئی بے عقلی ہوں، میرا دماغ نہیں کیا؟" اُسے نہ جانے کیوں غصہ آرہا تھا۔

"اتنی عقل ہوتی تو ایسے کام ہی کیوں کرتی، اچھی خاصی سمجھ دار دھی تھی میری۔ اللہ جانے کس نحوست مارے کی نظر لگ گئی۔" اماں نے غصے میں اس کا کڑھائی والا فریم اٹھالیا۔

"اب اس رومال پر کیا پھول بوٹے کاڑھنے لگی ہو اماں!" سکینہ نے بے زاری سے اماں کے ہاتھ میں پکڑے فریم میں لگے آتشی گلابی کپڑے کو دیکھا۔

"یہ تیرے جہیز کے تکیے کاڑھ رہی ہوں۔"

"میرے جہیز کے؟" سکینہ کو دھچکا سا لگا، اس نے سخت حیرت سے اماں کو دیکھا۔ "میری کون سا باہر بارات کھڑی ہے اور مجھ سے کون شادی کرے گا؟" اس نے برا سا منہ بنا کر واضح بے زاری کا اظہار کیا۔

"اب نہیں ہو رہی تو کبھی نہ کبھی تو ہو گی پتر!" انتہائی متحمل انداز سے بولیں۔

"جانے دے اماں! مجھ کبڑی سے کون شادی کرے گا۔"

"تو، تو کون سا ساری زندگی ایسی رہے گی۔ مولا تجھے بہت جلد ٹھیک کر دے گا۔" جمیلہ مائی کے لہجے میں بھرپور یقین تھا۔

"اور اگر ٹھیک نہ کیا تو..." اس کی بات پر جمیلہ مائی کے چہرے پر ایک تاریک سا سایہ لہرایا مگر پھر سنبھل کر بولیں۔

"بھئی تیرا رشتہ جہاں طے ہے ان کو تیری بیماری سے کوئی مسئلہ نہیں۔"

"میرا رشتہ؟" سکینہ ششدر سی رہ گئی۔

"ہاں تیرا رشتہ' جو ہم نے تیرے پیدا ہونے سے پہلے ہی کردیا تھا۔"

"اماں! کیسی باتیں کررہی ہے؟" وہ بالکل ہی بوکھلا گئی تھی۔ اس کے لیے یہ بالکل انوکھی بات تھی۔

"ہاں نا' جاجی کے ساتھ۔" اماں منہ پھاڑ کر ہنسیں۔

"وہ ایویں تھوڑی بھاگ بھاگ کر تیرے ابا کے ساتھ یہاں آتا ہے۔" اماں نے اس کے سر پر بم ہی تو پھوڑا تھا۔ اس کا پورا وجود سناٹے میں آگیا تھا۔ اس نے پہلی دفعہ اماں کے منہ سے ایسی عجیب و غریب بات سنی تھی۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے انہیں دیکھتی رہ گئی۔



"آپ سوچ بھی نہیں سکتیں کہ میں کس اذیت میں مبتلا ہوں۔ میرے اندر تخلیق کا آتش فشاں سا ہے' لیکن میرے لفظ مجھ سے روٹھ گئے ہیں۔ میں ایک لفظ بھی نہیں لکھ سکتی۔" اس کی آواز پست ہوتے ہوتے بالکل مدھم ہوگئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے ٹپکتی وحشت سے ماہم نے بمشکل نظریں چرائی تھیں۔

"میں قلم اٹھا کر بس بے معنی سی لکیریں کھینچتی رہتی ہوں' میں لکھنا بھول گئی ہوں۔" اس کی آواز میں نمی بڑھ گئی۔

"آپ سوچ بھی نہیں سکتیں کہ کسی ادیب کے لیے کتنا کرب ناک مرحلہ ہوتا ہے جب سوچیں اور خیال دماغ میں اودھم مچا رہے ہوں اور قلم لکھنے سے انکاری ہوجائے۔

وہ شخص میرے دل و دماغ میں دھرنا ڈال کے بیٹھ گیا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ جیسے وہ میرے خون میں شامل ہوکر شریانوں میں دوڑنے لگا ہے۔ وہ میری آنکھ کی بستی میں کوئی نیا موسم اترنے نہیں دیتا۔" ماہم نے دیکھا' وہ اپنی آنکھیں ہتھیلی کی پشت سے صاف کررہی تھی۔

"میں اس کی قربت کے سنہرے موسموں کو محسوس کرسکتی ہوں۔ اس کی نرم انگلیوں کی پوروں کا لمس ابھی بھی میرے بالوں میں ہے۔ اس کی آنکھ میں لرزتے ہوئے اقرار کی لو کو میں دیکھ سکتی ہوں۔ وہ کہیں نہیں ہے' لیکن ہر جگہ ہے۔" ماہم کو لگا جیسے وہ نیند میں بول رہی ہو۔

"کہیں آپ کو بھی تو نہیں لگتا کہ میں پاگل ہورہی ہوں؟" اس نے سر اٹھا کر بڑا عجیب سا سوال کیا تھا۔

"مجھے ایسا کیوں لگے گا اور اس سے پہلے کس کو لگا ہے ایسا؟" ماہم کا انداز دوستانہ تھا۔

"میری بیسٹ فرینڈ انابیہ کو' وہ کہتی ہے میرا دماغ خراب ہوگیا ہے۔"

"ایسا نہیں ہے ثنائلہ! زندگی میں بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کی عقلی توجیہہ نہیں پیش کی جاسکتی ہے۔" ماہم نے میز پر رکھے اس کے سرد ہاتھوں کو اپنے گرم ہاتھوں کی حدت بخشی تو وہ چونک کر دیکھنے لگی۔

"آج کے دور میں حساسیت سب سے بڑی سزا ہے۔ حساس دل کے ساتھ زندگی بسر کرنا ننگے پاؤں شعلوں پر چلنے کے مترادف ہے۔" ماہم کے لہجے کی سنجیدگی ثنائلہ کے لیے اطمینان بخش تھی۔

"کیا تمہیں لگتا ہے کہ تم اپنے اس فرضی کردار سے محبت کرنے لگی ہو؟" ماہم نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"وہ فرضی کردار نہیں ہے۔ وہ میرے ذہن کی اختراع ضرور ہے' لیکن مجھے لگتا ہے کہ وہ حقیقت میں یہیں کہیں ہے۔" اس نے بڑی بے ساختگی سے اس کی بات کاٹ کر کہا تھا۔ ماہم اس کی بات پر مسکرائی۔

"تمہارا وجدان کیا کہتا ہے کہ کیا تم اسے پالوگی؟" ماہم نے دلچسپی سے پوچھا۔

"ہاں..." ثنائلہ نے اس کی آنکھوں میں براہ راست جھانکتے ہوئے پورے اعتماد کے ساتھ کہا۔ اس لیے کہ مجھے اپنے جذبے کی سچائی پر یقین ہے۔" ماہم نے بہت دلچسپی سے اپنے سامنے بیٹھی لڑکی کو دیکھا جو اسے تخیلاتی کہانیوں کا ہی ایک کردار لگ رہی تھی۔ اس نے پچھلے ایک گھنٹے میں اس کے کئی روپ دیکھے تھے۔ اسے مایوسیوں کی اتھاہ گہرائیوں میں گرتے دیکھا تھا' اسے یقین کی بلندیوں پر چڑھتے دیکھا تھا۔ اس کے لہجے کی سچائی کو بھانپا تھا اور اس کی آنکھوں سے جھلکتی محبت کو محسوس کیا تھا۔

"وش یو بیسٹ آف لک ثنائلہ زبیر!" ماہم نے اس کے سرد ہاتھ کو اپنی گرفت میں دباتے ہوئے دل کی گہرائیوں سے کہا تھا۔

"تھینک یو..." وہ کھل کر مسکرائی۔

یہ اس کا ثنائلہ کے ساتھ تیسرا سیشن تھا' لیکن اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ ابھی بہت سی گرہیں کھلنا باقی ہیں۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ انسان کا تخیل آخر کتنا طاقت ور ہے کہ اسے اپنے ذہن میں تخلیق کی ہوئی چیزیں مجسم صورت میں نظر آنے لگیں۔

اس نے کافی کا خالی کپ میز پر رکھ کر رامس علی کی فائل اٹھائی۔ اس کے ساتھ اس کا اگلا سیشن اگلے ہفتے تھا۔ وہ انٹرویو دے کر آچکا تھا۔ ماہم کو آخری فون پر ہونے والی گفتگو میں وہ کچھ الجھا سا لگا تھا۔ اس کے ڈراؤنے خوابوں کا سلسلہ ایک دفعہ پھر شروع ہوگیا تھا' جس کی وجہ سے وہ کافی پریشان تھا اور ماہم کو اندازہ تھا کہ اسے ابھی کافی سارے سیشنز کی ضرورت ہے۔

"میں تمہیں بہت زیادہ مس کرتا ہوں۔" اس کے آخری ٹیکسٹ پر ماہم کے دل کی دھڑکن نہ جانے کیوں بے ربط ہوئی تھی۔

"لگتا ہے کہ مجھے بھی عائشہ رحیم کے ساتھ ایک کڑا کے دار سیشن کی ضرورت ہے۔" اس سوچ کے ابھرتے ہی وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔ اسی لمحے اس کے سیل فون پر آنے والی کال نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کروادی۔ اس نے سر جھٹک کر ثنائلہ زبیر کی کال اٹینڈ کرنے کے لیے سبز بٹن دبایا۔

"ماہم میں نے ابھی ابھی اسے دیکھا ہے۔" دوسری جانب اس کی آواز میں خوشی کی وجہ سے کپکپاہٹ نمایاں تھی۔

"کسے دیکھا ہے؟" وہ حقیقتاً" کچھ لمحوں کے لیے اس کی بات بالکل بھی نہیں سمجھ پائی تھی۔

"سکندر شاہ کو..." وہ بہت تیز تیز اونچی آواز میں بول رہی تھی۔

"جی وہ بالکل وہی تھا۔ جناح سپر میں ہنڈا سوک گاڑی میں۔ وہ مجھ سے صرف چند گز کے فاصلے پر تھا۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر چونکا تھا۔"

وہ اسے نہ جانے کون سی کہانی سنا رہی تھی۔ ماہم اس کی آخری بات پر بری طرح چونکی۔ ثنائلہ کی سانسیں غیر ہموار تھیں اور وہ دائیں بائیں موجود لوگوں سے بے نیاز جوش جذبات سے چیخ رہی تھی۔

"مائی گاڈ! میں نے اسے ابھی ابھی یہاں دیکھا ہے۔" اس کا انداز ابھی بھی بے ربط سا تھا۔

"اب کہاں ہے وہ؟" ماہم نے اس کی بات کاٹ کر روانی سے پوچھا' لیکن دوسری جانب شاید نیٹ ورک کی خرابی کی وجہ سے کال کٹ گئی تھی۔ اس میں سے آنے والی ٹوں ٹوں کی آواز اس کے دماغ میں ہتھوڑے کی طرح برسی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

عاصمہ احمد علی

پاپا کی رانی ہوں

مارچ 1990ء
اسلام آباد
بہت پیارے پاپا!

آپ کیسے ہیں؟ آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ پاپا آپ مجھے بہت زیادہ یاد آتے ہیں اور میں بالکل ٹھیک نہیں ہوں۔ پاپا ہمارا گھر کیسا ہے؟ کون صفائی کرتا ہوگا؟ میرا جھولا اور میرا کمرا کیسا ہے؟ میرے ٹیڈی بیئرز اور ڈولز روتی ہوں گی۔ اگر آپ میرے روم میں جائیں گے تو میرا بیڈ' میری رائٹنگ ٹیبل' اسٹوری بکس' میری فیورٹ سنو وائٹ کا وال پیپر' سب آپ کو بہت بہت تنگ کریں گے اور پوچھیں گے کہ ککی کہاں ہے؟ اس کو لے آو۔ ہم اداس ہیں۔ مجھے پتا ہے ناں! کیوں میں بھی بہت اداس ہوں۔

پاپا! آپ آکر مجھے لے جائیں۔ بلکہ مما' حارث اور فارس کو بھی زبردستی لے جائیں۔ حارث تو ابھی ذرا چھوٹا ہے۔ پاپا جی! جب میں آپ کو یاد کرتی ہوں تو نانو مجھے اتنی زور سے ڈانٹتی ہیں کہ مجھے اور زیادہ رونا آجاتا ہے۔ مما روتی رہتی ہیں تو پھر نانو چلا کر کہتی ہیں کہ "دفع کرو! اس منحوس لڑکی کو اس کے باپ کے پاس۔" پاپا! یہ منحوس کا مطلب کیا ہے؟

پر میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مما کے بغیر میں آپ کے پاس کیسے رہوں گی؟

پیارے پاپا! آپ کے پیروں کی مالش اب کون کرتا ہے؟ آپ کے سر میں درد ہوتا ہے تو انگلیاں' کون پھیرتا ہوگا؟ آپ کو نیند نہیں آتی ہوگی ناں..... مجھے بھی نہیں آتی۔ بہت ڈر لگتا ہے۔ پاپا! آپ کیوں نہیں آتے لینے؟ میرا جی چاہتا ہے میں اڑ کے آؤں اور آپ کے بازوؤں میں چھپ جاؤں۔ سب لوگ پیار کرتے ہیں۔ ماموں' مامی جان اور نائمہ آپا۔ مگر آپ جیسا کوئی نہیں۔

میرا نیکسٹ سیشن اسٹارٹ ہو رہا ہے۔ مما مجھے یہاں کے اسکول میں میرا ایڈمیشن کروا دیں گی۔ پاپا! مجھے اپنے پرانے اسکول میں ہی پڑھنا ہے۔ میری سب فرینڈز مجھے بہت یاد آتی ہیں۔ پلیز پاپا! ہمیں لینے آئیں ناں' پلیز پاپا۔

آپ کی لاڈلی
ککی

☼ ☼ ☼

جون 1995ء
پیارے پاپا جانو!

پاپا جی! آپ کیسے ہیں؟ آپ کی ککی ٹھیک ہے مگر بہت اداس ہے۔ پاپا میں نے آپ کو کتنے ہی خط لکھے کہ آپ ہمیں لینے آئیں مگر آپ نہیں آتے اب میں آپ سے نہیں کہوں گی۔ آج اتنے ڈھیروں دنوں بعد آپ کو پھر خط لکھنے کا دل چاہا.... اس کے باوجود کہ پچھلے خطوط کا نہ آپ نے جواب دیا۔ نہ ہی مجھے لینے آئے۔ آپ کو شاید میری خفگی کی بھی پروا نہیں ہوگی۔ کوئی بات نہیں۔

ماموں جان' جب نائمہ آپا کو پیار کرتے ہیں تو میرا دھیان خود ہی آپ کی طرف چلا جاتا ہے.... نہ چاہتے ہوئے بھی۔

مما کہتی ہیں کہ میں اب بڑی ہوگئی ہوں مجھے سمجھ دار ہو جانا چاہیے۔ انہیں مجھ سے بہت سی پرابلمز رہتی ہیں۔ مگر میں کیا کروں؟ میں تو بڑی ہوگئی۔ مگر میرا بچپن وہیں کہیں پرانے گھر میں پڑا رہ گیا ہے۔ آدھی ککی کیا بڑی ہوتی؟ آپ کو پتا ہے' میں نے سب کو ککی کہنے سے منع کر دیا ہے۔ ککی تو صرف مجھے آپ کے منہ سے سننا پسند تھا۔ اب میں فقط فضہ ہوں۔ سنجیدہ' کم گو' ہونق اور بے وقوف سی۔

جب آپ نے صحن بناتے ہوئے بوگن ویلیا کی بیل توڑی تھی تو میں بہت روئی تھی۔ اس بیل کی اور میری بچپن کی دوستی تھی۔ گرما کی کتنی ہی دوپہریں میں نے اس بیل کے نیچے گڑیا گھر سجاتے گزاری تھیں اور صحن کو پکا کراتے ہوئے بے دردی سے آپ نے اس بیل کو اتار پھینکا تھا۔ انسان کی یہ کیا فطرت ہے پاپا! کہ جو چیز یوز لیس ہو جائے' وہ اس کو بے دردی اور بے

رحمی سے پھینک دیتا ہے۔ پاپا! کیا میری ویلیو بوگن ویلیا کی اس بیل سے بھی کم تھی؟ مسلے' روندے وہ پھول اور ککی کتنے ملتے ہیں ناں۔ دیواریں بنانے سے پہلے غریب پھولوں کو بتانا تو چاہیے ناں؟

اچھا! اب خدا حافظ

آپ کی
ککی

☼ ☼ ☼

نومبر 1998ء

جان سے پیارے پاپا!

آداب!

پاپا! آپ کیسے ہیں؟ سردیاں اسٹارٹ ہو رہی ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ سردیوں میں آپ کو بہت جلدی فلو اور سردی کا مسئلہ ہو جاتا ہے۔ کیا اب بھی آپ صبح صبح بستر سے اٹھ کر صحن میں نکل آتے ہیں اور اکثر ننگے پاؤں ٹھنڈے فرش پر چلتے ہیں؟ کیا کوئی آپ کی چپل لیے پیچھے آتا ہو گا؟

پاپا! پچھلے آٹھ سالوں سے مسلسل آپ کو خط لکھ رہی ہوں۔ آپ کے جواب نہ دینے کے باوجود۔ کچھ عرصہ تو آپ فون پر بات کرتے رہے۔ اب پچھلے ایک سال سے فون کا رابطہ بھی ختم ہے۔

مجھے امید ہے کہ آپ کی صحت ٹھیک ہو گی۔ کیونکہ وہ خاتون جو اب آپ کی مسز ہیں۔ آپ کا خیال ضرور رکھتی ہوں گی۔

آپ کو بتانے کا کیا فائدہ' آج کل مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ مما کی صحت بہت گر گئی ہے۔ نانو بھی..... مما اور مجھے تنہا چھوڑ کر اللہ میاں کے پاس چلی گئی ہیں۔ ان کے بعد سے مما بہت کمزور اور دکھی ہو گئی ہیں۔ آپ کو پتا ہے' کوئی بھی آپ کے لیے اچھے الفاظ استعمال نہیں کرتا۔ سمجھ میں نہیں آتا پاپا! کہ دوسری شادی جرم تو نہیں تھی جو آپ نے کیا' مگر کیا کوئی اپنے بیوی اور بچوں کو اپنی زندگی سے یوں نکال پھینکتا ہے جیسے کوئی..... بڑی مہارت سے گلے سڑے ہوئے حصے کو' کسی پھل سے الگ دے۔ آپ نے ہمیں پھینک دیا۔ کیسا لگتا ہے کہ جب چلتے چلتے' کوئی رستہ بدل جائے اور آپ بے بسی سے دیکھتے رہ جائیں۔

کبھی زندگی کی شاہراہ پر باپ بھی رستہ بدلا کرتے ہیں کیا؟

مجھے نہیں پتا کہ آپ میں اور مما میں ایسا کیا غلط اور صحیح ہے۔ میں کیا کہوں مگر آپ نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ مما نے میری شادی طے کر دی ہے۔ آپ کو انہوں نے فون کیا تھا ناں؟ کیا آپ میری شادی پر آئیں گے؟ کتنا مزاحیہ سوال ہے' جو ایک بیٹی اپنے سگے باپ سے پوچھ رہی ہے۔ مجھے آپ کی ضرورت ہے۔ پہلے سے بہت زیادہ..... کاش! آپ کو احساس ہو.....

آپ کی لاڈلی (ہوا کرتی تھی)

بہت اداس
ککی

☼ ☼ ☼

اپریل 2003ء

پیارے پاپا!

امید کرتی ہوں کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ اللہ پاک آپ کو صحت اور لمبی عمر عطا فرمائے۔ آمین۔

پاپا جی! آپ سے پچھلے ماہ فون پر بات ہوئی۔ آپ کی آواز بہت کمزور سی لگی۔ آپ ٹھیک تو ہیں ناں؟ پاپا! آپ جب میری شادی کے بعد مجھ سے ملنے آئے تو کتنے کمزور سے لگے تھے مجھے۔ آپ کو پتا ہے کہ ممی کے بعد اب آپ کی ککی کتنی اکیلی ہو گئی ہے۔ مگر آپ کو کیسے پتا ہو سکتا ہے؟ پاپا تو پہلے ہی پاس نہیں تھے اور اب ممی بھی نہیں رہیں..... ککی کو تو جینا اچھا ہی نہیں لگ رہا۔ اگر عبید نہ ہوتے اور آپ کا تو اسانہ ہوتا تو شاید مر ہی جاتی..... پر جینے کا بہانہ ہوا۔

اب پتا چلا کہ ممی کو میری شادی کی اتنی جلدی کیوں تھی۔ ان کو اپنے ابدی سفر پر جانا تھا۔ میری ماں بہت جلدی مر گئیں پاپا! انہوں نے دکھوں سے ہار مان لی۔ میری صابر اور بہت سادہ ماں..... مما کے بعد اگر آپ پاس ہوتے تو یہ دل اتنی اذیت نہ اٹھاتا۔ شاید حوصلوں کی ڈور مضبوط ہو جاتی۔ آپ دونوں نے اپنی بیٹی کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ تنہا کر دیا مجھے۔ میری کوئی بہن ہوتی تو اس کے گلے لگ کر رو ہی لیتی۔ حارث اور فارس کا تو آپ کو پتا ہی ہے۔ حارث پہلے ہی دبئی میں سیٹل ہے اور فارس بھی چند دنوں میں چلا جائے گا۔ میں' میں کیا کروں پاپا! پہلے مجھے آپ بہت یاد آتے تھے اب مجھے مما بہت یاد آتی ہیں۔ جب وہ اسپتال میں تھیں۔ جب وہ کوما میں گئیں۔ ان کی ہر اذیت میں نے اپنی سانس میں محسوس کی ہے۔ پاپا! کاش آپ وہ وقت دیکھ پاتے' جب آپ کی ککی تنہا آئی۔ سی۔ یو میں اپنی ماں کے سرہانے کھڑی مانیٹر پر ان کی ڈوبتی نبض دیکھ رہی تھی۔ ان کی ہر سانس کم ہو رہی تھی اور میرا دل قطرہ قطرہ مر رہا تھا۔ ککی اندر سے مر گئی پاپا! ان کی اذیت کی تکلیف' ان کا سفر آخرت میرے حافظے سے نہیں جاتا پاپا! پر آپ کو کیا احساس؟

اگر آپ کو اپنے بچوں کے کرب کا' ان کے ادھورے پن کا احساس ہوتا تو آپ یہاں میرے پاس ہوتے۔ آپ کو کیا پتا کہ ہمیں اپنے دل کو خود ہی سمجھانا پڑتا ہے۔ اپنے آنسو خود ہی صاف کرنے پڑتے ہیں۔ وجود کے ریزے زخمی پوروں سے خود ہی سمیٹنا پڑتے ہیں۔

ہر روز اپنا تھکا ٹوٹا بدن خود ہی اٹھانا پڑتا ہے۔ کوئی ساتھ نہیں دیتا پاپا! کوئی ساتھ نہیں دیتا۔ حوصلہ بھی نہیں..... بعض دفعہ تو اپنا آپ بھی نہیں۔

آپ جیسے والدین اپنے بچوں سے اتنی امیدیں کیوں لگا لیتے ہیں..... اور رشتوں کے اس جنگل میں انہیں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیتے ہیں..... مجھے اب آپ سے مزید کوئی بات نہیں کرنی۔ آپ کی بیٹی نہیں میں۔

صرف اور صرف
ککی

☼ ☼ ☼

نومبر 2010ء

میرے پاپا!

آج کتنے عرصے بعد آپ سے مخاطب ہوں..... یاد نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے دنوں' مہینوں اور سالوں کا حساب رکھنا ہی چھوڑ دیا ہے۔

سب دن ایک جیسے ہیں۔ بے کیف' روکھے پھیکے اور بے مقصد۔ سنا تھا کبھی کہ بیٹیاں ماؤں کے نصیب لے کر پیدا ہوتی ہیں تو پھر میرا نصیب میری ماں سے جدا کیسے ہو..... اچھے ہیں عبید۔ بہت اچھے ہیں۔ سب لوگ یہاں بہت اچھے ہیں۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ میں ہی شاید ان سب اچھے لوگوں کے قابل نہیں ہوں..... مجھے خود میں ہزار ہا خامیاں نظر آتی ہیں۔ عبید بالکل ٹھیک کرتے ہیں میرے ساتھ..... اور ٹھیک کہتی ہیں ممانی جان مگر میرا بھی کیا قصور؟ میں جان کر غلطیاں نہیں کرتی۔ مجھ سے ہو جاتی ہیں۔ مجھ سے کوئی خوش نہیں رہتا۔

پاپا! آپ نے کبھی سوچا کہ ایک آپ کے نہ ہونے سے آپ کے بچوں نے کہاں کہاں خسارہ اٹھایا؟

ہر ایک نے جی بھر کر لوٹا ہے' زندگی' زندگی نہیں کوئی آزار بن گئی ہے۔

وہ بیٹیاں سسرال میں کبھی سر اٹھا کر نہیں جی سکتیں جن کے باپ ان کو کبھی عیدی دینے نہ آئیں۔

وہ بیٹیاں دل سے کیسے خوش ہوں گی' جن کے باپ کسی تہوار پر ان کو فون تک نہ کریں۔

وہ بیٹیاں عزت کی مستحق کیسے ہو سکتی ہیں' جن کے باپ جیتے جی ان کو یتیم کر جائیں۔

کبھی سوچا بھی نہیں تھا پاپا! کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا۔ سر پہ سائبان نہ ہو تو دھوپ تو جلاتی ہی ہے ناں؟

کہاں کہاں کیسی کیسی حسرتیں جمع ہو جاتی ہیں۔ بین کرتیں..... شور مچاتیں۔ کوئی اونچا بولے تو دل سہم جاتا ہے۔

کوئی زور سے پکارنے تو دھڑک جاتا ہے۔

کوئی زیادتی کر جائے' سہنا پڑتی ہے۔
کوئی چٹکی بھرے تو آنسو پینے پڑتے ہیں۔
کیونکہ وہ کاندھا کہاں ہے' جس پر سر رکھ کر چیخ چیخ کر رویا جائے؟ کیونکہ وہ سینہ کہاں ہے جس پر سر رکھ آنسو بہا دیئے جائیں؟ بہت سے آنسو۔۔۔ سارے ہی آنسو۔

اور اندر قطرہ قطرہ گرتے آنسو سینہ گلا دیتے ہیں بابا! دل کو زنگ لگا دیتے ہیں۔ کوئی مہربان آغوش وا نہیں ہوتی بابا!
کاش! آپ کو پتا ہوتا۔
کاش! آپ جان سکتے کاش! بابا۔۔۔ کاش۔۔۔

☼ ☼ ☼

"ارے عبید!" بالکل میرے ہی نام کی پکار پڑی تھی۔
"میاں! کدھر نکل لیے صبح ہی صبح؟" امی جان کی کراری آواز سے میں گہرا سانس لے کر واپس ہوا تھا۔
"ایک اتوار کا دن آتا ہے کہ وہ بھی تم گھومنے پھرنے میں نکال دو"۔
"کچھ نہیں امی جان! یونہی ذرا ٹہلنے کو نکلا تھا۔ آپ کہیے! کچھ کام ہے۔" میں بڑی فرماں برداری سے کہتا ان کے تخت پر آبیٹھا۔
"پتا بھی ہے کہ نائمہ آرہی ہے۔ پھر پورے ایک ہفتے کے بعد یہ اتوار آتا ہے۔ ماں کے پاس بیٹھو' کوئی دکھ کوئی سکھ بانٹو۔۔۔ میاں ہمارے دور اور تھے۔ آج کل کے بچوں کو کہاں پروا۔"
امی جان جان حسب عادت خفا تھیں۔ مجھے ہنسی آگئی۔ ان کے پاس ہی میں پاؤں اوپر کر کے بیٹھ گیا۔
"بس بیٹھ گیا۔ اب سارا دن تمہیں آپ کے پاس ہوں۔ ٹھیک ہے؟"
"ارے رہنے دو میاں یہ چونچلے' کہہ کرائی تو کیا کرائی؟"
میں سر پر ہاتھ پھیر کے رہ گیا۔ میری امی جان ایسی ہی تھیں۔ کسی بھی طور کم ہی راضی ہونے والی۔ دو بچوں کا باپ تھا میں۔ مگر ذرا جو لحاظ کرتی ہوں۔ تب ہی چائے کی ٹرے لیے میری پیاری سی زوجہ کی آمد ہوئی۔
"یہ لیجیے ممانی جان! چائے۔"
امی اور میرا کپ تخت پوش پر رکھ کر وہ ابا کو چائے دینے چلی گئی۔ جو ذرا دور اپنی پسندیدہ آرام کرسی پر بیٹھے خبریں دیکھ اور سن رہے تھے۔ ایک ہاتھ میں ریموٹ اور دوسرے میں اخبار تھا۔ فضہ نے ان کا چشمہ اتارا' اخبار تہہ کیا اور چائے کی پیالی ہاتھ میں دے دی۔
"جزاک اللہ بیٹا! جیتی رہو۔" ابا نے چائے پکڑ کر دعاؤں سے نوازا پھر امی جان کے پاس چلی آئی اور مسکرا کر بولی۔
"ممانی جان! کھانا تیار ہے۔ میں بس ذرا بچوں کو نہلا دھلا دوں اور خود بھی فریش ہو کر آتی ہوں تو پھر ٹیبل سیٹ کرتی ہوں۔"
"ہاں ہاں بھئی! ٹھیک ہے۔ یہ بڑے میاں سے کہو ٹی وی کی آواز کم کریں۔ توبہ ہے بھئی! خبریں گھول کر پئیں گے۔ ہاں میں یہ کہہ رہی تھی کہ فضہ بہو! میٹھے میں پھر کیا بنایا ہے؟ میں نے کل کھویا وغیرہ منگوایا تھا تو حلوہ بنایا ہے۔"
"جی ممانی جان! میں نے میٹھے میں گاجر کا حلوہ تو سب سے پہلے صبح اٹھتے کے ساتھ ہی بنا لیا تھا۔ اور باقی تھوڑا دودھ پڑا تھا تو میں نے بچوں کے لیے فروٹ کسٹرڈ بھی تیار کر لیا۔ شوق سے کھاتے ہیں ناں بچے۔"
"چلو شاباش! یہ تو بڑا اچھا کیا تم نے۔" شکر ہے امی جان کچھ خوش تو نظر آئیں "اور بادام اوپر ڈالنے کے لیے بھگو دیے ہوں تو مجھے دو۔ میں چھیل دوں"۔
یہ میرے' بہت پیارے پر سکون گھر کی ایک دوپہر ہے۔ اوائل دسمبر کی خوبصورت سی دوپہر۔ حرارت بخش سی دھوپ صحن میں پھیلی ہے۔ میرے ماں اور باپ پر سکون ہیں۔۔۔ اور میرے بے حد پیارے' اس گھر کی رونق' دونوں بچے' میری لاڈلی زینیا اور اماں کا لاڈلا پوتا عبدالہادی۔
اور پھر کی طرح گھومتی' خوش اطوار' خوش گفتار اور خوش لباس' میری زندگی کے آسمان کا ماہ کامل' میری

بیگم' میری زوجہ محترمہ فضہ عبید احسن۔ ہاتھوں میں تھمے چائے کے کپ ختم ہوتے ہوتے امی جان مجھے سارے خاندان کی بہوؤں کے قصے گوش گزار کر چکی تھیں اور اب اپنی بہو کی تعریف میں مگن تھیں۔
فضہ نہا کر آئی تو ٹیبل سیٹ کرنے لگی۔ تھوڑی دیر میں نائمہ بھی ہمراہ اہل و عیال پہنچ گئی۔ خوش گوار ماحول میں ملنا ملانا ہوا اور پھر کھانا کھایا گیا۔ فضہ کی تعریفیں اب معمول بن گئی تھیں۔۔۔ وہ بہت اچھی کک ہی نہیں' اچھی آرگنائزر بھی تھی۔۔۔
میں خالد بھائی سے گپیں لڑانے لگا۔ ابا نماز پڑھنے کے لیے اٹھ گئے۔ نائمہ کی ساس اور اماں چونکہ بہنیں تھیں۔ لہٰذا بالکل ایک مزاج کی تھیں۔ ان کی باتوں کا لمبا سلسلہ تھا۔ نائمہ اپنے اور میرے بچوں کو دوسرے کمرے میں چھوڑ آئی۔۔۔۔ پھر فضہ کے ساتھ مل کر کچن سمٹوایا اور اب دونوں باتوں میں مگن تھیں۔
میں اور نائمہ دو ہی بہن بھائی تھے۔ باقی ماشاء اللہ خاندان بڑا تھا۔ ننھیال' ددھیال والوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ پر فضہ کو میں نے کبھی موڈ خراب کرتے یا غصہ کرتے نہیں دیکھا تھا۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ میں عام سا روایتی شوہر ہوں مگر میری بیوی بہت خاص عورت ہے۔
اکلوتا بیٹا ہونے کی وجہ سے میں غصیلا اور نخریلا تو تھا ہی۔ پھر باہر سے پڑھ کر آیا تو اماں نے بالکل ہی سر پر بٹھا لیا۔ فضہ سے شادی کے بعد تو میں بالکل ہی نیم چڑھا کریلا بن گیا تھا۔ مجھے اعتراف ہے کہ شادی کے شروع کے چند سال میں نے اور اماں نے فضہ کی زندگی حرام کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔۔۔ وہ میری پھپھو زاد تھی۔ پھپھو اور پھوپھا کی کیوں نہیں بنی؟ مجھے آج بھی صحیح بات پتا نہیں۔۔۔ بس یہی باتیں کہ دوسری عورت' دوسری شادی' غلطی کس کی؟ جتنے منہ اتنی باتیں۔
شائستہ پھپھو شاید سادہ تھیں جبکہ پھوپھا بہت رنگین مزاج اور ہینڈسم۔۔۔ پتا نہیں اصل بات کیا تھی؟ امی جان فضہ سے میری شادی کرنے پر راضی نہ

تھیں۔ مگر ابا اپنی اماں اور بہن کو زبان دے چکے تھے۔ پھر ابا کی محبت اور خود فضہ کی تابعداری نے اماں کا دل جیت لیا اور میرا بھی۔۔۔ بقول امی جان' زن مرید ہوگیا۔ نجانے اس کے اندر کی سادگی اور اچھائی تھی یا اس کا پرفسوں لہجہ اور پروقار انداز۔

اداسی جیسے آنکھوں میں آٹھہری ہو۔ کچھ خاص کشش تھی۔ جس نے عبید احسن کا دل مٹھی میں کر چھوڑا تھا۔ نجانے کیسی کیمسٹری تھی محبت کی رگوں میں خون بن کر بہنے لگی تھی۔

"ارے بہو!" خاموشی کو عابدہ خالہ کی آواز نے توڑا۔

"یہ فضہ بھی کچھ بولنا سیکھی ہے یا ابھی تک منہ سیئے پھرتی ہے؟"

"ارے تو آپا! اچھا ہی ہے ناں" امی جان ہنس کر بولیں۔

"ارے بابا! ہمیں تو ایسا بندہ گھنا میسنا لگتا ہے۔ ہمارے جو دل میں' وہی زبان پر۔"

"اچھا فضہ بہو! یہاں آؤ' میرے پاس بیٹھو۔" میرے دماغ میں گھنٹی بجی۔ مگر میں کیا کر سکتا تھا۔ بے بسی سے دیکھتا رہا۔

"اے یہ بتاؤ! تمہارے باوا کا کوئی اتا پتا؟ ارے کتنی جلدی چلی گئی شائستہ۔ کتنے سال ہوگئے ؟"

چائے سرو کرتی فضہ کے ہاتھ ست پڑ گئے۔ پھیکی سی مسکراہٹ سے اس نے خالہ کو جواب دیا۔

"جی! اس سال پورے پانچ سال ہو جائیں گے۔"

"ہاں بھئی! جانے والوں کی یادیں ہی رہ جاتی ہیں۔ وقت کا کام گزرنا ہے' سو گزر جاتا ہے۔" وہ قلق سے بولیں۔ اب انہوں نے فضہ کو ہاتھ پکڑ کر بٹھا لیا تھا۔

"ارے! یہ بتاؤ' تمہارے باوا کی کوئی خیر خبر! میں تو خدا لگتی کہوں کہ ایسے مردود سے رابطہ بھی کیا رکھنا۔ ارے! بیوی کو بچوں کی خبر نہ لی۔ معصوموں کو گھر سے بے گھر کیا۔ بے حیا عورت کو سوکن بنا لایا۔۔۔ پھر کوئی حق نہ ادا کیا۔۔۔ ایسے باپ سے تو باپ کا نہ ہونا اچھا۔" خالہ نے پوری تقریر کر ڈالی۔

میں گہری سانس بھر کر رہ گیا۔ نجانے دوسروں کے زخموں پر نمک چھڑک کر ہمیں کیا ملتا ہے۔ میں نے تاسف سے فضہ کے دھواں دھواں چہرے کو دیکھا۔

"جی نہیں خالہ! کوئی رابطہ نہیں ہمارا ان سے۔"

اس کا لہجہ سپاٹ تھا مگر اندر درد کی کرچیاں کیسے پھیل گئی تھیں میں جانتا تھا۔

"ارے! ایسے مردود' نامراد نہ دیکھے' نہ سنے۔ سارا خاندان ہی کمینوں کا تھا۔ چلو! باپ کے بعد پھوپھیاں' چچا کسی نے خبر نہ لی۔ اور یہ فضہ کے بچے ہوئے۔ مگر نہ نصیب ہوا ان کو ننھیال کا پیار۔ ماموں بھی باہر جا کر بیٹھ گئے۔ حق ہاہ! بے فیض ہے یہ سارا ہی خاندان۔"

عابدہ خالہ حسب دستور' حسب مقدور' لتے لیتی رہیں۔ امی اور نائمہ بھی بیچ میں لقمے دے دیتیں۔ شام کو ڈھلنا تھا۔ ڈھل گئی باتوں میں اور دن تمام ہوا۔ تھکا دینے والا دن۔ نائمہ کا جلد آنے کا وعدہ لے کر امی نے خدا حافظ کہا۔

میں کمرے میں آیا تو فضہ بچوں کو سلا کر بیڈ پر بیٹھی تھی۔ کھوئی کھوئی سی۔

"فضہ"۔ میں نے پیار سے پکارا تھا۔ "تھک گئی ہو جانو! اب سو جاؤ۔"

"جی! بس آج ذرا تھکاوٹ تو ہے۔ پر اتنی نہیں۔ میں نماز ۔۔۔ پڑھ لوں۔" وہ آہستگی سے کہہ کر اٹھی اور واش روم کی طرف بڑھ گئی۔ میں لیٹا کچھ دیر تو ٹی وی دیکھتا رہا۔۔۔ بے مقصد ہی۔ میں نے کہا تھا ناں کہ میں کوئی بہت اچھا شوہر نہیں تھا۔ ابا کے کہنے پر میں اور امی راضی تو ہوگئے۔ مگر میں نے دل سے فضہ کو وہ مقام نہ دیا تھا۔۔۔ اور پھر مستزاد امی کا بار بار میرا دھیان اس کی لاپرواہیوں' بلکہ بے وقوفیوں پر دلانا اور میں جو باہر سے آیا تھا۔ اس کے بھولپن' کم عمری اور نادان طبیعت سے عاجز آگیا۔ ایک دن میں نے اس کی کسی غلطی پر دھاڑ کر کہا تھا۔ مجھے آج بھی اپنے الفاظ یاد ہیں۔

"جی چاہتا ہے کہ تمہیں فارغ کر دوں۔ یہ مسکین صورت میرے ہی لیے رہ گئی تھی۔ کس منحوس گھڑی میں نے ابا میاں کا کہا مان لیا۔ زندگی عذاب کر لی

اپنی۔"

یہ سوچے بغیر کہ میں ایک بیٹے کا باپ بن چکا تھا اور دوسرا آنے والا تھا۔ میں ایک معمولی سی بات کو مسئلہ بنا کر خوامخواہ فضہ پر برسے ہی چلا جا رہا تھا۔

"تم چلی کیوں نہیں جاتیں یہاں سے؟ میں ہی احمق ملا ہوں تمہیں؟ میں پوچھتا ہوں' کوئی ایک خوبی ہے تم میں؟ اوپر سے یہ آنسو بہا کر مجھے اور غصہ نہ دلاؤ۔"

نجانے فضہ کو کیا ہوا۔ وہ پانچ سال سے سن رہی تھی' آج جیسے تڑپ اٹھی۔ میرے قدموں میں ایک چیخ مار کر آن گری۔ اس نے میرے پاؤں تھام لیے۔

"عبید! آپ کو اللہ کا واسطہ۔ مجھے طلاق نہ دینا۔ مجھے گھر سے نہ نکالنا۔ میرا کوئی گھر نہیں۔ میں کہاں جاؤں گی؟ میں نے اللہ سے دعا کی تھی کہ وہ میرا نصیب میری ماں جیسا نہ لکھے۔ عبید! آپ دوسری شادی کرلیں۔ آپ جیسے رکھیں میں رہوں گی۔ مگر مجھے گھر سے نہ نکالیں پلیز۔۔۔ پلیز۔"

وہ کہتے کہتے بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ میں ششدر رہ گیا۔ اس دن مجھے اپنے آپ سے شرم آئی۔ چند دنوں بعد میں ایک بیٹی کا باپ بن گیا۔ ان ہی دنوں میرے ہاتھ فضہ کی وہ بلیو کلر کی فائل ملی۔ فائل پڑھ کر مجھ پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا۔

پھر میں نے خود کو بدل لیا۔ خود کو کہاں' میں نے صرف اپنا نظریہ بدلا تھا اور کسی کی تو دنیا ہی بدل گئی تھی۔ کچھ خاص محنت بھی نہیں کرنا پڑی تھی۔

فضہ میں کوئی کمی نہیں تھی۔ اگر کچھ معمولی سی بہتری کی ضرورت تھی بھی تو کوئی میرا احسان نہیں تھا۔ صرف میری توجہ' میرے تھوڑے بہت درگزر کرنے اور تھوڑی سی محبت کے بعد ایک بدلی ہوئی فضہ دنیا کے سامنے تھی۔ شوہر ہونے کے زعم میں' میں خود کو نجانے کیا سمجھ بیٹھا تھا۔ ننھی سی بیٹی کا باپ بنتے ہی "ککی" کی فائل میری آنکھوں کے آگے آگئی۔ کیا میں بھی اپنی بے حد' معصوم اور خوبصورت بیٹی کو' ننھی پری کو ایک اور ککی بنانے جا رہا تھا؟

میں نے باقاعدہ اپنی فضہ سے معافی مانگی اور خود سے عہد کیا کہ اب ان آنکھوں میں میری وجہ سے آنسو نہیں آئیں گے۔ کتنا عجیب ہے ناں؟ یہاں بھی اپنی ازلی خود غرضی ہی تھی۔ تھوڑی سی توجہ اور محبت دی تھی فضہ کو وہ پہلے تو حیران ہوئی۔

کبھی میں اس کی حیرانی پر شرمندہ ہوتا اور کبھی ڈھیٹ بن کر ہنس پڑتا۔۔۔ اور رفتہ رفتہ میرا گھر جنت نظیر بنتا چلا گیا۔ ابا کو بھی بڑا دکھ تھا بھانجی کی ناقدری کا۔۔۔ وہ بھی اب مجھ سے خوش ہوگئے تھے۔ دن رات ان کے لبوں پر میرے لیے دعائیں ہی دعائیں تھیں۔

میں نے اپنی محبت کے حصار میں فضہ کو لے لیا تھا۔۔۔ مگر پھر بھی کبھی کبھار چند لائنیں لکھتی وہ نظر آ ہی جاتی تھی۔

اور۔۔۔ آج صبح بھی فجر کے وقت میری آنکھ کھلی اور کروٹ بدلی۔ فضہ مجھے بے خبر سوتی نظر آئی۔

غالباً" وہ کافی دیر تک جاگتی رہی تھی۔ ورنہ نماز کے

وقت پر اٹھ جاتی تھی۔ میں نے بھی نہ جگایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ میری توقع کے عین مطابق تکیے کے نیچے سے جھانکتی وہ بلیو کلر کی فائل میرے سامنے تھی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس فائل کو باہر نکال لیا۔

اور آج بھی اس کی رنج میں ڈوبی ایک چٹھی میرے سامنے تھی۔

اپریل 2013ء

پیارے پاپا جانی!

اللہ آپ کو اپنی امان میں رکھے۔

میں ٹھیک ہوں۔۔۔ اللہ کا بہت احسان ہے۔ ماشاء اللہ دونوں بچے اور عبید بھی ٹھیک ہیں۔ پاپا! مجھے ہادی بالکل آپ کی طرح لگتا ہے۔ خاص طور پر اس کی آنکھیں اور بال۔۔۔ اور زینیا آپ کی نواسی وہ بالکل اپنے ددھیال پر ہے۔ اللہ کا شکر ہے پاپا! کہ عبید زینی کو بہت پیار کرتے ہیں۔ مگر پیار تو آپ بھی بہت کرتے تھے مجھے۔ حارث اور فارس سے کہیں زیادہ۔۔۔ پھر کہاں کیا ہوا تھا؟ پاپا! سب لوگ کہتے ہیں کہ آپ ایک برے انسان ہیں۔ مگر میرا دل کیوں نہیں مانتا۔ شاید عمر کی مزید منزلیں پار کر کے مان جائے۔۔۔ جب کچھ عقل آجائے۔ پتا ہے پاپا! یہ جو دل ہے ناں، یہ بہت بری چیز ہے۔ یہ خود سے تاویلیں گھڑتا ہے اور مفروضے بناتا ہے۔ خود ہی الزام لگاتا ہے خود ہی بری کرتا ہے۔ آس لگاتا ہے اور منہ کی کھاتا ہے۔ عمریں رزق خاک ہو جاتی ہیں۔ اس کی آس ختم نہیں ہوتی۔

مگر اب اس دل کو درد راس آنے لگے ہیں۔ اب مجھے کسی سے کوئی آس نہیں ہے۔ دل کیا ٹھہر گیا کہ زمانہ ٹھہر گیا۔

مگر ایک بات ہے پاپا جانی! کہ اللہ تعالیٰ نے عبید جیسا ہم سفر دے کر میری جھولی بھر دی ہے۔۔۔ پاپا! جب آپ میرے پاس نہیں تھے، ماما بھی نہیں تھیں۔۔۔ میں اس قدر اکیلی اور اداس تھی۔ ککی اکیلی رہ گئی تھی۔۔۔ مجھ سے کچھ بھی ٹھیک سے نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو کبھی بھی تنہا نہیں کرتے۔۔۔ میں نے اللہ تعالیٰ سے کہا کہ آپ تو سب جانتے ہیں۔ سب دیکھتے ہیں۔ میرا کوئی نہیں۔ میرا وارث کوئی نہیں۔ میرے وارث تو آپ ہیں۔ میں نے خود کو آپ کو سونپا۔ وہ ولی ہے، وہ خبیر وہ سمیع الدعوات ہے۔ ہمیں اکیلا نہیں کرتا۔ وہ دعاؤں کی لاج رکھتا ہے۔

اور میرے رب نے میرے سجدوں کی لاج رکھ لی۔ میرا گھر بن گیا ہے۔ تھوڑی بہت محنت لگی ہے۔ مگر پاپا! عبید جیسے میرے لیے اللہ کا تحفہ ہیں۔ وہ میرے لیے کڑی دھوپ میں سائبان ہیں۔

ماموں جان کے بعد اپنائیت کا اس دنیا میں میرا احوال ہیں۔ انہوں نے میری تنہائی بانٹ لی۔ میرا کرب سمیٹ لیا۔۔۔ اور میرے دل کو جیسے ڈھارس مل گئی۔ ایسا ہم سفر، ایسا ساتھ مل جائے تو زندگی سے اور کیا چاہیے۔ کاش پاپا! آپ بھی میری ماما کے ایسے ہی ہم سفر ہوتے۔ آج ہم سب کے پیروں میں غموں کے کانٹے نہ چبھے ہوتے۔۔۔

جب لوگ مجھے آپ کے حوالے سے تکلیف دیتے ہیں تو میں جانتی ہوں کہ وہ بے چین ہو جاتے ہیں۔۔۔ ان کی آنکھوں میں مجھے اپنے لیے ایک خاموش تسلی آمیز پیغام دکھائی دیتا ہے۔ جس سے میرا دل ٹھہر جاتا ہے۔ زندگی آگے بڑھ گئی ہے۔ اب سب کچھ پہلے سے بہتر اور ٹھیک ہے۔ آپ اپنا خیال رکھا کریں۔ اس دنیا میں کوئی ہے، جو آپ کے لیے ابھی بھی دعا کرتا ہے۔

اچھا پاپا جی! اب میں بہت تھک گئی ہوں، سونا چاہتی ہوں۔۔۔ میرے لیے دعا کریں گے ناں! میں بھی آپ کے لیے بہت ساری دعائیں کرتی ہوں۔۔۔

آپ کی بیٹی

(ککی) فضہ عبید احسن

خط پڑھ کر میں نے احتیاط سے نیلی فائل میں واپس رکھ دیا۔ مگر میں جانتا تھا کہ اس فائل میں رکھے دیگر پرانے خطوط کی طرح اسے بھی کبھی پوسٹ نہیں ہونا تھا۔

☼

ناولٹ

راشدہ رفعت

محبت حاصلِ زیست

اور چھوٹی کوٹھی آکر اندازہ ہوا کہ یہاں بھی انسان بستے ہیں۔ وہی عام سے انسان، دو ہاتھوں، دو پاؤں، ایک ناک اور دو کانوں والے انسان۔ ہاں! قہقہے سب جناتی لگاتے تھے۔ وہ اتنی دیر سے سب کے بیچ میں بیٹھی اپنے ہی دھیان میں گم تھی۔ سب کیا باتیں کر رہے تھے۔ اسے قطعاً" کوئی سروکار نہ تھا۔ ہاں! جب اچانک کوئی بلند و بانگ قہقہہ لگاتا تو وہ ایک دم سے چونک جاتی بلکہ شاید ڈر جاتی کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ ابا میاں کے بعد اس کا دل بہت کمزور ہو گیا تھا۔ اس کی ہرنی جیسی آنکھوں میں وحشت نے مستقل ڈیرہ ڈال لیا تھا۔

خودکشی حرام نہ ہوتی تو شاید وہ کر چکی ہوتی، ورنہ ا
میاں کے بعد بھلا زندہ رہنے کا کیا جواز تھا۔ اب تو
صرف زندگی کے دن پورے کرنے تھے۔ لیکن آ
کے انسان کی اوسط عمر ساٹھ برس بھی فرض کر لی جا
تو ابھی تو اس کے مرنے میں بہتیرے سال پڑے تھے
ہاں! اگر کوئی اچانک حادثاتی موت یا کوئی۔۔۔

استغفر اللہ! یہ کوئی سوچنے کی باتیں تھیں۔ ابا میا
کی روح تک اس کی سوچوں کی رسائی ہو جاتی۔ تب
پھر سے مادی وجود میں آنے کو بے قرار ہو جاتی، نا



ابامیاں آکر اس کا بایاں کان مروڑ سکیں۔ لیکن ابامیاں نے کبھی اس کا کان مروڑا تو نہ تھا۔ وہ تو جب کبھی اس پر زیادہ خفا ہوتے تو اسے گھور کر دیکھتے اور پورے نام سے پکارتے۔

"ماہ نیم ماہ!" اور آگے وہ ایک لفظ نہ بولتے۔ بس! ان کے نام پکارنے کا انداز ہی ایسا تنبیہی ہوتا کہ وہ جھٹ سوری کر لیتی۔ ویسے وہ اسے "ماہے" پکارتے تھے۔ دوسرے لوگوں کو یہ نام سننے میں کچھ عجیب لگتا۔ لیکن اسے کسی دوسرے کی پسند' ناپسند سے کیا سروکار ہونا تھا۔ اس کی کل کائنات اپنے ابامیاں پر مشتمل تھی۔

ابامیاں اور ان کی ماہے' دونوں ایک دوسرے کے جینے کا جواز تھے۔ اب ابامیاں چلے گئے تھے اور وہ تھی۔ کیوں آخر کیوں' اس کی آنکھیں بظاہر خشک تھیں' مگر آنسو دل پر گر رہے تھے اور تب کنول شاد نے اسے مخاطب کیا۔

"آپ واقعی اتنی کم گو ہیں یا ہماری کمپنی انجوائے نہیں کر رہیں۔" اس سے فوری طور پر کوئی جواب نہ بن سکا اور فیروزہ اچھی کزن ہونے کے ناتے فوراً" اس کی مدد کو آئی۔

"ویسے تو ماہ نیم ماہ کم ہی بولتی ہے' لیکن اپنے فادر کے انتقال کے بعد اسے مستقل چپ ہی لگ گئی ہے۔ اسی لیے تو میں اسے لے آئی ہوں' تاکہ اس کا جی کچھ بہل جائے۔" فیروزہ نے تو مسکرا کر جملہ حاضرین کو بتایا تھا۔ لیکن سب لوگوں کی آنکھوں میں اپنے لیے ترحم آمیز جذبات اٹدتے دیکھ کر ماہ نیم ماہ کو ذرا اچھا محسوس نہ ہوا۔

"میں آپ لوگوں کی کمپنی انجوائے کر رہی ہوں' لیکن چونکہ ابھی یہاں نئی آئی ہوں' اس لیے آپ لوگوں کی فیملی سے اچھی طرح واقف نہیں۔ اسی لیے فیملی گوسپ میں حصہ نہیں لے سکتی۔ بس سننے پر اکتفا کر رہی ہوں۔"

اس نے قصداً" مسکراہٹ چہرے پر سجا کر جواب دیا تھا۔ اس کی مسکراہٹ بہت خوب صورت تھی۔ کنول شاد نے تو برملا تعریف بھی کر ڈالی۔

وہ چھوٹی کوٹھی کی مکین نہیں تھی' اس لیے اس کا ظرف بڑا تھا۔ باقی لڑکیاں اس کے حسن سے بے اطمینانی محسوس کر رہی تھیں۔ دل ہی دل میں انہیں فیروزہ پر غصہ بھی آ رہا تھا کہ وہ ماہ نیم ماہ کو آج ہی ان سے ملوانے کیوں لے آئی۔ آج جب منصور آفاق کی آمد متوقع تھی۔ حسن منصور آفاق کی کمزوری تھا اور چھوٹی کوٹھی میں موجود حسین ترین لڑکیاں منصور آفاق کو متاثر کرنے میں ہنوز ناکام ہوتی آ رہی تھیں۔

اک عرصے تک فیروزہ بھی منصور کے التفات کی منتظر رہی تھی۔ لیکن اس نے فیروزہ کو اچھی دوست کے سوا کچھ نہ سمجھا۔ آخر جب کھاتے پیتے زمیندار گھرانے سے تعلق رکھنے والے اجلال شاہ کا رشتہ فیروزہ کے لیے آیا' تب عقل کا دامن تھامتے ہوئے فیروزہ نے ہاں کر دی۔ منصور آفاق اس کی قسمت میں ہی نہ تھا۔ یہ حقیقت اسے بہت دیر میں سہی' مگر سمجھ میں آ ہی گئی تھی۔

"منصور کی فلائٹ تو کب کی لینڈ کر چکی ہوگی' پھر وہ اب تک پہنچا کیوں نہیں؟" آرزو نے اچانک سوال داغا تھا۔ وہ سوال جو بہت دیر سے سب کے دلوں میں تو تھا۔ مگر لبوں پر نہیں آ پا رہا تھا۔ وہ سب مصروف ترین لڑکیاں اگر آج نک سک سے تیار چھوٹی کوٹھی کے ہال کمرے میں موجود تھیں تو اس کی وجہ شاید نہیں' بلکہ یقیناً" یہ ہی تھی کہ آج منصور آفاق کو یہاں آنا تھا۔

ویسے تو وہ سیلانی آدمی تھا۔ اس کا کوئی ایک مستقل ٹھکانہ نہ تھا۔ پھر کاروبار کے سلسلے میں بھی اسے ملکوں ملکوں گھومنا ہوتا تھا۔ اس کی آمد ہمیشہ اچانک ہوتی تھی۔ لیکن اس بار وہ باقاعدہ اطلاع دے کر آ رہا تھا۔ اس نے چھوٹی کوٹھی کے مکینوں سے درخواست کی تھی کہ وہ عرصے سے بند پڑی بڑی کوٹھی کی اپنے ملازمین سے صفائی ستھرائی کروا دیں۔ اس کا ارادہ کچھ عرصے کے لیے وہاں قیام کا تھا۔

بڑی کوٹھی والوں کا وہ اکلوتا وارث تھا۔ تینوں بہنیں

شادی شدہ اور دنیا کے تین مختلف براعظموں میں رہائش رکھتی تھیں۔ ماں' باپ' بیٹیوں کے فرض سے سبکدوش ہو کر اکلوتے بیٹے کے سر پر سہرا سجانے کی آرزو دل میں لیے رخصت ہو گئے۔ ماں' باپ کی زندگی میں وہ پھر بھی گھر میں ٹک کر وقت گزار لیتا تھا۔ یہ وقت چھوٹی کوٹھی کی لڑکیوں کی زندگی کا سنہرا ترین وقت تھا۔ منصور کی اکثر شامیں یہیں گزرتیں۔

ابراہیم اور شاہ میر اس کے بہترین دوست تھے۔ لڑکیوں میں اس نے صرف فیروزہ کو دوستی کے قابل جانا تھا۔ فیروزہ خود چھوٹی کوٹھی کی مکین نہ تھی۔ اس کی ماں کا تعلق بلاشبہ یہیں سے تھا' لیکن مغل گھرانے کے سپوت سے محبت کی شادی کے بعد چھوٹی کوٹھی والوں کو ایک عرصے تک اپنی بیٹی سے رابطہ تک رکھنا گوارا نہ تھا۔

فیروزہ بڑی ہوئی تو اس نے کالج میں پڑھنے والی اپنی ماموں زاد بہنوں سے دوستی گانٹھی اور آہستہ آہستہ چھوٹی کوٹھی تک بھی رسائی حاصل کر لی۔ اسے اپنی ماں کے احمقانہ فیصلے پر خوب تاؤ چڑھتا تھا۔ کیسی شان دار زندگی پر لات مار کر وہ اس کے باپ کی زندگی میں شامل ہوئی تھی۔ اگرچہ فیروزہ کو باپ سے شدید محبت تھی۔ وہ تھے بھی محبت کے قابل' وجیہہ' نرم خو اور انتہائی بااخلاق شخص ان سے جو بھی — ایک بار مل لیتا ان کا گرویدہ ہو جاتا اور صالحہ تو چار سال ان کی کلاس فیلو رہی تھیں۔ ایسے پیارے شخص کی محبت میں گرفتار ہونا تو سمجھ میں آتا تھا' لیکن شادی کا فیصلہ تو خوب سوچ سمجھ کر ہی کرنا چاہیے تھا نا۔

فیروزہ کی ننھیال میں دولت کا کوئی شمار ہی نہ تھا اور ددھیال میں علم کو ہی دولت شمار کیا جاتا تھا۔ ادب کی دنیا میں اس کے دادا کا نام آج بھی بہت احترام سے لیا جاتا تھا۔ وہ صاحب طرز ادیب تھے۔ فیروزہ کے تایا یعنی ماہ نیم ماہ کے والد بھی بہت قابل اور پڑھے لکھے شخص تھے۔ وہ بطور سفارت کار بنگلہ دیش گئے تھے۔ مگر پھر وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ زیب النسا سے ایک اتفاقی ملاقات محبت اور پھر شادی کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

کچھ عرصے بعد جب پاکستان واپسی کے سرکاری احکام موصول ہوئے تو وہ عجیب دوراہے پر آ کھڑے ہوئے۔ زیب اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھیں۔ وہ اپنی بوڑھی ماں اور معذور باپ کو اکیلا چھوڑ کر دور دیس جانے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھیں۔ جہانگیر نے استعفا محکمے کو بھجوا دیا۔ بے تحاشا قابلیت رکھنے والے شخص کو بنگلہ دیشی حکومت نے درس و تدریس کے پیشے سے منسلک ہونے کی اجازت دے دی۔ وطن سے دوری اختیار کرنے کے فیصلے پر کبھی کبھار کسک دل میں جاگتی تھی۔ لیکن انہوں نے شادی سے پہلے تمام ممکنات پر غور کیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ محبتوں سے گندھی یہ لڑکی اپنے بوڑھے والدین کی آخری سانسوں تک خدمت کرے گی۔ وہ خود اس کے والدین کی دل و جان سے عزت کرتے تھے۔ پاکستان میں ان کے ماں' باپ منوں مٹی کی چادر اوڑھ چکے تھے۔ ایک چھوٹا بھائی تھا جو بلاشبہ انہیں بہت عزیز تھا۔ لیکن وہ ان کا فیصلہ بدلنے پر

قدرت نہ رکھتا تھا' سو وہ وہیں بس گئے۔ ماہ نیم ماہ ان کی اور زیب کی اکلوتی اولاد تھی۔

زیب کے والدین طبعی عمر پوری کر کے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ تب انہوں نے پہلی بار زیب سے پاکستان چل کر رہنے کا کہا۔ زیب راضی بھی ہو گئیں۔ مگر زندگی نے مہلت نہ دی۔ دونوں میاں' بیوی ماہ نیم ماہ کا ایک بھائی یا بہن لانے کے خواہش مند تھے۔ دوران زچگی زیب النساء زندگی کی بازی ہار گئیں۔

ماہ نیم ماہ کا بھائی بھی ماں کے بغیر دنیا میں جینے پر راضی نہ ہوا۔ ماں کے مرنے کے چند گھنٹوں بعد تو مولود بھی زندگی کی بازی ہار گیا۔ ماہ نیم ماہ اس وقت چھ سال کی تھی۔ جو غم اسے مل چکا تھا۔ اس کی شدت کا احساس اسے ابا میاں نے ہونے ہی نہ دیا۔ وہ اب اس کی ماں بھی تھے' باپ بھی اور دوست بھی۔ ماہ نیم ماہ بہت پیاری بچی تھی۔ اس نے تیکھے نقش اپنی ماں سے لیے تھے تو شہابی رنگت اپنے ابا میاں کی چرائی تھی۔ ابا میاں نے بہت پیار اور ناز و نعم سے اس کی پرورش کی تھی۔

محض اس کی خاطر انہوں نے پاکستان جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ وہ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ اجنبی جگہ اور لوگوں میں جا کر ماہ نیم ماہ کی شخصیت متاثر ہو۔ اس نے ماں کو تو کھو دیا تھا۔ وہ گھر جس میں اس نے آنکھیں کھولی تھیں۔ وہ اس سے کیسے چھین لیتے اور سچ تو یہ تھا کہ اس گھر کے در و دیوار سے ان کی زیب کی یادیں جڑی تھیں۔ دونوں باپ' بیٹی کے لیے وہ گھر محض سیمنٹ، بجری سے بنا گھر نہیں ایک عافیت کدہ تھا۔

برسوں پہلے انہوں نے ایک ہجرت کی تھی۔ اب دوبارہ ہجرت کرنا زیادہ مشکل امر تھا اور پھر زندگی ایک ڈھب پر گزرے جا رہی تھی۔ وہ اپنے فیصلے سے زندگی' میں کوئی ہلچل اور ارتعاش نہیں چاہتے تھے۔ پاکستان سے ایک بار چھوٹا بھائی اپنی بیوی کو ساتھ لے کر ان سے ملنے آیا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی بچی بھی تھی' جو ان کی ماہ نیم ماہ سے ایک دو برس بڑی ہی ہوگی۔ ایک بار وہ اپنی ماہ نیم ماہ کو لے کر پاکستان گئے تھے۔ وہ مٹی جس میں ان کے ماں' باپ دفن تھے۔ کبھی کبھار انہیں شرمندگی کا احساس بھی ہوتا۔ وہ کیسے بیٹے ثابت ہوئے تھے۔

مرحومہ بیوی کی قبر کو اکیلا چھوڑنے کی ہمت نہ پاتے تھے اور اپنے دیس میں دفن اپنے والدین کے لیے غائبانہ فاتحہ خوانی پر ہی اکتفا کر لیتے تھے۔ پھر خود کو تسلی دیتے کہ ان کا چھوٹا بھائی ماں' باپ کی قبروں کی دیکھ ریکھ کے لیے موجود ہے۔ وہاں زیب کا ان کے سوا کون تھا۔ وہ روزانہ ماہ نیم ماہ کی انگلی پکڑ کر بیوی کی قبر پر جا کر فاتحہ خوانی کرتے۔ بنگال کا جادو مرنے کے بعد بھی اثر انداز تھا۔

جب ماہ نیم ماہ بڑی ہوئی' تب اس نے باپ کی انگلی پکڑ کر گھومنا پھرنا ترک کر دیا۔ اس نے بہت چھوٹی عمر سے گھر کی ذمہ داریاں بطریق احسن نبھانا شروع کر دیں تھیں۔ ابا میاں کی خواہش بھی یہی تھی کہ جب وہ گھرداری سنبھالنے کے پوری طرح قابل ہو جائے' تب وہ اسے پیا دیس سدھار دیں۔

انٹر کے امتحان پاس کرنے کے بعد ابا کے قریبی دوست شمس الحسن صاحب کے بیٹے سے اس کی نسبت طے کر دی گئی۔ اس رشتے میں اس کے لیے اطمینان کا پہلو یہ تھا کہ شمس الحسن صاحب کا گھر ان کے گھر کے قریب ہی تھا۔ وہ شادی کے بعد بھی ابا میاں کا خیال رکھ سکتی تھی۔ اپنے منگیتر سے اس کا کوئی خاص دلی یا جذباتی لگاؤ نہ تھا۔ ہو سکتا ہے وہ آپس میں ملتے رہتے تو تعلق بھی پروان چڑھ جاتا تھا۔ لیکن موصوف پر اعلا تعلیم کے لیے بیرون ملک جانے کا شوق سوار ہو گیا اور آخر کار اس نے ماں' باپ سے اپنی ضد منوا لی۔

شمس الحسن چاہتے تھے کہ جانے سے پہلے بیٹے کے پاؤں میں نکاح کی بیڑیاں ڈال دیں' تاکہ وہ آزاد فضاؤں میں بگڑ نہ جائے۔ لیکن ابا میاں نے نکاح کو رخصتی کے ساتھ ہی مشروط رکھا اور وقت نے ثابت کیا کہ ان کا یہ فیصلہ دانش کے عین مطابق تھا۔ جس روز اس کی بی اے میں فرسٹ ڈویژن آئی' اسی روز شمس الحسن صاحب کا معذرتی فون آیا۔ ان کے بیٹے نے کسی گوری سے بیاہ رچا لیا تھا اور وہ مارے شرمندگی کے ابا میاں کا سامنا تک کرنے کی ہمت نہ پاتے تھے۔ اپنے شان دار رزلٹ کے خوشی منانے کی آرزو اپنی موت آپ مر گئی۔

اسے منگنی ٹوٹنے کا خاص صدمہ نہ ہوا۔ لیکن ابا میاں کے لیے یہ خبر بہت تکلیف دہ تھی۔ وہ جلد از جلد اس کے لیے کوئی دوسرا رشتہ ڈھونڈنا چاہتے تھے۔ انہیں اپنی زندگی سے متعلق بے اعتباری سی ہو گئی تھی۔ اسے ابا میاں کے خدشے بے بنیاد لگتے۔ ٹھیک ہے' ابا میاں پر بڑھاپا طاری ہونے لگا تھا۔ لیکن وہ چست' صحت مند اور بالکل چاق و چوبند لگتے تھے' پھر ان کا یہ فقرہ ماہ نیم ماہ کی سمجھ سے باہر تھا۔

"میں چاہتا ہوں ماہے! اپنی زندگی میں ہی تمہیں گھر بار کا کر دوں۔" ان کی ماہے اس بات پر ان سے الجھ ہی پڑتی۔ لیکن ابا میاں کا یہ خدشہ بھی حقیقت پر مبنی ثابت ہوا تھا۔ ان کا دل ایک ہلکا سا اٹیک بھی برداشت نہ کر پایا اور وہ اپنی زیب کے پہلو میں ابدی نیند سو گئے۔

ماہ نیم ماہ تو ہوش و حواس سے بے گانہ ہو گئی تھی۔ ابا میاں کے شاگردوں اور ان کے دوستوں نے انہیں ان کی آرام گاہ تک پہنچایا تھا۔ چچا جان' ابا میاں کے انتقال کے پورے دس دن بعد پہنچ پائے تھے۔ ماہ نیم ماہ جوان دس دنوں میں بمشکل سنبھل پائی تھی۔ چچا جان کے سینے سے لگ کر اس بری طرح روئی کہ اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ چچا جان کا تو خود صدمے سے برا حال تھا۔

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ بھائی جان یوں اچانک ہمیں چھوڑ کر کیسے جا سکتے ہیں... چاہے وہ مجھ سے ہزاروں میل دور تھے۔ لیکن میرے لیے چھتنار درخت کی مانند تھے۔ میں تو بالکل ہی بے سائبان ہو گیا ہوں بیٹا! سمجھو' دوسری بار یتیمی کا صدمہ سہنا پڑ گیا ہے۔"

سکندر واقعی بڑے بھائی سے والہانہ لگاؤ رکھتے تھے۔ دونوں بھائی بلاشبہ ایک دوسرے سے بہت دور رہتے تھے۔ لیکن ان کے دل ساتھ دھڑکتے تھے۔ باقاعدگی سے خط و کتابت ہوتی تھی۔ ٹیلی فون پر بھی دونوں کا مسلسل رابطہ رہتا تھا۔

"بھائی جان کی طبیعت خراب تھی تو تم نے مجھ سے پہلے ذکر کیوں نہ کیا بیٹا! وہ تو چلو ہمیشہ "سب اچھا کی" رپورٹ دیتے تھے' تم ہی کچھ بتا دیتیں۔ میں کم از کم ان کی زندگی میں ان سے ملنے تو پہنچ جاتا یا پھر ان کا آخری دیدار تو نصیب ہو جاتا۔ کاش! میرا وطن دولخت نہ ہوا ہوتا تو کاغذی کارروائیوں میں اتنی دیر تو نہ لگتی۔"

چچا جان اتنے برسوں بعد بھائی کی موت کے ساتھ ملک ٹوٹنے کا غم بھی منا رہے تھے۔ ماہ نیم ماہ تو بس ان کے سینے سے لپٹی ابا میاں جیسی خوشبو محسوس کیے جا رہی تھی۔

"میں تمہیں اپنے ساتھ پاکستان لے جاؤں گا بیٹا! تم اپنی تیاری مکمل کر لو۔" چچا جان نے اس کی پیشانی چومتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں مخاطب کیا۔ وہ جیسے کرنٹ کھا کر ان سے الگ ہوئی۔

"میں یہ گھر چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی چچا جان! اس گھر میں میرے ابا میاں کی یادیں بکھری پڑی ہیں۔" اس نے زور' زور سے نفی میں سر ہلایا۔

ان مانوس در و دیوار والے گھر کو چھوڑ کر جانے کا وہ سوچ بھی کیسے سکتی تھی۔ وہ گھر جہاں اس نے آنکھ کھولی۔ ماں کے ساتھ گزارا وقت تو دھندلی یاد بن گیا تھا۔ لیکن ابا میاں کی یاد تو اس گھر کے چپے چپے سے جڑی تھی۔ وہ اب بھی ابا میاں کی اسٹڈی میں جا کر ان کی کرسی کے سامنے آنکھیں بند کر کے کھڑی ہوتی تو سامنے ابا میاں کرسی پر آن موجود ہوتے۔ وہ اپنے آس پاس ان کی موجودگی محسوس کرتی تھی۔ ان سے باتیں کرتی تھی۔ ہاں! وہ پہلے کی طرح جواب نہ دیتے تھے۔ بس مسکرا کر اسے دیکھتے رہتے۔ ابا میاں کی مسہری پر ان کے تکیے پر سر رکھ کر وہ اب بھی ان کی خوشبو محسوس کرتی تھی اور چچا جان کہہ رہے تھے کہ وہ اسے اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ پہلی بار اسے ابا میاں سے بے پناہ مشابہت رکھنے والے چچا جان برے لگے

تھے۔

"دیکھو بیٹا! جو غلطی بھائی جان نے کی تھی' وہ میں تمہیں دہرانے نہیں دوں گا۔ بھائی جان پر تو میرا زور چل نہ سکتا تھا۔ انہوں نے ایک غلط فیصلہ کیا اور میں دل میں کڑھنے کے سوا کچھ نہ کر سکا۔ ورنہ زیب بھابھی کے بعد بھائی جان اور تمہارا یہاں رہنے کا کوئی جواز نہ تھا۔ بھائی جان نے سوچا کہ تم اس گھر سے انسیت رکھتی ہو۔ کہیں اور جا کر تم آسانی سے سیٹ نہیں ہو پاؤ گی۔ لیکن بیٹا! گھر در و دیوار سے نہیں' انسانوں سے بنتے ہیں۔ اس وقت اگر بھائی جان تمہیں لے کر پاکستان آجاتے تو چند دن تک تو تم یقیناً" ڈسٹرب رہتیں۔ مگر آہستہ آہستہ تمہیں نیا گھر ہی اپنا لگنے لگ جاتا۔ زیب بھابھی کے بعد بھائی جان کی زندگی کا خلا تو برقرار رہنا تھا۔ مگر تمہیں وہاں بہت سے رشتے مل جاتے۔ خیر اب بھی زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ پاکستان میں تمہارے بہن' بھائی تمہارے منتظر ہیں۔ میں دعوا تو نہیں کرتا' مگر اللہ سے یہ دعا ضرور کرتا ہوں کہ تمہیں میرے گھر میں کسی اجنبیت کا احساس نہ ہو۔"

چچا جان کا لہجہ اور انداز مشفقانہ سہی' مگر دو ٹوک بھی تھا۔ وہ تو بس متوحش نگاہوں سے انہیں دیکھے گئی۔

پاکستان سے اس کا کوئی خاص قلبی تعلق نہ تھا۔ ابا میاں جب اسے وہاں کے بارے میں بتاتے۔ تب وہ دلچسپی اور شوق سے انہیں سنتی۔ اسے پاکستان جا کر وہاں گھومنے پھرنے کا شوق ضرور تھا۔ بہت بچپن میں وہ ایک بار پاکستان ضرور گئی تھی۔ لیکن ہوش سنبھالنے کے بعد وہ کبھی پاکستان نہ جا سکی تھی۔ حالانکہ ابا میاں نے بہت بار پروگرام بنایا۔ لیکن کوئی نہ کوئی رکاوٹ آڑے آجاتی اور آخر ابا میاں یہ خواہش دل میں لیے دنیا سے ہی رخصت ہو گئے۔ محض گھومنے پھرنے کے لیے پاکستان جانے کی خواہش اور بات تھی۔ مگر ہمیشہ کے لیے اپنا وطن چھوڑ کر دوسرے دیس چلے جانا کب اتنا آسان تھا اور یہی بات اس نے چچا جان سے بھی کہہ ڈالی۔ مارے دکھ کے وہ چند لمحوں تک کچھ بول ہی نہ پائے۔

"پاکستان بھی تمہارا وطن ہے بیٹا!" انہوں نے اسے پیار سے سمجھانا چاہا۔

"پاکستان ابا میاں کا وطن ضرور ہو گا چچا جان! میری پیدائش سے برسوں پہلے ابا میاں کے وطن کے دو ٹکڑے ہو گئے تھے۔ ابا میاں دونوں ٹکڑوں کو اپنا وطن کہتے تھے۔ مگر میں نے جس خطہ زمین پر آنکھیں کھولیں' میرا وطن وہی ہے اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ میرے ماں' باپ یہاں کی مٹی میں دفن ہیں۔ میں یہاں سے کہیں نہیں جاؤں گی۔"

ہٹ دھرمی کبھی بھی اس کی شخصیت کا خاصہ نہ تھی۔ مگر وہ اس وقت اپنی ضد پر اڑی رہی۔ چچا جان اسے بے بسی سے دیکھ کر رہ گئے اور اس رات جب وہ سوئی تو ابا میاں کو خواب میں دیکھا۔ وہ اس سے بہت خفا لگ رہے تھے۔ اس نے روتے ہوئے ان سے ان کی خفگی کی وجہ پوچھی تو انہوں نے چچا جان کی طرف اشارہ کر کے کچھ کہا۔ بات اس کی سمجھ میں نہ آئی۔ اسی وقت اس کی آنکھ کھل گئی۔

جسم پسینے میں شرابور تھا۔ پتا نہیں' یہ دن میں چچا جان سے کی جانے والی گفتگو پر اس کے لاشعور کی کارستانی تھی یا واقعی ابا میاں اسے چچا جان کے ساتھ بھیجنا چاہ رہے تھے' وہ سمجھ نہ پائی۔

سارا دن اسی اضطراب میں گزرا اور اگلی رات بھی جب اس نے بالکل وہی خواب دیکھا تو وہ اپنے فیصلے پر قائم نہ رہ سکی۔ بوجھل دل کے ساتھ اس نے چچا جان کے ساتھ جانے پر آمادگی کا اظہار کر دیا۔ پیچیدہ قانونی کارروائیاں ابا میاں کے شاگرد (جو اعلا عہدے پر فائز تھے) کی بدولت اتنی پیچیدہ نہ رہیں۔ چند ہی دنوں میں وہ چچا جان کے ساتھ پاکستان روانہ ہو گئی۔ اب تو صرف زندگی کے دن پورے کرنے تھے۔ جینے کی امنگ تو بالکل ختم ہو چکی تھی۔ اس نے بے بس ہو کر خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

پاکستان کی اجنبی سرزمین پر چچا جان کی فیملی سر توڑ کوشش کر رہی تھی کہ اسے کسی قسم کی اجنبیت کا احساس نہ ہو۔ مگر ان کی کوششیں کامیاب ثابت نہ ہو رہی تھیں۔ اس میں بڑا دخل ان دور پار کے رشتہ داروں کا تھا جو بظاہر تو ابا میاں کا پرسہ دینے آتے تھے۔ لیکن اصل میں ان کی بنگالی بیٹی دیکھنے کے خواہش مند تھے۔ ان کے تبصرے اکثر ماہ نیم ماہ کے کانوں میں بھی پڑتے رہتے تھے۔

"ہے تو بنگالی' مگر کیسی سنہری دمکتی ہوئی رنگت ہے میرا تو خیال تھا اپنی ماں پر گئی ہو گی۔"

یہ ابا میاں اور چچا جان کی پھوپھی زاد بہن تھیں جو محفل کے آداب کا خیال نہ کرتے ہوئے اپنی بیٹی سے سرگوشی کر رہی تھیں اور یہ سرگوشی ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہر فرد نے با آسانی سنی تھی۔ ماہ نیم ماہ تو خیر آج کل سنگی مجسمہ ثابت ہو رہی تھی۔ بے تاثر چہرے کے ساتھ آنے والوں کی تعزیت وصول کر لی۔ چچی جان بے چاری شرمندہ ہو جاتی تھیں۔ وہ بہت محبت کرنے والی خاتون تھیں۔ اس کا فیروزہ کی طرح ہی خیال رکھتی تھیں۔

فیروزہ خود اپنی ساری مصروفیات ترک کرتے ہوئے ماہ نیم ماہ کا سایہ بنی ہوئی تھی۔ ان لوگوں کی محبت اور خلوص پر اسے کوئی شبہ نہ تھا۔ لیکن وہ ان کی خواہش پر کیسے ایک دم ہنسی خوشی زندگی گزارنا شروع کر دیتی۔ چچا جان مثالیں دے کر سمجھاتے کہ دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہیں' جو اس سے بھی زیادہ دکھی ہیں۔ جن کی زندگی بہت مشکل اور آزمائشیں ختم ہونے کا نام نہیں لیتیں۔ لیکن وہ زندگی سے اپنے حصے کی خوشیاں حاصل کرنے کی تگ و دو میں مصروف رہتے ہیں اور یہ کہ وقت گزرنے کے ساتھ اس کے دکھ کی شدت کم ہو جائے گی۔ لیکن اسے بھی نئی زندگی کے آغاز کے لیے مثبت انداز فکر اپنانا ہو گا۔ وہ چپ چاپ چچا جان کو سنے جاتی۔ کسی بات پر سر بھی ہلا دیتی۔ جیسے ان کی بات سمجھ رہی ہو۔ لیکن سچ یہی تھا کہ وہ ابھی تک خود پر چھائی قنوطیت کی کیفیت کو ختم نہ کر پا رہی تھی۔ مرنے کے سوا زندگی کی کوئی دوسری آرزو نہ بچی تھی اور پھر ایک دن چچا جان نے فیروزہ کو مشورہ دیا۔

"تم اپنی بہن کو لے کر چھوٹی کوٹھی کا چکر لگا لو۔ تمہاری سہیلیوں میں جا کر اس کا جی بھی بہل جائے گا۔"

"چھوٹی کوٹھی ماہ نیم ماہ آپا کے لیے ہرگز مناسب جگہ نہیں ہے۔ بابا نے پتا نہیں کیا سوچ کر یہ مشورہ دیا۔" چچا جان کے منظر سے ہٹتے ہی فیروزہ سے چار سال چھوٹے مدثر نے بہن کو مخاطب کیا۔ وہ فیروزہ سے چھوٹا تھا' لیکن فیروزہ سے زیادہ ذہین و فطین ہونے کا دعوا کرتا تھا۔ فیروزہ اور اس کی بہت نوک جھونک ہوتی تھی۔ اب بھی فیروزہ اس کی بات سن کر چڑ گئی۔

"کیوں میں ماہ نیم ماہ کو وہاں کیوں لے کر نہ جاؤں؟ کیا وہاں انسان نہیں بستے؟"

"بالکل درست فرمایا۔ وہاں انسان نہیں بستے۔ انسانوں سے ملتی جلتی ایک مخلوق بستی ہے۔ تمام تر انسانی صفات سے عاری۔" مدثر نے فلسفہ بولا۔

"دیکھ رہی ہیں اماں! آپ کے میکے والوں کے متعلق آپ کے صاحبزادے کیا ارشاد فرما رہے ہیں؟" فیروزہ نے پاس بیٹھی صالحہ کو مخاطب کیا' جو اون سلائیاں ہاتھ میں تھامے شاید چچا جان کا سوئیٹر بن رہی تھیں۔ بیٹے اور بیٹی کو محض گھورنے پر اکتفا کیا اور سابقہ مشغلے میں مصروف رہیں۔

"اماں کا اپنے میکے سے کوئی تعلق نہیں فیروزہ آپا! اماں وہاں بالکل مس فٹ تھیں۔ وہ تو شکر ہے' ابا کی بدولت اماں وہاں سے نکل آئیں اور اگر تم برسوں بعد یہ رشتہ داری دوبارہ نہ جوڑتیں تو ان چھوٹی کوٹھی والوں سے ہماری ہمیشہ کے لیے جان چھوٹی رہتی۔" مدثر چھوٹی کوٹھی والوں سے ضرورت سے زیادہ شاکی تھا۔

"اگر اماں نے بابا سے شادی نہ کی ہوتی تو چھوٹی کوٹھی والے اماں کی شادی اپنے ہم پلہ لوگوں میں کرتے۔ پھر دیکھتے تم کہ ہمارے کیا ٹھاٹھ ہوتے۔"

فیروزہ کا دلی قلق زبان پر آگیا۔ ماہ نیم ماہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ اپنے باپ پر جان چھڑکنے والی فیروزہ کتنی آسانی سے یہ بات کہہ گئی تھی۔ اگر چچی جان کی

چچا جان سے شادی نہ ہوتی تو یقیناً" چچی کسی امیر کبیر شخص کی بیوی ہوتیں۔ مگر یہ ضروری تھا کیا کہ وہ امیر کبیر شخص چچا جان جیسی پیاری عادات واطوار کا مالک بھی ہوتا۔ ماہ نیم ماہ کو فیروزہ کی بات سن کر دکھ ہوا تھا اور مدثر تو یہ بات سن کر ہنستے سے ہی اکھڑ گیا۔

"تم کتنی مادہ پرست ہو فیروزہ آپا! آخر چھوٹی کوٹھی والوں کی خود غرضی تمہارے اندر بھی سرائیت کر ہی گئی نا۔ اگر اماں کی شادی کہیں اور ہوئی ہوتی تو تم بے شک اماں کے گھر پیدا ہو جاتیں۔ مجھے تو اپنے بابا کے گھر ہی پیدا ہونا تھا۔" وہ پھسلتی ہوئی عینک دوبارہ ناک پر جماتے ہوئے بولا۔

"یعنی تمہیں اماں سے کوئی محبت نہیں؟ اگر اماں کی جگہ ابا کی بیوی کوئی جھگڑالو' بد زبان' سانولی سی موٹے نقوش والی عورت ہوتی تو تمہارا کیا بنتا مدثر میاں؟؟" فیروزہ نے اسے چھیڑا۔ ماہ نیم ماہ کو ہنسی آگئی۔ کیسی لا یعنی بحث میں الجھے ہوئے تھے دونوں۔ بہن' بھائی اور چچی جان اس بحث سے یکسر لاتعلق اون سلائیوں میں ہی گم تھیں۔

"آہا فیروزہ آپا! تمہاری ساری فضول باتیں معاف۔ تم نے ماہ نیم ماہ آپا کو مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ مجھے تو یہ اس صدی کا سب سے اہم واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ یعنی کہ اپنی ماہ نیم ماہ آپا کو مسکرانا بھی آتا ہے۔"

مدثر کہہ رہا تھا اور ماہ نیم ماہ کے مسکراتے لب آپوں آپ سکڑ گئے۔ وہ تو واقعی مسکرانا بھول چکی تھی۔ ابا میاں کے بعد مسکراہٹ پر اس کا حق ختم ہو چکا تھا۔ مسکرانے کا مطلب تھا' وقتی طور پر اپنا غم بھولنا اور اپنا غم بھولنے کا مطلب تھا کہ ابا میاں کو بھولنا تو وہ انہیں کیسے اور کیونکر بھول سکتی تھی۔ ایک لمحے کی مسکراہٹ نے اسے ندامت میں مبتلا کر دیا تھا۔ چچی جان جواب تک اپنے کام میں مصروف تھیں' اون سلائیاں ایک طرف رکھتے ہوئے اس کی جانب متوجہ ہوئیں۔

"ماہ نیم ماہ بچے! یہاں آؤ' میرے پاس۔" وہ چپ چاپ اٹھ کر ان کے پاس چلی گئی۔

"تمہارے ابا میاں کی روح تمہیں غم زدہ دیکھ کر بے چین رہتی ہوگی۔ اگر تم ہنستی مسکراتی رہو گی تو یقیناً" انہیں بھی چین نصیب ہوگا۔ مسکرانے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تم نے ابا میاں کو بھلا دیا ہے۔" چچی جان نے اسے پیار سے سمجھایا تھا اور ماہ نیم ماہ تو حیرت سے منہ کھولے انہیں دیکھتی رہ گئی۔ وہ اس کے دل کا خیال کیسے پا گئی تھیں۔

"اماں ٹیلی پیتھی جانتی ہیں آپا!" مدثر نے مسکرا کر اسے مخاطب کیا۔ وہ دوسری بار حیران رہ گئی۔ مدثر کو کیسے پتا چلا کہ اس نے کیا سوچا۔ اسی لمحے فیروزہ بھی بول پڑی۔

"تمہارا چہرہ کھلی کتاب کی مانند ہے ماہ نیم ماہ! ہر کوئی دل کی بات پا جاتا ہے۔" یہ سب لوگ ہی ٹیلی پیتھی جانتے ہیں۔ ماہ نیم ماہ نے سر جھکا لیا۔ مبادا پھر کوئی اس کا چہرہ دیکھ کر کوئی تبصرہ کر دے۔

"پھر کل تم تیار ہو جانا۔ میں اور تم چھوٹی کوٹھی چلیں گے۔ امید ہے کل منصور بھی پہنچ جائے گا۔ اس سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔"

"شاید چھوٹی کوٹھی کے سب سے معقول شخص۔" مدثر کی زبان میں پھر کھجلی ہوئی تھی۔

"تم بھول رہے ہو منصور کا تعلق بڑی کوٹھی سے ہے۔" فیروزہ نے اسے یاد دلایا۔

ماہ نیم ماہ پھر ٹکر ٹکر دونوں کی شکلیں دیکھے گئی۔ چھوٹی' بڑی کوٹھی کی تکرار سے وہ الجھ کر رہ گئی تھی۔ آخر رات کو سونے سے قبل فیروزہ نے اسے مختصراً" چھوٹی اور بڑی کوٹھی کے پس منظر کے بارے میں بتایا۔



رائے نجیب احمد خان اور ان کے آباواجداد جنوبی افریقہ میں ہیروں کے کاروبار سے منسلک تھے۔ اس کاروبار سے انہوں نے اتنا کما لیا کہ نسلوں کے لیے بہت تھا۔ پھر نسلیں بھی تو ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھیں۔ کاروبار کا مقام اور نوعیت بے شک بدل گئی مگر دولت کی ریل پیل وہی رہی۔ رائے نجیب کے دو

بیٹے تھے۔ بڑے کی جائے رہائش بڑی کوٹھی کہلائی تو چھوٹے کی جائے رہائش کا نام چھوٹی کوٹھی پڑ گیا۔ حالانکہ رقبے میں وہ بڑی کوٹھی سے کچھ بڑی ہی ہوگی۔ صالحہ رائے نجیب کی پوتی تھیں' یعنی چھوٹی کوٹھی کے مالک رائے حفیظ کی بیٹی۔ تین بھائیوں کی اکلوتی بہن۔ پسند کی شادی کے جرم میں بھائیوں نے اکلوتی بہن سے لاتعلقی اختیار کر لی۔ والد جب تک حیات تھے بیٹی سے ملنے آتے رہے۔ بھائیوں نے پلٹ کر خبر نہ لی۔ بڑے ہونے پر فیروزہ کی متجسس طبیعت نے ننھیال کا کھوج لگایا اور اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی' جب پتا چلا کہ شہر کا متمول ترین گھرانہ ہی اس اس کا ننھیال ہے۔ ماموں زاد بہنوں سے دوستی گانٹھ کر اس نے چھوٹی کوٹھی تک رسائی حاصل کر لی اور جب چھوٹی کوٹھی کے سب مکینوں سے اس کی خوب جان پہچان ہو گئی تو اس نے انکشاف کر دیا کہ وہ صالحہ کی بیٹی ہے۔ خلاف توقع اس خبر پر کسی نے نہ خوشی کا اظہار کیا' نہ برہمی کا۔ اسے اب بھی بھانجی سے زیادہ لڑکیوں کی سہیلی کی حیثیت دی جاتی تھی اور وہ اسی پر مطمئن تھی۔ لڑکیاں البتہ اس کی گرویدہ تھیں۔

فیروزہ بہت خوب صورت تھی اور انتہا درجے کی ذہین۔ ذہانت تو خیر اسے ورثے میں ملی تھی۔ وہ کالج کی مقبول ترین لڑکی تھی۔ چھوٹی کوٹھی کی لڑکیاں اس ہمہ صفت لڑکی کی دوستی پر خوش تھیں۔ اصل مسئلہ تب پیدا ہوا' جب بڑی کوٹھی کا منصور بھی فیروزہ کے دوستوں کی صف میں شامل ہو گیا۔ فیروزہ کے تینوں ماموؤں کی پانچ عدد لڑکیاں عمروں کے فرق سے بے نیاز منصور پر صرف اپنا حق سمجھتی تھیں۔ حالانکہ بڑے ماموں کی شہرزاد منصور سے تین برس بڑی تھی تو چھوٹے ماموں کی تمکنت منصور سے آٹھ برس چھوٹی۔ مگر منصور آفاق کی شخصیت میں جانے کیا کشش تھی کہ جو لڑکی بھی اسے دیکھتی اس پر مرمٹتی۔ مرمٹی تو اس پر فیروزہ بھی تھی۔ مگر وہ اپنی پسندیدگی دل میں چھپائے منصور کی دوستی پر ہی قانع رہی۔

منصور حسن پرست تھا۔ اس بات کا وہ خود برملا اعتراف بھی کرتا تھا۔ لیکن اگر اسے صرف حسین لڑکی کا ساتھ درکار تھا تو یہ سب حسین لڑکیوں کی بھول تھی۔ وہ اپنی شریک حیات میں جو خوبیاں چاہتا تھا' ان سے شاید خود بھی ناواقف تھا۔ بس اسے یہ علم تھا کہ اس کی زندگی میں اب تک جتنی بھی لڑکیاں آئی ہیں ان میں سے ایک بھی اس کے دل کے تار چھیڑنے کا باعث نہیں بنی ہے۔ فیروزہ اور منصور کی دوستی ایک عرصے تک چھوٹی کوٹھی کی لڑکیوں کو رشک و حسد میں مبتلا کرتی رہی۔ فیروزہ دنیا جہان کے موضوعات پر شستہ انگریزی میں منصور سے گپیں لڑاتی۔ پٹر پٹر انگریزی تو چھوٹی کوٹھی کی سب ہی لڑکیاں بول لیتی تھیں کہ سب کانونٹ کی پڑھی ہوئی تھیں۔ لیکن دنیا جہان کے موضوعات کو کون فیروزہ کی طرح موضوع گفتگو بنا سکتا تھا۔

پھر کنول شاد آگئی' بلکہ کنول شاد دریافت کی گئی۔ اس دریافت کا سہرا بڑے ماموں کی شہرزاد کے سر تھا۔ کنول شاد فیروزہ سے زیادہ حسین نہ سہی۔ مگر فیروزہ سے زیادہ ذہین ضرور تھی۔ لڑکیاں سمجھ رہی تھیں کہ منصور فیروزہ کی ذہانت سے متاثر ہے۔ کیونکہ اپنی دانست میں وہ سب فیروزہ سے زیادہ حسین تھیں۔ فیروزہ کو ذہانت پر زعم تھا ناں۔ وہ اپنی ذہانت کے بل پر باہر سے آکر ان سب سے ان کا منصور ہتھیانا چاہتی تھی' سو اس کی ذہانت کا توڑ کنول شاد کی صورت کیا گیا لیکن لڑکیوں کی مایوسی کی کوئی انتہا نہ رہی' جب کنول شاد اور فیروزہ گہری سہیلیاں بن گئیں۔ اب منصور کوئی علمی' ادبی بحث چھیڑتا تو دونوں لڑکیاں مل کر اسے دلائل سے قائل کرنے کی کوشش کرتیں۔ فیروزہ تو اس کا دل اپنی طرف مائل کرنے کی کوششوں میں بھی مصروف رہی۔ لیکن وہ ہمیشہ اسے اچھی دوست ہی کہتا اور سمجھتا رہا۔ آخر فیروزہ نے دل ہی دل میں ہار تسلیم کرتے ہوئے کنول شاد کے چچازاد بھائی کے رشتے پر ہاں کر دی۔ کنول شاد کا تعلق بھی امیر کبیر زمیندار گھرانے سے تھا۔

فیروزہ کو منصور تو نہ ملا۔ البتہ خواہش کے مطابق

دولت مند گھرانہ مل گیا منصور کاروباری دورے پر پھر دنیا کی سیر کو نکل گیا تھا۔ فیروزہ کی منگنی اور منصور کے باہر جانے کے بعد ماموں زاد بہنوں نے پرانی سہیلی سے دل صاف کر کے پھر سے اسے اچھی دوست کا درجہ دے دیا۔ چھوٹی کوٹھی میں لڑکیوں کی محفلیں اب بھی باقاعدگی سے جمتی تھیں۔

چھ مہینے بعد منصور وطن واپس آیا تھا۔ لیکن اس بار وہ کاروباری معاملات میں الجھا رہا۔ پاکستان سے بزنس وائنڈاپ کر کے باہر کے ملکوں میں کاروبار مستحکم کر رہا تھا چھوٹی کوٹھی کی لڑکیوں کے لیے یہ ہرگز اچھی خبر نہ تھی۔ یہ سچ تھا کہ پہلے بھی منصور کا بیشتر وقت ملک سے باہر گزرتا تھا۔ لیکن پاکستان بھر میں پھیلے بزنس کی وجہ سے اسے باقاعدگی سے پاکستان کا چکر بھی لگانا پڑتا تھا۔ لیکن اگر یہاں سے کاروبار ہی ختم ہو گیا تو اس کا پاکستان آنے کا جواز ہی نہیں بچے گا۔ ماں باپ پہلے ہی گزر چکے تھے۔ تینوں بہنیں باہر ممالک میں بیاہی گئی تھیں چھوٹی کوٹھی کی پانچ عدد لڑکیوں میں سے دو لڑکیوں نے حقیقت پسندی سے صورت حال کا تجزیہ کیا اور بالآخر اسی نتیجے پر پہنچ گئیں۔ جس پر کنول شاد اور فیروزہ پہلے ہی پہنچ چکی تھیں۔ سو شہرزاد اور شہرینہ کی انگلیوں میں بھی منگنی کی انگوٹھیاں سج گئیں لیکن ایسے میں منصور کی پھر پاکستان آمد کی خبر سنی تو سب لڑکیاں بے تابی سے اس کی راہ تکنے لگیں۔

ابراہیم جو فیروزہ کے بڑے ماموں کا بیٹا اور منصور کا گہرا دوست تھا اس کا کہنا تھا کہ منصور بالآخر شادی پر راضی ہو گیا ہے اور پاکستان آمد بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ وہ اس بار لڑکی منتخب کرنے آرہا ہے۔ منگنی شدہ لڑکیوں کا بس نہ چل رہا تھا کہ وہ اپنی انگوٹھیاں نوچ کر اتار پھینکیں۔ شہرزاد نے تو واقعی سوچ لیا تھا کہ اگر منصور کی نگاہ انتخاب اس پر ٹھہر گئی تو وہ منگنی توڑنے سے بھی گریز نہیں کرے گی۔

اور پھر منصور کی آمد کا دن آن پہنچا۔



بہت دنوں بعد چھوٹی کوٹھی میں لڑکیوں کی محفل جمی تھی۔ سب بے تابی سے منصور کی منتظر تھیں۔ مگر اپنی بے چینی اور بے تابی دل میں چھپائے ادھر ادھر کی بے مقصد باتیں کیے جا رہی تھیں۔ عادت کے مطابق گفتگو کے بیچ میں بلند و بانگ قہقہے بھی لگ رہے تھے ایسے قہقہے جن سے نووارد لڑکی چونک چونک جاتی تھی۔ جانے فیروزہ کو کیا پڑی تھی کہ اپنی اس کزن کو آج سب سے ملوانے لے آئی۔ بظاہر سب اس سے بہت تپاک سے ملی تھیں۔ لیکن اندر ہی اندر ماہ نیم ماہ کے حسن سے سب ہی خائف تھیں۔ وہ بلاشبہ بہت خوب صورت تھی۔ لیکن شاید اپنے حسن سے آگاہ نہ تھی۔

"سادہ لباس اور کسی بھی قسم کے میک اپ سے پاک چہرے کے باوجود اتنی حسین لگ رہی ہے۔ اگر نک سک سے تیار ہوتی تو کیا قیامت ڈھاتی۔" شہرینہ نے اس کے چہرے پر اچٹتی نگاہ ڈالتے ہوئے سوچا تھا اور اسی لمحے ماہ نیم ماہ نے فیروزہ کو مخاطب کیا تھا۔

"چلیں فیروزہ۔"

"ہاں! ابھی چلتے ہیں تھوڑی دیر میں۔" فیروزہ نے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں سمجھانا بھی چاہا کہ وہ ابھی چلنے پر اصرار نہ کرے۔ لیکن ماہ نیم ماہ بری طرح اکتا چکی تھی۔

"فیروزہ! میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ میں گھر جا کر آرام کرنا چاہتی ہوں۔"

"فیروزہ! ماہ نیم ماہ کو دوبارہ بھی ہم سے ملوانے ضرور لانا۔ آج شاید یہ اپنی طبیعت کی وجہ سے اچھا محسوس نہیں کر رہیں۔" آرزو نے مسکرا کر فیروزہ کو مخاطب کیا اس جملے کے بعد وہاں رکنا سراسر ڈھٹائی تھی اور فیروزہ چاہنے کے باوجود اتنی ڈھٹائی اختیار نہ کر سکی۔

"ہاں ہاں! کیوں نہیں۔ ہم جلد ہی پھر چکر لگائیں گے۔" وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتی اٹھ گئی۔ ماہ نیم ماہ کی بچی کی تو گھر جا کر خبر لینی تھی۔ ابھی تو سب سے مسکرا مسکرا کر الوداعی مصافحہ اور معانقہ کرنے پڑ رہے تھے۔ وہ سب کی سب یقیناً منصور سے اس کی ملاقات نہ ہونے کے سبب دل میں خوب خوش ہو رہی ہوں گی۔

فیروزہ بہت بوجھل دل کے ساتھ ماہ نیم ماہ کو لے کر جس وقت چھوٹی کوٹھی سے باہر نکل رہی تھی۔ اسی لمحے ابراہیم کی گاڑی گھر کے عظیم الشان گیٹ کے سامنے آن رکی۔ فیروزہ کے دل کی کلی کھل گئی۔ گاڑی میں بیٹھے منصور نے اسے دیکھ لیا تھا۔ اب وہ اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر نکل رہا تھا۔

"ہیلو فیروزہ! کیسی ہو؟" منصور نے بہت اپنائیت اور گرم جوشی سے اسے مخاطب کرتے ہوئے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

"ایک دم فٹ فاٹ۔ اپنی سناؤ۔" فیروزہ نے جواباً اتنی ہی گرم جوشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

"ہم خانہ بدوشوں کا کیا پوچھتی ہو۔" منصور نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا تھا۔ فیروزہ نے انتہائی رشک سے اس خانہ بدوش کو دیکھا، جس کی شخصیت کا سحر مقابل کو بے خود سا کر دیتا تھا۔ اسی لمحے ابراہیم نے فیروزہ سے ماہ نیم ماہ کی بابت دریافت کیا تھا۔ فیروزہ کو بھی جیسے یاد آیا کہ اس کے ساتھ کھڑی بے زار شکل والی کزن سے منصور اور ابراہیم کا تعارف کروانا چاہیے۔

"یہ ماہ نیم ماہ ہے، میری کزن۔"

"نائس ٹو میٹ یو۔" ابراہیم نے خوش گوار مسکراہٹ اس کی طرف اچھالتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھایا۔

"آداب۔" ماہ نیم ماہ نے اپنا ہاتھ پیشانی کے قریب لے جا کر اتنے روکھے اور سپاٹ انداز میں آداب پیش کیا کہ ابراہیم تو کھسیایا سو کھسیایا فیروزہ بھی بری طرح شرمندہ ہو گئی۔ صرف منصور تھا جس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر کر غائب ہو گئی تھی۔

"آپ کو پہلے کبھی فیروزہ جی کے ساتھ نہیں دیکھا۔" جانے ابراہیم نے خفت مٹائی تھی یا ماہ نیم ماہ کے حسن سے پہلی نگاہ میں اتنا متاثر ہو گیا تھا کہ اس سے مخاطب ہونے کی خواہش دل میں نہ دبا سکا۔

"ان فیکٹ ماہ نیم ماہ کچھ دن پہلے ہی بنگلہ دیش سے آئی ہے۔ میرے تایا جان بنگلہ دیش میں ہوتے تھے ان کے انتقال کے بعد ماہ نیم ماہ کو بابا پاکستان لے آئے۔" فیروزہ نے ہی ماہ نیم ماہ کی طرف سے جواب دیا تھا۔

وہ تو ایسے لاتعلق کھڑی تھی جیسے اس نے ابراہیم کا سوال سنا ہی نہ ہو۔ منصور نے ایک اچٹتی نگاہ ماہ نیم ماہ کے چہرے پر ڈال کر اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ یہ بے نیازی فطری ہے یا دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش۔ لیکن ماہ نیم ماہ کے چہرے پر پھیلی بے زاری اتنی واضح تھی کہ منصور نے دوسری سوچ کو یکسر مسترد کر دیا۔

اسے خود پر یہ زعم تھا کہ کوئی بھی لڑکی اس پر ایک نگاہ ڈالنے کے بعد اسے نظرانداز نہیں کر سکتی۔ لیکن سامنے کھڑی بنگال کی حسینہ نے تو اسے ایک اچٹتی نگاہ کے قابل بھی نہ سمجھا تھا۔

واہ فیروزہ بی بی! پاکستان آتے کے ساتھ تم نے تو مجھے بڑا خوش گوار سا سرپرائز دیا۔ میں تو اپنی چچا زاد کزنز کے تصور سے ہی بے زار ہوا جا رہا تھا۔ تمہاری کزن بہت مختلف اور منفرد لگ رہی ہے۔ منصور آفاق کو اس کی انفرادیت بھائی ہے۔

اس نے دل میں سوچا تھا۔ فیروزہ کا البتہ شرمندگی کے مارے برا حال ہو رہا تھا۔ وہ اپنی بے زار کزن کو خفگی سے گھورتی، ان دونوں کو اللہ حافظ کہتے ہوئے جلد ہی وہاں سے چل پڑی۔ اسے ماہ نیم ماہ پر پہلی بار شدید غصہ آرہا تھا۔ گھر پہنچ کر سب کی موجودگی کے باعث اس وقت تو اسے کچھ نہ کہہ سکی۔ مگر رات کو سونے سے پہلے وہ ماہ نیم ماہ پر اپنی خفگی ظاہر کیے بنا نہ رہ سکی۔

"تم نے منصور اور ابراہیم کے سامنے بہت بد تہذیبی کا مظاہرہ کیا۔ کیا سوچتے ہوں گے وہ تمہارے متعلق۔" ماہ نیم ماہ جو سینے تک لحاف تانے چت لیٹی چھت کو گھورے جا رہی تھی فیروزہ کی بات سن کر چڑ ہی تو گئی۔

"وہ میرے متعلق جو بھی سوچیں، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔ بلکہ مجھے تو تم پر غصہ آرہا تھا۔ کس مزے سے تم نے اس لڑکے کا ہاتھ تھام لیا۔ اسلامی

جمہوریہ پاکستان کی لڑکیاں اتنی آزاد خیال ہوتی ہوں گی میں نے سوچا بھی نہ تھا۔"

وہ "اسلامی جمہوریہ پاکستان" پر زور دیتے ہوئے طنزیہ انداز میں گویا ہوئی تھی۔ فیروزہ نے اس کے انداز پر پہلے تو حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا پھر بے تحاشا ہنستے ہوئے جھک کر اس کا گال ہی چوم ڈالا۔

"آج پہلی بار مجھے احساس ہوا ہے کہ میرا واسطہ کسی ڈمی سے نہیں، جیتے جاگتے انسان سے پڑا ہے تمہاری لاتعلقی جھیلتے جھیلتے میں تھک گئی تھی کزن او گاڈ! میں تمہیں بتا نہیں سکتی کہ تم یوں طنز کرتے ہوئے کتنی کیوٹ لگی ہو۔ کم از کم کسی بات پر تو تمہاری طرف سے رسپانس آیا۔ یعنی تم بھی عام انسانوں کی طرح سوچتی ہو۔ تمہیں بھی کچھ اچھا برا لگ سکتا ہے۔" فیروزہ خوشی کا اظہار کر رہی تھی۔ ماہ نیم ماہ کچھ خفیف سی ہو گئی۔

"فار گاڈ سیک ماہ نیم ماہ! ایک فقرہ بول کر پھر سے اپنے خول میں بند نہ ہو جانا۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ تم انسان نہیں روبوٹ ہو۔ صبح مقررہ وقت پر چپ چاپ ناشتے کی میز پر پہنچ جاتی ہو۔ خاموشی سے دو چار نوالے لینے کے بعد کسی اسٹیچو کی طرح صوفے پر جا کر بیٹھ جاتی ہو۔ سوچتی رہتی ہو۔ کوئی بات کرتا ہے تو "ہوں ہاں" کر کے جواب دے دیتی ہو اماں ہاتھ پکڑ کر بازار لے جائیں تو چپ چاپ ساتھ چل پڑتی ہو۔ نہ پسند کا اظہار کرتی ہو نہ ناپسندیدگی کا۔ مدثر کہتا ہے ماہ نیم ماہ آپا! آئیں ٹی وی دیکھیں تو چپ چاپ اس کے ساتھ بیٹھ کر اس کی پسند کے پروگرام دیکھتی چلی جاتی ہو۔ بلکہ صرف نگاہیں اسکرین پر ہوتی ہیں اور دماغ کہیں اور، ابا کوئی کتاب پڑھنے کو پکڑائیں تو صبح سے شام تک اس کا دیباچہ کھول کر بیٹھی رہتی ہو۔ میں ہاتھ پکڑ کر چھوٹی کوٹھی لے گئی تو چپ چاپ میرے ساتھ چل پڑیں۔ دو گھنٹوں میں صرف دو فقرے بولے۔ میں تو اسی پر خوش ہو گئی تھی۔ لیکن ابھی جو تم نے طنز کا تیر چلایا ہے نا واہ! دل ٹھنڈا کر دیا۔" فیروزہ لطف لیتے ہوئے بولی۔ ماہ نیم ماہ کے لبوں پر بھی مدھم سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

"پلیز ماہ نیم ماہ! مسکرانے کی کوشش کرتی رہا کرو۔ تم نہیں جانتیں کہ تمہارے ہونٹوں پر پھیلتی مسکراہٹ ہمیں کتنی بڑی خوشی سے ہمکنار کرتی ہے۔" فیروزہ نے بہت محبت سے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

"تم بے شک ہم سے ہزاروں میل دور دیس رہتی تھیں۔ لیکن یقین کرو! ہم نے ہمیشہ اپنے گھر کا فرد سمجھا ہے۔ بابا نے بہت چھوٹی عمر میں ہی مجھے باور کروا دیا تھا کہ میری ایک اور بہن بھی ہے۔ وہ چاہے ہم سے کتنی بھی دور رہے، لیکن اسے ہمارے دل سے دور نہیں ہونا چاہیے۔ تایا جان اور تم میرے بابا کو کتنے عزیز ہو، تم سوچ بھی نہیں سکتی ماہ نیم ماہ! میرے بابا جس سے محبت کرتے ہیں، ہماری پوری فیملی خود بخود اس شخص کی محبت میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ میں کہتی تو ہوں کہ اماں نے بابا سے شادی کر کے غلطی کی، لیکن یہ بات تو میں بس یوں ہی اماں کو بلکہ زیادہ تر مدثر کو چڑانے کے لیے کہتی ہوں۔ میرے بابا دنیا کے سب سے پیارے شخص ہیں۔ سر سے پاؤں تک محبت۔ اور بابا کہتے ہیں کہ اگر تمہیں اپنے تایا کے ساتھ رہنے کا موقع ملتا تو تمہیں پتا چلتا کہ سراپا محبت کی تعریف پر کون پورا اترتا ہے۔" فیروزہ بول رہی تھی اور ماہ نیم ماہ کی آنکھوں سے آنسو کی لڑیاں ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگیں۔

"میرے ابا میاں بہت اچھے تھے فیروزہ! ان کے بغیر میرا جینے کو جی ہی نہیں چاہتا۔" روتے روتے وہ فیروزہ سے لپٹ گئی۔ فیروزہ اسے کیا چپ کرواتی، خود بھی زار و قطار رونے لگی۔

"قدرت کے کاموں میں دخل دینے کی جرات کون کر سکتا ہے ماہ نیم ماہ! نہ تم، نہ میں، نہ کوئی اور۔ ہم سب اللہ سے دعا کرتے رہتے ہیں کہ وہ تمہیں صبر سے نوازے اور ان شاء اللہ تمہیں صبر آ ہی جائے گا۔" فیروزہ اسے خلوص سے سمجھاتی رہی۔

"تم سب لوگ بہت اچھے ہو فیروزہ! میں اگر وہاں اکیلے رہتی تو شاید پاگل ہو چکی ہوتی یا پھر شاید خودکشی کر ہی چکی ہوتی۔"

اس نے پاکستان آمد کے اتنے دن بعد آخر چچا جان کے فیصلے کی درستی کو تسلیم کر ہی لیا۔ فیروزہ یہ سن کر نہال ہو گئی۔

چار دن بعد کی بات تھی۔ چھوٹی کوٹھی سے میلاد کا بلاوا آیا۔ وہ جانے سے ہچکچا رہی تھی۔ لیکن فیروزہ کی پیار بھری دھونس کے آگے اس کی ایک نہ چلی۔ حالانکہ موسم ابر آلود ہو رہا تھا۔ لیکن فیروزہ نے مدثر سے کہہ کر رکشہ گھر کے دروازے پر منگوایا نک سک سے تیار ہو کر اسے ساتھ کھینچتی ہوئی، پھٹ پھٹ کرتے رکشے میں بیٹھ کر چھوٹی کوٹھی پہنچ گئی۔



ہال کمرے میں آج درجنوں خواتین موجود تھیں۔ لڑکیاں بھی ادب سے دوپٹا سر پر جمائے بیٹھی تھیں۔ پہلی مڈبھیڑ فیروزہ کی بڑی ممانی سے ہوئی۔

"صالحہ نہیں آئی کیا؟ اسے بھی تو بلایا تھا۔" انہوں نے چھوٹتے ہی چچی جان کے متعلق دریافت کیا۔ عجیب نخوت بھرا انداز تھا ان کا۔

"اماں کی طبیعت ناساز تھی، ورنہ ضرور آتیں۔" فیروزہ نے بہت شائستگی سے عذر پیش کیا۔ جس کو انہوں نے ناک پر بیٹھی مکھی کی طرح اڑا پھینکا۔

"ہم جانتے ہیں تمہارے باوا کی انا کو ٹھیس پہنچتی ہے، بیوی کو یہاں بھیج کر۔ برسوں گزر گئے۔ ہم نے کشادہ دلی کا ثبوت دیتے ہوئے ماضی کی غلطیوں کو بھلا دیا۔ تم یہاں آئیں، تمہیں سینے سے لگا لیا، لیکن تمہارے باوا۔۔۔"

"ممانی جان! یہ ساڑھی آپ پر بہت جچ رہی ہے۔ کیا خوب صورت زرد رنگ ہے۔ اگر ساتھ گیندے یا موتیے کے گجرے بھی ہوتے تو یقین کریں! محفل میں آپ کے سوا کسی پر نگاہ ہی نہ ٹھہرتی۔" فیروزہ نے ان کی بات کاٹتے ہوئے ستائش کے دو جملے ان کی طرف لڑھکائے تھے اور کیا سریع الاثر جملے تھے۔ ممانی جان کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ ابھر آئی۔

"بس چندا! یہ گجرے وجرے تو تم لڑکیوں پر ہی سجتے ہیں۔ ویسے سچ سچ بتاؤ! موسم کی مناسبت سے رنگ کا انتخاب صحیح کیا ہے نا میں نے؟"

"ایک دم صحیح ممانی جان!" فیروزہ نے انہیں یقین دلایا تھا۔ وہ مطمئن ہو کر مسکرا دیں۔

فیروزہ اس کا ہاتھ پکڑ کر لڑکیوں کے پاس جا پہنچی۔ میلاد کا باقاعدہ آغاز نہیں ہوا تھا۔ اس لیے سب ہی گپوں میں مشغول تھے۔ فیروزہ کی خاطر ماہ نیم ماہ نے آج اس کی سہیلیوں سے اچھی طرح علیک سلیک کی تھی۔ ذرا دیر بعد میلاد کا آغاز ہوا تو سب کی باتوں میں وقفہ آ گیا۔ ماہ نیم ماہ بھی دل سے نعت خوانی کی طرف متوجہ تھی۔ نعتیں پڑھنے کا اسے بچپن سے ہی بہت شوق تھا۔

ابا میاں اکثر بہت سوز سے نعتیہ کلام پڑھتے تھے وہ ان سے سنی گئی نعتیں چپکے چپکے دہراتی تھی اور پھر جب ابا میاں نے ایک دن اسے نعت پڑھتے سنا تو کتنا خوش ہوئے تھے وہ۔ بے ساختہ اس کی پیشانی چوم کر انہوں نے اس کی آواز اور انداز دونوں کی تعریف کی۔ ابا میاں کی حوصلہ افزائی کے بعد اس نے ایک بار اسکول میں بھی نعت خوانی کے مقابلے میں حصہ لیا تھا اور جب اسے پہلا انعام ملا تو وہ خوش خوش ابا میاں کو پرائز دکھانے آئی تھی، پھر ابا میاں نے اسے پیار سے سمجھایا تھا۔

"تم نے مقابلہ جیتا، مجھے بہت خوشی ہوئی ماہ! لیکن بیٹا ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا، پہلی پوزیشن یا انعام کی خاطر کبھی نعت مت پڑھنا۔ پڑھائی ہو، تقریری مقابلہ ہو یا مباحثہ ہو، ان میں تو تم پرائز کی نیت کر کے مقابلے میں حصہ لے سکتی ہو، لیکن نعت ہمیشہ دل سے پڑھنی چاہیے۔ من میں ڈوب کر کسی کی ستائش یا انعام سے بالکل بے نیاز ہو کر۔ تم سمجھ رہی ہو نا ماہ۔" ابا میاں اسے بہت چھوٹی عمر میں بڑی بڑی باتیں سمجھاتے تھے اور وہ سمجھ بھی جاتی تھی۔

آج اس محفل میں آ کر کتنے دنوں بعد دل کو عجیب سا سکون مل رہا تھا۔ جب میلاد پڑھنے والی خاتون نے

مولانا جامی کی مشہور نعت پڑھنا شروع کی تو نعت کے الفاظ سے اس پر رقت تو طاری ہوئی 'سو ہوئی' ابا میاں کی یاد بھی اس پل بہت شدت سے حملہ آور ہوئی۔ ابا میاں جب یہ نعت پڑھتے تھے تو ان کی آواز بھیگ بھیگ جاتی تھی۔ میلاد پڑھنے والی خاتون بار بار حاضرین محفل سے اپنا ساتھ دینے کی درخواست کر رہی تھیں۔ اکثر خواتین آواز میں آواز ملانے کی کوشش کر رہی تھیں' مگر بات بن نہیں رہی تھی۔ پھر اس سے رہا نہ گیا۔ اس نے ہولے سے گلا کھنکھارا اور خاتون کا ساتھ دینے کو آواز بلند کی۔

ایسی خوب صورت مترنم آواز۔ عورتوں نے پلٹ پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ اور تو اور فیروزہ بھی حیران رہ گئی تھی۔ ماہ نیم ماہ کو خیر کسی کی حیرانی یا ستائش بھری نگاہوں سے کوئی غرض نہ تھی' بلکہ اسے تو پتا بھی نہ تھا کہ وہ بہت سی نگاہوں کی زد میں ہے۔ آنکھیں بند کر کے وہ تو کسی اور ہی جہان میں پہنچی ہوئی تھی۔

میلاد پڑھنے والی خاتون نے دو شعر تو اس کے ساتھ پڑھے۔ مگر پھر وہ بھی خاموش ہو گئیں۔ اس کی آواز اتنی مکمل اور خوب صورت تھی کہ کسی اور آواز کی ضرورت ہی نہ تھی۔ وہ اب صرف ماہ نیم ماہ کی نعت سنتے ہوئے بے ساختہ "سبحان اللہ" کی صدائیں بلند کر رہی تھیں۔ ماہ نیم ماہ آنکھیں موندے' بہت جذب سے نعت پڑھ رہی تھی۔ آنکھوں سے موتی پھسل رہے تھے۔

وہی وقت تھا' جب ہال کمرے کے باہر سے گزرتے منصور آفاق کے قدم آگے بڑھنے سے انکاری ہو گئے تھے۔ کھڑکی کے کھلے پٹ میں سے خواتین کے بیچ میں بیٹھی وہ لڑکی صاف نظر آ رہی تھی۔ خالص زنانہ محفل میں جھانکنا معیوب بات تھی۔ کسی عورت کی نگاہ اس پر پڑ جاتی تو اس کے متعلق کیا رائے قائم کی جاتی۔ لیکن منصور خود کو بہت بے بس محسوس کر رہا تھا۔

فیروزہ کی بنگال سے آئی یہ کزن ضرور کوئی ساحرہ تھی۔ چند لمحوں تک اسے تکنے کے بعد آخر وہ آگے بڑھ گیا۔

لیکن اگلے روز شام کے وقت وہ فیروزہ کے گھر پہنچ گیا۔ فیروزہ کی والدہ اس کی رشتے کی پھوپھی تھیں فیروزہ کی بدولت اسے پھوپھی سے آشنائی حاصل ہوئی تھی۔ جب فیروزہ کا چھوٹی کوٹھی آنا جانا شروع ہوا تب نوجوان نسل کو صالحہ بیگم کے بارے میں پتا چلا۔ ان کے دیگر بھتیجے' بھتیجیاں تو اب بھی ان سے لاتعلق ہی تھے۔ ہاں! ایک' دو بار منصور کا وہاں جانے کا اتفاق ہوا تو اسے اپنی باوقار سی یہ پھوپھی بہت اچھی لگی تھیں اور پھوپھی سے بھی اچھے تو اسے سکندر احمد لگے تھے۔ بہت وضع دار ذہین اور قابل شخص۔ فیروزہ کو ذہانت یقیناً" ان ہی سے ورثے میں ملی تھی۔ اسی ذہانت کی وجہ سے وہ فیروزہ کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ شروع شروع میں اسے لگا تھا کہ فیروزہ ہی وہی لڑکی ہے جس کی اسے تلاش تھی۔ وہ ذہین تھی اور خوب صورت بھی۔ لیکن وہ بھانپ گیا تھا کہ فیروزہ اپنی ذہانت اور حسن کے بل پر اسے زیر کرنے کے چکر میں ہے۔

وہ بلاشبہ حسن پرست تو تھا۔ لیکن شاید اسے ایسی لڑکی کی تلاش تھی جو اپنا نسوانی وقار پہچانتی ہو۔ خود بخود گلے کا ہار بن جانے والی لڑکیاں اسے سخت کوفت میں مبتلا کرتی تھیں۔ خیر! فیروزہ واقعی ذہین تھی۔ بھانپ گئی کہ وہ اسے اچھے دوست سے زیادہ کوئی درجہ دینے پر تیار نہیں' سو اس نے اس کی اچھی دوست بننے پر ہی اکتفا کر لیا تھا۔ کم از کم چھوٹی کوٹھی میں مقیم اس کی دیگر کزنز کی طرح ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے ہی نہیں پڑ گئی تھی۔ کچھ بھی تھا۔ وہ فیروزہ کی کمپنی انجوائے کرتا تھا اور دوسری لڑکیوں سے کہیں زیادہ اس کی عزت بھی کرتا تھا۔ وہ ایک بہت سلجھے ہوئے خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔

اور اسے کیا پتا تھا کہ اسی سلجھے ہوئے خاندان کی ایک اور لڑکی یوں اچانک اس کے حواسوں پر چھا جائے گی کہ وہ محض اسے ایک نظر دیکھنے اس کے چچا کے گھر پہنچ جائے گا۔

اس کی آمد فیروزہ کے لیے بے تحاشا حیرت کا باعث بنی تھی۔ اس نے اپنی حیرت چھپانے کی ضرورت بھی

نہ سمجھی۔ وہ خود کچھ خفیف سا ہو گیا۔

"میں یہاں سے گزر رہا تھا تو سوچا پھوپھی جان سے ملتا چلوں۔"

"بہت اچھا کیا بیٹے! کیسے ہو؟ بہنیں ٹھیک ہیں؟" کسی گھر آئے مہمان کی آمد پر حیرت کا اظہار مہمان کو شرمندگی میں مبتلا کر دیتا ہے۔ یہ لڑکی جانے کب بڑی ہو گی' فی الحال تو صرف اسے گھورنے پر اکتفا کرتے ہوئے انہوں نے منصور کی خیر خیریت دریافت کی۔ وہ شائستگی سے ان کے سوالوں کے جواب دیتا رہا' مگر نگاہیں کسی کو ڈھونڈنے کی کوشش میں مصروف تھیں۔

"پھوپھا جان نظر نہیں آ رہے۔" کسی اور کے متعلق پوچھنے کی خواہش دل میں دباتے ہوئے اس نے سکندر احمد کے متعلق دریافت کیا تھا۔

"قریبی پارک تک گئے ہیں' آتے ہوں گے۔ صبح شام چہل قدمی کی اتنی پختہ عادت ہے کہ دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے تمہارے پھوپھا اپنا معمول ترک نہیں کرتے۔" صالحہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اسی لیے تو بابا ابھی تک اتنے ہینڈسم ہیں اماں!" فیروزہ شوخ ہوئی۔ صالحہ محض مسکرا کر رہ گئیں۔ اسی لمحے سکندر بھی آ گئے تھے۔ ان کے ہمراہ وہ شخصیت بھی تھی' جس کی کشش منصور کو یہاں کھینچ لائی تھی۔

"ارے واہ! منصور میاں آئے ہوئے ہیں۔"

سکندر اس سے بہت تپاک سے ملے۔ ان سے معانقے کے بعد منصور نے پاس کھڑی ماہ نیم ماہ کو بھی بہت شائستگی سے سلام کیا تھا۔ ہاتھ بڑھانے سے گریز کیا تھا۔ ابراہیم کا حشر اسے اچھی طرح یاد تھا۔

"یہ ماہ نیم ماہ ہے۔ فیروزہ کی بہن اور میری دوسری بیٹی۔" چچا جان نے اس کا منصور سے تعارف کروایا۔ اس نے سر ہلا دیا۔ ماہ نیم ماہ فقط دو سیکنڈ وہاں کھڑی رہی ہو گی' پھر چپ چاپ کمرے میں گھس گئی۔ منصور اس روز وہاں دو گھنٹے بیٹھا تھا' مگر اسے کمرے سے نہ نکلنا تھا' نہ نکلی۔ ناکام و نامراد وہ واپسی کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

"آپ کے ساتھ بہت اچھی نشست رہی پھوپھا جان! اب چلتا ہوں۔" ان دو گھنٹوں میں اس نے خطے کی تازہ ترین سیاسی صورت حال پر سکندر کے ساتھ سیر حاصل گفتگو کی تھی' لیکن اس گفتگو کو آخر کتنا طول دیا جا سکتا تھا۔ آخر وہ اجازت لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"کھانے کا وقت ہو رہا ہے۔ کھانا کھا کر جانا بیٹا!" صالحہ نے اسے محبت بھرے اصرار سے روکا۔

"ارے نہیں پھوپھی جان! کھانا پھر کبھی سہی۔ ایک دوست نے ڈنر پر انوائیٹ کیا ہوا ہے۔ وہ میرا منتظر ہو گا۔" اس نے رسان سے انکار کیا۔

"چلو! یوں کرتے ہیں' اتوار کو تمہاری باقاعدہ دعوت کر دیتے ہیں۔۔۔ تو برخوردار! اتوار کا لنچ آپ ہمارے ساتھ کیجئے گا۔" سکندر احمد نے شگفتگی سے مسکراتے ہوئے مخاطب کیا۔

"اگر زیادہ تکلف نہ کرنے کی یقین دہانی کروا دیجیے تو حاضر ہو جاؤں گا۔"

"آپ تشریف لے آئیے گا۔ ہم آپ کو فقط دال چاول پر ٹرخا دیں گے۔" فیروزہ نے مسکرا کر کہا۔ سب ہی ہنس پڑے تھے۔



اتوار کو وہ پھر نئی امید کے ساتھ وہاں پہنچا ہوا تھا۔ خوش قسمتی سے ماہ نیم ماہ نے کھانے کی میز پر سب کا ساتھ دیا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ اس کا ہونا' نہ ہونا برابر ہی تھا۔ بہت خاموشی سے اس نے کھانا کھایا تھا۔ میز چھوڑ کر سب سے پہلے اٹھنے والی بھی وہ ہی تھی۔ مگر پھر چچا جان نے اسے روکا تھا۔

"ماہ نیم ماہ بیٹا! زبردست سی چائے تو پلا دو۔ تمہاری بہن چائے بنانے میں اناڑی ہے اور اگر تمہاری چچی سے چائے بنوائی تو پھیکی چائے پینے کو ملے گی۔"

"ہاں تو شوگر دیکھی ہے آپ نے اپنی۔" صالحہ خفا ہوئیں۔

"بس بیٹا! اپنے چچا کے کپ میں آدھا چمچہ چینی ڈالنی ہے۔"

"آپ نہیں پئیں گی؟" اس نے صالحہ سے استفسار

کیا۔
"ارے نہیں! پیٹ بھر کر کھانا کھایا ہے۔ چائے کی گنجائش ہی کہاں بچی۔ بس! تمہارے چچا کا چائے کے بغیر کھانا ہضم نہیں ہوتا۔" صالحہ کو سکندر کے بار بار چائے پینے سے سخت چڑ تھی۔

"بالکل ابا میاں کی طرح۔ میں جب دسترخوان پر کھانا چنتی تو ساتھ ہی ابا میاں کی چائے ہلکی آنچ پر دم پر رکھ کر آتی تھی۔ کھانا کھانے کے فوراً" بعد ابا میاں کو بھی چائے کی سخت طلب ہوتی تھی۔"

اس کی زبان سے بے ساختہ باپ کا ذکر نکل گیا۔ فقرے کے آغاز میں باپ کے ذکر پر اس کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں، تو فقرے کے اختتام پر آنکھیں بھیگ چلی تھیں۔ پھر اسے خفت نے آن گھیرا۔ ایک اجنبی کے سامنے بھلا اس تذکرے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اس نے ویسے ہی نگاہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ وہ پہلے سے ہی بہت محویت سے اسے تکنے میں مشغول تھا۔ نگاہوں کے تصادم پر گڑبڑا گیا۔

"اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو ایک کپ چائے میرے لیے بھی بنا دیجئے گا۔ چائے کے بغیر میرا بھی کھانا ہضم نہیں ہوتا۔" اس مغرور حسینہ کی کسیلی نگاہ کی تاب نہ لاتے ہوئے منصور نے جھٹ چائے کی فرمائش کر ڈالی۔ وہ گردن ذرا سا ہلا کر بنا کچھ کہے پلٹ گئی۔

منصور نے گہرا سانس اندر کھینچا۔ یہ اس کی زندگی کا انوکھا ترین تجربہ تھا۔ وہ خود مردانہ وجاہت کا شاہکار تھا اور اس سے بخوبی آگاہ بھی تھا۔ لڑکیاں اس پر دیوانہ وار مرتی تھیں اور جو شرم و حیا کی ماری کچھ کہنے کی ہمت نہ کر سکتی تھیں، وہ چور نگاہوں سے اسے تکتی رہتی تھیں۔ زندگی میں پہلی بار کوئی لڑکی یوں اس کے حواسوں پر چھا رہی تھی کہ اس کی موجودگی میں وہ گرد و پیش سے بے خبر ہو جاتا تھا۔ حالانکہ ابھی تک تو وہ اس کے متعلق ٹھیک سے جان بھی نہ پایا تھا۔ آج یہاں آنا اس لیے سودمند رہا کہ ماہ نیم ماہ کے متعلق کچھ معلومات کا حصول ممکن ہو گیا۔ وہ تو چائے کی ٹرے تھما کر پھر غائب ہو گئی تھی۔ منصور کو پتا تھا کہ انتظار فضول ہو گا، سو جلد ہی اجازت لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ مدثر بھی کتابیں لے کر اس کے ساتھ ہی نکلا تھا۔ اسے کمبائن اسٹڈی کے لیے کسی دوست کی طرف جانا تھا۔

"چلو یار! کیا پیدل مارچ کرو گے۔ میں ڈراپ کر دیتا ہوں۔"

اس نے مدثر کے انکار کے باوجود اسے گاڑی میں بٹھا لیا۔ دس، بارہ منٹ کے سفر میں ماہ نیم ماہ کے متعلق کچھ ضروری معلومات حاصل ہو گئی تھیں۔ وہ اپنے ماں، باپ کی اکلوتی اولاد تھی۔ ماں، باپ اس دارفانی سے کوچ کر چکے تھے۔ کچھ عرصے پہلے اس کے والد کے انتقال کے بعد سکندر احمد اسے بنگلہ دیش سے پاکستان لے آئے تھے اور اب چچا کے خاندان کے سوا دنیا میں اس کا کوئی نہ تھا۔ اس نے مدثر کو بچہ جان کر اس سے سب کچھ پوچھ ڈالا تھا، لیکن مدثر نہ تو بچہ تھا، نہ بے وقوف۔ رات گئے جب وہ گھر واپس لوٹا تو آتے ہی اس نے فیروزہ کو ساری رپورٹ دی۔ وہ تو سنتے ہی اچھل پڑی۔

"تو گویا میرا اندازہ درست نکلا۔ منصور صاحب کے یہاں چکر بلاوجہ نہیں لگ رہے۔ اگر منصور واقعی ماہ نیم ماہ کو پسند کرنے لگا ہے اور اس کے لیے سنجیدہ بھی ہو جائے تو مزا ہی آجائے گا۔" فیروزہ ایک دم پرجوش ہو گئی۔

"بندے تو وہ واقعی شان دار ہیں، لیکن کیا وہ واقعی ماہ نیم ماہ آپا کے لیے اتنے سیریس ہوں گے؟"

"تو ہماری ماہ نیم ماہ کم شان دار ہے کیا؟ اگر منصور کوئی راج کمار ہے تو وہ بھی کسی ریاست کی شہزادی لگتی ہے۔ سچ! کیسا پیارا کپل ہو گا اور وہ چھوٹی کوٹھی والیاں۔۔۔ وہ تو جل بھن جائیں گی۔" فیروزہ نے چشم تصور سے ان کے لٹکے ہوئے چہرے دیکھے اور چٹخارا لے کر کہا۔

"بری بات فیروزہ آپا! کسی کے بارے میں یوں نہیں کہتے۔" مدثر نے پھسلتی عینک دوبارہ ناک پر جماتے ہوئے بہن کو ٹوکا۔

"میں تو کہوں گی۔ ایسی مغرور لڑکیاں ہیں۔ خود کو کوہ قاف سے آئی پریاں سمجھتی ہیں۔۔۔ اور منصور پر تو ایسا حق جتاتی ہیں کہ گویا کسی اور کو اسے نظر بھر کر دیکھنے کی بھی اجازت نہیں۔ ارے! ان کے سینے پر تو سانپ لوٹ جائیں گے۔"

"پھر وہی بات فیروزہ آپا۔۔۔ اور آپ کا خود کے بارے میں کیا خیال ہے۔ ایک زمانے میں آپ خود منصور بھائی میں خاصی دلچسپی لیتی تھیں۔" مدثر اس کا ہمراز تھا، سو یاد دلائے بنا نہ رہ سکا۔ فیروزہ ہنس پڑی۔

"منصور جیسے شخص کو کوئی آنکھوں سے اندھا شخص ہی ناپسند کر سکتا ہے۔۔۔ اور میں اسے پسند ہی کرتی تھی نا! محبت تو نہیں کرتی تھی اس سے۔ خیر سے میری منگنی ہو گئی ہے۔ اب میں اجلال کے علاوہ کسی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ اگر میری بہن کے مقدر میں منصور جیسے شخص کا ساتھ لکھا ہے تو میرے لیے اس سے بڑی خوشی کی بات کوئی اور نہیں ہو سکتی۔"

"اچھا! یہ تو ہمارے مفروضے ہیں۔ ہو سکتا ہے منصور بھائی ویسے ہی ماہ نیم ماہ آپا کے متعلق پوچھ رہے ہوں۔" مدثر نے بات سمیٹ دی۔



ادھر منصور خود بھی اسی شش و پنج میں مبتلا تھا۔ کیا ماہ نیم ماہ ہی وہی لڑکی ہے، جس کی مجھے تلاش ہے۔ کہیں میں وقتی پسندیدگی میں مبتلا ہو کر اپنی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ تو نہیں کرنے جا رہا۔ اس لڑکی کے متعلق میں ٹھیک سے جانتا بھی نہیں۔ لیکن میں اس سے جتنی بار بھی مل لوں، اس کے متعلق اس سے زیادہ نہیں جان پاؤں گا، جتنا جان چکا ہوں۔ وہ مجھے سلام تک کرنے کی روادار نہیں۔ مجھ سے تفصیلی بات چیت کیسے کر سکتی ہے۔ "منصور میاں! ایسی ہی لڑکی کی خواہش رکھتے تھے نا تم۔ اب اندازہ ہوا کہ ایسی لڑکی زندگی کو کس مشکل سے دوچار کر دیتی ہے۔" وہ دل ہی دل میں ہنستے ہوئے خود سے مخاطب تھا۔



دو دن بعد چھوٹی کوٹھی میں آرزو کی برتھ ڈے پارٹی تھی۔ کیا بچکانہ پن تھا۔ میچور لڑکیاں بچوں کی طرح اب تک اپنی سالگرہ مناتی تھیں اور اس حماقت میں ان کے والدین ان کا بھرپور ساتھ دیتے تھے۔ بہرحال اسے فنکشن میں شرکت تو کرنا تھی۔ قیمتی تحفہ لے کر وہ وقت مقررہ پر چھوٹی کوٹھی میں پہنچ گیا۔ چھوٹی کوٹھی کے وسیع و عریض لان میں رنگ و بو کا سیلاب امڈا ہوا تھا۔

آرزو آسمانی میکسی میں خود کو آسمان سے اتری حور سے کم محسوس نہیں کر رہی تھی۔ منصور آیا تو وہ لہک کر اس کے پاس پہنچی۔

"کیسی لگ رہی ہوں؟" نگاہوں میں چھپا سوال سمجھنا منصور کے لیے بہت آسان تھا۔

"یو آر لکنگ ویری پریٹی۔" منصور نے اس کا دل توڑنا مناسب نہ جانا تھا۔ وہ گویا ہواؤں میں اڑنے لگی۔

"فیروزہ نظر نہیں آ رہی، کیا اسے انوائیٹ نہیں کیا؟" منصور کے اگلے سوال نے اس کی خوشی غارت کر دی۔

"ہمارے گھر کا کوئی فنکشن فیروزہ کبھی مس نہیں کرتی۔ آج صبح رسمی سا بلاوا دیا تھا۔ وقت سے پہلے ہی پہنچ گئی تھی۔" آرزو لہجے کی کڑواہٹ چھپا نہ پائی۔

"اوہ۔۔۔ انوائیٹ تو مجھے بھی صبح ہی کیا گیا ہے۔ کہیں میں بھی رسمی بلاوے پر تو شریک نہیں ہو گیا؟" منصور نے سنجیدگی سے ابرو اچکاتے ہوئے پوچھا۔

آرزو اس کی ناگواری اور ناراضی بھانپ گئی تو کھلا کر وضاحت دینے لگی۔ مگر بے سود۔ وہ آگے بڑھ چکا تھا۔ کنول شاد کے ساتھ فیروزہ کھڑی نظر آگئی تھی۔ آرزو بھی پاؤں پٹختی ہوئی مڑ گئی تھی۔

"یہ فیروزہ چڑیل منگنی کروا کر بھی منصور کا پیچھا نہیں چھوڑ رہی۔ کون سا منحوس وقت تھا، جب شہرزاد اور شہرینہ نے اس سے دوستی گانٹھی تھی۔۔۔ اور بعد میں تو رشتہ داری بھی نکل آئی۔ میرا بس چلے تو گھر میں اس کا داخلہ ہی بند کر دوں۔ لیکن شہرزاد اور شہرینہ کی جب سے منگنی ہوئی ہے، پھر سے فیروزہ کے گن گانے لگی ہیں، ورنہ پہلے وہ بھی کتنا چڑنے لگی تھیں اس سے

آرزو دل ہی دل میں کھولتے ہوئے اپنی سہیلیوں کی طرف مڑ گئی۔ لیکن تھوڑی تھوڑی دیر بعد فیروزہ، منصور اور کنول شاد کی طرف قہر بھری نگاہ ضرور ڈالتی رہی۔ جانے کیا باتیں ہو رہی تھیں کہ تینوں کی ہنسی ہی رکنے میں نہ آرہی تھی۔

"پلیز کنول! کوئی اور جوک مت سناؤ۔ میں ہنس ہنس کر تھک چکی ہوں۔" فیروزہ نے کنول شاد کے سامنے باقاعدہ ہاتھ جوڑے تھے۔

"تم ہماری فیملی میں آنے والی ہو۔ اس لیے اپنا اسٹیمنا بڑھاؤ۔ ذرا سی دیر میں ہنس کر تھک جاؤ گی تو کیسے بات بنے گی؟ تمہارے سسرال والے سب کے سب ہی بہت ہنسوڑ ہیں۔" کنول شاد نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ مستقبل میں اسے فیروزہ کی رشتے کی نند بننا تھا، وہ اسی لیے اسے اپنے خاندان والوں کے مزاج اور عادات کے بارے میں آگاہ کرتی رہتی تھی۔

"خیر! ہماری فیملی بھی کم خوش مزاج نہیں، لیکن اعتدال میں ہنستے ہیں۔ ہر وقت منہ پھاڑ کر قہقہے لگانا میری اماں کو سخت ناپسند ہے۔" اس نے مسکرا کر بتایا۔

"اس میں کوئی شک نہیں۔ تم لوگ ناپ تول کر بولتے ہو، ناپ تول کر کھاتے ہو اور ناپ تول کر ہنستے ہو اور وہ تمہاری کزن...... یار! اسے دیکھ کر تو لگتا نہیں کہ وہ زندگی میں کبھی مسکرائی بھی ہوگی۔ ویسے آج اسے کیوں ساتھ نہیں لائیں، لے آتیں اس کا دل ہی بہل جاتا۔" کنول شاد نے آخر منصور کے دل کی بات کہہ ڈالی۔

"اول تو وہ میرے اصرار کے باوجود آنے پر راضی نہ ہوتی اور دوسری بات یہ کہ اماں نے کچھ جاننے والوں کو مدعو کیا ہوا تھا۔ اماں اور بابا کی شدید خواہش ہے کہ جلد از جلد ماہ نیم ماہ کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائیں۔" فیروزہ نے بات کرتے کرتے منصور کے چہرے پر نگاہ ڈالی۔ وہ واضح طور پر چونکا تھا۔

"اچھا! چھوڑو۔ منصور پاس کھڑا ہے۔ ہم کیا اپنی اپنی باتیں لے کر بیٹھ گئے۔ اور سنائیں منصور صاحب! سنا ہے آپ اس دفعہ خاص مشن پر پاکستان آئے ہیں؟" فیروزہ نے دانستہ بات ادھوری چھوڑ کر منصور کو شگفتگی سے مخاطب کیا۔

"آں ہاں۔" وہ اپنے ہی دھیان میں گم تھا، چونکتے ہوئے فیروزہ کو دیکھا۔ پھر جیسے زبردستی مسکرایا۔

"ہر بار میرے پاکستان آنے پر کچھ افواہیں اڑا دی جاتی ہیں۔ تم لوگ یقین نہ کیا کرو۔" وہ اپنے مخصوص لاپروا سے انداز میں مسکرایا۔

"یقین کیسے نہ کریں منصور صاحب! اس بار آپ کے اطوار ہی بدلے ہوئے ہیں۔" فیروزہ دل ہی دل میں مسکرائی۔ اس نے ہوا میں تیر چلایا تھا، جو عین نشانے پر لگا۔

☼ ☼ ☼

دو دن بعد منصور پھر گھر پہنچا ہوا تھا۔ اس کی بڑی بہن نے اسی دوران صالحہ کو فون کر کے مدعا پہنچایا تھا۔

"منصور اور ماہ نیم ماہ؟" صالحہ حیران رہ گئی تھیں۔ سامنے مودب بیٹھا منصور غور سے ان کے چہرے کے تاثرات جانچ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے عفت! میں تمہارے پھوپھا جان سے مشورہ کر کے تمہیں آگاہ کروں گی۔" انہوں نے وہی جواب دیا۔ جو دینا چاہیے تھا۔

ماہ نیم ماہ کو جب منصور کے رشتے کا علم ہوا تو وہ ہکا بکا رہ گئی۔

"ایسا شان دار شخص تمہارا طلب گار ہوا ہے۔ بس تم "ہاں" کر دو۔" رشتہ اس کا آیا تھا اور شادی مرگ کی کیفیت فیروزہ پر طاری تھی۔

"منصور بھائی بہت اچھے شخص ہیں آپا! آپ ان کے ساتھ خوش رہیں گی۔" مدثر بھی بہن کا ہم نوا تھا۔

"دیکھو بیٹا! میں تمہیں کہتا تھا کہ نا کہ زندگی میں تمہارے حصے کی خوشیاں موجود ہیں، جو وقت آنے پر تمہیں ضرور ملیں گی۔ منصور میں وہ سب خوبیاں موجود ہیں جو میں تمہارے شریک سفر میں چاہتا تھا۔ بلکہ سچ پوچھو تو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میں تمہارے لیے اتنا اچھا بر ڈھونڈ پاؤں گا۔ اگر تم "ہاں" کر دیتی ہو تو میں روز محشر بھائی صاحب کے سامنے سرخرو ہو جاؤں گا۔" چچا جان نے اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے مخاطب کیا۔

"میں ابھی ذہنی طور پر شادی کے لیے تیار ہی نہیں ہوں۔" وہ سب کی سن چکی تو صالحہ کے پاس جا کر آنسو بہاتے ہوئے انہیں اپنی ذہنی کشمکش سے آگاہ کیا۔

"دیکھو بیٹا! جلد یا بدیر شادی تمہیں کرنا ہی ہے۔ اگر تمہیں منصور میں کوئی خرابی نظر آتی ہے تو ٹھیک ہے، اسے بنیاد بنا کر انکار کر دو۔ لیکن بلاوجہ انکار مت کرو۔ تم سوچنے کے لیے وقت لو۔ لیکن جذباتی بن کر مت سوچنا۔ عملی زندگی کے حقائق کو سامنا رکھنا۔ مانا! ابھی تم بھائی صاحب کے غم سے نہیں نکلی ہو۔ لیکن بیٹا! کسی بہت اپنے کے بچھڑنے کے باوجود زندگی کے تقاضوں سے منہ نہیں موڑا جا سکتا۔ زندگی کا سفر تو جاری و ساری رہتا ہے۔ اور اگر قسمت سے اچھا شریک سفر مل جائے تو اس سے بڑی خوش بختی اور کیا ہو سکتی ہے؟"

صالحہ نے بہت پیار اور رسان سے اسے سمجھایا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔ اس کی ماں کو بچھڑے ایک زمانہ بیت گیا تھا۔ ذہن کے پردے پر موجود ماں کے نقش تک دھندلا گئے تھے۔ لیکن سامنے بیٹھی عورت اب اسے اپنی ماں جیسی ہی لگنے لگی تھی۔ اس نے سب کی خواہش پر سر جھکا دیا۔

☼ ☼ ☼

ایک شام سادہ سی تقریب میں اس کی انگلی میں منصور کے نام کی انگوٹھی پہنا دی گئی۔ منصور کی خالہ رسم کرنے آئی تھیں۔ چھوٹی کوٹھی سے کوئی تقریب میں شرکت کرنے نہ آیا۔ البتہ اگلی صبح بڑی مامی تنتناتے ہوئے پہنچی تھیں۔

"بہت خوب صالحہ! ہیرے جیسا لڑکا پھانس ہی لیا۔ پہلے بیٹی کو آگے کر رکھا تھا۔ جب دال نہیں گلی تو جیٹھ کی بیٹی سے منصور پر ڈورے ڈلوائے۔ کیا تم نہیں جانتیں کہ منصور کے مرحوم باپ کی خواہش تھی کہ چھوٹی کوٹھی کی کوئی لڑکی ان کی بہو بنے؟"

"اپنے مرحوم باپ کی خواہش کا پاس منصور کو رکھنا چاہیے تھا۔ یہ رشتہ سراسر اس کی رضامندی اور پسند پر طے ہوا ہے۔ آپ کو ہم سے جواب طلبی کا کوئی حق نہیں۔" صالحہ کا چہرہ غصے کی شدت سے تمتما گیا تھا۔

مامی پاؤں پٹختے ہوئے واپس چلی گئیں۔ صالحہ نے فیروزہ کو بلا کر سختی سے سمجھایا تھا۔

"تمہیں من مانی کرنے کی بہت عادت ہے فیروزہ! لیکن آج کے بعد تم چھوٹی کوٹھی گئیں تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔" فیروزہ نے ماں کو بہت کم اتنا غصے میں دیکھا تھا، سو سر ہلانے میں ہی عافیت جانی۔ البتہ بڑی کوٹھی فون کھڑکا کر منصور کو ساری بات بتا ڈالی۔ شرمندہ شرمندہ سا منصور شام کو معذرت کرنے چلا آیا۔

"ارے نہیں بیٹا! جب قصور تمہارا نہیں تو معذرت تم کیوں کرو۔ اور رات گئی، بات گئی۔ ہر کسی کا اپنا اپنا ظرف ہوتا ہے۔ ہمیں کسی سے کوئی گلہ نہیں۔"

"پھوپھی جان! اگر آپ اجازت دیں تو میں ماہ نیم ماہ سے مل لوں۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ لوگوں کی باتیں سن کر کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ ہمارے درمیان اعتبار اور اعتماد کا رشتہ سب رشتوں سے پہلے استوار ہو۔" اس نے جھجکتے ہوئے اپنی خواہش سے آگاہ کیا۔ صالحہ نے بہت خوش دلی سے اس کی بات مان لی۔

ماہ نیم ماہ منصور کے سامنے آنے پر گھبرا رہی تھی۔ فیروزہ اس کا ہاتھ پکڑ کر ڈرائنگ روم میں لے آئی۔ صالحہ پہلے ہی باورچی خانے کی راہ لے چکی تھیں۔ فیروزہ دونوں کو تخلیہ فراہم کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اب اس کا ہاتھ ماہ نیم ماہ کی گرفت میں تھا۔ اس نے بے بسی سے منصور کو دیکھا۔

"بیٹھ جاؤ تم بھی۔ تمہاری غیر موجودگی میں محترمہ ایک منٹ نہیں بیٹھیں گی۔" منصور نے مسکرا کر

فیروزہ کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"تمہیں جو کہنا ہے منصور! کھل کر بات کرلینا۔ یوں سمجھو! میرے کان بند ہیں۔" فیروزہ شریر ہوئی تھی۔ منصور ہنس پڑا۔ پھر ماہ نیم ماہ کے جھکے سر کو دیکھا۔

"ماہ نیم ماہ۔" اس نے رک رک کر نام لیا تھا۔

"آپ کا نام بہت خوب صورت ہے۔ لیکن بہت لمبا بھی ہے۔ کیا میں آپ کو صرف "ماہے" کہہ سکتا ہوں؟" وہ نرم لہجے میں مخاطب تھا۔

"ایسا غضب مت کرنا منصور! دنیا میں ماہ نیم ماہ کو "ماہے" کہنے کا حق صرف اس کے ابا میاں کو حاصل تھا۔ ہم نے لاکھ منتیں کرلیں۔ مگر ہمیں یہ کہنے کی اجازت نہیں ملی اور تم ہو کہ۔۔۔"

"شاید تم نے کان بند کر رکھے تھے فیروزہ!" منصور نے مسکراتے ہوئے اسے ٹوکا۔ وہ ہنس پڑی۔

"جی تو ماہے۔۔۔!" وہ پھر رکا۔ ماہ نیم ماہ نے نگاہیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

"اجازت ہے نا؟" اس کی آنکھوں میں شرارت مسکرا رہی تھی۔

"آپ کو جو کہنا ہے' پلیز! جلدی کہیے۔" ماہ نیم ماہ نے تیزی سے دھڑکتے دل کو قابو میں کرتے ہوئے سنجیدگی ظاہر کی۔

"دیکھیں! میں چند دنوں بعد واپس باہر جارہا ہوں۔ میری خواہش تو تھی کہ نکاح ہو جاتا۔ تاکہ آپ کے کاغذات وغیرہ بنوانے میں آسانی ہو جاتی۔ لیکن آپ اس کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں' میں آپ کی ذہنی کیفیت سمجھ سکتا ہوں۔ اسی لیے میں نے اپنی بات پر اصرار نہیں کیا۔ لیکن میں تین ماہ بعد واپس آؤں گا۔ کیا میں امید رکھوں کہ اس وقت تک آپ شادی یا چلیں' کم از کم نکاح کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو چکی ہوں گی؟"

"کیوں نہیں ہوگی؟ تم فکر نہ کرو! یہ ذمہ داری میری۔" فیروزہ پھر بول پڑی۔

"فیروزہ! اگر تم کان بند نہیں کر سکتیں تو کم از کم زبان ہی بند کرلو۔" منصور نے اسے مصنوعی خفگی سے گھورا۔ فیروزہ نے مسکراتے لبوں پر انگلی رکھ لی۔

"میں آپ سے صرف یہ کہنے آیا تھا ماہے! کہ آپ کو میرے متعلق بہت سی الٹی سیدھی باتیں سننے کو ملیں گی۔ فیروزہ کے ماموں میرے ابو کے سگے چچازاد بھائی ہیں۔ ہمارے آپس میں بہت قریبی تعلقات ہیں۔ لیکن بخدا! ان لڑکیوں میں سے میری کسی سے کوئی کمٹمنٹ نہیں تھی۔ وہ لوگ آج کل بہت سے پر کی اڑا رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی خواہش کو دل میں حقیقت جان لیا تھا۔ یہ بات میں بہت لوگوں کے منہ سے پہلے بھی سن چکا تھا کہ چھوٹی کوٹھی میرا سسرال ہے۔ میں ہر دفعہ ایسی باتیں سن کر ہنسی میں اڑا دیتا تھا' لیکن میرے سسرال والوں کو جب سے میری منگنی کا پتا چلا ہے تو وہ بہت اپ سیٹ ہو گئے ہیں۔ میں ان لوگوں کی نیچر سمجھتا ہوں۔ وہ تمہیں بھی مجھ سے بدظن کرنے کے لیے کسی بھی جھوٹ کا سہارا لے سکتے ہیں۔ لیکن یقین کرو! میں نے تم سے پہلے کسی کو اس نگاہ سے دیکھا تک نہیں۔ تم نے پہلی نگاہ میں ہی میرے دل تک رسائی حاصل کرلی تھی۔ تمہارا مجھے علم نہیں۔ لیکن میں پہلی نظر کی محبت میں ہی مبتلا ہوا ہوں۔"

وہ اسے وارفتگی سے تکتے ہوئے بول رہا تھا۔ ماہ نیم ماہ کی ہتھیلیاں پسینہ پسینہ ہوئے جارہی تھیں۔ اتنا کھلم کھلا اظہار محبت اور وہ بھی فیروزہ کے سامنے۔ اس کے بعد میں تو چھیڑ چھیڑ کر حشر ہی کر دینا تھا۔

"ویسے آپ میرے ساتھ پر خوش تو ہیں نا؟" وہ پوچھ رہا تھا۔ ماہ نیم ماہ جو اپنے دل کے کواڑ بند کرنے کی کوشش میں ناکام ہوئے جارہی تھی' سوال سن کر گھبرا ہی تو گئی۔

"پتا نہیں۔" عجیب لٹھ مار انداز تھا اس کا۔ منصور کے چہرے کی مسکراہٹ یکلخت سمٹ گئی۔ مگر اگلے ہی پل وہ ہنس پڑا۔

"ٹھیک ہے! آپ پتا کر کے رکھیں۔ پتا چل جائے تو مجھے آگاہ کر دیجیے گا۔ میں انتظار کروں گا۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ماہ نیم ماہ نے ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"اللہ حافظ۔" منصور نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔ وہ پھر سے نگاہیں جھکا گئی۔

فیروزہ' منصور کو چھوڑنے دروازے تک گئی تھی۔ واپس اس پر چڑھ دوڑی۔

"وہ کوئی ایرا غیرا نتھو خیرا نہیں تھا ماہ نیم ماہ! تمہارا منگیتر تھا۔ تم نے اس کے ساتھ کتنا روڈلی بی ہیو کیا ہے۔ کیا تم واقعی خوش نہیں ہو؟"

"پتا نہیں فیروزہ! بس میں شدید قسم کے احساس جرم میں مبتلا ہو رہی ہوں۔ ابھی ابا میاں کو بچھڑے عرصہ ہی کتنا ہوا ہے اور میں اتنی جلدی انہیں بھول کر زندگی کی رنگینیوں اور رعنائیوں کی طرف متوجہ ہو رہی ہوں۔ تم لوگوں سے منصور کی بار بار تعریفیں سن کر شاید میں خود منصور کی شخصیت کے سحر میں گرفتار ہو رہی ہوں۔ میں بھی تو ایک عام سی لڑکی ہی ہوں نا۔ میں دل و دماغ کی کشمکش کے آگے ہار رہی ہوں۔"

"میں ابا سے کہوں گی کہ تمہیں کسی اچھے سے ماہر نفسیات کے پاس لے جائیں۔ تمہارے پاگل پن کا علاج ہمارے پاس تو نہیں۔" وہ جو فیروزہ کے منہ سے تسلی کے دو بول سننے کی منتظر تھی۔ حیران ہو کر اس کی شکل تکنے لگی۔

"تم صرف فضول کی خود ترسی میں مبتلا ہو ماہ نیم ماہ! زندگی آگے بڑھ کر تمہارے دامن میں خوشیاں ڈال رہی ہے۔ اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے اپنے حصے کی خوشیاں وصول کرو۔ تم یہ کیوں سوچتی ہو کہ تایا جان کے بعد تم اگر دوبارہ زندگی خوشی خوشی جینے لگوگی تو اس کا مطلب ہے کہ تم نے انہیں بھلا دیا؟ پلیز ماہ نیم ماہ! اپنے سوچنے کا انداز بدلو' ورنہ تم واقعی نفسیاتی مریض بن جاؤگی۔" فیروزہ نے آج اس کے ساتھ ہمدردی جتانے کے بجائے اسے ڈپٹ کر سمجھانا بہتر جانا تھا۔ ماہ نیم ماہ بے بسی سے لب کچلتی رہی۔

"اس شریف شخص کے ساتھ تم نے اچھا نہیں کیا۔ کس چاہت سے اس نے تمہارا ہاتھ مانگا۔ آج کے دور میں وہ پہلی نگاہ کی محبت کی بات کرتا ہے نہ صرف بات کرتا ہے۔ بلکہ اس نے ثبوت بھی دیا۔ محض دو بار کی ملاقات۔۔۔ بلکہ ملاقات سے زیادہ آمنا سامنا کہنا مناسب ہوگا۔ اور اس نے بالکل سیدھا راستہ اپناتے ہوئے تمہارا رشتہ بھجوا دیا۔ بات پکی ہونے کے بعد تم سے بات چیت کی خواہش کا اظہار کیا۔ اسے خدشہ تھا کہ چھوٹی کوٹھی والے تمہیں اس سے بدظن کرنے کے لیے کوئی بھی ہتھکنڈا استعمال کر سکتے ہیں۔ اس نے تمہیں سب سے پہلے اپنی ذات کا مان اور اعتبار دیا اور تم نے کیا' کیا بے چارے کے ساتھ؟ اک ذرا سا سوال ہی پوچھا تھا اس نے کہ تم اس کے ساتھ پر خوش ہو' کیسے منہ پھاڑ کر کہہ دیا۔ "پتا نہیں۔"" فیروزہ نے اس کی نقل اتاری۔

"اچھا! بس کرو فیروزہ! میں پہلے ہی شرمندہ ہو رہی ہوں۔" اس نے روہانسی ہو کر اسے ٹوکا۔

"ایک شرط پر چپ ہوں گی۔ اگر تم مجھے ایک سوال کا سچ سچ جواب دوگی۔" فیروزہ سنجیدہ تھی۔

"پوچھو" ماہ نیم ماہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تمہیں منصور اچھا لگنے لگا ہے نا؟" فیروزہ سنجیدگی کا چولا اتارتے ہوئے شرارتی ہوئی۔

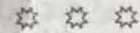
"تم لوگوں نے ان کی اتنی تعریفیں جو کردی ہیں۔ برے کیسے لگ سکتے ہیں؟" اس نے پہلو بچایا۔

"بی بنو! ہماری تعریفوں سے کچھ نہیں ہوا ہے۔ میں نے تو ہمیشہ ہی منصور کی تمہارے سامنے تعریف کی تھی۔ لیکن پہلے تمہیں اس کی اچھائی' برائی سے کوئی سروکار ہی نہ تھا۔ تم دونوں کے بیچ جڑا یہ تعلق ہے' جو تمہیں اس کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ یقین کرو! وہ اجلال ہے نا' مجھے پہلی نظر میں ایک دم ڈفر لگا تھا۔ میں نے صرف اس کے اسٹیٹس کی وجہ سے اس سے منگنی پر ہامی بھری تھی۔ لیکن منگنی کے بعد مجھے وہ اچھا لگنے لگا ہے۔۔۔ تو منصور جیسے شان دار شخص سے منگنی کے بعد بھی تم اسے پسند نہ کرنے لگتیں تو مجھے یقین آجاتا کہ تمہارے سینے میں دل کے بجائے پتھر فٹ ہے۔"

"منگنی تو میری علی سے بھی ہوئی تھی' لیکن اس کا سامنا کرنے پر تو میرا دل یوں نہیں دھڑکتا تھا' جیسے آج دھڑک رہا تھا۔" اس نے کہا۔ فیروزہ کو اس کی معصومیت پر ڈھیروں پیار آگیا۔

وہ اس لیے ڈر کہ علی تم سے محبت نہیں کرتا تھا۔ اگر محبت کرتا تو کسی گوری کے چکر میں پڑ کر تمہیں چھوڑ نہ دیتا اور منصور تو آیا ہی گوریوں کے دیس سے ہے۔ وہاں رہ کر بھی نہ تو وہ خود کسی کی زلف کا اسیر ہوا' نہ کسی کو اپنے دام میں پھنسایا۔ تم جیسی خالص لڑکی ہی اس کی خالص محبت کی حق دار ہے۔ یہ اس کی محبت کی طاقت ہے' جس نے تمہارے اندر جینے کی امنگ جگائی ہے۔ میں اگر دادا ابا کی طرح لکھنے کے ہنر سے آشنا ہوتی نا! تو پہلی نگاہ کی محبت پر ضرور ایک ناول لکھ مارتی۔"

فیروزہ کے کہنے پر وہ مسکرادی۔ زندگی اگر ناول ہوتی تو یقیناً" اس کا اختتام یہیں پر ہو جاتا۔ لیکن یہ ناول نہیں' حقیقی زندگی تھی' جس میں ابھی بہت کچھ ہونا باقی تھا۔



ایک ہفتے بعد بنگلہ دیش سے شمس الحسن صاحب اور ان کی بیوی پاکستان آئے تھے۔ بہت عاجزی اور منت سے چچا جان سے دوبارہ ماہ نیم ماہ کا ہاتھ مانگ رہے تھے۔

علی بنگلہ دیش واپس لوٹ آیا تھا۔ قلیل عرصے میں ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس نے ماہ نیم ماہ کو چھوڑ کر کتنی عظیم حماقت کا ارتکاب کیا ہے۔ وہ جس گوری کے چکر میں پھنسا تھا' اس نے علی کی زندگی اجیرن کردی تھی۔ کتنی مشکلوں سے اس سے پیچھا چھڑا کر وہ وطن واپس لوٹا تھا۔ یہ الگ کہانی تھی۔ اس نے ماں' باپ کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگی۔ معافی مل گئی۔ اگلے مرحلے میں اس نے اسی انمول لڑکی کا ساتھ مانگا' جو اس کے لیے قدرت کا قیمتی تحفہ تھا۔ مگر جس کا احساس اسے بہت بعد میں ہوا۔

شمس الحسن صاحب تو پہلے ہی ابا میاں کے اچانک انتقال پر خود کو مجرم محسوس کرتے تھے۔ سو ماہ نیم ماہ کے سر پر دوبارہ دست شفقت رکھنے کی آرزو لے کر چچا جان کے پاس پہنچے تھے۔ چچا جان نے گھر آئے مہمانوں کی حتی المقدور تواضع کی تھی' مگر ان کی خواہش پوری کرنے سے معذوری کا اظہار کر دیا۔ ماہ نیم ماہ کی منگنی کے بارے میں جان کر وہ لوگ اپنی خواہش سے ویسے بھی دست بردار ہو گئے تھے۔ چار دن پاکستان میں گزار کر وہ واپس لوٹ گئے۔ ان کے آنے سے ماہ نیم ماہ پھر سے ذہنی طور پر منتشر ہو گئی۔ گزرا وقت' جان سے پیارے ابا میاں اور بچھڑی سرزمین پھر سے شدت سے یاد آنے لگے تھے۔

اس روز کنول شاد فیروزہ سے ملنے آئی تو ماہ نیم ماہ کی متورم آنکھیں دیکھ کر فیروزہ سے پوچھے بنا نہ رہ پائی۔

"آخر اس لڑکی کو کیا غم ہے' جو منصور جیسے شخص کا ساتھ بھی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لانے کا سبب نہیں بن پایا؟"

"منصور کے ساتھ پر ماہ نیم ماہ بہت خوش ہے کنول! لیکن تم خود سوچو! کوئی پودا جڑ سے اکھاڑ کر دوسری جگہ لگایا جائے تو نئے ماحول سے مطابقت اختیار کرنے میں کچھ وقت تو لگتا ہے نا! اللہ اللہ کر کے ماہ نیم ماہ گزشتہ زندگی کی یاد سے پیچھا چھڑا کر زندگی کا از سر نو آغاز کر رہی تھی کہ اس کے سابقہ سسرال والے پھر سے یادوں پر کھرنڈ نوچنے پہنچ گئے۔"

فیروزہ نے کنول شاد کے سامنے دل کی کھولن باہر نکالی۔ کنول شاد نے فطری تجسس سے مغلوب ہو کر پوری بات سنی تھی۔ فیروزہ کو اندازہ ہی نہ ہوا کہ وہ کیا غضب کر بیٹھی ہے۔

ایک ہفتے بعد منصور کی واپسی تھی۔ صالحہ نے منصور کو کھانے پر مدعو کیا ہوا تھا۔ مگر وہ کھانے پر نہ آیا۔ اگلے دن جب اس کا طیارہ وطن کی فضاؤں سے دور نکل گیا۔ تب صالحہ کو اس کا رقعہ موصول ہوا تھا۔

"جو بندھن میں نے جلد بازی میں باندھا تھا۔ میں ماہ نیم ماہ کو اس سے آزاد کرتا ہوں۔ آپ لوگ اس کی زندگی سے متعلق کسی بھی قسم کا فیصلہ کرنے میں آزاد ہیں۔"

اس شام گھر میں جیسے مرگ کا سا سماں تھا۔ سکندر احمد کے شانے ڈھلک گئے تھے۔ صالحہ' ماہ نیم ماہ سے نگاہیں نہ ملا پا رہی تھیں۔ مدثر سخت طیش میں تھا اور فیروزہ کا تو بس نہ چل رہا تھا کہ کہیں سے منصور سامنے آئے اور وہ اس کا منہ نوچ لے۔

اس کی خالہ جنہوں نے ماہ نیم ماہ کو منگنی کی انگوٹھی پہنائی تھی' ان سے رابطہ کیا۔ وہ تو منصور کی واپسی تک سے لاعلم تھیں۔ صالحہ منصور کی بڑی بہن سے رابطہ کرنا چاہتی تھیں' مگر سکندر نے منع کر دیا۔

"ہم سے غلطی ہوئی صالحہ! غلطی تسلیم کر لینی چاہیے۔ منصور کی قابلیت' وجاہت اور دولت سے اتنا مرعوب ہوئے کہ اس رشتے کے کسی اور پہلو پر غور ہی نہیں کیا۔ جس لڑکے کی بیرونی ملک رہائش گاہ کا پتا تک ہمیں معلوم نہیں' ہم اس کے ہاتھ میں اپنی بیٹی کا ہاتھ دے رہے تھے۔" سکندر احمد شدید ترین پچھتاوے میں مبتلا ہو رہے تھے۔

"آخر منصور نے رشتہ کیوں توڑا؟ وجہ جاننے کا تو ہمیں حق حاصل ہے نا؟"

صالحہ کے دل کے کسی گوشے میں ابھی بھی خوش گمانی موجود تھی۔ ان کا خیال تھا کہ منصور کو کوئی غلط فہمی لاحق ہوئی ہے' ورنہ یہ رشتہ تو سو فیصد اس کی پسند اور خوشی سے طے پایا تھا۔ اگر کسی طرح منصور سے رابطہ ممکن ہوتا تو شاید الجھی ڈور کا کوئی سرا ہاتھ لگ جاتا۔ مگر منصور سے کسی طور رابطہ ہی ممکن نہ ہو رہا تھا۔ اور تو اور اس کی بڑی بہن' جس نے منصور کے ایما پر رشتے کی بات کی تھی' وہ بھی اب فون اٹھانے کی روادار نہ تھی۔ چھوٹی کوٹھی والوں سے منصور کا اتا پتا مل سکتا تھا۔ لیکن وہ اس معاملے میں تعاون کیونکر کرتے؟ ان کی تو دلی مراد بر آئی تھی۔

فیروزہ تو کہتی بھی تھی کہ ماہ نیم ماہ ان ہی کی نظر اور حسد کا شکار ہوئی ہے۔ حیرت انگیز طور پر ماہ نیم ماہ نے بہت بردباری اور سمجھ داری سے صورت حال کا سامنا کیا۔ وہ ایک دو دن تو گم صم رہی' مگر پھر اس نے ایسا ظاہر کرنا شروع کر دیا' جیسے اسے اس بات سے کوئی فرق ہی نہ پڑا ہو۔ بلکہ جو قنوطیت اس پر پہلے طاری رہتی تھی' اب اس کی جگہ خوش مزاجی نے لے لی تھی۔ فیروزہ اس بات پر بھی اس سے الجھ پڑی۔

"تم یوں پوز کیوں کرتی ہو' جیسے تمہیں رشتہ ٹوٹنے پر کوئی افسوس نہ ہو؟ تم ہمیں غیر سمجھتی ہو نا؟ پریشانی اور دکھ بانٹنے سے کم ہوتے ہیں۔ میرے ساتھ مل کر اس کو گالیاں ہی دے کر دل کا بوجھ ہلکا کر لو۔ مگر تم تو اپنا غم چپ چاپ اپنے اندر اتارے جا رہی ہو آخر کیوں ماہ نیم ماہ؟" فیروزہ کی بات پر اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

"پتا ہے فیروزہ! جب علی سے میری منگنی ٹوٹی تھی تو ان دنوں ابا میاں مجھ سے یوں آنکھیں چراتے تھے جیسے سارا قصور ان کا ہو۔ انہوں نے میرے لیے جیون ساتھی کے انتخاب میں بہت بڑی غلطی کا ارتکاب کر دیا ہو۔ میرے ابا میاں اس پچھتاوے کو لے کر اس دنیا سے ہی رخصت ہو گئے اور اب دوبارہ ویسی ہی صورت حال در پیش ہے۔ میں جانتی ہوں چچا جان نے میری زندگی سے متعلق فیصلہ پوری نیک نیتی سے کیا تھا۔ اگر اس بار بھی میری قسمت آڑے آ گئی ہے تو اس میں چچا جان یا چچی جان کا تو کوئی دوش نہیں' لیکن مجھے ان کی آنکھوں میں ویسے ہی پچھتاوے جھلکتے ملتے ہیں' جو میرے ابا میاں کو دیمک کی طرح چاٹ گئے۔ میں اپنے سے محبت کرنے والی ہستیوں کو ہرگز کسی شرمندگی میں مبتلا نہیں دیکھ سکتی فیروزہ!" وہ رو پڑی۔

"منصور نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا فیروزہ! میرے دل کا کاغذ تو بالکل کورا تھا۔ جب اس نے مجھ سے اپنی پہلی نگاہ کی محبت کا اقرار کیا' تب خود بخود میرے دل کی سرزمین پر بھی محبت کی کونپل پھوٹنے لگی تھی۔ اس نے کہا تھا نا کہ میں پتا کر کے رکھوں کہ میں اس کے ساتھ پر خوش ہوں بھی یا نہیں.... اور جب مجھے اس کے سوال کا جواب ملا تو وہ ساتھ ہی چھوڑ گیا۔"

وہ آخر فیروزہ کے ساتھ دکھ بانٹنے پر راضی ہو گئی تھی۔ فیروزہ نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ وہ واقعی اک لڑکی ہی تو تھی۔ جذبات و احساسات رکھنے والی لڑکی' جس کے سینے میں یقیناً" پتھر کے بجائے دل ہی دھڑکتا تھا۔ فیروزہ کا رواں رواں اپنی اس پیاری سی کزن کے

لیے دعاگو تھا۔



وقت کا کام گزرنا ہے' سو اپنی رفتار سے گزرتا رہا۔ فیروزہ کے سسرال والوں نے شادی کا تقاضا کیا تو صالحہ اور سکندر نے بیٹی پیا سنگ رخصت کردی۔ سکندر کی پھوپھی زاد بہن اپنے منجھلے بیٹے کے لیے ماہ نیم کا رشتہ لے آئیں۔ لڑکا پڑھا لکھا تھا۔ مگر شکل و صورت کا واجبی سا تھا۔ پھوپھی کا کنبہ بڑا تھا۔ مالی حالات بھی کچھ زیادہ اچھے نہ تھے۔ سکندر انکار کرنا چاہتے تھے' مگر ماہ نیم ماہ نے انہیں عارف کے بارے میں مثبت عندیہ دے کر مخمصے میں ڈال دیا۔ فیروزہ کو پتا چلا تو وہ بھی دوڑی آئی۔

"خبردار! جو اس کے لیے "ہاں" کی۔ اماں بابا بھی اس رشتے کے لیے دل سے راضی نہیں ہیں۔ تم نے آخر کیا سوچ کر "ہاں" کی ہے۔"

"چچا جان میری وجہ سے بہت پریشان رہتے ہیں۔ میں انہیں اپنی ذمہ داری سے آزاد کرنا چاہتی ہوں اور عارف میں کوئی ایسی برائی بھی نہیں۔ اس کی ماں کا مزاج تیز ہے۔ لیکن خیر ہے! میں گزارہ کرلوں گی۔ تم ہرگز چچا جان یا چچی جان کو کوئی پٹی نہیں پڑھاؤ گی۔ ویسے بھالے لوگ ہیں۔ میرا نباہ بہت آسانی سے ہوجائے گا۔" وہ رسانیت سے بولی۔

فیروزہ دکھ سے اس کی شکل دیکھ کر رہ گئی۔ کتنا فرق آگیا تھا ماہ نیم ماہ میں۔ کتنی سنجیدہ' بردبار اور سمجھ دار ہوگئی تھی۔ فیروزہ کی شادی کے بعد اس نے واقعی صالحہ اور سکندر کو بیٹی بن کر دکھایا۔ گھر کی ساری ذمہ داری کس خوش اسلوبی سے اٹھالی تھی ورنہ جب وہ یہاں آئی تھی تو شروع شروع میں بالکل مہمانوں کی طرح لاتعلق بنی رہتی تھی اور اب اسے دیکھ کر لگتا تھا جیسے وہ ہمیشہ سے اس گھر کا حصہ ہو۔

"کاش میں مدثر کی جگہ پیدا اور مدثر میری جگہ پیدا ہوگیا ہوتا۔" فیروزہ کا قلق زبان پر آگیا۔

"مدثر چاہے جس کی جگہ بھی پیدا ہوتا وہ میرے لیے صرف بھائی ہوتا۔ تم نے اگر مجھے بہن کے مزے سے روشناس کروایا ہے نا فیروزہ تو مدثر نے میرے بھائی کی کمی پوری کی ہے اور اب تمہاری بہن شادی شدہ زندگی کے مزے اٹھانا چاہ رہی ہے تو تم آگئی ہو روڑے اٹکانے۔" اس نے مصنوعی خفگی دکھائی۔ فیروزہ بدقت مسکرائی تھی۔

ماہ نیم ماہ پر نظر ڈالتے ہی اسے منصور شدت سے یاد آتا تھا اس کی شہزادیوں جیسی بہن منصور کی نہ سمجھ آنے والی زیادتی کا شکار ہوگئی تھی ورنہ کیسا پیارا کپل لگتا تھا دونوں کا جیسے دونوں بنے ہی ایک دوسرے کے لیے ہوں اور وہ چھچھورا سا عارف فیروزہ کا بس نہ چل رہا تھا کہ وہ اسے اٹھا کر ڈرائنگ روم سے باہر پھینک دے اس وقت وہ اپنی ماں کے ساتھ موجود تھا۔ پھوپھی جلد شادی چاہتی تھیں اور شادی سے پہلے کے معاملات طے کرنے آئی تھیں۔

"ہم نے سنا تھا' بنگلہ دیش میں ماہ نیم ماہ کے نام مکان بھی ہے۔ اس بات میں کہاں تک سچائی ہے بھیا! اور وہ مکان بنگلہ دیش میں پڑے پڑے انڈے بچے تو دے گا نہیں۔ اسے بیچ باچ کر ماہ نیم ماہ کے اکاؤنٹ میں رقم جمع کروا دو۔" چائے میں بسکٹ ڈبو کر کھاتے ہوئے پھوپھی نے آخر تھیلے سے بلی باہر نکالی تھی۔

"وہ مکان۔۔۔" سکندر احمد نے گلا کھنکھارا۔ ماہ نیم ماہ متوحش ہوکر کبھی چچا اور کبھی ہونے والی ساس کو دیکھ رہی تھی۔

"اس مکان میں تایا جان کے ایک شاگرد نے بے سہارا اور لاوارث بچوں کے لیے ایک ادارہ قائم کیا ہوا ہے۔ ماہ نیم ماہ نے بہ رضا و رغبت اپنا مکان مع سازوسامان اس ادارے کو عطیہ کردیا ہے۔ یہ آج کی نہیں بہت پرانی بات ہے۔ بنگلہ دیش سے آتے ہوئے ماہ نیم ماہ اپنے ساتھ صرف اپنی تعلیمی اسناد' تصویریں' چند کپڑے اور تھوڑی بہت ضروری چیزیں لائی تھی۔" فیروزہ نے سپاٹ اور سنجیدہ لہجے میں پھوپھی کو جواب دیا۔ دونوں ماں بیٹے نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"ماہ نیم ماہ کی پہلے بھی دو منگنیاں ٹوٹی ہیں۔ وجہ پوچھ سکتا ہوں۔" عارف صاحب نے آج وجہ جاننے کی زحمت کی۔

"ابا! میں اپنا یہ مکان ماہ نیم ماہ کے نام کردیتا ہوں۔" سکندر احمد نے جیسے اس کا سوال سنا ہی نہیں تھا۔ ماہ نیم ماہ نے تڑپ کر چچا کو دیکھا۔ اس کے ابا میاں کا عکس' جنہوں نے ابا میاں کے بعد اسے اپنی پیار بھری چھاؤں میں رہنے کو جگہ دی تھی۔ ان کی ساری زندگی کی پونجی' ان کی نیک نامی اور مادی چیزوں میں فقط یہ مکان ہی تو تھا۔ عارف گردن اٹھا کر مکان کے رقبے کا اندازہ لگانے لگا۔

"جہاں میری دو منگنیاں ٹوٹی ہیں۔۔۔ تیسری یہ بھی سہی۔" اس نے برائے نام وزن والی سونے کی انگوٹھی' جو ہفتہ بھر پہلے پھوپھی نے اسے پہنائی تھی' انگلی سے اتار کر پھوپھی کو تھمادی۔

"توبہ توبہ! ایسی خود سر لڑکی ہے۔ بڑوں کے بیچ میں بات چیت طے ہورہی ہے اور کیسے جھٹ سے انگوٹھی اتار کر اپنا فیصلہ سنا دیا سکندر میاں! یہ ہمارا ہی ظرف تھا' جو ہم آنکھوں دیکھی مکھی نگل رہے تھے۔ ورنہ کوئی تو بات ہوگی' جو اس کی حسین صورت کے باوجود دو دو بار اس کی منگنی ٹوٹی ہے۔ اللہ جانے وہاں بنگال میں کیسا چال چلن ہوگا اس کا۔"

"آپا! آپ میرے ہی گھر میں بیٹھ کر میری بیٹی پر کوئی کیچڑ نہیں اچھال سکتیں۔ میں ماہ نیم ماہ کے فیصلے کی تائید کرتا ہوں۔ ہمیں یہ رشتہ قبول نہیں۔" سکندر احمد اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ مہمانوں کو جانے کا اشارہ تھا۔ دونوں ماں بیٹا اول فول بکتے رخصت ہوگئے۔

"خس کم جہاں پاک۔" فیروزہ نے ان کے جانے کے بعد دھاڑ سے دروازہ بند کیا۔ چچا جان ہارے ہوئے جوارے کی طرح صوفے پر سر پکڑ کر بیٹھے تھے۔ صالحہ انہیں تسلی' دلاسا دینے لگیں۔

ماہ نیم ماہ آنسو پیتے ہوئے کمرے میں چلی گئی۔ اس کی ذات نے ہمیشہ اس کے پیاروں کو آزمائش اور دکھ میں مبتلا کیا تھا۔ چچا جان کے ہاں آکر اسے پیار' محبت مان سب کچھ ملا تھا۔ لیکن وہ اس کی تقدیر اور قسمت سے تو نہیں لڑسکتے تھے نا۔ اس نے اپنے ہاتھ کی لکیروں کو دیکھا۔ اس کے لبوں پر پھیکی مسکراہٹ ابھر آئی۔

اتنے میں فیروزہ کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کی پرخلوص دوست اور بہن جو ہمیشہ اسے آنسو بہانے کے لیے اپنا کندھا فراہم کرتی تھی اور پھر اس کے آنسو پونچھتی بھی رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ سوچتی کہ کاش! وہ چچا جان کے ساتھ پاکستان نہ ہی آتی۔ اس کی وجہ سے یہ خاندان بلاوجہ کی ٹینشن میں مبتلا تھا۔ ورنہ کیا خوش باش گھرانہ ہوتا۔ مدثر انجینئرنگ کالج میں زیر تعلیم تھا۔ ذہین اور سلجھا ہوا لڑکا۔ ماں باپ کو اس کے حال یا مستقبل کے بارے میں کوئی ٹینشن یا پریشانی نہ تھی۔

فیروزہ بھی کھاتے پیتے گھرانے میں بیاہ کر گئی تھی اور اپنے میاں اور سسرال والوں کے دلوں پر راج کررہی تھی۔ وہ اپنے شوہر کے لیے بہت بھاگوان ثابت ہوئی تھی۔ شادی کے بعد اجلال نے ایک نیا کاروبار شروع کیا تھا' جو دن دوگنی رات چوگنی ترقی کررہا تھا۔ چچا جان اور چچی جان کو فیروزہ کی شادی سے پہلے اجلال یا اس کے گھر والوں سے متعلق جتنے بھی خدشات تھے' وہ غلط ثابت ہوئے۔ یہ رشتہ فیروزہ کی خواہش پر طے ہوا تھا اور اسے اپنے گھر میں مسرور اور مطمئن دیکھ کر سکندر اور صالحہ بھی اطمینان محسوس کرتے تھے۔

ان کی بے اطمینانی کی واحد وجہ ماہ نیم ماہ ہی تو تھی۔ اس نے تو انہیں اپنی ذمہ داری سے آزاد کرنے کے لیے عارف جیسے رشتے پر بھی "ہاں" کردی تھی۔ لیکن شاید اس کے ہاتھ میں شادی کی لکیر ہی نہ تھی۔ وہ چچا جان کو کیسے سمجھائے۔ وہ اس کی شادی کے لیے پریشان نہ ہوں اور اس کے لیے اچھا سا رشتہ ڈھونڈنے کی تگ و دو سے باز آجائیں۔ زندگی جیسے گزر رہی تھی۔ ویسے بھی تو گزر سکتی تھی۔

"ہاں! تو ٹھیک ہے' ایسے اوٹ پٹانگ شخص سے شادی سے بہتر ہے کہ انسان ایسے ہی رہ لے۔ میں تو دو نفل شکرانے کے ادا کروں گی اور خبردار ماہ نیم ماہ! تم اس فضول بندے سے منگنی ٹوٹنے پر زیادہ دیر رنجیدہ

رہیں۔ مجھے اللہ پر پورا بھروسا ہے۔ تمہیں اتنا اچھا اور پیار کرنے والا ساتھی ملے گا کہ تم اپنی قسمت پر رشک کروگی۔"

فیروزہ سنجیدہ تھی۔ مگر اسے ہنسی آگئی۔ فیروزہ اسے خفگی سے گھور کے رہ گئی۔ لیکن دل ہی دل میں فیروزہ بھی رو رہی تھی۔ جانے اس پیاری سی لڑکی کے دامن میں زندگی کب خوشیاں ڈالے گی۔ بہت بوجھل دل کے ساتھ فیروزہ میکے سے رخصت ہوئی تھی۔

کچھ دنوں بعد اس کی شادی کی دوسری سالگرہ آنے والی تھی۔ اجلال اس بار بہت دھوم دھام سے شادی کی سالگرہ منانا چاہتا تھا۔ اسے بزنس میں غیر متوقع کامیابی ملی تھی۔

"شادی کی سالگرہ کو اتنے دھوم دھڑکے سے منانے کی کوئی تک ہے بھلا؟ یہ دن تو بس میاں بیوی کو آپس میں مل کر سیلیبریٹ کرنا چاہیے۔" اب فیروزہ کا جی اس قسم کے ہنگاموں سے اچاٹ ہوجاتا تھا۔ مگر وہ اجلال کا دل توڑنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ سو بہت پیار اور رسان سے اسے سمجھانا چاہا تھا۔ بات اجلال کی سمجھ میں آگئی۔ کچھ دنوں بعد اس نے فیروزہ کے ہاتھ پر ایک مغربی ملک کے ریٹرن ٹکٹس رکھ دیے۔

"ہم اپنی سیکنڈ ویڈنگ اینورسری باہر منائیں گے۔ ہنی مون سمجھ لو یا سیر سپاٹا۔ میں کچھ دنوں کے لیے روٹین کی مصروفیات سے فرار چاہتا ہوں۔"

گھومنے پھرنے کی تو خود فیروزہ بھی بہت شوقین تھی سو خوشی خوشی تیار ہوگئی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہاں یوں اچانک اس کی منصور سے ملاقات ہوجائے گی۔ اگر اللہ کو کسی سے ملانا مقصود ہو تو وسیع و عریض کائنات سمٹ کر چھوٹی ہوجاتی ہے۔

فیروزہ اس مشہور و معروف شاپنگ مال کے تھرڈ فلور پر موجود تھی۔ وہ اپنے سسرال والوں اور گھر والوں کے لیے تحفے تحائف خرید رہی تھی۔ جب اسے ایک شخص پر منصور کا گمان ہوا۔ اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔ خوب صورت، طرحدار۔ مگر انتہائی کم عمر۔ جس بے تکلفی سے وہ منصور کا ہاتھ پکڑے چل رہی تھی اور منصور اس سے بات کرتے ہوئے جس وارفتگی سے دیکھ رہا تھا، دونوں کے تعلقات کا اندازہ لگانا چنداں مشکل نہ تھا۔ فیروزہ اس کے پیچھے لپکی۔ تھوڑی دور جاکر اس نے منصور کو جالیا۔

"میری بہن کی زندگی سے کھیلتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آئی؟ اگر اپنے سے آدھی عمر کی لڑکی کا ساتھ چاہیے تھا تو یہ بات تمہیں پہلے سوچ لینی چاہیے تھی۔ رشتہ جوڑ کر پھر توڑنے کا مذاق تم نے ہم لوگوں کے ساتھ ہی کیوں کیا۔"

وہ اس پر ایک دم چڑھ دوڑی۔ منصور کے خلاف کب سے دل میں ابلتے لاوے کو آج باہر نکلنے کا راستہ ملا تھا۔ لال بھبھوکا چہرے کے ساتھ اس نے با آواز بلند منصور کو سنانی شروع کیں۔ منصور اسے اپنے سامنے پاکر بھونچکا رہ گیا۔ بار بار کچھ کہنے کے لیے لب کھولتا۔ مگر فیروزہ اسے بولنے کا موقع ہی کب دے رہی تھی۔

"تو یہ تھی وہ جس کی وجہ سے تمہاری پہلی نظر کی محبت دم توڑ گئی؟" استہزائیہ انداز میں اس نے حیران پریشان کھڑی لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

"اسٹاپ اٹ فیروزہ!" منصور کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو۔

اگر پاکستان ہوتا تو اس منظر کو دیکھ کر وہاں لوگوں کا جمگھٹا لگ گیا ہوتا۔ یہاں بھی ارد گرد کے لوگ ان کی جانب متوجہ ہوگئے تھے۔ فیروزہ کو تو خیر کسی چیز کا ہوش ہی نہ تھا۔ وہ ایسی ہی سرپھری اور جذباتی لڑکی تھی۔ لیکن جب منصور کے ساتھ کھڑی لڑکی نے منصور سے پوچھا۔

"ہو از شی ماموں!"

فیروزہ ہکا بکا رہ گئی اتنے میں اجلال بھی آن پہنچا۔ فیروزہ کی منتخب کردہ چیزوں کے بلز کی ادائی کے بعد بیوی کو ڈھونڈتا ڈھونڈتا یہاں پہنچا تھا۔

"کہاں رہ گئی تھیں فیروزہ! میں تمہیں کب سے ڈھونڈ رہا ہوں۔" اس نے بیوی کو مخاطب کیا۔ مگر چپ چاپ کھڑی بیوی اور اس کے سامنے کھڑے بندے کو دیکھ کر اسے کسی انہونی کا احساس ہوا تھا۔

"یہ اجلال ہیں.... میرے ہزبینڈ۔" اس نے سپاٹ انداز میں منصور کو مخاطب کیا۔ منصور نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھادیا۔

"اور اجلال! یہ منصور ہے۔" اس نے شوہر کو صرف اتنا بتانے پر اکتفا کیا تھا۔ منصور کے بارے میں باقی سب باتیں وہ پہلے سے ہی جانتا تھا۔

"کسی کافی شاپ میں بیٹھ کر کافی پیتے ہیں۔ یوں کھڑے کھڑے بات کرنا مناسب نہیں۔" اجلال نے سمجھ داری کا ثبوت دیا۔

"آپ لوگ کہاں ٹھہرے ہیں؟ میں شام میں وہیں ملنے آجاؤں گا۔" منصور نے سنجیدگی سے پوچھا۔ اجلال نے اسے اپنے ہوٹل کے بارے میں بتایا۔ وہ اجلال سے دوبارہ مصافحہ کرکے اپنی بھانجی کا ہاتھ پکڑے آگے بڑھ گیا۔

شام ڈھلے منصور ان لوگوں سے ملنے پہنچ گیا۔ فیروزہ اسے چپ چاپ گھورنے میں مشغول تھی اجلال نے ہی رسمی بات چیت سے گفتگو کا آغاز کیا تھا۔

"پاکستان میں سب کیسے ہیں؟ صالحہ پھوپھی سکندر انکل اور مدثر؟" آخر منصور نے ہی فیروزہ کو مخاطب کیا تھا۔

"سب اچھے ہیں۔ اماں بھی، بابا بھی مدثر بھی اور ماہ نیم ماہ بھی۔" اس نے کاٹ کھانے والے انداز میں جواب دیا۔ منصور نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

"میں نے پوچھا تھا، پاکستان میں سب کیسے ہیں؟" اس کے لہجے کا اضطراب فیروزہ اور اجلال دونوں سے ہی چھپ نہ پایا تھا۔

"میں نے بھی پاکستان میں بسنے والوں کی خیریت سے ہی آگاہ کیا ہے۔ تم کیا سمجھتے تھے، جو گھاؤ تم نے ہمیں لگایا ہے۔ ہم اسے برداشت نہ کرتے ہوئے دار فانی سے ہی کوچ کر جائیں گے؟" غصے کی شدت سے فیروزہ کے منہ سے بے تکی بات نکلی تھی۔

"ماہ نیم ماہ تو اب بنگلہ دیش میں ہوگی نا۔" اس نے فیروزہ کا طنز نظر انداز کرتے ہوئے رسانیت سے پوچھا۔

"وہ بنگلہ دیش کیوں جانے لگی۔" فیروزہ نے ابرو اچکائے۔

"میں نے سنا تھا، وہ شادی کے بعد شوہر کے پاس بنگلہ دیش چلی گئی ہے۔" منصور کے کہنے پر فیروزہ اور اجلال دونوں بری طرح چونکے تھے۔

"آپ نے کس سے سنا تھا، کچھ بتانا پسند فرمائیں گے؟" فیروزہ نے پھر کاٹ دار لہجہ اختیار کیا تھا۔ اجلال نے بیوی کو گھورا۔

"منصور بھائی! اگر آپ کھل کر بات کریں تو شاید یہ گتھی سلجھانے میں آسانی ہوجائے۔ کیونکہ ماہ نیم ماہ کی شادی نہیں ہوئی۔ ان کے بنگلہ دیش جانے کی بابت آپ کو کس نے بتایا؟" اجلال بہت سبھاؤ سے بات کررہا تھا۔ منصور نے تھکے تھکے انداز میں ایک صفحہ فیروزہ اور اجلال کی طرف بڑھادیا۔

اس کی چھٹی حس اسے بتارہی تھی کہ وہ اپنا کتنا بڑا نقصان کر بیٹھا ہے۔ فیروزہ نے بے تابی سے کاغذ کا صفحہ منصور کے ہاتھ سے جھپٹا اور سطروں پر نگاہ دوڑانے لگی۔

یہ ماہ نیم ماہ کے نام سے منصور کو لکھا جانے والا خط تھا۔ جس میں اس نے بنگلہ دیش میں مقیم اپنے سابقہ منگیتر سے والہانہ محبت کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا کہ علی سے وقتی بھول ہوئی تھی۔ لیکن اب جب وہ واپس پلٹ آیا ہے تو ماہ نیم ماہ اس سے بے تحاشا محبت کرنے کے باعث اس کا قصور معاف کرتے ہوئے واپس اس کی زندگی میں شامل ہونا چاہتی ہے۔ وہ اپنے دیس واپس جاکر اپنے محبوب کے سنگ خوش گوار زندگی جینا چاہتی ہے۔ منصور اور اس کے تعلق کی تو ابھی ابتدا تھی اور وہ منصور سے کوئی جذباتی وابستگی محسوس نہیں کرتی جبکہ علی اس کے بچپن کا ساتھی تھا۔ اس کے والدین بنگلہ دیش سے خاص طور پر پاکستان صرف اس کا ہاتھ مانگنے آئے ہیں اور اگر منصور اسے اس بندھن سے آزاد کردے، جو محض چند روز پہلے جڑا تھا تو ماہ نیم ماہ زندگی بھر اس کا احسان نہیں بھولے گی۔ چچا کی فیملی کے اس پر اتنے احسانات ہیں کہ وہ ان کا طے کیا ہوا رشتہ توڑ کر ان کی نگاہوں میں برا نہیں بننا چاہتی وغیرہ

وغیرہ۔ نیچے ماہ نیم ماہ کا نام درج تھا۔
فیروزہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔
"اب تم کیا کہتی ہو فیروزہ! اس خط کے بعد میرے پاس اس کے سوا کوئی اور راستہ بچا تھا کہ میں ماہ نیم ماہ کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکل جاؤں؟" منصور پوچھ رہا تھا۔
"تم اتنے گاؤدی ثابت ہوگے منصور! میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا۔ میں تو تمہیں بہت انٹلیکچوئیل سمجھتی تھی اور تم کتنی آسانی سے کسی کے بچھائے گئے جال میں پھنس گئے۔" صدمے سے فیروزہ کا برا حال تھا۔
"کیا مطلب؟" منصور اس کی بات سن کر بھونچکا رہ گیا۔
"اس خط کے نیچے ماہ نیم ماہ کا نام ہے تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ یہ ماہ نیم نے ہی لکھا ہے؟ تمہیں یہ کیسے ملا تھا؟"
"ڈاک کے ذریعے۔" منصور نے فیروزہ کو نا سمجھی سے تکتے ہوئے جواب دیا۔
"بڑی کوٹھی کے ایڈریس پر کوئی بھی شخص تمہیں یہ خط پوسٹ کر سکتا تھا۔ تم نے عقل کے گھوڑے دوڑانے کی زحمت ہی نہ کی؟"
"ایسا خط مجھے کون پوسٹ کر سکتا ہے؟ ماہ نیم ماہ کی گزشتہ زندگی، اس کے منگیتر کا نام کسی کو ان سب کے بارے میں خواب تو نہیں آسکتا تھا؟ ہماری منگنی کے بعد تمہارا چھوٹی کوٹھی آنا جانا ختم ہو گیا تھا۔ پھر کسی کو کیسے پتا چل سکتا تھا کہ ماہ نیم ماہ کے سابقہ سسرال والے بنگلہ دیش سے تجدید تعلق کے لیے آئے ہوئے ہیں؟" منصور خود بھی الجھ رہا تھا اور فیروزہ کو بھی الجھا رہا تھا۔
"میں ان سب سوالوں کا جواب یقیناً دے سکتی ہوں منصور! لیکن ماہ نیم ماہ کی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے میرے پاس صرف ایک دلیل ہے۔ اگر تم اسے کافی سمجھو تو۔" فیروزہ بات کرتے کرتے رکی تھی۔ منصور نے بے تابی سے اسے دیکھا۔
"ماہ نیم ماہ بہت اچھی اردو بولتی ہے۔ کسی حد تک پڑھ بھی سکتی ہے۔ مگر وہ اردو لکھ نہیں سکتی۔۔۔ اور یہ خط شروع سے آخر تک اردو میں لکھا گیا ہے۔ اگر تم یقین کر سکتے ہو تو کر لو کہ اس خط کو لکھنے والی ماہ نیم ماہ ہر گز نہیں ہے۔" فیروزہ نے کہا تو منصور بائیں ہاتھ سے پیشانی مسلنے لگا۔ وہ اس وقت شدید تناؤ کی کیفیت میں تھا۔
"اور وہ ماہ نیم ماہ کا سابقہ منگیتر۔۔۔ ماہ نیم ماہ تو اس کی شکل تک دیکھنے کی روادار نہیں تھی۔ وہ اپنے ابا میاں کی موت کا ذمہ دار صرف اور صرف علی کو ہی قرار دیتی تھی اور۔۔۔" فیروزہ کو اچانک کچھ خیال آیا تھا۔ اس نے خط پر دوبارہ نگاہیں دوڑائیں۔ پھر ایک سطر پر انگلی رکھ کر منصور کو پڑھنے کا اشارہ کیا۔
"ڈیڈی کے انتقال کے بعد میں پاکستان آتو گئی لیکن میرا دل بنگلہ دیش میں ہی دھڑکتا ہے۔" "یقین کرو منصور! ماہ نیم ماہ اپنے مرحوم والد کے لیے صرف "ابا میاں" کا لفظ استعمال کرتی ہے۔ "ڈیڈی" کا لفظ چھوٹی کوٹھی کی لڑکیاں استعمال کرتی ہوں گی۔۔۔ ماہ نیم ماہ ہر گز نہیں۔" فیروزہ کی دلیل معقول تھی۔
"چھوٹی کوٹھی کی لڑکیوں کے علم میں یہ ساری باتیں کس طرح آئیں؟ کیا تم نے کبھی ان لوگوں سے ماہ نیم ماہ کی منگنی یا سابقہ منگیتر کے بارے میں ذکر کیا تھا؟" جلال نے پوچھا۔ فیروزہ نے نفی میں گردن ہلادی۔ پھر اس کی یادداشت نے کام کر دکھایا۔
"ہاں! میں نے کنول سے ماہ نیم ماہ کے بنگلہ دیش سے آئے ہوئے سابقہ ساس سسر کے بارے میں تذکرہ کیا تھا۔ اس نے کرید کرید کر ساری باتیں پوچھی تھیں۔ میں کنول پر شک نہیں کر رہی۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ اس نے چھوٹی کوٹھی میں جا کر یہ بات بتائی ہو اور آگے چھوٹی کوٹھی والوں کے زرخیز ذہن نے کام دکھایا ہو۔" فیروزہ نے بہت جلد کڑیاں جوڑ لی تھیں۔
"ماہ نیم ماہ دھوم دھام سے رخصت ہو کر بنگلہ دیش واپس چلی گئی ہے۔ یہ اطلاع مجھے چھوٹی کوٹھی والوں نے ہی دی تھی۔" منصور نے گہرا سانس اندر کھینچ

ہوئے انکشاف کیا۔ اس بات کے بعد کسی اور بات کی گنجائش ہی کب بچتی تھی۔
"تم نے ہمارے ساتھ تو برا کیا سو کیا۔ اپنے ساتھ بھی کچھ اچھا نہیں کیا منصور۔" طویل خاموشی کے بعد فیروزہ نے اسے مخاطب کیا۔ وہ کچھ نہ بولا دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر بیٹھا رہا۔
"تم ماہ نیم ماہ کو اپنی ذات کا اعتبار اور مان دینے آئے تھے۔ اسے تاکید کی تھی کہ وہ تم سے متعلق کسی الٹی سیدھی بات پر کان نہ دھرے اور خود بنا کسی تحقیق اور تفتیش کے ایک جعلی خط کو اصل مانتے ہوئے اسے اتنی بڑی سزا دے دی؟ اس کا دل اگر زندگی میں کسی کے لیے دھڑکا تھا تو وہ صرف تم تھے منصور۔ وہ تمہاری پہلی نظر کی محبت پر ایمان لے آئی تھی اور تم۔۔۔" شدت جذبات سے فیروزہ کی آواز کپکپا گئی اسے سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ وہ سامنے بیٹھے اس شخص پر غصہ کرے یا ترس کھائے۔
اس کی حالت بتا رہی تھی کہ اگر ماہ نیم ماہ کی زندگی مسلسل آزمائش سے دوچار رہی ہے تو وہ خود بھی سکون سے نہیں جی پایا ہے۔ وہ بہت مضطرب اور شکستہ حال لگ رہا تھا۔ اس نے یقیناً ماہ نیم ماہ کو شدت سے چاہا تھا ورنہ وہ اس کی خوشی کی خاطر اپنی خوشی سے یوں دست بردار نہ ہوا ہوتا۔ اس کی اجڑی بکھری حالت دیکھ کر فیروزہ کا دل پسیج گیا۔
"بہت دیر ہو گئی ہے۔ مجھے چلنا چاہیے۔" منصور کے پاس اب کہنے کو کچھ نہ بچا تھا وہ اٹھ کھڑا ہوا۔
"ابھی بھی بہت دیر نہیں ہوئی ہے منصور! تم چاہو تو سب کچھ ٹھیک ہو سکتا ہے۔" فیروزہ نے اسے دھیرے سے مخاطب کیا۔ اس نے بے یقینی سے فیروزہ کو دیکھا۔ فیروزہ نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"میں آپ کے پاس بہت آس لے کر آئی ہوں صالحہ پھوپھو! پلیز انکار مت کیجیے گا۔" یہ عفت جہاں تھیں منصور کی بڑی بہن۔ شرمندگی اور معذرت کے بے پناہ اظہار کے بعد وہ وہی سوال دہرا رہی تھیں، جو چند سال پہلے کر چکی تھیں۔ لیکن اس بار انہیں من پسند جواب نہ مل رہا تھا۔
"ماہ نیم ماہ بہت صابر بچی ہے۔ اس نے ہمیشہ اپنی زندگی سے متعلق فیصلوں کا اختیار اپنے بڑوں کو دیا ہے اور ہمیشہ ان فیصلوں پر سر جھکایا ہے۔ لیکن عفت! اس بار وہ ہمارے سمجھانے پر بھی راضی نہیں ہو رہی ہے اور ہم اس پر کسی قسم کا دباؤ نہیں ڈال سکتے۔" صالحہ نے رسانیت سے عفت کو بتایا۔
"میں ماہ نیم ماہ سے خود بات کروں گی۔" عفت آج کسی طور ٹلنے والی نہ تھیں۔
وہ ماہ نیم ماہ کے کمرے میں چلی گئیں۔ اس روشن پیشانی اور صبیح رنگت والی لڑکی کو دیکھتے کے ساتھ ہی انہیں اپنے بھائی کا خیال آیا تھا۔ اگر وہ ماہ نیم ماہ کی "نہ" کو "ہاں" میں بدل دیتیں تو یہ جوڑی یقیناً "چاند سورج کی جوڑی" ہوتی۔ چند سال پہلے جب منصور نے انہیں فون کر کے بتایا تھا کہ وہ لڑکی منتخب کر چکا ہے اور وہ صالحہ سے فون پر باقاعدہ رشتہ مانگیں تو عفت نے شکر منایا تھا کہ ان کا سر پھرا بھائی گھر بسانے پر راضی ہو گیا ہے انہوں نے اس کی خواہش کے عین مطابق صالحہ سے رشتے کی بات کی تھی۔ یہ رشتہ خوش دلی سے قبول کر لیا گیا۔ مگر کچھ دنوں بعد منصور پاکستان سے لوٹا تو اس نے منگنی ختم کرنے کے فیصلے سے آگاہ کرتے ہوئے انہیں تاکید کی تھی کہ وہ صالحہ سے اب کوئی رابطہ نہیں کریں گی۔
عفت کے کریدنے پر اس نے فقط یہ ہی کہا کہ اس نے لڑکی کا انتخاب جلد بازی میں کیا تھا اور لڑکی اس کے معیار پر پوری نہیں اتری۔ عفت نے تو لڑکی دیکھی تک نہ تھی۔ سو بھائی کی بات تسلیم کر لی۔ لیکن ان کا اکلوتا چھوٹا بھائی جو انہیں اپنے بچوں کی طرح ہی عزیز تھا اس کے بعد بالکل گم صم ہو کر رہ گیا تھا۔ انہوں نے اسے پاکستانی کمیونٹی کی دوسری بہت سی لڑکیاں دکھائیں مگر منصور کو کسی میں قطعاً "دلچسپی نہ تھی۔ تنگ آکر

ان تینوں بہنوں نے منصور کو کسی گوری تک سے شادی کی اجازت دے دی تھی۔ وہ بس بھائی کا گھر بسا ہوا دیکھنا چاہتی تھیں۔ لیکن بھائی شادی کا نام سننا بھی نہ چاہتا تھا۔ انہیں کیا پتا تھا کہ وہ محبت کا روگ لگائے بیٹھا ہے اور اب اتنے عرصے بعد منصور نے انہیں اپنی غلطی سمیت ساری داستان سے آگاہ کیا تھا۔ انہیں چھوٹی کوٹھی والوں پر ایسا شدید تاؤ چڑھا تھا کہ وہ تو ٹیلی فون پر ہی ان سے زبردست قسم کا جھگڑا کرنا چاہتی تھیں لیکن منصور انہیں ایسا کرنے سے روک دیا۔

"اب ان تمام باتوں کا کوئی فائدہ نہیں۔ اگر آپ میرے لیے کچھ کر سکتی ہیں تو میرے ساتھ پاکستان جاکر صالحہ پھوپھی اور سکندر پھوپھا سے دوبارہ میرے رشتے کی بات کریں۔"

پہلی ممکنہ فلائٹ سے دونوں بہن بھائی پاکستان پہنچے تھے۔ دوسری دو بہنیں پوری تیاری سمیت کچھ دن بعد آنے والی تھیں۔ وہ اب منصور کی شادی میں کسی قسم کی تاخیر نہ چاہتی تھیں۔ وہ بھائی کی غلطی سے آگاہ تھیں۔ لیکن یہ غلطی سے زیادہ غلط فہمی کا کیس تھا اور جب منصور معذرت کر رہا تھا تو بھلا لڑکی والے کیوں انکار کرتے۔ ان کے شہزادے جیسے بھائی کو کوئی کیسے ٹھکرا سکتا تھا؟ لیکن یہ بھی ان کی غلط فہمی ہی تھی۔

ماہ نیم ماہ کا انکار اقرار میں نہ بدل سکا۔ منصور نے آخری امید کے طور پر فیروزہ سے رابطہ کیا۔

"آخر تمہارا ہنی مون کب ختم ہوگا؟ پلیز فیروزہ جلدی واپس آؤ اور اپنی بہن کو سمجھاؤ۔ میں تو تمہارے آس دلانے پر پاکستان آیا تھا۔ لیکن وہ تو میری بات سننے اور شکل تک دیکھنے کی بھی روادار نہیں ہے۔ آپا کو بھی اس نے بہت شائستگی سے انکار کردیا ہے۔" منصور کی جان تو گویا سولی پر اٹکی ہوئی تھی۔

"تم لوگ شادی کی تیاریاں کرو۔ ماہ نیم ماہ مان جائے گی۔" فیروزہ کا لہجہ پریقین تھا۔ پاکستان پہنچ کر اس نے ماہ نیم ماہ کی ٹھیک ٹھاک کلاس لی تھی۔

"جب تمہیں ساری بات کا پتا چل گیا ہے تو کیوں اپنی بات پر اڑی ہوئی ہو؟ کہاں کسی بھی ایکس، وائی زیڈ سے شادی پر تیار تھیں۔ مگر منصور کو ذرا سی بھی رعایت دینے کو تیار نہیں؟ حالانکہ وہ رعایت کا بہت زیادہ مستحق ہے۔"

"میں اب بھی اپنی بات پر قائم ہوں۔ چچا جان کسی بھی ایکس، وائی زیڈ سے میرا رشتہ طے کردیں۔ میں سر جھکا دوں گی۔ لیکن منصور آفاق سے شادی کسی قیمت پر نہیں کروں گی۔"

"اس کا قصور معاف کرو ماہ نیم ماہ! وہ تم سے بہت محبت کرتا ہے۔" فیروزہ منت پر اتر آئی۔

"اسی لیے تو میں اس کا قصور معاف نہیں کر سکتی۔ اس کے علاوہ کسی نے مجھ سے محبت کا دعوا نہیں کیا تھا۔ ایک اعزاز کی طرح اس نے مجھے اپنی ہمراہی بخشی تھی اور جب میں اس کے سنگ زندگی گزارنے کے خواب دیکھنے لگی تو اس نے مجھے عرش سے فرش پر لا پٹخا۔ میں نے اس دن اپنا مان اور اپنی ذات کا وقار ہمیشہ کے لیے کھو دیا تھا۔ منصور آفاق دنیا کا آخری شخص ہو تو بھی میں اس سے شادی نہیں کروں گی۔"

"اور اس کے علاوہ کسی سے بھی؟" فیروزہ کا لہجہ عجیب سا ہوگیا۔

"ہاں! اس کے علاوہ کسی سے بھی۔" اس نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے ٹھوس لہجے میں یقین دلایا۔

"تو پھر ٹھیک ہے! مدثر کا انجینئرنگ کا آخری سال ہے۔ ان شاء اللہ اگلے برس وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہوجائے گا۔ بابا کہتے ہیں کہ میں نے روز حشر اپنے بڑے بھائی کو منہ دکھانا ہے۔ دنیا بہت مطلبی اور خود غرض لوگوں پر مشتمل ہے۔ میں ماہ نیم ماہ کے سلسلے میں مزید کوئی رسک نہیں لے سکتا۔ وہ سدا ہماری نظروں کے سامنے رہے۔ اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔" فیروزہ بول رہی تھی اور ماہ نیم ماہ کا حیرت اور صدمے سے منہ کھل گیا تھا۔

"مدثر میرا چھوٹا بھائی ہے۔" وہ چیخ ہی تو پڑی۔

"ہاں! اگر سگا یا رضاعی بھائی تو نہیں۔۔۔ اور پھر چند سال کی چھوٹائی بڑائی کیا معنی رکھتی ہے۔ اب تو ماشاء اللہ وہ کیسا گبھرو جوان لگتا ہے۔"

"پلیز فیروزہ! چپ کر جاؤ۔" وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رو پڑی۔

"فیصلے کا اختیار تمہارے پاس ہے، مدثر یا منصور۔ لیکن پلیز! اپنے فیصلے سے مجھے جلد آگاہ کردینا۔ اماں اور بابا اب جلد تمہاری ذمہ داری سے سبکدوش ہونا چاہتے ہیں اور یہ روز روز کی گھر میں پھیلی ٹینشن مجھ سے بھی برداشت نہیں ہوتی۔" فیروزہ سنجیدگی سے کہہ کر کھٹ کھٹ کرتے ہوئے چل دی۔

اور آج ماہ نیم ماہ کی رخصتی تھی۔ فیروزہ نے رخصتی سے قبل اس کے کان میں آکر سرگوشی کی۔

"میرے جھوٹ کے لیے مجھے معاف کردینا۔ مدثر اور تم۔۔۔ توبہ توبہ! ہم تو ایسا خواب میں بھی نہیں سوچ سکتے۔ تم تو اس کی جان سے پیاری آپا ہو۔ دیکھو تمہاری رخصتی پر کیسے کھڑا آنسو بہا رہا ہے۔" فیروزہ بے تحاشا ہنس رہی تھی۔ وہ جانتی تھی گھونگٹ میں گردن جھکائے ماہ نیم ماہ کا دل اس وقت یقیناً "اسے کچا چبالینے کو چاہ رہا ہوگا۔ لیکن وہ یہ بھی جانتی تھی کہ اس کا یہ جھوٹ ماہ نیم ماہ کی زندگی کو خوشیوں سے بھردے گا۔ وہ اپنی انا کی تسکین کے لیے محبت سے منہ موڑ رہی تھی۔ فیروزہ اسے خود کے ساتھ یہ زیادتی کیسے کرنے دیتی۔ منصور فیروزہ سے پوچھ پوچھ کر تھک چکا تھا کہ اس نے ماہ نیم ماہ کا انکار اقرار میں کیسے بدلوایا۔

"یہ بات حجلہ عروسی میں جاکر اپنی بیگم سے خود پوچھ لینا۔" فیروزہ شوخ ہوتے ہوئے بولی۔

بہت دھوم دھام سے ماہ نیم ماہ رخصت ہوکر بڑی کوٹھی آئی تھی۔ منصور کی بہنیں بھانجے بھانجیاں اس کے ایسے ناز اٹھا رہے تھے کہ جیسے وہ واقعی کسی ریاست کی شہزادی ہو۔

اور منصور کو تو گویا ہفت اقلیم کی دولت مل گئی تھی۔ وہ بے حد خوش تھا اور بے تحاشا مسرور بھی۔ جانتا تھا کہ گھونگٹ میں منہ چھپائے اس کی بیوی اس سے بے تحاشا و بے حساب ناراض ہے۔ مگر یہ خفگی اس کا حق تھی۔ اسے اپنی محبت پر کامل بھروسا تھا۔ ماہ نیم ماہ کی ناراضی زیادہ دیر برقرار نہیں رہ سکتی تھی۔

اگلی شام جب ولیمہ کی تقریب میں شرکت کے لیے ماہ نیم ماہ کے گھر والے یہاں پہنچے تو ماہ نیم ماہ کے دمکتے ہوئے مسکراتے چہرے پر نگاہ ڈال کر سب شاد ہوگئے۔

فیروزہ کے اندیشوں سے دھڑکتے دل کو بھی قرار مل گیا۔ اس کی سرپھری بہن سے کچھ بعید نہ تھا۔ وہ منصور کی والہانہ محبت کے جواب میں رکھائی اور بے زاری اختیار کرکے اس کا دل پھر سے توڑ سکتی تھی۔ مگر ایسا کچھ نہ ہوا تھا۔ ناراضی، معذرت اور محبت کے اظہار کے مرحلے طے ہونے کے بعد بدگمانی کے بادل چھٹ چکے تھے اور مطلع صاف ہوچکا تھا۔

منصور اسے والہانہ نگاہوں سے تکتے ہوئے جانے اس کے کان میں کیا سرگوشی کررہا تھا کہ شرگیں مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے جدا ہونے کا نام ہی نہ لے رہی تھی۔ فیروزہ کو یقین آگیا کہ نکاح کے دو بولوں کے ساتھ محبت کے دو بولوں میں بھی بڑی طاقت ہوتی ہے۔

اس نے صدق دل سے ان کی پرمسرت ازدواجی زندگی کی دعا کی۔ ماہ نیم ماہ کہتی تھی کہ منصور آفاق دنیا کا آخری شخص ہو تو بھی وہ اس سے شادی نہیں کرے گی۔ مگر منصور آفاق ہی دنیا کا آخری شخص تھا، جس سے اس کی شادی ہونی تھی۔ یہ تقدیر کا لکھا فیصلہ تھا جو کسی طور نہ بدل سکتا تھا۔ فیروزہ نے ایک ترحم بھری نگاہ چھوٹی کوٹھی کی لڑکیوں پر ڈالی جو مہمانوں کی طرح ایک گوشے میں بیٹھی تھیں۔

ان کے چہروں کی حسرت چھپائے نہ چھپ رہی تھی۔ فیروزہ نے اندازہ لگانا چاہا کہ منصور اور ماہ نیم ماہ کی زندگی میں کس کی سازش نے زہر گھولا تھا۔ مگر اگلے ہی پل وہ سر جھٹک کر مسکرادی۔ سازش کے بل پر کسی سے کسی کا نصیب چھینا جاسکتا تو دنیا سے سچی محبت کا یکسر خاتمہ ہوجاتا۔ مگر محبت موجود تھی۔ اپنی تمام تر سچائی اور تابناکی کے ساتھ اور یہ ہی محبت زندگی کا حاصل تھی۔

فیروزہ مسکراتے ہوئے ماہ نیم ماہ سے ملنے اسٹیج کی طرف بڑھ گئی۔

میمونتہ الکبریٰ



ستونتی کئی ماہ سے عجیب عارضے میں مبتلا تھی۔ چھاتی میں درد اٹھا کرتا، سانس تنگ ہونے لگتی اور بھوک تو جیسے مٹ ہی گئی تھی۔

جتنی زبانیں اتنے قصے۔ کوئی چور بخار کی بیماری بتاتا تو کوئی تپ دق تجویز کرتا۔ جسم تھا کہ دیکھنے میں بھلا چنگا پھر بھی زلزلوں میں رہتا تھا۔

اور جیسے جیسے سرما کی دھوپ ڈھلتی اور شام کے سائے سرد اور گہرے ہونے لگتے، اپنے بند کواڑوں کے پیچھے ستونتی کو لگتا کہ اس کی زندگی دھیرے دھیرے ڈھلتی جا رہی ہے اور کبھی اچانک ہی اس سے روٹھ جائے گی۔ کوئی روگ تھا جو دیمک کی طرح اندر ہی اندر اس کی زندگی کو چاٹے جا رہا تھا اور وہ چاہ کے بھی اس قفل کو کھولنا نہیں چاہتی تھی، جس کے اندر دفن اس کے وجود کو کوئی دیمک زدہ کیے جا رہا تھا۔

اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اس تالے کو جوں ہی کھولے گی تو سانسوں کا جڑا طلسم کرچی کرچی ہو جائے گا اور وہ یوں بکھر جائے گی کہ سمیٹے نہیں سمٹے گی۔

میں اسے لاکھ کہتا کہ ”ستونتی! یہ تیرے وہم ہیں۔ تو نے درد پال رکھے ہیں۔ تو خوش رہا کر۔ تیری تندرستی ہی میری مسرت ہے۔ میری ساری عیدیں، ساری امیدیں تجھ سے وابستہ ہیں۔ تیرے جسم میں میری جان اور میری جان میں تیری جان ہے۔“ میں اس کی زندگی کے سارے کانٹے چن لینا چاہتا تھا۔ میں اسے مست رُتوں کے ہنگھوڑے میں جھلانا چاہتا تھا۔

میں نے اس کے لیے دنیا تیاگی نہیں تھی، لیکن اک الگ دنیا بنالی تھی۔ جو ہماری دنیا تھی۔ جس میں اسے سب میری حیثیت سے جانتے تھے اور جہاں اس کی ایک الگ پہچان تھی۔ میں نے اسے پٹاری کا انگو... بنا کے رکھا تھا۔ وہ کہتی تھی۔

”مجھ سے اتنا لاڈ نہ کیا کریں۔ میری عادتیں بگڑ جا رہی ہیں۔ میں نازک مزاج ہوتی جا رہی ہوں۔“

میں اس سے کہتا کہ ”بے شک ہو جاؤ نازک مزاج... میں تمہارے ناز خوش دلی سے اٹھاؤں گا۔ میں تو کہتا ہوں کہ تم کانچ کی گڑیا بن جاؤ، پھر میں تمہیں اپنے نرم نرم ہاتھوں سے چھوؤں گا۔ برف کے گالے کی طرح ہو جاؤ کہ پگھلنے کا گماں ہونے لگے۔ میں چاہتا ہوں تم کپاس کے پھول جیسی شفاف رنگت لے لو تاکہ ہاتھ لگانے سے پہلے مجھے ہاتھ دھونے کا خیال رہے۔“

میری باتیں سن کر وہ کھلکھلا کے ہنس پڑتی تھی۔ اس کی مدھر ہنسی کا ترنم میری سماعتوں میں آج بھی جلترنگ بجاتا گونجتا ہے۔

وہ میری خوشی کے لیے یکدم ایسی ہی نازک اور پیاری بن جاتی، لیکن وہ بڑے حوصلے والی تھی۔ زمانے کی تلخیوں کے سامنے پوری چٹان تھی۔ ایسی چٹان جس سے دریا کی تند و تیز موجیں ٹکرا ٹکرا کے واپس پلٹتی رہیں، پر وہ اپنی جگہ ثبت رہے۔ اس کی سلامتی اس کی آن، مان ویسے ہی قائم رہے۔ میرے گمان میں بھی نہ تھا کہ کبھی وہ بھی بھربھری ریت کا ٹیلہ بن جائے گی۔ اس نے مجھے اپنی خوشیوں کا ساجھی بنایا۔ میرے سارے دکھ، تنہائیاں اور محرومیاں خود پہ تان لیتی اور مجھے شاد و آباد کر دیتی۔ اپنے آنسو تو مجھے دکھا دیتی، پر کرب چھپا جایا کرتی تھی۔ میں جان تو جاتا پر جتاتا نہیں تھا کہ اس کا دل نہ ٹوٹ جائے۔

ہم نے اکٹھے بہت خواب بُنے۔ اپنے بچوں کے خواب، ڈھلتی عمر کے خواب، بڑھاپے کے خواب، جنت کے خواب ...... ہم ہمیشہ ساتھ رہنے کی بات کرتے تھے۔ پر اس کے ساتھ ہی اس پر آسیب کی طرح کی اک چپ سی ٹھہر جاتی تھی۔ پھر وہ کافی دیر تک خلاؤں میں گھورتی رہتی اور اپنی نازک نازک مخروطی انگلیاں مروڑ مروڑ کے کچھ نقشے سے بناتی رہتی۔

وہ میرے سارے کام اپنے ہاتھوں سے کرتی تھی۔ کسی اور کو میرے کام کے نزدیک نہ آنے دیتی تھی۔ اگر کبھی میں دیر سے گھر آتا تو دروازے سے لگی بیٹھی رہتی اور جب میری چاپ سنائی دیتی تو جھٹ سے بستر کھول کر آنکھوں میں نیند بھر لیتی اور کچھ دیر بعد اٹھ کے کہتی۔

”آپ آگئے؟ میں تو سو ہی گئی تھی۔ مجھے تو پتا ہی نہ چلا۔“

اور میں چپکے سے دیکھ لیتا کہ نہ بستر میں سلوٹیں ہیں نہ لباس میں شکن..... اور وہ ٹھنڈا یخ بستر گواہی دیتا کہ اسے میرے بغیر آرام کہاں۔

پھر ہمارے اوپر تلے دو بچے ہو گئے۔ بچوں کی آمد سے گھر میں چہل پہل اور ہنگامہ ہو گیا اور اس کا شکوہ بھی کم ہو گیا کہ مجھے تنہائی ڈستی ہے۔ اکیلے گھر میں ڈر لگتا ہے۔ یہ دیواریں دن کے وقت کاٹ کھانے کو دوڑتی ہیں۔ وہ بچوں کے ساتھ خوب چہلیں کرتی۔ پر ان کے زیادہ تر کام مجھ سے ہی کرواتی تھی۔ ان کے لیے خریداری سے لے کر سلانے، جگانے اور کھانا کھلانے کی ذمہ داری مجھ پر تھی۔ بچے جب ذرا سمجھ



دار ہونے لگے تو بہت بچپن سے ہی ان کے بہت سے کام اس نے ان ہی کے سپرد کردیے۔

اک روز ہم جاڑے کی چمک دار دھوپ میں بیٹھے تھے کہ کہنے لگی۔

"اب اپنے کام خود کرنا سیکھ لیں۔"

میں نے کہا "کیوں؟ تم کس لیے ہو..... میں کیوں اپنے کام خود کروں؟"

تو ہنس کے کہنے لگی۔ "آپ کی ستونتی میں اب وہ پہلے سے چستی باقی نہیں۔ وہ اب بوڑھی ہوتی جارہی ہے۔" پھر کہنے لگی.... "میں تھک جاتی ہوں۔ آپ خود ہی اپنا خیال رکھا کریں۔ اپنے ناخن کاٹ لیا کریں۔ حجامت بنوالیا کریں۔ کپڑے کبھی کبھی خود ہی استری کر لیا کریں۔ جب تک میں نہ کہوں آپ ان کاموں کی طرف توجہ ہی نہیں دیتے۔"

میں نے سوچا کہ واقعی جب سے وہ میری زندگی، میرے گھر آنگن میں آئی، میں نے اتنی چھوٹی چھوٹی باتیں بھی اس کے سپرد کردیں۔ میرے کاموں کا خیال وہی رکھتی۔ جب بھی میرے بڑھے ہوئے ناخن دیکھتی ناخن تراش لے کر آ بیٹھتی اور کاٹنے لگتی۔ پھر رفتہ رفتہ اس کے ہاتھوں میں کپکپی آگئی۔ جب کبھی اس کام کو بیٹھتی کوئی ایک زخمی کردیتی اور پھر سارا دن اس پر خائف ہوتی رہتی۔

برتن دھوتے ہوئے کوئی برتن اس کے ہاتھ سے چھوٹ کے گر جاتا اور پھر ٹوٹے ہوئے برتن کی کرچیاں چنتے ہوئے پوریں خون آلود کرلیتی۔ میں شام کو آتا تو ہاتھ پہ پٹی دیکھ کر غصہ ہوتا کہ آج پھر ہاتھ زخمی کرلیا۔

میرے غصے سے اتنا ڈرتی تھی کہ اس نے اپنے ہاتھوں کے زخم مجھ سے چھپانے شروع کردیے۔ آنچل میں زخم چھپائے چور سی بنی پھرتی رہتی۔ میں اس کی شرمندگی سے محظوظ ہوتا تھا۔ اس لیے اگر جانچ بھی لیتا تو چپ رہتا اور وہ میرے نظر انداز کرنے کو سمجھتی نہیں تھی۔ اس لیے فتح مندی سی دیکھا کرتی تھی۔ کبھی کبھی میں اسے دیکھتا تو مجھے لگتا، اس کے جیون کی عمارت دھیرے دھیرے ڈھے رہی ہے۔ اس کا دن شام شام ہوا جاتا ہے۔ مجھے وہ اپنے سامنے اک چلتی پھرتی روح جیسی نظر آتی۔ کبھی یہاں تو کبھی وہاں سائے کی طرح خاموش اور ٹھنڈی۔ وہ گھر کی غلام گردشوں میں ننگے پیر چکراتی پھرتی۔ یوں لگتا کہ کچھ تلاش کررہی ہے۔ خدا جانے وہ کیا ڈھونڈا کرتی تھی۔ میں اس سے کبھی پوچھ بھی نہ پایا۔ اس نے اتنا موقع ہی نہ آنے دیا۔

دستر خوان لگاتی تو کھانے کے لیے سب سے پہلے خود ہی بیٹھ جاتی۔ میں اور بچے بھی آ کے بیٹھ جاتے ہمارے لیے بھی چن دیتی۔ ہم کھا کے اٹھ جاتے، وہ تب بھی بیٹھی ہوتی۔ ہم مذاق اڑاتے، پر کان نہ دھرتی۔ وہ اپنا رزق جلدی جلدی تمام کررہی تھی۔ کبھی کبھی ہم سب مل کر اس کا بہت مذاق اڑاتے کہ اتنی مختصر سی سوکھی سڑی دکھتی ہو، پر اتنا کھاتی ہو..... تو وہ سچ مچ غصہ ہوجاتی کہ "آپ لوگ میرے نوالے گنتے ہو۔"

ہم بظاہر تو دبک جاتے، پر ہنسی کے مارے ہمارا برا حال ہوجاتا۔ غصے میں وہ بپھری شیرنی بن جاتی تھی۔ توڑ پھوڑ سے بھی دریغ نہ کرتی اور اس کا گرم خون ایک بار جوش مار جاتا تو ٹھنڈا کرنا بڑا مشکل ہوتا۔

پھر اسے کھانسی رہنے لگی اور کبھی شام میں بخار بھی ہوجاتا۔ کھانا پینا کم ہوگیا۔ ہنسی میں وہ ترنم نہ رہا۔ قہقہوں کی گونج نہ رہی

اچانک ہی وہ اکتا جاتی۔ وہ بہت حد تک چڑچڑی ہوگئی تھی۔ کبھی تو پوری رات جاگتے میں گزار دیتی اور کبھی بے ہوش سو رہتی۔ کبھی اس پر نیم بے ہوشی کی کیفیت طاری ہوتی وہ نیند میں مسلسل بولتی اس کا بولنا میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی بن کے دوڑ جاتا اور میں انجانے کرب سے گزر جاتا۔

بچوں کے معاملات میں پہلے بھی لاتعلق ہی رہتی تھی۔ اب اور بھی ان کی ذمہ داری میرے سپرد کردی۔ گھر کی اضافی چیزیں سب کسی کو دے دیں۔ اپنی ذاتی استعمال کی ضروری چیزیں بھی صدقہ کردیں۔ وہ گھر کو

بہت صاف ستھرا رکھنے لگی۔ کچھ قیمتی اشیا سنبھال کے رکھ دیں۔ گھر کا اک نظام مرتب کردیا۔ اب ہر بندہ اپنے سارے کام خود ہی کرنے لگا۔ سب ہی ایک دوسرے کے آرام و سکون کا زیادہ سے زیادہ خیال رکھنے کی کوشش کرنے لگے۔ یوں لگتا تھا کہ سب ہی کسی بہت بڑے راز سے واقف ہوچکے ہیں اور حتی المقدور اپنی کیفیات دوسروں سے چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔

وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر بچوں کے پاس چلی جاتی اور انہیں سوتے ہوئے دیکھا کرتی۔ پھر ان سے لاڈ کرتی اور ہولے سے چند آنسو اپنے آنچل میں سمو کر واپس بستر پہ آجاتی اور سکون سے لیٹ جاتی۔ اب اس میں بہت ٹھہراؤ آگیا تھا۔

ڈاکٹر نے بتایا کہ تپ دق ہے۔ اس نے چیڑ کے درختوں کی جڑوں سے ہو کر نکلتے کڑوے چشموں کا پانی منگوا کر پینا شروع کردیا۔ کچھ عرصہ استعمال کے بعد بھی افاقہ نہ ہوا تو چھوڑ دیا۔ وہ ہمیشہ اپنا علاج خود ہی تجویز کرنے کی عادی تھی۔ پھر جب سینے میں درد اٹھنے لگا تو ہار سی گئی اور ڈاکٹر سے باقاعدہ علاج کروانے کے لیے مان گئی۔ پھر کئی ڈاکٹروں کے پاس جانا ہوا۔ ڈھیروں دوائیں کھائی گئیں۔ بے شمار ٹیسٹ کروائے گئے۔ پر جو ہو رہا تھا وہ ہم دیکھنا نہ چاہتے تھے۔ جو ہو رہا تھا، وہ ہم ہونے نہیں دینا چاہتے تھے۔ پر ہونی کو کون روک سکا ہے۔

علاج کا سلسلہ طویل ہوتا گیا۔ سرطان نے جڑیں پھیلالیں۔ سینے میں درد ٹھہر سا گیا۔ اس کا درد میرے گلے کی پھانس بنتا گیا۔ پہلے ایک آپریشن ہوا۔ ایک سال تک اس کا اثر باقی رہا۔

اور پھر بار بار آپریشن کروانے کی ضرورت پڑتی رہی۔ دعائیں موت کے آڑے آجاتیں۔ زندگی جیت جاتی۔ ہم خوش ہوجاتے۔ پر یہ خوشی دیرپا نہ تھی۔ کب تک یہ ہار جیت کا سلسلہ چلتا..... زندگی ڈوب رہی تھی۔ موت کی لہریں تند و تیز ہوتی جارہی تھیں۔ ہم ہار رہے تھے۔ ہمارے سروں پر بگولے رقص کرتے تھے۔ ہمیں سرخ آندھیاں چاروں طرف سے گھیرے میں لینے کو لپکتی تھیں۔ ہمارا آنگن اجڑ رہا تھا۔

اس نے مجھ سے بات کرنا بہت کم کردی۔ وہ مجھے اپنے بغیر رہنے کا عادی بنانا چاہتی تھی۔ پر میں اس کے خاموش وجود کا عادی ہوتا گیا۔

کبھی وہ گزرے دنوں کی باتیں کرنے لگتی۔ بہت ہلکی آواز میں، بہت مگن ہو کر..... بڑی اداس مسکراہٹ سجا کر۔ وہ اپنے خوابوں کی تعبیروں کی دعا مانگتی تھی۔ اپنے عہد و پیمان یاد کرتی اور دنیا کی بے ثباتی پہ خوب ہنستی۔ میں دل مسوس کے رہ جاتا۔ میرے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں تھا۔ میں، بہت بے بس، بہت مجبور ہوگیا تھا۔

پھر ایک صبح آئی۔ خزاں کی پھیکی بے رونق صبح۔ اس موسم کی صبح جو اسے بہت پسند تھا۔ اسی پت جھڑ کی صبح، جس کے سائے اسے دیوانہ کردیا کرتے تھے اور وہ چرمر کرتے پتوں پر میرا ہاتھ پکڑ کر دوڑ لگایا کرتی تھی۔ اس سرد ظالم صبح نے میرے جیون میں خزائیں بھر دیں۔

میں کبھی خود روتا تو کبھی پیارے بچوں کو رونے سے روکتا۔ لیکن کون جانے کہ وہ میری زندگی تھی۔ میری دھڑکن تھی۔

میری خوشیوں کو سرطان کا دیمک چاٹ گیا تھا۔ میری ستونتی جنت کے باغوں میں کھل کر چلی گئی۔ سدرہ کے درخت سے ایک پتا گرا اور میری زندگی کے درخت پر پت جھڑ کا موسم ٹھہر گیا۔ پھر اس کے سائے لمبے ہوتے گئے۔ جو میرے وجود کے آر پار ہوتے جاتے ہیں۔

اور میں اب اپنے گھر کی غلام گردشوں میں ایسے ہی چکراتا ہوں تاکہ میرے قدم اس آنگن میں پورے ہوں اور ستونتی اپنی تعبیریں مکمل دیکھے۔

☼

عظمیٰ افتخار

زندگی خاک نہ تھی

"یار ایسا نہیں ہو سکتا کہ دور قدیم لوٹ آئے۔ برتنوں میں کھانے کے بجائے پتوں میں کھانا کھائیں۔ تاکہ یہ جو برتنوں کا انبار جمع ہو جاتا ہے اس سے تو جان چھوٹے۔" ملی نے چڑ کر کہا اور تیز نل کھول کر پلیٹیں دھونے لگی۔

"ہاں..... واقعی اور اگر کیلے کے پتے ملیں تو کیا ہی اچھی بات ہو..... بڑا سا پتا ہو تو دو تین دن تو آرام سے نکل جائیں۔" تاشی، ملی سے بھی زیادہ کام چور تھی اور نفاست پسند بھی صرف دو انگلیوں سے اسٹیل وول پکڑ کراوون کی اوپری سطح صاف کر رہی تھی۔

"ویسے تمہیں ہی شوق تھا جامعہ کراچی میں داخلہ لینے کا..... اچھا بھلا پنجاب یونی ورسٹی سے کیمسٹری میں ماسٹرز کر لیتے۔ نہ گھر چھوٹتا اور نہ یہ مفت کی بیگار جھیلنی پڑتی۔" تاشی نے ہر بار کی طرح اس بار بھی الزام ملی کے سر پر رکھا۔

"ہاں تو میں نے سوچا تھا کہ مزے سے گرلز ہاسٹل میں رہیں گے۔ نت نئے تجربات ہوں گے اور بے فکری کی زندگی انجوائے کریں گے..... مجھے کیا پتا تھا کہ کالے پانی کی سزا مل جائے گی۔" ملی اب گلاس دھونے کے بعد اسے سونگھ رہی تھی کہ آیا اس میں سے خوشبو آ رہی ہے یا نہیں۔

"آہستہ بولو..... پھوپھی اماں نے سن لیا تو ابھی دونوں کو سچ مچ کالے پانی بھیج دیں گی۔"

"اور یہ کیا تم ہر گلاس کو دھونے کے بعد سونگھ سونگھ

مکمل ناول



کر چیک کر رہی ہو۔ یہ خواص تم میں پہلے تو نہیں پائے جاتے تھے۔" تاشی نے پہلے کھوجتی ہوئی نگاہوں سے دروازے کی طرف دیکھا پھر ملی کو اس کی اس غیر مہذبانہ حرکت پر ٹوکا۔

"تمہیں شاید معلوم نہیں..... پھوپھی اماں کی عقابی نظریں بندے کا تو ٹھیک ٹھاک پوسٹ مارٹم کرتی ہی ہیں..... اس کے کیے گئے کام پر بھی کڑی نگاہ رکھتی ہیں۔ پرسوں میں صرف گلاس کو پانی سے کھنگال کر ان کے لیے اس میں پانی لے کر چلی گئی تو معلوم ہے انہوں نے کیا کیا..... "ملی نے ہاتھ روک کر ڈرامائی انداز اختیار کیا۔

"پہلے تو انہوں نے گلاس کو سونگھا پھر کہنے لگیں "کیا جاتا اگر ایک سرف میں بھیگے کپڑے کا ہاتھ لگ جاتا۔ حد ہوتی ہے کام چوری کی بھی۔ پڑھی لکھی لڑکی ہو کر تمہارا یہ حال ہے کہ صفائی کے اصولوں سے نابلد ہو۔ تم سے اچھی تو رخسانہ ہے۔ جبکہ ان پڑھ ہے' پھر بھی طریقے سلیقے سے کام کرتی ہے۔ اب کوئی ان سے پوچھے کہ جب آپ کے گھر میں ایک فل ٹائم ملازمہ ہے تو بھلا اپنی پیاری پیاری' خوب صورت بھتیجیوں سے کام کاج کروانے کی کیا ضرورت ہے' مگر نہیں جی..... مساوات کا دریا تو ہمارے ہی گھر میں بہہ رہا ہے۔ محترمہ رخسانہ صاحبہ نے روحان کے اعزاز میں دعوت شیراز کا کھانا کیا بنا لیا۔ بس اب پھوپھی اماں کے کمرے میں سکون سے آرام فرما رہی ہیں اور ہم ہیں کہ ماسی بنے ہوئے ہیں..... اور روحان کو دیکھا تھا کیسا ندیدوں کی طرح کھا رہا تھا۔ چھ پلیٹیں تو اس نے استعمال کی ہیں۔" ملی سچ مچ تپی ہوئی تھی۔

آج پھوپھی اماں کے نیچے والی منزل کے کرائے دار راشدہ آنٹی اور ان کے اکلوتے بیٹے روحان کی دعوت تھی۔ اور وجہ دعوت یہ تھی کہ روحان کو ایک فوڈ کمپنی کے فنانس ڈپارٹمنٹ میں اکاؤنٹنٹ کی جاب مل گئی تھی۔ اس نے پچھلے سال فنانس مینجمنٹ میں ایم بی اے کیا تھا۔ نہ صرف مشاہرہ اچھا تھا بلکہ دوسری مراعات بھی تھیں۔ اچھی کارکردگی پر آگے ترقی کے مواقع بھی تھے۔

"تم مانو یا نہ مانو..... یہ ضرور ہماری اماؤں کی سازش ہو گی۔ وہاں تو صرف امور خانہ داری پر لیکچر ملتا تھا..... یہاں پریکٹیکل کرنے بھیج دیا..... اگر مجھے پتا ہوتا کہ تمہاری خالدہ پھپھو ایسی سخت ہیں تو میں کبھی اسلام آباد چھوڑ کر یہاں نہ آتی۔" تاشی بالآخر اوون صاف کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی اور اب اپنے ہاتھ اچھی طرح دھو کر کچن میں ہی چھپائے گئے ہینڈ لوشن سے مساج کر رہی تھی۔

"کومل..... نتاشا!" پھوپھی اماں کی عادت تھی وہ دور سے آواز دیتے ہوئے مقابل کی طرف آتی تھیں۔ اور یہ ان کی واحد خوبی تھی کومل اور نتاشا جس کی معترف تھیں..... کیونکہ آواز سنتے ہی دونوں فوراً" شریف اور بیبا بچیوں کا روپ دھار لیتی تھیں۔ نتاشا نے فوراً" ہینڈ لوشن دراز میں رکھا اور مستعد ہو گئی۔

"نتاشا! کچن صاف ہو گیا؟" پھوپھی اماں دروازے تک پہنچ چکی تھیں اور اب نتاشا سے مخاطب تھیں۔

"جی..... جی پھوپھی!" نتاشا کے آدھے لفظ اندر تھے اور آدھے باہر۔

"ٹھیک ہے..... مجھے ذرا قہوہ بنا کر دو۔" پھوپھی اماں نے حکم دیا۔ پھر کچھ خیال آنے پر دوسرا سوال داغا۔

"قہوہ تو بنانا آتا ہے ناں....." اس بار پھوپھی اماں کی نگاہیں نتاشا کے چہرے پر جمیں۔

"جی..... وہ چینی پتی اور دودھ سے ہی بنتا ہو گا ناں۔" نتاشا نے تھوک نگلا۔

"چینی' پتی اور دودھ سے چائے بنتی ہے بی بی..... قہوہ نہیں۔" انہوں نے وہ ہی ناصحانہ انداز اختیار کیا جو وہ غصہ آنے پر رخسانہ (ماسی) کے لیے کرتی تھیں۔

"ایک کپ پانی میں چھوٹا سا ادرک کا ٹکڑا' آدھا دار چینی کا ٹکڑا اور ایک چٹکی پتی ڈال کر جوش دے لے ناں' پھر ذرا دم پر رکھ دینا' بس قہوہ تیار ہے..... سمجھ

گئیں؟" ترکیب بتانے کے ساتھ ہی انہوں نے نتاشا سے سوال کیا۔

"جی..... جی پھوپھی اماں۔" نتاشا فوراً" چائے کی پتیلی کیبنٹ سے نکالنے لگی۔ یہ اور بات ہے کہ پوچھ نہ سکی کہ دار چینی کس شکل کی ہوتی ہے۔

"اور کومل! حد ہے تمہاری سستی کی بھی..... چار پلیٹیں' تین گلاس' چھ چمچ اور دو پتیلے..... اتنے سے برتن اور اتنی اٹھا پٹخ کہ آوازیں کمرے تک آ رہی ہیں۔ گھنٹے بھر میں بھی نہیں دھلے؟" پھوپھی اماں کی توپوں کا رخ اب کومل کی طرف ہو گیا تھا۔

"جی' جی پھوپھی اماں! بس ہو گئے۔" وہ چاول کا پتیلا دھو کر نیچے کے کیبنٹ میں رکھنے لگی۔

"ٹھیک ہے..... کام ختم ہو جائے اور قہوہ بن جائے تو دونوں میرے کمرے میں آ جانا۔ کچھ سوٹ پیس رکھے ہیں۔ پسند آئیں تو سلوا لینا۔"

وہ جیسے آئی تھیں ویسے ہی واپس پلٹ گئی تھیں اور وہ دونوں فقط کندھے اچکا کر رہ گئی تھیں۔ پھوپھی اماں کا مزاج سمجھنا..... ڈان کو پکڑنے سے زیادہ مشکل تھا..... یہ تاشی کا خیال تھا اور ملی اس سے سو فیصد متفق تھی۔



"اوف..... تاشی..... جلدی آؤ..... کیا ہینڈسم ہے' اسمارٹ..... میرا تو دل آ گیا اس پر..... جی تو کر رہا ہے..... ایک بار تو اسے چھو کر دیکھوں۔" ملی چھت پر اپنی دوربین لیے سامنے والے گھر کا پوسٹ مارٹم کر رہی تھی۔

"کہاں ہے؟ دکھاؤ..... دکھاؤ مجھے بھی۔" تاشی کینو کھانا چھوڑ چھاڑ اس کی طرف لپکی۔

"پہلے یہ اپنے کھٹے میٹھے ہاتھ صاف کرو' جن سے رس ٹپک رہا ہے۔"

تاشی نے جھٹ پٹ اپنے کاسنی دوپٹے سے ہاتھ صاف کیے اور دوربین پکڑ لی۔

"ایں..... "سامنے تو منظر ہی کچھ اور تھا۔

"تم..... اس کی بات کر رہی تھیں۔ اس ڈھائی تین سال کے بچے کی؟ حد ہے ملی۔ بچہ بھی کبھی ہینڈسم اور اسمارٹ ہوتا ہے؟ تمہیں تو یہ بھی ڈھنگ سے نہیں معلوم کہ بچے کی تعریف میں کون سی صفت لگانی ہے..... میں بھی پاگلوں کی طرح اپنا شغل چھوڑ کر تمہاری باتوں میں آ گئی..... ہونہہ! اور اپنا اچھا بھلا دوپٹا بھی خراب کر لیا۔" اب کے گھورنے کی باری تاشی کی تھی۔ وہ جھٹکے سے دوربین ملی کے ہاتھ میں تھما کر واپس اپنی کرسی پر جا بیٹھی تھی۔

"ہاں! تو میں نے غلط تو نہیں کہا۔ اس بچے کے زمانہ' مستقبل کی تصویر کشی کی تھی۔ وہ کیوٹ سا بچہ بڑا ہو کر تو ہینڈسم اور اسمارٹ ہی نکلے گا ناں۔"



"مجھے تو اس بچے کو دیکھ کر اپنا گپلو سا بھتیجا رامش یاد آرہا ہے۔ دو دن سے اتنا ٹف شیڈول ہے کہ میں نے اپنے پیارے سے بھتیجے کو ایک بھی ہوائی پیغام نہ بھیجا۔"

ملی دوبارہ دوربین اپنی آنکھوں پر فٹ کر چکی تھی۔ بچہ بہت پیارا تھا۔ وہ اپنے چھوٹے سے مگر خوب صورت اور ترتیب دیے ہوئے لان میں گیند سے کھیل رہا تھا۔ گرین شیڈ میں شاید کوئی موجود تھا۔ جسے وہ آواز دے کر اپنی طرف متوجہ بھی کر رہا تھا۔

"ہاں، جیسے رامش تو تمہارے ایس ایم ایس وصول کرنے کے لیے بے تاب ہے۔" تاشی نے تڑ سے جواب دیا۔

"ہاں تو اور نہیں تو کیا..... میں جو بھی ایس ایم ایس سمیعہ بھابھی کو کرتی ہوں۔ جواباً" وہ یہی لکھ کر بھیجتی ہیں کہ رامش نے اس کا جواب یہ دیا ہے۔"

"آپی کی تو رہنے ہی دو۔ انہیں اپنی طرف سے کہانیاں بنانے کی عادت ہے، یاد نہیں ہر اچھی اور خوب صورت چیز جو ان کے پاس ہوتی ہے۔ وہ اس کی تعریف اس جملے کے ساتھ کرتی ہیں کہ یہ انہیں فرجاد بھائی نے دی ہے۔"

"تو تمہارا کہنے کا مطلب ہے کہ رامش مجھے یاد نہیں کرتا اور سمیعہ بھابھی یہ سب میرا دل رکھنے کو کہتی ہیں؟" ملی نے دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر اسے گھورا۔

"ہاں تو اور کیا..... رامش کو اور بھی سینکڑوں کام ہیں، رونا، گانا، کھیلنا، کمرا پھیلانا..... وہ تمہیں یاد کرنے میں سارا وقت برباد کر دے گا کیا؟" تاشی نے تجاہل عارفانہ سے کام لیا۔

"ہونہہ!" ملی نے سر جھٹکا اور دوبارہ اپنے شغل میں مصروف ہو گئی۔

"سوچو تاشی..... میں اس بچے سے کیسے ملوں۔" ملی کی سوئی بچے پر ہی اٹکی ہوئی تھی۔

"سمپل..... اس کے والد محترم دنداں ساز ہیں۔ اپائنٹمنٹ لو اور مل لو۔" تاشی نے آخری پھانک منہ میں رکھی اور نمک ہاتھوں سے جھاڑا۔

"مطلب؟" ملی نے اسے گھورا۔

"مطلب یہ کہ وہ ڈینٹسٹ ہیں۔ لاسٹ ویک تمہارے دانت میں درد تھا تو پھوپھی اماں نے نہیں کہا تھا۔ حمزہ بیٹے کے کلینک چلی جاؤ۔"

"تو..... وہ حمزہ..... اس بچے کے فادر ہیں؟"

"میرا تو یہی خیال ہے کہ اس بچے کے فادر ہیں۔" تاشی نے اطمینان سے کہا۔

"تو چلو ناں تاشی! تم اپنا دانت دکھانا۔ میں اس بچے سے مل لوں گی۔" وہ ملتجی انداز میں گویا ہوئی۔

"واہ..... ملنا تمہیں ہے..... اور اپنے دانت کو بلی میں چڑھاؤں۔ نہ بی بی، چوہا لنڈورا ہی بھلا۔" تاشی نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"اب اگر میں دانت دکھانے گئی تو بچے سے کیسے ملوں گی؟ تم دانتوں کا چیک اپ کرانا۔ میں بچے کو دو چار جپھیاں ڈال لوں گی۔" ملی کے پاس تو گویا پورا پروگرام تھا۔

"محترم کومل فصیح الدین! انہوں نے گھر میں کلینک نہیں کھولا ہوا..... رات بارہ بجے سے پہلے وہ گھر تشریف نہیں لاتے..... اور اس کے بعد جانا شریفوں کا وطیرہ نہیں۔" تاشی نے گویا ہوش دلایا۔

"اچھا تو ان کی وائف تو ہوں گی۔ کوئی نئی ڈش ٹرائی کرتے ہیں۔ دینے کے بہانے بچے سے مل آئیں گے۔"

"توبہ ہے ملی! تمہیں تو نئی نئی راہیں سوجھ رہی ہیں۔ گویا بچے سے نہیں ملنا، بلکہ اپنے محبوب سے ملنا ہو، کوئی وائف نہیں ان کی، میرا تو خیال ہے میاں بیوی میں علیحدگی ہو چکی ہے۔" تاشی نے اپنا خیال ظاہر کیا اور کھڑے ہو کر کپڑے جھاڑے اور سارے چھلکے شاپر میں ڈالے۔

اسی وقت پھوپھی اماں نے نیچے سے آواز لگائی کہ مغرب کا وقت ہو رہا ہے نیچے آجاؤ..... تاشی نے سیڑھیوں کی طرف قدم بڑھائے۔ ملی بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ آخری بار پھر سامنے والوں کے لان میں جھانکا۔ لان خالی تھا۔ وہ اپنی دوربین دوپٹے میں چھپائے نیچے اتر گئی۔

☼ ☼ ☼

"ہاں نتاشا..... وہ گتے کا ڈبا ہٹاؤ، اب جو چیز نظر آ رہی ہے اس پر سے کپڑا اٹھاؤ۔"

پھوپھی اماں کی ہدایت پر نتاشا نے ان کے بیڈ کے نیچے موجود سلائی مشین نکال کر باہر رکھی۔

"صبح تم لوگ جب یونیورسٹی گئے تھے تو رخسانہ سے گھر کی صفائی کے بعد میں نے یہ مشین اسٹور سے نکلوائی۔ پھر صاف کروا کر اس کے پرزوں میں تیل ڈلوا کر دھوپ میں رکھوایا تاکہ یہ کچھ رواں ہو جائے۔"

"پہلے پہل تو تم لوگوں سے موٹر والی مشین سے نہیں سیا جائے گا ناں۔ اس لیے ہاتھ والی نکلوائی ہے۔"

تاشی اور ملی آنکھیں پھاڑے کبھی پھوپھی اماں کو دیکھ رہی تھی اور کبھی سلائی مشین کو..... جو یقیناً" ان کے جہیز کی تھی۔

"ارے بھئی! سلائی کٹائی نہیں سیکھنی کیا؟" انہوں نے دونوں کے ہونق منہ دیکھ کر کہا۔

"جی..... جی مگر ہماری پڑھائی....." ملی نے تھوک نگلا۔

"پڑھائی پر کیا اثر پڑتا ہے۔ جس طرح ہر ویک اینڈ پر تم لوگ کچن سنبھالتے ہو۔ اب دو کے بجائے ایک کچن سنبھالے گی اور ایک سلائی مشین۔" "اگلے ویک اینڈ پر پہلے والا، دوسرے کی پوزیشن سنبھالے گا۔" پھوپھی اماں نے یوں کہا گویا جنگ کا میدان ہو اور کوئی مورچہ خالی نہ چھوڑا جائے۔

"اور ٹننگ، وہ کب ہو گی؟" اب کے تاشی نے زبان کھولی۔

"وہ روز ہو گی آخر یونیورسٹی سے آکر پچاس سہیلیوں کو ایس ایم ایس کرتی ہو، روز ٹی وی پر عمیرہ احمد، ملاہا ملک، فائزہ افتخار اور ثروت نذیر کے ڈرامے دیکھتی ہو۔ کھانے کے بعد ایک گھنٹہ کمپیوٹر پر وقت گزارتی ہو..... تو دس سے پندرہ منٹ ٹننگ کی پریکٹس نہیں کر سکتیں کیا؟" پھوپھی اماں سے جیتنا بہت مشکل تھا۔

"کاش! میں ڈان کو پکڑنے خود نکل جاتی..... مگر جامعہ کراچی میں داخلہ نہ لیتی۔" یہ سارے ارشادات سن کر ملی کے کانوں سے دھواں نکل رہا تھا۔ تاشی کے بھی کم و بیش یہی تاثرات تھے۔ پھوپھی اماں دونوں کی حالت زار سے قطع نظر مشین پر کپڑا ڈال کر واپس اپنے بیڈ کے نیچے کر رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"کومل، ناجیہ، مینا، جلدی چلو..... میڈم صادقہ لیب میں بہت غصے میں ہیں۔ نتاشا نے لیب میں دھماکا کر دیا ہے۔" ارسلان بڑے سے لیب کوٹ میں بوٹا سا قد لیے ان کے سر پر کھڑا جلدی جلدی بول رہا تھا۔

"دھماکا..... تاشی نے؟" سنتے ہی تینوں نے اوپر کی طرف دوڑ لگائی۔

آرگینک کیمیکل فرام نیچرل کمپاؤنڈ کے پریکٹیکل ہو رہے تھے۔ مس صادقہ ڈیمونسٹریشن دے چکی تھیں اور اب تمام اسٹوڈنٹس پریکٹیکل کے طریقہ کار کے مطابق اپنا لیبارٹری سامان سیٹ کر کے پریکٹیکل شروع کر چکے تھے۔ لیبارٹری میں چوبیس اسٹوڈنٹس تھے۔ ہر گروپ چار، چار اسٹوڈنٹس پر مشتمل تھا۔ تاشی، ملی، ناجیہ اور مینا بھی راؤنڈ بوتل میں لکڑی کے ٹکڑے اور دوسرے مطلوبہ کیمیکل ڈال کر بوائلنگ کے لیے رکھ چکی تھیں۔ بوائلنگ تقریباً" پینتالیس منٹ کے لیے کرنی تھی اور وقفے وقفے سے درجۂ حرارت نوٹ کرنا تھا اور مطلوبہ درجۂ حرارت پر رکھنے کے لیے اسپرٹ لیمپ کو واٹر باتھ کے نیچے رکھنا اور ہٹانا تھا۔

پینتالیس منٹ تک پوری تجربہ گاہ کے اسٹوڈنٹس کو سکون سے بیٹھ کر راؤنڈ بوتل کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے کا یارا نہ تھا اور چونکہ مس صادقہ اس معاملے میں آزادی کی قائل تھیں۔ اس لیے ہر گروپ کے دو، دو

تین تین ممبرز کینٹین جا چکے تھے مگر جانے سے پہلے اپنے رکنے والے ساتھی کو درجہ حرارت نوٹ کرنے کی تاکید کرنا نہ بھولے تھے۔ ملی، ناجیہ اور مینا بھی تاشی کے سپرد یہ کام کر کے کباب رول اور کولڈ ڈرنک لینے چلی گئی تھیں ۔۔۔ مگر سیڑھیوں کی ریلنگ کے ساتھ ٹیک لگائے ۔۔۔ رول کھاتے اور کولڈ ڈرنک کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرتے اور بے تحاشا بولتے ہوئے وہ تینوں بھول گئیں کہ وہ آدھے گھنٹے سے لیب سے باہر ہیں اور اب جوار سلان نے آکر تینوں کے حواس مختل کر دیے تھے۔

لیبارٹری میں قدم رکھتے ہی دھوئیں نے ان کا استقبال کیا۔ ان کی ٹیبل جائے واردات کی نشان دہی کر رہی تھی۔ پوری لیب کے اسٹوڈنٹس اور خصوصاً ان چاروں کو مس صادقہ سے بے بھاؤ کی سننے کو ملی تھیں اور نتیجے کے طور پر سب کا پریکٹیکل کے دوران لیب سے باہر جانا ممنوع قرار پایا تھا۔

آخر جب ڈانٹ سے گلوخلاصی ہوئی اور لیب اسٹنٹ نے تینوں کو چارج شیٹ تھمائی کہ جو سامان ٹوٹا ہے اس کے پیسے اس میں درج ہیں تو ملی شعلہ بار نگاہوں سمیت تاشی کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ پوری پریکٹیکل بینچ شیشے کی باریک کرچیوں سے ڈھکی ہوئی تھی اور تاشی پیچھے ہاتھ کیے سر جھکائے کھڑی تھی۔

"تاشی کی بچی ۔۔۔ یہ سب کیا ہے؟"

"تم آدھے گھنٹے تک ڈھنگ سے درجہ حرارت بھی نوٹ نہیں کر سکتی تھیں؟" مینا نے بھی لتاڑا۔

"ضرور کر لیتی ۔۔۔ اگر پھندوں میں نہ اٹک جاتی۔" تاشی نے اٹک اٹک کر کہا۔

"پھندے ۔۔۔؟" ان تینوں نے نا سمجھی میں ایک دوسرے کی سمت دیکھا۔ تاشی نے ان کی گھورتی نگاہوں کی تاب نہ لا کر سلائیاں اور اون کا گولہ آگے کر دیا۔

"میں نے پھندے ڈال کر بیس تو بنا لی تھی مگر بارڈر بناتے وقت الجھ گئی ۔۔۔ سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ ہر بار اون گھما کر آگے سے پیچھے لینا ہے یا ایک بار سیدھا ٹانکا اور ایک بار الٹا ٹانکا لینا ہے، بس کنفیوژن میں درجہ حرارت نوٹ کرنا بھول گئی۔" وہ معصومیت کا پیکر بنی کھڑی تھی۔

"اف۔" ملی نے دانت کچکچائے "یہ پھوپھی اماں اور ان کے سگھڑ بنانے کے طریقے ۔۔۔ آج لیب میں بھی لے ڈوبے۔" ناجیہ اور مینا ہنوز بت بنی کھڑی تھیں۔ ناجیہ کے مجسمے میں حرکت ہوئی۔

"اب بھرو ۔۔۔ یہ چار سو روپے ۔۔۔ کھایا پیا کچھ نہیں اور گلاس توڑا بارہ آنے کا۔"

"پریکٹیکل بھی نامکمل رہا۔ اور نقصان بھی ہو گیا۔" ملی نے تینوں کی طرف سے تین سو روپے تاشی کے ہاتھ میں تھمائے، مطلب چوتھا نوٹ اب تم ڈالو اور لیب اسٹنٹ کو دے کر آؤ۔

وہ مرتی کیا نہ کرتی، اون سلائیاں بیگ میں رکھ کر لیب اسٹنٹ کی طرف چل دی۔

☼ ☼ ☼

"پھوپھی اماں! آپ اکیلے یہاں رہتی ہیں ۔۔۔ آپ کو ڈر نہیں لگتا؟"

آج چھٹی کا دن تھا۔ تاشی، پھوپھی اماں کے سر میں تیل سے مساج کر رہی تھی۔ جبکہ ملی پاس ہی کاؤچ پر بیٹھی اپنے سر میں خود تیل لگا رہی تھی۔ پھوپھی اماں نے اسے سرسوں کے تیل میں ایلوویرا اپھینٹ کر دیا تھا کہ اس کے ۔۔۔ مسلسل استعمال سے بال خوب صورت ہو جائیں گے۔

"ڈر ۔۔۔ کس چیز کا ڈر؟" انہوں نے رسانیت سے پوچھا۔

"اکیلے پن کا ڈر؟" تاشی نے کہا۔

"نہیں۔" پھوپھی اماں نے قطعیت سے کہا۔ "جتنی زندگی گزری ہے۔ بس یہی جانا ہے کہ انسان کو اکیلے پن سے شاید اتنا ڈر نہیں لگتا ۔۔۔ جتنا انسانوں کے ہجوم سے۔ اکیلا انسان تو آہستہ آہستہ خدا شناس بن جاتا ہے مگر انسانوں کے ہجوم میں رہنے سے اسے اپنے ہر عمل، ہر فیصلے اور ہر ضرورت کے لیے ہجوم کے چہروں پر نظر ڈالنی پڑتی ہے کہ کسی رشتے میں دراڑ تو نہیں پڑ رہی، کوئی ہمیں چھوڑ تو نہیں دے گا، کسی کا دیا دکھ ہماری جان نہ لے لے۔ بس اپنے رہو اور اپنے ہی بن کے رہو۔"

ملی سر نیچے کیے بالوں میں مساج کر رہی تھی۔ پھوپھی اماں کی بات پر اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ ان کا لہجہ سادہ تھا اور وہ مساج کے زیر اثر آنکھیں بند کیے بولتی جا رہی تھیں۔ چہرے پر دکھ کا شائبہ بھی نہ تھا۔ مگر جانے کیوں ملی کو لگا وہ کسی غم سے گزری ضرور ہیں ۔۔۔ کوئی ایسا اضطراب جس نے ریاضت کے بعد سکون کا رنگ لے لیا ہے۔

"اور پھر کاہے کا ڈر بیٹا ۔۔۔ نیچے کا پورشن راشدہ کو دیا ہے۔ ماشاء اللہ سے وہ اور روحان دونوں بہت اچھے ہیں۔ آدھی رات کو بھی کسی چیز کی ضرورت پڑے تو روحان آجاتا ہے۔ باہر کے کاموں کے لیے گلفام ہے۔ کہنے کو سترہ برس کا ہے مگر زیرک اور ہوشیار ہے اور وہ نہ ہو تو روحان آتے جاتے میرا حال پوچھ لیتا ہے۔ گھر میں میری دیکھ بھال اور کام کاج کے لیے رخسانہ ہے، قابل اعتبار ہے، کئی سالوں سے کام کر رہی ہے۔ آنکھ کا اشارہ تک سمجھ جاتی ہے۔ تمہارے پھوپھا کی اچھی خاصی پنشن آجاتی ہے۔ دو دکانوں کا کرایہ آجاتا ہے، کچھ پیسہ بینک میں ہے ۔۔۔ بس مجھ اکیلی کی اور ضرورت بھی کیا ہے۔ خدا کے فضل سے اچھے دن گزر رہے ہیں۔" آج وہ بہت موڈ میں تھیں، تاشی اور ملی دونوں کو انہیں سننا اچھا لگ رہا تھا۔ ان کا یہ روپ حیران کن تھا۔ آج سے پہلے انہوں نے کبھی دونوں سے یوں دل کی باتیں نہ کی تھیں۔

"اماں جی! چائے ۔۔۔" رخسانہ چائے کے تین کپ لیے چلی آئی۔ پھوپھی اماں نے آنکھیں کھولیں اور تاشی اور ملی کے گرد چھایا سحر ٹوٹ گیا۔

"بس بیٹا! تھک گئی ہو گی شکریہ! اچھا مساج کیا۔" انہوں نے نرمی سے تاشی کو منع کیا۔

"رخسانہ کی یہ اچھی بات ہے۔ عام کام کرنے والیوں کی طرح کسی کام کے لیے اسے آوازیں نہیں لگانی پڑتیں۔ یہ میرا ٹائم ٹیبل جانتی ہے۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے چائے کا کپ تھام لیا۔ ملی اور تاشی نے بھی اپنے اپنے کپ تھام لیے۔

"یہ کیا بات کی اماں جی ۔۔۔ میں تو خود کو اس گھر کا فرد ہی سمجھتی ہوں ۔۔۔ میں کوئی عام ماسی نہیں ہوں۔" وہ ناراض چہرہ لیے ان کے قدموں میں بیٹھ کر ان کے پیر دابنے لگی۔

"جیتی رہو۔ خوش رہو۔" پھوپھی اماں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

تاشی اور ملی کی آنکھیں ایک دوسرے سے چار ہوئیں۔ پھوپھی اماں کے سخت رویے کے نیچے محبت اور نرمی تھی۔ ملی کو جانے کیوں رہ رہ کر ناریل کا خیال آتا رہا۔

☼ ☼ ☼

"اٹھو ناں تاشی! اتنا اچھا موسم ہو رہا ہے ۔۔۔ چھت پر چلتے ہیں، یا پھر واک کرتے ہیں باہر چل کر۔"

شام کے پانچ بج رہے تھے۔ موسم بڑا ہی سہانا تھا ۔۔۔ آسمان کو بادلوں نے ڈھکا ہوا تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ ملی، تاشی کو جگا رہی تھی مگر وہ جب سے یونی ورسٹی سے آئی تھی۔ گدھے گھوڑے بیچ کر سو رہی تھی۔ اتفاق تھا کہ آج پھوپھی اماں راشدہ آنٹی کے ساتھ مارکیٹ گئی ہوئی تھیں۔ گلفام بھی ان ہی کے ساتھ گیا تھا اور ان لوگوں کی اب تک واپسی نہ ہوئی تھی ۔۔۔ ملی نے تاشی کو جگایا مگر جب وہ ٹس سے مس نہ ہوئی تو ملی اپنی دوربین اور موبائل ہاتھ میں لیے دل ہی دل میں تاشی کو برا بھلا کہتی چھت پر چلی آئی۔ اور دوربین آنکھ سے لگتے ہی اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

وہی خوب صورت سا دو ڈھائی سال کا بچہ لان سے اندر کی طرف جاتی سیڑھیوں پر گرا پڑا تھا اور روئے جا رہا تھا۔

بھاگتی ہوئی نیچے آئی اور گھر کا دروازہ کھول کر سامنے والے گیٹ کی طرف بڑھی۔ دو تین دفعہ بیل بجائی مگر شاید بیل خراب تھی۔ پھر اس نے دروازہ پیٹا مگر کوئی باہر نہ نکلا۔ اس نے دروازے پر بھرپور نظر ڈالی۔

دروازہ ایسا جالی والا تھا کہ ان میں پیر پھنسا کر دوسری طرف جایا جاسکتا تھا۔

ملی نے بس ایک لمحے کے لیے سوچا۔ اپنی دوربین کو لٹکتی ڈوری سے گلے میں ڈالا اور دروازے کی جالیوں میں پیر پھنسا کر اوپر چڑھی اور دوسری طرف کود گئی۔

اونچی جگہ سے کودنے سے اس کی ٹانگ میں جھٹکا سا آیا تھا مگر اس وقت اسے خود سے زیادہ بچے کی فکر تھی۔ بھاگتی ہوئی وہ بچے کے قریب آئی۔ اس کا خون بہہ رہا تھا۔ وہ روتے روتے ہلکان ہو گیا تھا۔ اس نے بچے کو گود میں اٹھایا اور زور زور سے آواز دینے لگی کہ اندر کوئی ہو تو باہر آجائے۔

اور جتنی دیر میں کوئی اندر سے باہر آتا وہ تاشی کو کال ملا چکی تھی۔ شکر تھا کہ اس نے بروقت کال ریسیو کرلی۔ ملی نے تاشی کو ساری صورت حال بتا کر اسے باہر نکل کر کوئی ٹیکسی روکنے کا کہا۔ جیسے ہی ملی نے فون رکھا۔ اندر سے ایک خاتون، وہیل چیئر دھکیلتی ہوئی باہر آئیں۔ باہر آکر ان کے چیخ نکل گئی۔

"ارسل میری جان..... یہ کیسے.....؟" ان کا جملہ پورا ابھی نہ ہوا اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

"بیٹا..... میں اپنے بیٹے کو کال کرتی ہوں۔" وہ روتے ہوئے کہنے لگیں۔

"نہیں آنٹی! آپ فکر نہ کریں۔ میں اسے اسپتال لے جاتی ہوں۔ میں سامنے والے گھر سے آئی ہوں۔ خالدہ پھپھو کی بھتیجی ہوں۔" ملی نے اتنا ہی کہا کہ اس کے موبائل پر تاشی کی کال آنے لگی۔ وہ لوگ دروازے پر ہی تھے۔ ملی نے دروازہ کھول دیا۔

"روحان صاحب ابھی گھر آئے تھے۔ میں نے انہیں بتایا تو انہوں نے ٹیکسی کرنے کے بجائے خود ساتھ چلنے کی آفر کردی۔" تاشی نے جلدی جلدی بتایا۔

"اوکے روحان! چلیں، پھر جلدی سے آجائیں۔" ارسل ملی کی گود میں ابھی تک سسک رہا تھا۔ ملی کو بچے پر بے تحاشا ترس آرہا تھا۔

وہ بجلی کی سی تیزی سے روحان کے ساتھ باہر نکلی۔

مگر جاتے ہوئے وہ تاشی کو آنٹی کا خیال رکھنے کی تاکید کر گئی اور یہ بھی کہ پھوپھی اماں آجائیں تو انہیں بھی بتا دینا۔

تاشی نے اثبات میں سر ہلایا اور ان خاتون کے پاس چلی آئی۔ وہ ابھی تک صدمے کی کیفیت میں تھیں۔ تاشی ان کی وہیل چیئر دھکیلتی اندر لے آئی اور پانی پلانے لگی۔ ساتھ ہی تسلی بھی دینے لگی۔ جب ذرا ان کے حواس بحال ہوئے تو وہ تاشی کو بتانے لگیں۔

"فاطمہ ارسل کی اور میری میڈ ہے۔ گروسری لینے گئی ہوئی ہے۔ ارسل میرے ساتھ ہی ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ جانے کب بیٹھے بیٹھے میری آنکھ لگ گئی اور یہ چپکے سے باہر نکل آیا۔ شاید یہ سلائیڈز پر کھیلتے ہوئے پھسلا ہے، جب ہی چوٹ لگ گئی ہے..... اگر یہ بچی نہ آتی تو جانے کیا ہوتا۔ میں حمزہ کو کیا جواب دیتی۔ میرا بچہ پہلے ہی پریشان رہتا ہے۔ اپاہج ماں اور چھوٹا سا بچہ..... اب وہ باہر کی ذمہ داری سنبھالے یا گھر کو دیکھے۔" وہ بہت دل گرفتہ سی تھیں۔

"مگر یہ لڑکی..... یہ کیسے آئی؟ دروازہ تو بند تھا....." وہ جیسے اب صحیح معنوں میں چونکی تھیں اور جواباً تاشی مسکرادی۔

"یہ لڑکی..... صرف لڑکی نہیں ہے آنٹی! اشی از ملی..... میرا مطلب کومل۔" اور پھر وہ انہیں سارا قصہ سنانے لگی۔ بچوں سے محبت، دوربین سے دور، دور تک دیکھنے کا شوق، تاشی کو جگاتا پھر اکیلے ہی چھت پر چلے جانا۔ یہاں تک کی کہانی تو تاشی جانتی تھی۔ باقی کی کہانی اس نے اپنے تخیل سے پوری کردی تھی کہ یقیناً "ملی نے اوپر سے ارسل کو دیکھا ہو گا اور دروازہ پھلانگ کر ان کے گھر پہنچ گئی۔ تاشی کا انداز اتنا برجستہ تھا کہ آنٹی سنتے سنتے مسکرائے گئیں۔ وہ حقیقتاً "ملی کی دل سے شکر گزار تھیں۔

☼ ☼ ☼

ارسل کے ماتھے پر زیادہ گہرا زخم نہیں آیا تھا۔ ڈاکٹر نے صفائی کر کے ماتھے کی ڈریسنگ کردی تھی۔ اب تک انجانے خوف کے زیر اثر ملی کی گود میں دبکا جا رہا تھا۔

وہ دونوں جب ارسل کو لے کر اس کے گھر پہنچے تو حمزہ آچکا تھا اور گھر کے لان میں ہی بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔

"چوبابا....." ارسل نے اندر داخل ہوتے ہی حمزہ کو دیکھ کر نعرہ لگایا ملی نے اسے گود سے اتارا وہ بھاگ کر حمزہ کی گود میں آگیا۔ حمزہ نے بے تابی سے اسے گود میں بھر لیا۔ وہ اسے ہر جگہ پیار کیے جا رہا تھا۔ ماتھے پر، گال پر، گردن پہ، وہ یہ بھی بھول گیا کہ روحان اور ملی دروازے پر ہی کھڑے ہیں۔ جبکہ ملی ارسل کے طرز تخاطب پر حیران تھی۔

"چوبابا۔" اور ساتھ ساتھ یہ خوب صورت ملاپ بھی دیکھے جا رہی تھی۔ تب ہی ارسل ہاتھ کے اشارے سے اسے بلانے لگا۔ وہ اور روحان قریب چلے آئے۔ فاطمہ بھی نزہت آنٹی کی وہیل چیئر دھکیلتی ہوئی باہر آگئی تھی۔

"میں تہہ دل سے آپ دونوں کا شکر گزار ہوں۔ تھینک یو، ریئلی تھینک یو سو مچ۔" حمزہ بہت مشکور تھا۔

"حمزہ بھائی! میرا نہیں، مس کومل کا شکریہ ادا کریں۔ اصل کارنامہ تو انہوں نے انجام دیا ہے۔" روحان نے ملی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور پھر سارا واقعہ کہہ سنایا۔

"تھینک یو مس کومل! اگر آج ارسل کو کچھ ہو جاتا..... تو میں خود کو کبھی معاف نہ کرتا" اس کا لہجہ ہی نہیں انداز بھی تشکر سے لبریز تھا۔

"شکریہ کی کوئی بات نہیں حمزہ صاحب! ارسل اتنا پیارا بچہ ہے کہ کوئی اس سے محبت کیے بنا رہ ہی نہیں سکتا۔" ملی نے ارسل کی طرف محبت سے دیکھا۔

"نہیں مس کومل! ہوتے ہیں دنیا میں کچھ ایسے لوگ، جنہیں فطرت کے یہ پھول بھی اپنی زندگی کی راہ میں کانٹوں کی طرح محسوس ہوتے ہیں۔" حمزہ کا لہجہ عجیب سا درد لیے ہوئے تھا۔

ملی کو لگا شاید وہ اپنی ازدواجی زندگی کی کوئی تلخی بیان کر رہا ہے۔ پھر اس نے اپنی جیب سے وزیٹنگ کارڈ نکال کر ملی کی طرف بڑھایا۔ "کبھی بھی مدد کی ضرورت ہو تو ضرور کہیے گا۔" ملی نے کارڈ تھام لیا۔

"ارسل تو آج سے میرا بیسٹ فرینڈ ہے۔ کیوں ارسل میرے دوست بنو گے نا؟" وہ حمزہ کی بات کا اثر زائل کرنے کے لیے اس کی سمت متوجہ ہو گئی اور اپنا موی ہاتھ اس کی جانب بڑھا دیا۔ ارسل نے جھٹ سے تھام لیا۔ وہ بھی جواباً" مسکرادی۔

حمزہ سے بات کر کے وہ اور روحان، نزہت آنٹی کی طرف آئے اور ان سے جانے کی اجازت چاہی۔ وہ بھی حمزہ کی طرح دونوں کی اور خاص طور پر ملی کی شکر گزار تھیں اور یوں بنا کسی خاطر داری کے ان کے چلے جانے پر رضامند نہ تھیں، مگر روحان اور ملی دونوں نے دوبارہ آنے کا وعدہ کرلیا۔



"اف! ساڑھے چار مہینے بعد آخر ہم اپنے شہر جا رہے ہیں۔ اب آئے نا عیش کے دن۔" تاشی نے ایک لمبی انگڑائی لی۔

"میں تو پارلر کے تین چار سیشن لوں گی۔ مینی کیور اور پیڈی کیور کرواؤں گی۔ یونی ورسٹی کی دھوپ چھاؤں نے پیروں پر زیبرا کراسنگ بنا دی ہے اور پھوپھی اماں نے برتن دھلوا دھلوا کر میرے ہاتھوں کی چمک ماند کر دی۔"

وہ اسلام آباد جا رہی تھیں۔ ان کے جانے سے سب اداس تھے۔ پھوپھی اماں، روحان، راشدہ آنٹی، رخسانہ اور گلفام ہی نہیں، ارسل اور نزہت آنٹی بھی جبکہ وہ دونوں متوقع عیاشیوں کے پیش نظر خوش تھیں۔

جانے سے پہلے تاشی اور ملی ارسل سے ملنے آگئیں۔ ملی اس کے لیے اپنے ہاتھوں سے بنا ہوا سوئیٹر لے گئی جو ارسل کو بہت پسند آیا تھا۔

نزہت آرا کو ملی بہت اچھی لگی تھی۔ پُر خلوص اور گرم جوش سی کومل۔ جانے کیوں وہ جتنی بار بھی انہیں

ملی تھی۔ ایک اپنے پن کا گہرا تاثر چھوڑ گئی تھی۔

"کیا ہی اچھا ہو..... جو اس کے آنے سے میرے حمزہ کی زندگی میں بہار آجائے۔" نزہت آرا اسے الوداع کہتی اسی سوچ میں غلطاں رہیں۔

"تم بہت چالاک نکلیں..... چھوٹا سا سوئیٹر بُن کر پھوپھی اماں پر بھی اپنے سگھڑاپے کی دھاک بٹھادی اور نزہت آنٹی کو بھی متاثر کردیا۔"

"ایک میں ہوں..... ابھی تک آدھا ہی بن پائی ہوں۔ لگتا ہے اگلی سردیوں تک ہی مکمل ہوگا۔" تاشی نے ملی سے کہا۔

"جی نہیں! نہ تو میں پھوپھی اماں پر اپنے سلیقے کی دھاک بٹھانا چاہ رہی تھی اور نہ ہی میں نے نزہت آنٹی کو امپریس کرنا چاہا۔ یہ سوئیٹر تو میں اپنے عزیز از جان بھتیجے رامش کے لیے بُن رہی تھی۔ مگر جب ارسل سے ملی تو مجھے لگا اس سوئیٹر کا حق دار وہ ہی ہے۔ تم نے دیکھا تھا ناں۔ وہ پہن کر کتنا پیارا لگ رہا تھا۔" ملی کی نگاہ میں ارسل کا معصوم سراپا لمحے بھر کو لہرایا۔

"اور تم..... تم تو معلوم نہیں کس کا بُن رہی ہو۔ اون کے گولوں کا رنگ بھی خالصتاً" مردانہ منتخب کیا ہے۔ گرے اور آف وائٹ..... اور سائز' ہے کہ بڑھتا ہی چلا جارہا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے۔ تم اگلی سردیوں میں یہ سوئیٹر بنفس نفیس یا تو روحان کو پیش کروگی یا گلفام کو تمغہ حسن کارکردگی پر دوگی جو پھوپھی اماں کے ہر حکم پر الرٹ رہتا ہے۔ اور تمہیں املی اور کٹارے لالا کر دیتا ہے۔"

"بکو مت..... میں گلفام کو کیوں دینے لگی' اسے تو اس کی کوئی گل جان ہی دے گی۔" تاشی نے تڑ سے جواب دیا۔

"اوہو..... ہو..... ہو ہو' اس کا مطلب یہ روحان کے لیے ہے۔" ملی زور زور سے ہنسنے لگی۔

اور جواباً" تاشی نے اس پہ مکے برسانے شروع کر دیے۔ اس کے چہرے پر عجیب سی قوسِ قزح تھی۔ دھوپ چھاؤں کا منظر۔ تحمل سے اظہار اور منہ سے انکار۔ ملی دل و جان سے اس کے سارے مکے سہتی اطمینان سے پھوپھی اماں کے گھر کا گیٹ پار کر گئی۔

☆ ☆ ☆

"گھر کا مطلب کیا؟" تاشی نے ماں کو بڑی سی ٹرے اٹھائے اپنے کمرے میں آتے دیکھ کر زوردار نعرہ لگایا۔ وہ بیڈ پر کھڑی تھی۔

"زندگی' آزادی اور خوشی۔" ملی بھی تاشی کے برابر میں کھڑی ہوگئی اور ہاتھ کا مائیک بنا کر زور سے بولی۔

فیروزہ دونوں کے انداز پر ہنس دیں۔ وہ آگے آئیں اور انہوں نے ٹرے بیڈ کے وسط میں رکھ دی۔ ایک بڑے سے پیالے میں پاپ کارن تھے۔ دوسرے میں فرنچ فرائز جو چاٹ مسالے اور کیچپ میں ڈوبے تھے اور ساتھ میں کافی کے بڑے دو مگ۔

"جئیں ممانی جان!" ملی ان سے لپٹ گئی۔

"سچ میں امی! میں تو اس عیاشی کو ترس ہی گئی تھی۔" تاشی ان کے برابر میں دھم سے بیٹھ گئی۔

"اور مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میرے گھر کی رونق لوٹ آئی ہو۔" فیروزہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"دیکھا! میں نہ کہتی تھی..... ہم ہی سے زندگی میں رنگ ہے۔" کومل نے فخر سے اپنے نادیدہ کالر کھڑکھڑائے۔ فیروزہ نے مسکراتے ہوئے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا اور باہر نکل گئیں۔ ملی نے اسٹریو لگادیا۔ پہلے دونوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ سے فرنچ فرائز کھائے۔

ایک' دو' تین کر کے کافی کے مگ آپس میں ٹکرائے اور پھر بڑا سا گھونٹ لیا۔ پھر خوب زوردار قہقہے لگاتے ہوئے باتوں میں اتنی مصروف ہوئیں کہ ارد گرد کو بھول ہی گئیں۔ میوزک کی تیز آواز میں دونوں کے بے ہنگم قہقہے جانے اور کتنی دیر تک جاری رہتے' اگر میوزک بند نہ ہوتا.....

یوں لگا کہ در و دیوار ساکت ہوگئے..... سوئی بھی گرے تو آواز سنائی دے جائے۔ اسٹیریو سسٹم کے پاس کھڑا ازمیر دونوں کو خشمگیں نظروں سے گھور رہا تھا۔

"کب سے آوازیں دے رہا ہوں..... اور تمہارا یہ

حال ہے کہ ہر چیز سے بے خبر' کمرے کا حال دیکھا ہے؟ کسی لڑکی کا کمرا ہے؟" ازمیر کومل کر نظر انداز کیے نتاشا پر برس پڑا' جبکہ کومل کمرے پر نظر ڈالنے لگی۔ خود اس کا دوپٹا کندھے سے پھسلنے کو بے قرار تھا' جو اس نے ازمیر کو دیکھتے ہی درست کیا تھا۔

"وہ..... بھائی..... دراصل..... اتنے دنوں بعد خوشی۔"

"خوشی..... کس بات کی خوشی؟" ازمیر کو اچنبھا ہوا۔

اور نتاشا کے جملے کو وہیں بریک لگ گیا۔ اب وہ کیا کہتی کہ پھوپھی اماں کے گھر پر جو مظلومیت ان کے چہروں پر برستی تھی' اس سے خلاصی کی خوشی میں۔

"فراز آیا ہے..... جلدی سے اچھی سی چائے اور ساتھ میں کچھ کھانے کو بھجواؤ۔" وہ حکم دیتا ہوا جس طرح آیا تھا۔ واپس لوٹ گیا اور جاتے ہوئے کومل پر ایک کڑی نظر ڈالنا نہ بھولا تھا۔

"اف!" کومل کی سانس آزاد ہوئی۔ "مجھے ایک لمحے کے لیے لگا کہ پھوپھی اماں' تمہارے بھائی کا روپ دھا کر آگئی ہیں۔" کومل نے کہتے ہوئے نیچے پڑے پاپ کارن اٹھائے۔

"آہستہ بولو! سن لیں گے تو واپس آکر مزید دو چار سنا دیں گے۔" نتاشا نے اسے گھُر کا اور ملی کے ساتھ کمرا سمیٹنے لگی۔

"ویسے حیرت ہے بھائی نے سارا نزلہ مجھ پر ہی گرایا۔ تمہیں تو ایک لفظ بھی نہ کہا۔ یہ فرق ہوتا ہے بہن اور منگیتر میں۔"

"یہ صرف تمہاری خوش فہمی ہے کہ انہوں نے مجھے منگیتر سمجھ کر کچھ نہ کہا۔ جاتے ہوئے جیسی کڑی نظر ڈال کر گئے ہیں' وہ کسی بھی طرح منگیتر کی نظریں نہیں لگ رہی تھیں۔ ہٹلر کے جانشین لگ رہے تھے۔ بغیر اجازت لیے دروازہ کھول کر اندر آئے اور شروع ہوگئے۔" کومل بڑبڑاتے ہوئے نتاشا کے ساتھ کچن میں چلی آئی۔

"انہوں نے یقیناً" دستک دی ہوگی۔ ہم اپنی مستی میں گم تھے اور ویسے بھی اتنے سویرے سے میرے ازمیر بھائی کیا چھچھورے' نوعمر لڑکوں کی طرح تمہیں چھیڑتے ہوئے گزرتے۔" نتاشا کی وکالت جاری تھی۔ ساتھ ساتھ ہاتھ بھی چل رہے تھے۔ اس نے چائے کا پانی رکھا اور فریج میں سے کباب نکالنے لگی۔ کوئی اس کے بھائی کو برا کہے' نتاشا سے برداشت نہ ہوتا تھا۔

"ہونہہ!" کومل نے سر جھٹکا "تمہیں تو موقع چاہیے اپنے بھائی کی حمایت کرنے کا۔"

"سچ بتاؤ..... ساڑھے چار مہینے بعد بھائی کو دیکھ کر تمہارے دل میں کوئی گدگدی نہیں ہوئی؟" تاشی نے ملی کو چھیڑا۔

"بکواس نہ کرو۔" ملی جھینپ گئی۔ ست رنگی دھنک لمحوں میں اس کے چہرے پر سج گئی تھی۔ خیال میں ازمیر کا وجیہہ سراپا روشن ہوا گیا تھا جو ایک محبت بھری نگاہ اسے دان کر جاتا۔

کومل بظاہر لاپروا نظر آتی تھی' مگر اندر سے حساس تھی۔ جب سے شعور کی دہلیز پر قدم رکھا تھا۔ ازمیر کا نام اپنے نام کے ساتھ سنا تھا۔ ثاقب ماموں اور فیروزہ ممانی اور اس کے اپنے امی بابا یہ ذکر کم ہی کرتے مگر سمیعہ بھابھی اور نتاشا اکثر اسے چھیڑتے تھے۔ بظاہر ان کے چھیڑ چھاڑ سے وہ چڑتی تھی۔ مگر حقیقتاً" ازمیر کے نام پر دل کے ایوانوں میں خوشبو سی پھیل جاتی تھی۔

ازمیر مرتضیٰ اس کا اکلوتا ماموں زاد' سمیعہ بھابھی اور نتاشا کا بھائی..... نتاشا اور کومل سے عمر میں چار سال بڑا' سنجیدہ' اپنے کام میں مصروف' جاذب نظر شخصیت..... پر کومل کو نہ جانے کیوں موجود ہوتے ہوئے بھی آس پاس محسوس نہ ہوتا۔

"ویسے اگر میرے بھائی کے دل تک جانا چاہتی ہو تو معدے والا رستہ پکڑلو۔ بڑی بوڑھیوں کا آزمایا ہوا نسخہ ہے اور ویسے بھی چھ مہینے میں پھوپھی اماں نے اتنا ٹرینڈ تو کر ہی دیا ہے۔"

نتاشا نے اسے رستہ دکھایا اور ٹرالی دھکیلتے ہوئے

باہر نکل گئی۔ ملی نے بھی باہر کی راہ لی۔ اپنے گھر کے گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہوئے آخری سوچ جو اس کے ذہن میں آئی' وہ یہی تھی کہ تاشی کا آئیڈیا برا نہ تھا۔



بابا کی چھوٹی سی لائبریری کی تینوں دیواریں کتابوں سے بھری تھیں' جبکہ چوتھی دیوار پر متعدد فریم لگے ہوئے تھے' ماضی اور ماضی کے لمحوں کو مقید کیے ہوئے۔

آج سے پہلے کومل نے ان ساری تصویروں کو بس یوں ہی سرسری سا دیکھا تھا۔ بھاگتی دوڑتی زندگی میں اتنا وقت ہی کہاں تھا کہ گزرے ہوئے پلوں کو ٹھہر کر دیکھا جائے۔

اس کے بابا اور امی کی تصویر' فرجاد بھائی کی اور اس کے بچپن کی۔ کسی تصویر میں وہ چاروں ایک ساتھ کھڑے تھے۔ ایک تصویر اس کی اور نتاشا کی تھی۔ ایک کومل کی بچپن میں منائی گئی کسی سالگرہ کی' جس میں وہ کیک کاٹ رہی تھی اور پیچھے سب کھڑے تھے۔ ایک تصویر میں پھوپھی اماں عبیرہ آپی کو گود میں لیے ہوئے تھیں اور ان کے ساتھ امی' فرجاد بھائی کو گود میں لیے کھڑی تھیں۔ وہ تصویر ہاتھ میں لیے پھوپھی اماں کو دیکھے گئی۔ ہنستے مسکراتے چہرے کے ساتھ' منہ بسورتی صحت مند سی عبیرہ آپی کو گود میں بمشکل دبوچے' کندھوں تک آتے گھونگھریالے بال ایک شانے پر پڑا دوپٹا اور ہلکے ہلکے میک اپ کے ساتھ' آج کی پھوپھی اماں سے یکسر مختلف لگیں۔ نظر کا چشمہ' بال پیچھے کی جانب سیدھی سی چوٹی بنائے سنجیدہ چہرہ' ہمہ وقت ہلکے رنگ کے کپڑوں میں ملبوس۔ سر پہ دوپٹا لپیٹے' کسی نہ کسی کام میں مصروف پھوپھی اماں۔ وہ بلا ارادہ تصویر دیکھے گئی۔

"ملی! کیا ہوا؟" امی کی آواز پر وہ چونکی اور پھر آہستگی سے مڑی۔ ان کے ہاتھ میں چائے کے دو کپ تھے اور چائے دیکھتے ہی اسے یاد آیا کہ وہ تو بابا سے چائے کا پوچھنے آئی تھی۔

"کیا ہوا؟ بابا کہاں ہیں تمہارے؟" وہ اس کے قریب چلی آئیں۔

"بابا..." وہ لاؤنج میں فون پر بات کر رہے ہیں۔ شاید پھوپھی اماں کا فون ہے۔" اس نے آہستگی سے کہتے ہوئے تصویر دیوار پر واپس لگا دی تھی۔

"ٹھیک ہے! پھر یہ چائے تم ہی لے لو... ان کے لیے دوسری بنا دیں گے۔ ٹھنڈی چائے انہیں مزا نہیں دیتی۔" امی نے کپ اس کی طرف بڑھایا اور اسے پھوپھی اماں یاد آئیں۔ وہ بھی تو بالکل تازہ' گرم' چولہے پر سے اتری ہوئی چائے پیتی تھیں۔

"امی! پھوپھی اماں کتنی بدل گئی ہیں ناں!" اس نے کپ تھام لیا۔

"بس بیٹا! وقت بڑی بے رحم شے ہے۔ کبھی تو دبے پاؤں گزرتا ہے اور کبھی شور مچاتا۔ اس کی شوریدہ لہریں... جب سیلاب کی سی صورت اختیار کر لیں تو اکثر بہت کچھ بہا کر لے جاتی ہیں۔ عبیرہ کی حادثاتی موت نے پہلے خالدہ کو اندر سے توڑ پھوڑ دیا تھا' پھر بعد میں رضی بھائی کی بیماری اور موت نے اسے یکسر بدل دیا۔" امی کا لہجہ اندرونی درد کا غماز تھا۔

"ایسا کیا ہوا تھا امی... عبیرہ آپی کے ساتھ... آپ نے بابا نے کبھی کسی نے کچھ بتایا ہی نہیں۔" اس نے کپ رائٹنگ ٹیبل پر رکھ دیا۔

"تمہارے بابا' خالدہ' میں اور تمہارے ثاقب ماموں' ہم آپس میں فرسٹ کزن ہیں۔ سارا بچپن ایک ساتھ ہی گزرا۔ رضی کا گھر پڑوس میں ہی تھا۔ سمجھ دار' سلجھا ہوا۔ ثاقب بھائی' تمہارے بابا اور رضی کی خوب ہی بنتی تھی۔ ہم سب میں خالدہ سب سے زیادہ شرارتی تھی۔ اس کا دل چاہتا ہر وقت کوئی ہلا گلا ہو۔ اکثر اس کی شرارتوں کا نشانہ رضی ہی بنتا تھا۔ ہنسی مذاق کب آپس کے پیار و محبت میں بدلا کسی کو پتا ہی نہ چلا۔ وہ چپکے چپکے خالدہ کو پسند کرنے لگا اور یہ بھول گیا کہ وہ وٹے سٹے کے رشتے میں بندھا ہوا ہے۔ رضی کی خالہ کی بیٹی سنبل کی شادی رضی سے ہونی تھی اور بدلے میں رضی کی بہن

جویریہ خالہ کے گھر جانے والی تھی۔ ہم میں سے کوئی یہ بات نہیں جان پایا کہ رضی نے کس طرح اپنے والدین کو خالدہ کے لیے راضی کیا۔ بس ادھر میری شادی تمہارے بابا سے ہوئی۔ ادھر رضی کے والد خالدہ کے لیے رشتہ لے آئے۔ والدہ نہیں آئی تھیں۔ ان کے والد نے بہانہ کر دیا تھا کہ وہ بیمار تھیں۔ قسمت میں دونوں کا ساتھ لکھا تھا۔ سو شادی تو ہو گئی... مگر خالدہ کو سسرال میں سوائے سسر اور اپنے شوہر کے کسی سے مورل سپورٹ نہ ملی۔ نہ ساس سے' نہ جویریہ سے اور نہ ہی چھوٹے دیور سمیع سے۔ کیونکہ جویریہ کو تو پھر بھی اس کی خالہ بک جھک کے لے گئیں کہ ان کا بیٹا جویریہ کو پسند کرتا تھا' مگر خالہ کی بیٹی سنبل جو رضی کے نام پر تھی اسے عرصے تک کوئی بر نہ ملا۔ یوں نفرت اور سرد مہری کی دیوار بڑھتی ہی گئی... جسے خالدہ کی محبت اور خدمت بھی نہ پاٹ سکی۔ وہ تین سال ان کے ساتھ رہی مگر اس کی شفاف بے ریا ہنسی اور آنکھوں سے جھانکتی شرارت اور چمک میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ کہتی تھی "رضی تو میرا ہے' بس کافی ہے۔ باقی سارے دکھ درد پیر کی جوتی۔"

میری گود میں فرجاد ایک سال کا تھا۔ تب خالدہ کے گھر عبیرہ ہوئی اور تمہارے ماموں کے گھر سمیعہ آئی۔ سمیعہ کے تین سال بعد ازمیر اور چار سال کے بعد نتاشا آئی اور ہمارے گھر فرجاد کے بعد عرصے تک کوئی پھول نہ کھلا اور پھر تم آئیں۔ تم میں اور نتاشا میں چھ ماہ کا فرق تھا۔

خالدہ کے گھر عبیرہ کے بعد کوئی اولاد نہ ہوئی۔ طنز نے بڑھ کر طعنوں کی شکل اختیار کر لی۔ اولاد نرینہ نہ ہونا جیسے اس کا جرم بن گیا۔ اس نفرت کی زد میں جب عبیرہ بھی آنے لگی تو رضی نے الگ ہونے کا سوچا۔ وہ کراچی چلے گئے۔ وہاں انہوں نے دو' تین دکانیں عبیرہ کے نام پر خرید کر کرائے پر چڑھا دیں۔ عبیرہ بالکل خالدہ کا پرتو تھی' بلا کی خوب صورت' ذہانت و شرارت کا امتزاج اور اس پر معصومیت۔ خالدہ کے دل میں کہیں اندر بیٹے کی خواہش تھی... اس لیے عبیرہ تمام بوائے بنتی چلی گئی۔ خالدہ اس کے بہت لاڈ اٹھاتی تھی۔ کھانے' پینے' سونے' کھیلنے... ہر چیز میں عبیرہ کی چوائس۔ رضی بھی اس کے بہت ناز اٹھاتا تھا۔ میری اور تمہارے بابا کی بڑی خواہش تھی کہ ہم فرجاد کے لیے عبیرہ کا رشتہ مانگتے مگر یہ خواہش دل میں ہی دبی رہ گئی۔ اور ایک انہونی ہو گئی۔

سنبل نے اپنے بیٹے عدیل کے لیے عبیرہ کا رشتہ مانگ لیا۔ خالدہ پریشان تھی مگر رضی خوش تھا۔ اتنے عرصے بعد رضی کا اپنے خاندان سے پھر ملاپ ہو رہا تھا۔ رضی کے دل میں تبھی خاندان کی رشتہ داروں کی محبت جاگ اٹھی۔ لاکھ خالدہ نے کہا کہ جہاں انہیں پذیرائی نہ ملی' وہاں عبیرہ کے حصے میں کیا آئے گا؟

خالدہ کی مخالفت پر رضی کا سارا خاندان امڈ آیا۔ سنبل کی اعلا ظرفی کی طرف توجہ دلائی گئی کہ دیکھو... اسے رد کیا گیا تھا۔ پھر بھی اپنے قابل بیٹے کا رشتہ عبیرہ کے لیے مانگ رہی ہے۔ عبیرہ اس وقت گریجویشن کر رہی تھی۔ انیس سال کی عمر' اپنے آپ میں مگن' الھڑ سی' شادی اس کے لیے جیسے ایک فینٹسی... اپنے گھر میں اس نے تنکی پھلی بھی نہ توڑی تھی' مشکل ہوتی کیا ہے... اس جملے سے کبھی خواب میں بھی پالا نہ پڑا تھا۔ اسے تو جو منظر نظر آ رہا تھا وہ یہ تھا کہ خوبرو' اسمارٹ سا عدیل اس کا طالب ہے اور عدیل کی فیملی نے ان کے گھر کی چوکھٹ پکڑ لی ہے کہ عبیرہ کو یہاں سے لے کر ہی جائیں گے۔ چاہنا ایک احساس ہوتا ہے بیٹا! مگر چاہے جانے کا احساس ایک اعزاز ہوتا ہے اور عبیرہ کو یہ اعزاز چاہیے تھا۔"

میمونہ گزرے ہوئے کل کی پرت در پرت اٹھا رہی تھیں اور کومل دم سادھے بیٹھی تھی۔ وہ تو جانتی ہی نہ تھی کہ اس کے خاندان کی بھی کوئی تاریخ تھی۔ اسے تو بس اتنا پتا تھا کہ اس کے ایک ماموں ہیں اور ایک پھوپھی اماں۔ ماموں کی فیملی پڑوس میں رہتی ہے اور پھوپھی اماں کراچی میں۔ پھوپھا کا انتقال ہو گیا اور عبیرہ آپی... ان کے بارے میں اسے کچھ خاص معلوم نہ تھا۔ جب بھی ان کا ذکر نکلتا... سب یہی کہتے کہ وہ

تھوڑی عمر لکھوا کر لائی تھی...... شادی کے ایک سال بعد انتقال کر گئی۔

جن دنوں عبیر کی شادی ہوئی۔ وہ فقط تیرہ سال کی تھی۔ اور تیرہ سال کی عمر میں اٹینڈ کی گئی عبیر آپی کی شادی کی کوئی یادگار اس کے ذہن میں نہ تھی اور نہ ہی وہ عمر کے اس حصے میں تھی جب انسان چہرہ شناس ہو جاتا ہے۔ شاید پھوپھی اماں اس کے بچپن میں اسلام آباد آتی رہی ہوں۔ مگر پچھلے چھ سال سے وہ مطلق اسلام آباد نہ آئی تھیں۔ یوں وہ ماموں کی فیملی کے نزدیک ہوتی گئی۔ اور یہ محبتیں مزید پائیدار تب ہو گئیں جب ماموں کی پیاری سی سمیعہ اس کی اکلوتی بھابھی بن کر آگئی۔ ماں کی آواز اسے اپنے خیالات سے باہر لے آئی۔

"اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ عدیل بہت قابل تھا۔ اگر وہ سنبل کا بیٹا نہ ہوتا تو یقیناً" یہ رشتہ خالدہ کے لیے بھی من چاہا ہوتا مگر تمہارے پھوپھا نے دوسری بار سب کچھ نظر انداز کر دیا تھا۔" میمونہ نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

"جب خالدہ سے شادی کی تو اپنے خاندان کو نظر انداز کر دیا تھا اور آج جب خاندان سامنے تھا تو خالدہ پس منظر میں چلی گئی تھی۔ عبیر کی شادی دونوں کی محبت کا حتمی نتیجہ ثابت ہوئی۔

سنبل کے دل کا حال کوئی نہ جانتا تھا۔ گزرے ہوئے وقت میں ملنے والے دکھ کی دبی چنگاری عبیر کو سامنے پا کر بھڑک اٹھی تھی یا شاید آگ بھڑکانے کے لیے ہی اس نے اس شادی کا اہتمام کیا تھا۔ عدیل ماں کی مظلومیت سے آگاہ تھا۔ پہلی اولاد تھا اور ماں سے بہت قریب تھا۔ اس پر مستزاد عبیر سے عمر میں آٹھ سال بڑا تھا اور شک کا عنصر اس کی طبیعت میں تھا۔ فینٹسی ختم ہوئی اور زندگی شروع ہو گئی۔ پہلے عبیر کی تربیت کرنے والوں کو طعنے دیے گئے۔ پھر خود عبیر کی ذات کو نشانہ بنایا گیا۔ وہ لڑکی جسے انڈا بھی ابالنا نہ آتا تھا۔ اب پھرکی کی طرح سارے گھر میں گھومتی تھی اور پھر بھی کوئی اس سے خوش نہیں تھا۔ وہ دن بہ دن مرجھاتی چلی گئی۔"

"تو وہ پھوپھی اماں کے گھر کیوں نہ چلی گئیں امی! جب سنبل آنٹی اور ان کی فیملی ان پر اتنا ظلم کرتی تھی۔" ملی نے ماں کی طرف دیکھا۔

"بیٹا...... خالدہ کراچی میں تھا اور عبیر کا سسرال اسلام آباد میں۔ فون پر بات ہو جائے تو ہو جائے، پر عدیل اسے اپنے گھر ماں باپ سے ملنے جانے دیتا ہی نہ تھا۔ وہ خالدہ کو ہی تو چوٹ پہنچانا چاہتے تھے اور عبیر کے ذریعے وہ یہ حسرت آسانی سے پوری کر رہے تھے۔ ان لوگوں کی یہ سازش کچھ مہینوں بعد ہی ہم سب سمجھ گئے تھے مگر جانے کیوں رضی نہ سمجھ سکا یا شاید وہ کفارہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ بہرحال شروع شروع میں، میں نے اور تمہارے بابا نے عبیر کی خبر گیری رکھنے کی حتی الامکان کوشش کی...... مگر پھر ایک دن عبیر نے خود ہی ہمیں منع کر دیا...... ہم سے ملنے کے بعد اس کے اوپر اور بھی سختی ہوتی تھی۔

تمہارے بابا اور میں نے رضی کو اس طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی مگر جب تک وہ کوئی قدم اٹھاتا...... عبیر ہی اس دنیا سے چلی گئی۔ جانے خود جل گئی یا جلا دی گئی۔" میمونہ کی آواز میں کرب تھا۔ ملی کے لبوں سے سسکی سی نکلی۔

"عدیل اور اس کے گھر والوں کا کہنا تھا کہ وہ لاپروا تھی۔ کوئی بھی کام ڈھنگ سے نہ کرتی تھی۔ کچن میں جانے کیسے کام کر رہی تھی کہ جل گئی...... اور وہ ننھی سی جان، جس کی کرن اس کے اندر پھوٹی تھی۔ وہ بھی خشک ہو گئی۔

خالدہ کتنے ہی دن نیم پاگل سی روتی بین کرتی رہی۔ وہ کہتی تھی "میری عبیر خود سے جل کر نہیں مر سکتی۔ وہ تو آنے والی ننھی کلی کے پھول بننے کے خواب مجھے سنایا کرتی تھی...... سینت سینت کر ہر قدم اٹھانے لگی تھی۔ کہتی تھی ماما اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔ سب کے دل پھیر دے گا اللہ۔ پھر وہ کیسے اپنی ننھی کلی کو گل لالہ کا رنگ سونپ سکتی تھی۔"

خالدہ کا وجدان غلط نہیں تھا۔ وہ ٹھیک کہتی تھی۔

آخری چند لمحے، جب وہ زندگی کو پھر سے پا لینے کی خواہش لے کر موت کو پچھاڑ کر واپس آئی تھی اپنے ادھ جلے وجود کے ساتھ۔ تب میں اس کے پاس تھی۔ خالدہ اور رضی کو تو فلائٹ ہی نہ ملی تھی اس وقت تک۔

تب مجھ سے عبیر نے کہا تھا۔ ممانی! میں نے امی کی محبت کا کفارہ ادا کر دیا۔ ان لوگوں کے سینے میں جتنی آگ تھی میری ماں کے لیے...... وہ سب میں نے اپنی جان پر لے لی۔ مگر امی کو نہ بتانا...... کہیے گا وہ خود جل گئی۔ بس پھر وہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی۔

احساس جرم نے پہلے رضی بھائی کو بیمار کیا...... پھر زندگی کے بوجھ سے بھی آزاد کر دیا۔ خالدہ سے قدرت نے پہلے محبت کی نشانی واپس لی...... پھر محبت بھی واپس لے لی۔" میمونہ نے ایک سرد آہ بھری۔ میمونہ کے کپ میں پڑی چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ ان کی نظریں عبیر کی تصویر پر جمی تھیں اور ملی کو پتا ہی نہ تھا کہ وہ رو رہی تھی۔

کہانی ختم ہوئی۔ وہ جیسے نیند سے جاگی۔ گود میں دھرے ہاتھوں پر موجود نمی سے احساس ہوا کہ آنسو کب سے ہتھیلی کے پیالے میں جمع ہوئے جا رہے ہیں۔

اس کی اب سمجھ میں آیا تھا۔ پھوپھی اماں ایسی کیوں تھیں۔ انہوں نے ایک دن بھی اسے اور نتاشا کو مہمان سمجھ کر خاطر داریاں نہ کی تھیں۔ کیونکہ وہ ان دونوں کو عبیر جیسا نہیں بنانا چاہتی تھیں۔ اسے پھوپھی اماں پر ٹوٹ کر پیار آیا۔

"محبت وہ نہیں ہوتی، جس کا اظہار کیا جاتا ہے، محبت وہ ہوتی ہے جسے دل سے محسوس کیا جا سکے۔ بیٹا! لوگ بیٹی کی پیدائش سے نہیں ڈرتے، اس کے نصیب سے ڈرتے ہیں۔ نہیں جانتے کہ جس کو پھولوں کی طرح پالا ہے، کل اس کے گرد کیسی خار دار جھاڑیاں اگ آئیں گی۔ خون نکال دینے والی...... جان کھینچنے والی۔ مگر اللہ کا شکر ہے، مجھے راحت ہے کہ میری بچی کسی پرائے گھر نہیں جا رہی۔ ماموں کے گھر جا رہی ہے...... جہاں وہ ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی۔" میمونہ نے اپنی آنکھوں کی نمی صاف کی اور کومل کو محبت سے دیکھا۔

وہ آنسو بھری آنکھیں لیے بے اختیار ماں سے لپٹ گئی۔ اس کے پاس اس وقت کہنے کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔



کومل کا انداز مصروف سا تھا۔ سمیعہ نے دو تین بار کچن میں جھانکا مگر اسے ہنوز مصروف ہی پایا۔ بنانا کیک بیک ہو چکا تھا۔ سنگاپورین رائس دم پر تھے اور اس وقت وہ دھواں دہی قیمہ کے لیے کوئلہ دہکا رہی تھی۔

"میں اندر آجاؤں...... مجھے پانی پینا ہے۔" سمیعہ نے دروازے سے اندر منہ ڈال کر اجازت چاہی۔ اس کے انداز میں شرارت تھی۔ ملی نے گردن گھما کر آواز کی سمت دیکھا اور مسکرا دی۔

"کیا بنا رہی ہو ویسے؟" سمیعہ نے چاروں طرف نظریں دوڑاتے ہوئے پوچھا۔ کچن ساتھ ساتھ سمیٹا جا چکا تھا اور کھانا اختتامی مراحل پر پہنچا ہوا نظر آ رہا تھا۔

"سنگاپورین رائس، دھواں دہی قیمہ اور بنانا کیک۔" ملی نے فخریہ کہا۔

"اوہ...... واؤ! سنگاپورین رائس تو میری پسندیدہ ڈش ہے۔" سمیعہ نے چاول کے پتیلے کا ڈھکن اٹھایا اور کفگیر میں تھوڑے سے چاول نکال کر چکھے...... پھر ہاتھ سے ملی کو اے ون کا اشارہ دیا۔

وہ قیمہ کی ڈریسنگ مکمل کر چکی تھی۔ دہکتا ہوا کوئلہ قیمے والی ڈش میں رکھ کر اس پر ایک چمچہ تیل ڈال کر ڈھکن دوبارہ مضبوطی سے بند کر دیا۔

"تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ تمہارے بھائی اور بابا جان، دس منٹ میں پہنچ رہے ہیں...... اور تم جانتی ہو ناں کہ فرجاد بھوک کے کتنے کچے ہیں...... جبکہ مجھے لگ رہا ہے نہ تو تم نے اب تک آٹا گوندھا ہے اور نہ ہی روٹی بننے کے آثار ہیں۔ ہم دھواں دہی قیمہ کھائیں گے کس چیز سے؟" سمیعہ نے آٹا

ڈھونڈنا چاہا۔

"اف..... قسم سے یہ میں تو بھول ہی گئی۔" ملی نے سر پر ہاتھ مارا۔

"کوئی بات نہیں..... جتنا تم نے بنالیا ہے' وہ ہی بہت ہے..... سلام ہے پھوپھی اماں کو' جنہوں نے ہماری باگڑ بلی کو سدھار دیا..... ویسے یہ سدھار صرف تم میں ہی آیا ہے یا تاشی کے بھی پروں پر پانی پڑا ہے۔"

"جی..... جی وہ بھی بہتری کی طرف مائل ہے۔" ملی نے ایسے انداز سے کہا گویا وہ ڈاکٹر ہو اور تاشی مریض۔ سمیعہ ہنس پڑی اور پرات میں آٹا نکال کر گوندھنے لگی۔

"چلیں جی سارا کھانا تیار ہے..... اب میں ذرا ایک ٹرے تیار کرکے آپ کے میکے دے آؤں۔"

"میرے میکے یا تمہارے سسرال؟" سمیعہ نے چھیڑا۔

"جو چاہے سمجھ لیں۔" ملی نے شان بے نیازی دکھائی۔

"کپڑے تو بدل لو۔ ملی نہیں' ماسی لگ رہی ہو۔" فرجاد کے ساتھ ازمیر بھی آرہا ہے۔" سمیعہ نے اطلاع دی۔

"یہ سارے مرد حضرات' انہیں کوئی کام نہیں ہے جو بے وقت گھر چلے آرہے ہیں۔" ملی نے نفاست سے چاول' قیمہ اور کیک ٹرے میں رکھا۔ ازمیر کے نام پر دھڑکنوں میں ارتعاش بپا ہو گیا تھا۔

"میڈم ملی! آپ بھول گئیں۔ آج ہاف ڈے ہے۔" سمیعہ نے اسے یاد دلایا اور ملی نے اپنی یادداشت پر چار حرف بھیجے۔

فصیح صاحب کا اپنا فروزن فوڈ کا چھوٹا سا بزنس تھا اور فرجاد ان کا معاون تھا۔ جبکہ ازمیر مقامی بینک میں برانچ منیجر تھا۔

"اوکے! بھائی آجائیں تو آپ لوگ کھانا کھا لیجیے گا۔ میں چینج کرکے یہ سب کچھ تاشی کو کھلا کر آتی ہوں۔" وہ کہتی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

"ابھی ڈھونڈ ہی رہی تھی تمہیں یہ نظر ہماری کہ تم آگئے اچانک بڑی عمر ہے تمہاری۔"

کومل کے ہاتھ میں ٹرے دیکھ کر تاشی نے لاؤنج سے ہی تان لگائی اور ریموٹ سائیڈ پر اچھال کر ملی کے پاس چلی آئی۔

"وہ مارا..... سچ آج میں خدا سے من و سلویٰ کے بجائے کچھ اور بھی مانگتی تو وہ بھی مل جاتا۔"

"یہ تمہارے لیے نہیں ہے۔" کومل نے فوراً ٹرے اس کے قبضے میں جانے سے بچائی۔

"اوہ..... اچھا۔ تو تم وہ معدے والے راستے سے جانے کے لیے راضی ہو گئیں گریٹ! راستہ ذرا مشکل ہے مگر سولڈ ہے..... ساس صاحبہ تو شاید اس کے ذریعے تم پر دل و جان سے فدا ہو جائیں مگر منگیتر صاحب..... ان کا فدا ہونا ذرا مشکل ہے۔"

"کیا مطلب؟" ملی کی خاک بھی سمجھ میں نہ آیا۔ اس نے ٹرے ڈائننگ ٹیبل پر رکھ دی تھی۔

"ازمیر بھائی جس آندھی طوفان کی طرح آئے تھے۔ ویسے ہی واپس لوٹ گئے۔ پنڈی جانا تھا انہیں۔ شام میں ان کے دوست کی شادی ہے۔ اب واپسی یا تو رات گئے ہو گی یا کل صبح ہو گی۔"

"تمہارے بھائی کچھ زیادہ ہی پنڈی نہیں جارہے؟ پچھلے ہفتے بھی تو گئے تھے۔" ملی کا سارا موڈ غارت ہو چکا تھا۔

"تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے پچھلی بار وہ بینک کے کام سے گئے تھے اور اس بار دوست کی شادی میں۔"

"تم اپنے بھائی کی حمایت جاری رکھو میں جارہی ہوں۔ یہ سب ممانی جان کو ٹیسٹ کرادینا۔"

"ارے..... ارے رکو' امی کو بلاتی ہوں۔ ساتھ کھانا کھائیں گے۔ پھپھو کو بتادو' آج تم یہیں رکو گی بھائی تو ہیں نہیں۔ خوب ہلا گلا کریں گے اور اچھی سی مووی دیکھیں گے۔" تاشی کے پاس پورا پلان تھا۔ ایک لمحہ لگا اور ملی کا موڈ ٹھیک ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ سمیعہ کو میسج کرنے لگی اور تاشی ماں کو بلانے چلی دی۔

☼ ☼ ☼

گھپ اندھیرے میں اسے گھٹن کا احساس ہوا۔ چادر منہ پر سے ذرا سی ہٹائی۔ کمرے میں مکمل اندھیرا تھا۔ یقیناً" لائٹ چلی گئی تھی۔ اسے ہمیشہ مکمل اندھیرے میں سانس رکتا محسوس ہوتا تھا۔ پہلے تو اسے سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کہاں ہے۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ماحول سے مانوس ہونے کی کوشش کرتی رہی۔ اسے شدت سے پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھنے لگی کہ ہاتھ کسی نرم سی لجلجی چیز سے ٹکرایا اور اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

"اف..... تاشی کی بچی' اسٹوپڈ کہیں کی۔ پہلے ہارر فلم دیکھیں گی محترمہ اور پھر میرے بستر میں گھس جائیں گی۔ توبہ! فلم بھی کتنی ڈراؤنی تھی۔ میں اکیلے تو شاید کبھی نہ دیکھ پاتی۔"

جھرجھری آگئی۔ تاشی نے آج کمرے میں پانی کی بوتل بھی نہ رکھی تھی اور اب کچن کے فریج تک پہنچنا بھی محال لگ رہا تھا۔

اندازے سے موبائل کی روشنی میں چلتی ہوئی وہ کچن تک آئی۔ فریج سے پانی نکال کر پی ہی رہی تھی کہ لائٹ آگئی۔ اس نے بے اختیار خدا کا شکر ادا کیا۔ پانی پی کر جیسے ہی پلٹی لاؤنج میں ڈائننگ ٹیبل کی درمیانی کرسی پر کوئی بیٹھا نظر آیا۔ اس کی ملی کی طرف سے پشت تھی۔

"بھوت....." دوسرے ہی لمحے اس نے آنکھیں بند کرکے چیخنا شروع کر دیا۔ بھوت نے فوراً" اپنی جگہ چھوڑی اور ملی کے منہ پر کس کے ہاتھ رکھ دیا۔ دہشت کے مارے ملی کی آنکھیں پٹ سے کھل گئیں۔

"تم..... میرا مطلب آپ..... یہاں اس وقت؟" سامنے ازمیر کھڑا تھا۔ وہ اپنا ہاتھ اس کے منہ سے ہٹا چکا تھا۔

"یہ سوال تو مجھے تم سے کرنا چاہیے کہ تم یہاں کیا کر رہی ہو؟ اپنے گھر میں سکون نہیں ملتا تمہیں؟ زہر لگتی ہیں مجھے وہ لڑکیاں جو بچکانہ حرکتیں کرتی ہیں۔ چھپکلی' کاکروچ اور سائے سے بھی ڈرنے والی۔" وہ بن بادل برس رہا تھا۔ اس کے لہجے اور انداز دونوں میں ناگواری تھی۔

"حد ہوتی ہے۔ بندہ اپنے گھر میں سکون سے بیٹھ کر ایک کپ کافی کا بھی نہیں پی سکتا۔" وہ اسے گھورتا لمبے لمبے ڈگ بھرتا اپنے کمرے میں چلا گیا تھا' جبکہ وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکی تھی۔

اسی وقت ثاقب ماموں کے کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ باہر آئے۔

"کیا ہوا ملی بیٹا! ابھی تم ہی چیخی تھیں۔" وہ اس کے قریب آئے۔

"جی ماموں..... وہ اندھیرا تھا تو اس لیے۔" اسے رونا آرہا تھا۔ وہ اپنی بات مکمل نہ کر سکی۔

"سوری ماموں..... میری وجہ سے آپ کی آنکھ کھل گئی۔" وہ نادم تھی۔

"ارے نہیں بیٹا..... ہو جاتا ہے کبھی کبھی ایسا۔ جاؤ لیٹ جاؤ شاباش۔ ویسے بھی نماز کے لیے تو اٹھنا ہی تھا۔ ازمیر بھی ابھی ایک گھنٹہ پہلے ہی تو پنڈی سے واپس آیا ہے۔ جاؤ تم لیٹ جاؤ۔" انہوں نے اسے پیار سے کہا سر پر ہاتھ رکھا اور پلٹ گئے۔

وہ خاموشی سے کمرے میں چلی آئی۔ فجر کی اذان ہو رہی تھی۔ اس نے سونے کا ارادہ ترک کر دیا۔ نماز کے لیے کھڑی ہوئی تو کتنے ہی موتی پلکوں کی باڑھ پھلانگ کر گالوں سے پھسلتے ہوئے دوپٹے میں جذب ہو گئے۔ ازمیر کا لہجہ اور انداز دونوں اس کے دل میں کھب سے گئے تھے۔

"زہر لگتی ہیں وہ لڑکیاں جو بچکانہ حرکتیں کرتی ہیں۔" تیز نوکیلا بھالا تھا۔ وہ سسکیاں دباتی نیت باندھنے لگی۔

"کیا وہ مجھے ناپسند کرتا ہے؟" یہ سوال بار بار اس کے ذہنی ارتکاز کو توڑتا رہا۔

☼ ☼ ☼

پھوپھی اماں کے گھر رہتے ہوئے وہ دونوں ایک

ایک دن انگلیوں پر گنتی تھیں اور اسلام آباد میں سارے دن پر لگا کر اڑ گئے تھے۔

واپسی سے ایک دن پہلے رامش کی سالگرہ تھی۔ بابا جان نے اس بار سالگرہ منانے کا منفرد آئیڈیا دیا تھا۔ یعنی ٹیکسلا کے کھنڈرات کی سیر اور واپسی پر خان پور لیک کے کنارے رامش کی برتھ ڈے منائی جائے۔

سب ہی کو یہ آئیڈیا بہت پسند آیا تھا۔ پکنک کی پکنک ہو جاتی اور برتھ ڈے کا ہلا گلا الگ۔ یوں دونوں گھرانوں کا یہ چھوٹا سا قافلہ عازم سفر ہوا۔

کچھ ہی راستہ طے ہوا تھا کہ تاشی نے بھوک بھوک کا شور مچا دیا۔ ازمیر نے گاڑی ایک نیم پختہ چھوٹے سے ہوٹل کے سامنے روک دی۔ تاشی کی بھوک کا تو بہانہ تھا۔ جیسے ہی گرما گرم نان پکوڑے 'پودینے کی چٹنی کے ساتھ سامنے آئے تو سب کے لیے ہاتھ روکنا مشکل ہو گیا۔

گندھارا آرٹ کا فسوں اپنے جوبن پر تھا۔ کتنی ہی دیر تک وہ ٹیکسلا کے کھنڈرات میں کھوئے رہے۔ پھر ٹیکسلا میوزیم آئے 'پھر مغل گارڈن کی سیر کی۔

واپسی میں خان پور لیک پر گاڑی روکی۔ تاشی اور ملی دونوں رامش کے لیے گھر سے کیک بنا کر لے گئی تھیں۔ ہریالی سے بھرے اس قطعہ ارضی پر سب نے بہت محبت سے رامش کی سالگرہ منائی۔ رامش نے باری باری سب کو اپنے ہاتھ سے کیک کھلایا...... تاشی سب کے ساتھ اس کی تصویریں بنانے لگی۔ پھر سب جیسے جوڑوں میں بٹ گئے۔

ملی بھی آہستہ آہستہ پانی کے کنارے کنارے چلنے لگی۔ کچھ دیر تک سیدھے چلتے رہنے کے بعد اس نے واپسی کا سفر شروع کیا اور یونہی نظر اٹھا کر سب کو دیکھا۔ ثاقب ماموں اور ممانی پانی میں پیر ڈال کر بیٹھے تھے۔ تاشی 'رامش کو اڑتے ہوئے پرندے دکھا رہی تھی۔ امی 'بابا بوٹنگ کر رہے تھے۔ فرجاد بھائی اور سمیعہ بھابھی گھاس پر بیٹھے تھے۔ وہ ہر تھوڑی تھوڑی دیر بعد کوئی ایسی بات سمیعہ بھابھی کے کان میں کہتے کہ ان کا چہرہ رنگین ہو جاتا۔

اسے لگا ہر تصویر مکمل ہے 'سوائے اس کی تصویر کے......

ازمیر سب سے کافی فاصلے پر ایک اونچی جگہ پر بیٹھا ہوا فون پر گفتگو میں مصروف تھا۔ دو تین بار اس نے زور سے قہقہے بھی لگائے تھے۔ پرجوش 'ارد گرد سے بیگانہ وہ جس طرح باتوں میں مصروف تھا۔ لگتا تھا کہ فون کی دوسری جانب کوئی دلچسپ شخصیت موجود ہے۔

"پھپھو چلیں......" رامش نے یکدم آ کے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ چونکی۔

"میرے ساتھ فوٹو بنائیں۔" رامش اس کا ہاتھ پکڑ کر ازمیر تک لے آیا۔

"ماموں پک......" اب وہ ازمیر سے مخاطب تھا۔

"تاشی لالہ...... ہماری پک لیں۔" رامش نے زور سے آواز لگائی۔ ملی کو لگا جیسے رامش نے اسے ازمیر کے پاس لا کر اسے ڈسٹرب کر دیا ہو۔ اس کا پرجوش انداز یکدم ہی سلوٹ بھرا ہو گیا تھا۔

"اچھا سونیا یار...... میں بعد میں بات کرتا ہوں۔" ازمیر نے عجلت میں فون بند کیا۔

"رامس پلیز۔" ملی نے اپنا ہاتھ رامش کی گرفت سے چھڑایا۔

"کیا ہوا 'بھائی کے ساتھ تصویر نہیں بنوائی؟" تاشی پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ قریب پہنچ چکی تھی۔

"نہیں...... مجھے بابا بلا رہے ہیں۔" وہ قطعیت سے کہتی آگے بڑھ گئی۔ اسے ڈھیر سارا رونا آ رہا تھا۔



ان کا دوسرا سمسٹر شروع ہو چکا تھا۔ تعلیمی مصروفیت اپنے زوروں پر تھی۔ پریکٹیکل 'پروجیکٹ یا تھیسز ان تینوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا اور دونوں نے پریکٹیکل کرنے کو ترجیح دی تھی۔

میڈم صادقہ نے پریکٹیکل کے ضمن میں بھی تمام طلبا و طالبات کو نباتاتی کیمیکل ریسرچ کا کام سونپ دیا تھا۔ یہ انفرادی طور پر کرنے والا پروجیکٹ تھا۔ اس لیے ہر کوئی ریسرچ لائبریری کھنگالنے میں مصروف تھا۔ تاشی اور ملی کی روزانہ پانچ بجے سے پہلے واپسی نہ ہوتی تھی۔

پھوپھی اماں نے دونوں کو گھر کے ہر کام سے بری الذمہ کر دیا تھا اور رخسانہ کو ہدایت کی تھی کہ دونوں کے کھانے پینے کا خیال رکھے اور رات کو سونے سے پہلے نیم گرم دودھ میں بادام ڈال کر دے۔

ملی کو جب سے ماضی سے آگاہی ہوئی تھی۔ پھوپھی اماں دل سے بے حد قریب محسوس ہونے لگی تھیں۔ اس کی کوشش ہوتی کہ جب بھی اسے پڑھائی سے فرصت ملے 'وہ پھوپھی اماں کے ساتھ وقت گزارے۔ اسے عبیر آپی کی موت سے چند لمحوں پہلے اس کی امی سے کہی گئی بات بھولتی نہ تھی۔

مصروفیت کے بھاگتے دوڑتے لمحوں میں ارسل کی سالگرہ تازہ ہوا کا جھونکا ثابت ہوئی تھی۔

اتوار کا دن تھا۔ پہلے دونوں نے آدھا دن سو کر گزارا اور اب کپڑوں کے انتخاب میں الجھی ہوئی تھیں۔ اسی وقت پھوپھی اماں چلی آئیں۔

"اگر میں تم لوگوں کا کام آسان کر دوں تو......" انہوں نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ان کے ہاتھ میں دو شاپنگ بیگز تھے۔

"کیا مطلب پھوپھی اماں؟" ملی نے ناسمجھی سے کہا۔

"یہ......؟" انہوں نے دونوں شاپنگ بیگز کھول کر ان کے سامنے کر دیے۔ نظروں کے سامنے خوب صورت سی مغلیہ طرز کی فراکیں ہینگرز میں لٹکی ہوئی تھیں۔ ایک انگوری رنگ کی تھی اور دوسری گلابی رنگ میں۔

"واؤ...... یہ تو بہت خوب صورت ہیں۔ ملی کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ وہ پھوپھی اماں کے قریب چلی آئی اور ہاتھ میں فراکیں لے کر دیکھنے لگی۔

"دونوں فراکوں کا رنگ کتنا دیدہ زیب لگ رہا ہے۔" تاشی بھی نزدیک آ گئی۔ اس کی نگاہوں میں بھی ستائش تھی۔

"یہ ہمارے لیے ہے؟" دونوں نے پہلے ایک دوسرے کی سمت دیکھا اور پھر پھوپھی اماں کی طرف۔

"ہاں! تم دونوں کے لیے ہی ہے۔ جب تم دونوں اسلام آباد گئی ہوئی تھیں۔ تب میں نے سلوائی تھیں۔ مگر معلوم نہ تھا کہ تم دونوں کو اتنی پسند آئیں گی۔" پھوپھی اماں سادہ سے لہجے میں کہہ رہی تھیں۔ وہ شاید آگے بھی کچھ کہتیں 'پر ملی اور تاشی بے اختیار ان سے لپٹ گئی تھیں۔

جھلمل کرتی آنکھوں کے ساتھ ہونٹوں پر چٹکی مسکراہٹ کی شفق...... اور زبان ایک شکریہ کہنے سے بھی گنگ۔

پھوپھی اماں نے دونوں کو اک نظر دیکھا۔ پھر زور سے خود میں بھینچ لیا۔ سچی محبت لفظوں کی محتاج نہ تھی۔



"ہیپی برتھ ڈے ٹو یو...... ہیپی برتھ ڈے ڈیر ارسل! ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔ مے یو ہیو مینی مور...... مے یو ہیو مینی مور......"

ارسل اپنی تیسری سالگرہ کا کیک کاٹ رہا تھا اور سب تالیاں بجا رہے تھے۔ چھوٹا سا پیارا سا ارسل 'میرون شیروانی اور سفید چوڑی دار پاجامے میں شہزادہ سا بنا کھڑا تھا۔ اس کے دائیں طرف حمزہ تھا اور بائیں طرف دوا۔ ارسل نزہت آنٹی کو دوا کہتا تھا۔ فاطمہ 'نزہت آنٹی کی وہیل چیئر کے پیچھے کھڑی تھی اور میز کے اطراف باقی سب لوگ تھے۔ پھوپھی اماں 'تاشی 'ملی 'روحان 'راشدہ آنٹی اور تو اور رخسانہ اور گلفام بھی تھے۔ ان لوگوں کے علاوہ نزہت آنٹی کے کچھ رشتے دار بھی تھے۔

ملی تالیاں بجاتے ہوئے تاشی کی کسی بات کا جواب دے رہی تھی کہ اسے لگا 'کوئی اس کی فراک کا کونا پکڑ کر کھینچ رہا ہے۔ اس نے ذرا سا مڑ کر دیکھا۔ ارسل کھڑا تھا۔

"ارے ارسل...... کیا ہوا؟" وہ اسے بازوؤں کے

گھیرے میں لیے نیچے اس کے سامنے پنجوں کے بل بیٹھ گئی۔

"آپ نے مجھے گفٹ نہیں دیا۔" وہ منہ بسورتے ہوئے بولا۔

"اوہ ..... میری جان۔" وہ لمحوں میں شرمندہ ہو گئی۔ اب وہ اسے کیا بتاتی کہ ان تینوں یعنی تاشی، ملی اور پھوپھی اماں کی طرف سے ایک ہی گفٹ دیا گیا ہے۔ یعنی تین پہیوں والی سائیکل۔ ملی کو محسوس ہو رہا تھا کہ ارسل کے اس کے قریب آنے سے سب ملی کی طرف متوجہ ہو گئے ہیں۔

"سوری ..... "میں آپ کو کل ایک اچھا سا گفٹ لادوں گی۔" ملی نے جھٹ کان پکڑے۔

"پر مجھے تو ابھی چاہیے ..... اور وہ بھی اپنی مرضی کا گفٹ۔" کہنے کو ارسل تین سال کا تھا مگر اس کی زبان بہت صاف تھی۔ بولتے ہوئے وہ سامنے والے کا دل موہ لیتا تھا۔

"ابھی .....؟" ملی قدرے کنفیوژ ہوئی۔ "اچھا بتاؤ کیا لیتا ہے آپ کو۔"

حمزہ اور نزہت آنٹی بھی دونوں کی گفتگو سننے میں مگن تھے۔ بڑا دلچسپ سا منظر تھا۔

"آپ مجھے ماما جیسی لگتی ہیں۔ کیا میں آپ کو ماما کہہ سکتا ہوں۔" وہ جو مسکراتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ جانے اس وقت ارسل کیا مانگے گا۔ اس انوکھی فرمائش پر دنگ رہ گئی تھی۔

اور وہاں موجود ہر شخص گویا بت بن گیا تھا۔ ایک معصوم سے بچے کے دل میں کیا تھا؟ انوکھی سی خواہش، ایک تشنگی کی کیفیت، بے شمار گفٹس کا میز پر ڈھیر لگا تھا..... اور اسے ان سب سے ہٹ کر چاہیے تھا۔

بس کچھ لمحے لگے تھے۔ پھر بے اختیار ہی اس نے ارسل کی پیشانی چوم لی تھی۔

"ارسل! یو آر مائی فرینڈ..... اور فرینڈ اپنے اچھے دوست کو جو دل چاہے کہہ سکتا ہے۔" وہ اسے اپنے ساتھ لپٹائے کہے جا رہی تھی۔

"تھینک یو..... اب آپ چلیں۔ میرا کیک کاٹیں۔" وہ اسے ہاتھ پکڑ کر کھینچنے لگا۔

"مگر کیک تو آپ نے کاٹ لیا۔" وہ ابھی بھی نہ سمجھی تھی۔

"آپ سب کے لیے پیس بنائیں ناں اور پھر میرے گفٹ بھی کھولیں۔ میری ماما ہوتیں تو یہ کام کرتی ناں۔" ارسل کے سادہ سے لہجے پر ملی کا دل کٹ سا گیا۔ وہ آج اپنے خوب صورت دن پر اپنی ماما کو یاد کر رہا تھا۔

"ارسل بیٹا! آنٹی کو تنگ نہ کرو۔ چلو! میں سب کے لیے پیس بناتا ہوں..... اور اپنے بیٹے کے لیے سب سے بڑا پیس۔" حمزہ جو کافی دیر سے ارسل اور ملی کے مکالمے سُن رہا تھا۔ قریب چلا آیا۔ وہ کومل کو ارسل کے نازک سوالات سے بچانا چاہتا تھا۔

"اٹس او کے حمزہ صاحب! اتنی سی تو خواہش ہے اس کی۔ میں سب کو سرو کر دوں گی۔" ملی نے دھیرے سے کہا اور ارسل کے ساتھ میز کے قریب جا کر پیسز بنانے لگی۔

ارسل خوشی خوشی اسے پلیٹیں پکڑانے لگا۔ خوشی اس کے ننھے سے چہرے پر ستارہ بن کر جگمگا رہی تھی۔ حمزہ یہ منظر دیکھے گیا کتنا مانوس سا ماحول تھا۔ کیا زویا، ملی جیسی نہیں بن سکتی تھی؟

حمزہ کو وہ غلط موقع پر یاد آئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"یہ سڑک جہاں تک جاتی ہے۔ ہمیں وہاں تک واک کرنی چاہیے۔" تاشی نے احمقانہ بات کی۔

"ہاں! تاکہ واپس آتے آتے ہمیں صدیاں لگ جائیں اور پھوپھی اماں مسجد میں ہماری گم شدگی کا اعلان کروا دیں۔" ملی نے اسے گھورا۔

"اچھا بابا..... یہ جو موڑ نظر آ رہا ہے۔ وہاں تک تو چلا جائے۔"

"ہاں تو چلو ناں! کس نے منع کیا ہے۔" ملی نے کہا اور تاشی کے ساتھ تیز تیز قدم بڑھانے لگی۔ موڑ تک بھی نہ پہنچی تھیں کہ سامنے سے ایک دم روحان آتا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں کتے کی رسی تھی۔

تاشی تو جہاں تھی، وہیں ساکت ہو گئی تھی..... اور ملی صرف تاشی کے چہرے کے تاثرات دیکھے جا رہی تھی۔ جو خطرناک حد تک بگڑ چکے تھے۔

"کیا ہے؟" روحان دونوں کے نزدیک چلا آیا اور مسکراتے ہوئے دونوں سے کتے کے لیے رائے لے رہا تھا۔ مگر روئے سخن تاشی کی جانب تھا۔ اب وہ

"آئی ہیٹ یو۔" تاشی زور سے دھاڑی اور بھاگتے ہوئے واپس پلٹ گئی۔

"انہیں کیا ہوا۔" اس کا روشن چہرہ لمحوں میں بجھ سا گیا تھا۔

"میں نے تو کتے کے لیے پوچھا تھا۔ میرا دوست عدیم اسکالر شپ پر ایم ایس کرنے آسٹریلیا جا رہا تھا۔ مجھے اس کا یہ آسٹریلین کیٹل ڈوگ بہت پسند تھا۔ میں نے اس سے لے لیا..... پر مس نتاشا کو کیا ہوا؟" وہ بہت حیران سا تھا۔

"اگر تم نے اپنے بارے میں رائے مانگی ہوتی تو یقیناً" وہ کچھ اچھا کہتی۔ مگر کتے ..... کتے اسے ہمیشہ سے ناپسند ہیں..... اور جو کتے پالتا ہے..... اس سے تو وہ گھن کھاتی ہے۔"

"یو مین..... اسی لیے مس نتاشا نے مجھے آئی ہیٹ یو کہا۔" روحان کی شکل اتر گئی تھی اور ملی نے فقط سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

ایک پسندیدہ چیز اس کے پاس آئی تھی تو ایک پسندیدہ ہستی اس سے روٹھ گئی تھی۔

"ہیلو..... کہاں کھو گئے۔" ملی نے اس کی آنکھوں کے آگے ہاتھ لہرایا تھا۔ وہ بری طرح چونکا۔ جیسے کسی خوب صورت خواب سے جاگا ہو۔ کتا بھی ایک ہی جگہ رک جانے پر رسی کو جھٹکا دیے جا رہا تھا۔ روحان آہستہ آہستہ چلنے لگا۔

"ویسے تو تم بھی اسٹڈیز میں بہت اچھے ہو۔ تم کیوں نہیں اسکالر شپ پر بیرون ملک گئے؟" ملی بھی اس کے ہم قدم ہو گئی تھی۔

"اسکالر شپ پر باہر جا کر پڑھنا، اپنی فیلڈ میں تعلیم حاصل کرنا میرا خواب تھا اور یہ خواب سہل الحصول بھی تھا۔ مگر اپنے بہت پیارے لوگوں کو اکیلے چھوڑ کر جانا اور دیار غیر میں ان کے بغیر رہنا میری ترجیح نہیں ہے۔ اس لیے میں اپنے خواب سے خود ہی دست بردار ہو گیا۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں۔ امی اور خالدہ آنٹی کی دعاؤں کی بدولت ہوں۔ میں ان دونوں کے بغیر نہیں رہ سکتا۔" روحان کا لہجہ بہت پرخلوص تھا۔

"یعنی تم یہ بات جانتے ہو کہ محبت میں کبھی کبھی اپنی پسندیدہ چیز بھی قربان کرنی پڑتی ہے؟ پھر تو تمہیں اس کتے کو واپس بھیجنے پر کوئی اعتراض نہ ہو گا۔" ملی کو شوخ و شنگ روحان کا یہ روپ بہت اچھا لگا تھا۔

"تم کیا نجومی ہو؟" روحان جانے کیوں چڑ گیا۔ شاید اپنا آپ آشکار ہو جانے پر۔

"عاشق کا چہرہ پڑھنا سب سے زیادہ آسان ہوتا ہے۔" ملی نے گویا عقل مندی جھاڑی تھی۔ "ویسے تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ دو دن بعد تاشی کی برتھ ڈے ہے اور اسے پیٹس (پالتو) میں خرگوش بہت پسند ہیں..... اب میں چلتی ہوں۔ ورنہ تاشی مجھے قتل کر دے گی۔" ملی نے واپسی کا قصد کیا۔

"ویسے میں نجومی نہیں ہوں۔ مگر گہری نگاہ رکھتی ہوں۔ مجھے وہ دو آنکھیں یاد ہیں جو بڑی عقیدت سے مس نتاشا کو اپنے گھر کے لان میں واک کرتے ہوئے دیکھا کرتی ہیں۔" ملی نے مسکرا کر کہا۔ وہ دو قدم بڑھا کر پھر رک چکی تھی۔

اس بار روحان بھی اپنی مسکراہٹ نہ روک سکا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا کہ اس راز سے صرف کومل واقف تھی۔

☼ ☼ ☼

امتحانات کا موسم شروع ہوا اور ختم بھی ہو گیا..... درمیان میں تعلیمی مصروفیات کے ساتھ اسٹوڈنٹ ویک بھی زور و شور سے منایا گیا اور فائنل ایر کے اعزاز میں عشائیہ بھی دیا گیا۔ اس بار دونوں کو امتحانات کے بعد گھر جانے کی جلدی نہ تھی کیونکہ پھوپھی اماں کے

ساتھ جو تعلق تھا وہ قربت میں بدل گیا تھا اور قربت کبھی بھی بوجھل پن کا شکار نہیں ہوئی۔ پھوپھی اماں تاشی کو اپنے ساتھ مارکیٹ لے گئی تھیں تاکہ اسلام آباد سب کے لیے اپنی طرف سے کچھ سوغاتیں بھجوا سکیں۔

ملی کچھ دیر تک ٹی وی دیکھتی رہی۔ پھر ارسل سے ملنے کے لیے دل مچلنے لگا تو اٹھ کھڑی ہوئی۔ خود پر نظر ڈالی۔ حلیہ معقول ہی لگا۔ سفید چوڑی دار پاجامہ پر اس نے مردانہ طرز کی کالر والی قمیص زیب تن کی ہوئی تھی۔ دوپٹا سلیقے سے شانوں پر پھیلائے وہ رخسانہ کو بتا کر باہر نکل آئی تھی۔

نزہت آنٹی لان میں ہی موجود تھیں اور شام کی چائے پی رہی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی کھل اٹھیں۔

"آہا۔۔۔ آج تو ہماری کومل بٹیا آئی ہے۔۔۔ بڑے دنوں بعد چکر لگایا۔" انہوں نے خوش دلی سے کہا اور پھر اندر کی طرف منہ کر کے فاطمہ کو آواز دینے لگیں۔

"کومل بٹی کے لیے بھی چائے لے کر آؤ۔۔۔ بلکہ اچھا سا ناشتا لاؤ۔"

"ارے نہیں آنٹی۔۔۔ میں تو بس یوں ہی ارسل سے ملنے چلی آئی تھی۔" وہ ان کی اس درجہ محبت پر نہال ہو گئی۔

"بیٹا! ارسل تو اپنے چوپاپا کے ساتھ پارک تک گیا ہے۔ آج بہت دنوں بعد حمزہ کو فرصت میسر آئی تو بس ارسل نے ضد شروع کر دی کہ گھومنے چلیں۔ مگر کیا تم صرف ارسل سے ملنے آئی تھیں۔ اپنی آنٹی سے نہیں ملو گی۔" انہوں نے جھوٹ موٹ کی ناراضی دکھائی تو وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

"ارے نہیں آنٹی! میں آپ دونوں سے ملنے آئی تھی۔ پھر اسلام آباد چلے جائیں گے تو ایک مہینے سے پہلے تو واپسی ناممکن ہے۔" وہ کہتی ہوئی ان کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔

وہ معذور تھیں۔ سارا دن تو وہیل چیئر پر گزارتی تھیں۔ پھر بھی ملی جتنی بار ان سے ملی تھی' انہیں مایوسی سے کوسوں دور پایا تھا۔ وہ اٹھتے بیٹھتے خدا کا شکر ادا کرتی نظر آتی تھیں۔

"آنٹی۔۔۔ آپ کی یہ معذوری ہمیشہ سے ہے؟" یہ سوال پوچھتے ہوئے وہ ذرا سا جھجکی تھی۔

"نہیں بیٹا! یہ تو ایک حادثے کی دین ہے۔" فاطمہ چائے لے آئی تھی اور ساتھ میں نمکو اور سموسے بھی۔ نزہت آنٹی اسے اپنے ہاتھ سے پلیٹ میں سامان نکال نکال کر دینے لگیں۔

"کیسا حادثہ آنٹی؟" وہ پوری طرح ان کی سمت متوجہ ہو گئی تھی۔

"اسامہ میرا بڑا بیٹا تھا۔ ماشاء اللہ سے شادی شدہ تھا۔ اس کا آٹو پارٹس کا کاروبار دن دگنی ترقی کر رہا تھا۔ اس نے نئی گاڑی خریدی تو کہنے لگا کہ آپ کو اور رومیلہ کو لانگ ڈرائیو پر لے جاتا ہوں۔ حمزہ ان دنوں اپنا کلینک اسٹیبلش کرنے میں مصروف تھا۔ شام چھ بجے کا وقت تھا۔ سردیوں کے دن تھے۔ جلدی اندھیرا پھیل گیا تھا۔ میں اور رومیلہ اسامہ کے ساتھ چلے گئے۔ ارسل سو رہا تھا۔ اس لیے رومیلہ اسے فاطمہ کے پاس چھوڑ گئی تھی۔

نئی گاڑی کی خوشی دور تک چمک دار تارکول کی سڑک' میوزک کا شور' اسامہ جوش میں اسپیڈ بڑھاتا چلا گیا۔ کافی آگے جا کر ایک ٹرک نظر آیا۔ اس پر لوہے کے سریے لوڈ تھے۔ اسامہ نے بریک لگا کر اسپیڈ کم کرنی چاہی تاکہ گاڑی واپس موڑ لے یا پھر ٹرک اور گاڑی کے درمیان فاصلہ بڑھا لے۔ مگر ممکن نہ ہو سکا۔ بس لمحوں کی بات تھی اور ایک خوفناک تصادم ہوا اور دو زندہ انسانوں کو نگل گیا۔ وہ دونوں فرنٹ سیٹ پر تھے۔ موقع پر ہی دم توڑ گئے اور میں۔۔۔ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپاہج۔۔۔ ہنستا مسکراتا سفر آنسوؤں میں بدل گیا۔

دو مہینوں تک میں اپنے حواسوں میں نہ آپائی۔ اور اس دوران زندگی کے معانی ہی بدل گئے۔

حمزہ نے آٹھ ماہ کے ارسل کو کیسے سنبھالا' میری کس طرح دیکھ بھال کی۔ مجھے کچھ نہیں پتا اور جب سمجھ میں آیا تو میرے حمزہ کی زندگی سے بھی بہار

روٹھ چکی تھی۔ چھ مہینے بعد دونوں کی شادی تھی اور وہ بھی جا چکی تھی۔ حمزہ کو اس سے بہت محبت تھی۔

مشکل کا وقت تھا' کٹ ہی جاتا' مگر زویا کو یوں لگنے لگا تھا کہ حمزہ اب کبھی میری اور ارسل کی بیڑی سے آزاد نہ ہو گا اور شادی کے بعد وہ بھی اس زنجیر میں مقید ہو جائے گی۔ ایک یتیم اور ایک اپاہج اس کے لیے بوجھ تھے۔ پہلے وہ ہمارے وجود سے بے زار ہو لی گئی اور پھر حمزہ سے یکسر متنفر ہو گئی۔ یہ وہ وقت تھا جب حقیقی معنوں میں حمزہ کو دل آشنا کی ضرورت تھی۔ مگر عین شادی سے ایک مہینہ پہلے اس نے منگنی توڑ دی۔۔۔ میرا بیٹا تو ٹوٹ ہی گیا۔ اور میں۔۔۔ رشتے میرے ہاتھ سے پھسلتے چلے گئے' میں پھر بھی زندہ تھی مگر حمزہ۔۔۔ اس نے ایک دن بھی اپنا شکست خوردہ وجود مجھے نہ دکھایا۔ گھر' کلینک میں اور ارسل۔۔۔ بس یہی اس کی زندگی کا محور بن گیا۔" نزہت آنٹی سوگوار سی تھیں اور ملی بالکل خاموش۔۔۔ اسے اب سمجھ میں آیا تھا۔ ارسل حمزہ کو "چوپاپا" کیوں کہتا تھا۔

اسی وقت گاڑی کا ہارن بجا۔ فاطمہ نے جلدی سے جا کے دروازہ کھولا۔

"ملا۔۔۔" گاڑی جیسے ہی اندر آئی' ارسل نے اتر کر ملی کی آواز لگائی اور بھاگتے ہوئے اس کی طرف آیا۔ حمزہ بھی گاڑی سے اتر کر ان لوگوں کی سمت آگیا۔

"ارسل بیٹا۔۔۔ بری بات۔ ملی آنٹی ہیں وہ۔" حمزہ نے نرمی سے ٹوکا۔

"کوئی بات نہیں۔ میں اسے سمجھاتی ہوں۔" ملی نے حمزہ کی بات کا جواب دیا۔

"ارسل بیٹا! صرف خاص خاص موقعوں پر ماما بولتے ہیں۔ ورنہ میں تو ملی آنٹی ہوں۔" وہ اسے بازوؤں میں بھر کر بولی۔

"تو میں آپ کو اکیلے میں ماما کہہ لوں؟ میں نے کبھی کسی کو ماما نہیں کہا۔" ارسل نے اتنی معصومیت سے کہا کہ کومل ہنس پڑی اور اس کے پھولے پھولے گالوں پر پیار کرنے لگی۔

نہیں فرنیش ہو کر آتا ہوں۔" حمزہ نے دونوں کو ایک دوسرے میں مگن دیکھا تو ماں کو مخاطب کیا۔ نزہت آنٹی خود بھی کومل اور ارسل کی باتوں میں گم تھیں۔ پہلے چونکیں اور اثبات میں سر ہلایا۔

ارسل اب اس کی گود سے اتر کر اپنی دوا کو اپنی تفریح کی کہانی سنا رہا تھا۔ ملی غیر محسوس انداز میں حمزہ کو اندر جاتا دیکھتی رہی۔

"کون کہتا ہے' فرشتے نظر نہیں آتے۔" ملی نے سوچا۔

اسلام آباد میں تو وہ اپنے لوگوں کے درمیان رہتی تھی مگر یہاں۔۔۔ کراچی میں اسے جگہ جگہ فرشتے ملے تھے۔

پھوپھی اماں۔۔۔ بظاہر اوپر سے سخت' مگر اندر سے ملی اور تاشی کے لیے ماں جیسی فکر مندی اور ان کی اچھی تربیت کے لیے ہر لمحہ کوشاں۔

روحان۔۔۔ جس نے اپنے سنہری مستقبل اور اسکالر شپ پر اعلا تعلیم حاصل کرنے کے خواب کو راشدہ آنٹی اور پھوپھی اماں کے اکیلے پن پر قربان کر دیا تھا۔

اور اب یہ حمزہ۔ جس نے اپنی ساری زندگی کا محور ارسل اور نزہت آنٹی کو بنا لیا تھا۔"

یہ شہر واقعی روشنیوں کا شہر تھا۔ ان دیکھی روشنیاں جو روح سے پھوٹتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔



"واؤ۔۔۔" حسب معمول فجر کی نماز کے بعد تاشا لان میں آئی تو پنجرے میں چھوٹے سے خرگوش کو مقید پایا۔ وہ تیزی سے پنجرے کے نزدیک آئی۔ پنجرے کے ساتھ ایک وش کارڈ سرخ ربن کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔

"ضرور یہ ملی لائی ہو گی۔" وہ پرجوش سی ربن سے بندھا کارڈ کھولنے لگی۔ ایسا منفرد خیال صرف ملی کو ہی آ سکتا تھا۔

"میں نے اپنی خوشی آپ کی خوشی پر قربان کر دی ہے مس نتاشا!

میں نہیں جانتا۔ میں نے ایسا کیوں کیا۔

مگر میں اپنے دل میں بہت خوشی اور سکون محسوس کر رہا ہوں۔ آپ جواباً" کیسا محسوس کریں گی اور اس خلوص کو رشتوں کی کون سی کسوٹی پر پرکھیں گی؟ یہ بات اس چھوٹے سے تحفے کے قبول کرنے میں پنہاں ہے۔

نیک تمناؤں کے ساتھ روحان۔"

تاشی کی نظریں جیسے جیسے سطر در سطر آگے بڑھ رہی تھیں۔ یقین استعجاب میں بدل رہا تھا۔

کوئی اور بھی اس کی خوشی جانتا ہے؟ کوئی اور بھی ایسا منفرد تحفہ دے سکتا ہے؟ تاشی کے دل پر اچھوتا سا احساس طاری تھا۔ اس نے اک نظر خوب صورت سے معصوم سے خرگوش پر ڈالی۔ دوسرے ہی لمحے وہ کارڈ اور پنجرے کو اٹھائے اندر بڑھ رہی تھی۔ پردے کے پیچھے سے جھانکتی دو آنکھوں کے ساتھ اب لب بھی مسکرا رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

خبر کیا تھی دھماکا تھا۔ نزہت آنٹی نے پھوپھی اماں سے کومل اور حمزہ کے رشتے کے لیے بات کی تھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ پھوپھی اماں کومل کے بابا سے اس رشتے کے سلسلے میں بات کریں۔ تاشی نے جب سے سنا تھا' چراغ پا تھی۔

"پھوپھی اماں..... آپ انہیں منع کر دیں۔ ملی اور ازمیر بھائی کی بچپن سے بات طے ہے اور ملی بس میری ہی بھابھی بنے گی۔ آپ ہرگز' ہرگز بھی فصیح پھوپھا سے ایسی کوئی بات نہیں کریں گی۔" تاشی کا لہجہ قطعیت بھرا تھا۔ ملی نے کچھ نہ کہا۔ وہ خاموشی سے پیکنگ کرتی رہی۔

"میں یہ بات جانتی ہوں نتاشا بیٹا! اور میں نے نزہت کو یہ بات بتا بھی دی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حمزہ مجھے بہت پسند ہے۔ بہت سلجھا ہوا اور سمجھ دار۔ اگر ملی کی ازمیر سے بات طے نہ ہوئی ہوتی تو مجھ سے زیادہ اس رشتے پر کسی کو خوشی نہ ہوتی۔" پھوپھی اماں نے محبت سے کہا اور ملی نے چونک کر سر اٹھایا۔

وہ پہلی بار یوں برملا ان دونوں کے سامنے اپنی خوشی کا اظہار کر رہی تھیں۔ وگرنہ تو ملی نے انہیں خاموش دیکھا تھا یا اپنے کام میں مگن۔ ملی نے پھوپھی اماں اور تاشی کی گفتگو کے دوران اک لفظ بھی نہ کہا تھا۔

ازمیر نے نہ تو اس کی آنکھوں کو کوئی خواب سونپا تھا نہ اس کی ہتھیلیوں پر جگنو رکھے تھے..... اور نہ ہی اس کے آنچل میں محبت کے رنگ باندھے تھے۔ یہ تو بس اک معاہدہ تھا' جو بڑوں کے درمیان ہوا تھا۔

اس نے اپنا سر جھٹکنا چاہا..... مگر حمزہ اور ازمیر کا سراپا آپس میں گڈمڈ ہونے لگا۔

ازمیر اپنا تھا' مگر دور کھڑا نظر آتا تھا۔

اور حمزہ' جس سے بس چند بار ہی ملاقات ہوئی تھی..... ہر بار ایک اپنے پن کا احساس چھوڑ جاتا تھا۔

وہ تاشی اور پھوپھی اماں کی باتوں سے اپنا دھیان نکال کر باقی ماندہ چیزیں رکھنے لگی کہ کل دوپہر کو ان کی روانگی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ دونوں گھر پہنچیں تو اک بری خبر ان کی منتظر تھی۔ ثاقب مرتضیٰ کل رات سے اسپتال میں داخل تھے۔ تاشی کا رو رو کر برا حال ہو گیا اور آنکھیں تو ملی کی بھی بار بار بھیگ جا رہی تھیں۔ سب حیران تھے۔ انہیں تو کبھی ہلکا سا سر درد بھی نہ ہوا تھا..... اور اچانک دل کا عارضہ.....

ابھی کچھ دیر پہلے ڈاکٹر ثاقب مرتضیٰ کو انجیو گرافی کے لیے لے گئے تھے۔ کمرے میں نتاشا اور فیروزہ تنہا رہ گئی تھیں۔ سب لوگ ان کے یوں اچانک دل ہار جانے پر حیران تھے مگر فیروزہ نہیں۔ وہ بہت گم صم اور اداس تھیں۔ آنکھیں بہت رونے سے سرخ تھیں۔

"بتائیں امی! کیسے ہوا یہ؟ آپ اتنی چپ کیوں ہیں

اس نے ماں کے کندھے پر دباؤ بڑھایا۔

"ازمیر نے کومل سے شادی سے انکار کر دیا ہے۔" ایک دھماکا سا تھا' جس کی گونج اس کی سماعت نے سنی تھی۔ اس نے جھٹکے سے سر اٹھا کر ماں کو دیکھا۔ ان کی نگاہیں اس کی طرف متوجہ نہیں تھیں' کسی غیر مرئی چیز پر جمی تھیں۔

"ثاقب اور ازمیر کی بہت بحث ہوئی۔ پنڈی میں اس کے بینک کی برانچ میں کوئی لڑکی ہے سونیا۔ اکاؤنٹنٹ ہے۔ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔" فیروزہ کی زبان سے بے ربط جملے ادا ہو رہے تھے۔

"تو کیا ملی ٹھیک کہتی تھی..... ازمیر بھائی کو واقعی اس سے لگاؤ نہ تھا۔" "مگر کیوں؟ کومل میں کیا برائی تھی؟"

اسے پھوپھی اماں سے کہے گئے اپنے قطعیت بھرے جملے یاد آ رہے تھے۔

"کومل اور ازمیر بھائی کی منگنی بچپن سے طے ہے۔ اور کومل بس میری بھابھی بنے گی۔" اس نے کتنے مان سے پھوپھی اماں سے کہا تھا۔

دوسرے ہی لمحے وہ فیروزہ سے لپٹ کر رونے لگی۔ وہ جانتی تھی اس کے بابا ثاقب مرتضیٰ کو بیٹیاں کتنی پیاری تھیں۔

وہ' سمیعہ اور کومل..... یہی نہیں' ان کے گھر سے تو اب تک میمونہ پھپھو کی عیدی بھی جایا کرتی تھی۔ کپڑے' جوتے' چوڑیاں' خشک میوہ جات اور سویاں اور اب..... اب ایک بیٹی کے حق پر ضرب پڑنے والی تھی۔ اس ضرب کا احساس ہی ثاقب مرتضیٰ کے دل پر گھاؤ ڈال گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"امی! سونیا بہت اچھی لڑکی ہے۔ آپ پلیز اس سے ایک بار مل تو لیں۔" ازمیر ماں کے سامنے دو زانو بیٹھا تھا۔

"بابا کا ری ایکشن تو فطری تھا۔ مگر آپ تو ماں ہیں۔ کیا آپ بھی مجھ سے منہ پھیر لیں گی۔"

"ازمیر! بہت افسوس کی بات ہے۔ ثاقب کو دل کا عارضہ ہو گیا اور تم ابھی تک اسی بات کو لے کر بیٹھے ہو..... آخر کیا کمی ہے کومل میں۔" وہ چیخ پڑیں۔

ابھی میمونہ اور نتاشا ثاقب مرتضیٰ کے پاس تھے۔ اس لیے وہ کچھ دیر کے لیے گھر آ گئی تھیں تاکہ کپڑے بدل کر اور کچھ دیر سستا کر دوبارہ چلی جائیں۔ پر ابھی دس منٹ پہلے ہی کومل کا فون آیا تھا کہ۔

"ممانی! آپ ابھی اسپتال نہ جائیے گا۔ میں ماموں کے لیے ویجی ٹیبل سوپ بنا رہی ہوں۔ پھر ساتھ مل کر چلیں گے۔" انہوں نے ہامی بھر لی تھی۔ جب تک کومل آتی۔ وہ کچھ دیر کے لیے بیڈ کی پشت سے کمر ٹکا کر لیٹ گئی تھیں۔ جب ازمیر چلا آیا اور اب تک اسی بات پر ڈٹا ہوا تھا۔

"امی..... کومل ایک انتہائی بچکانہ مزاج کی لڑکی ہے۔ اس کے نزدیک زندگی صرف ہنسی مذاق اور ہلا گلا ہے..... وہ میرے مزاج سے میل نہیں کھاتی۔"

"تم بھول رہے ہو ازمیر! تمہاری اپنی بہن نتاشا بھی اسی مزاج کی ہے۔ فطرت میں لاابالی پن ہے۔ شادی کے بعد سب لڑکیاں اپنی ذمہ داریاں سمجھ جاتی ہیں۔" انہوں نے ایک بار پھر رسانیت سے سمجھانا چاہا۔

"امی! نتاشا میری بہن ہے..... میں اس کے لاڈ ہزار مرتبہ اٹھا سکتا ہوں مگر معذرت کے ساتھ' بیوی مجھے اس طرح کی نہیں چاہیے۔ بیوی تو سنجیدہ شخصیت کی حامل ہو۔ جس کی زندگی میں کوئی مقصدیت ہو۔ سوچ سمجھ کر فیصلے کرنے والی اور کومل..... اس میں ہے کیا؟ ہر وقت بے ہنگم قہقہے لگانا' گھر کے کسی کام کو ہاتھ نہ لگانا' ہنسی مذاق' تیز تیز بولنا' تیز تیز چلنا..... چھپکلی اور لال بیگ سے ڈرنے والی' ہارر فلمیں دیکھ کر اپنے سائے سے بھی خوف کھانے والی..... اس میں ایسا کیا ہے جسے میں پسند کروں؟" ناراضی ازمیر کے لہجے سے جھلک رہی تھی۔

"سونیا بہت اچھی لڑکی ہے۔ والد کی ڈیتھ کے بعد کم عمری سے گھر کو سنبھال رہی ہے۔ اس نے اپنے بھائیوں کو اس قابل کیا کہ آج وہ اچھے کالج میں پڑھ

[illegible]

انسانی چہروں کی خوب صورتی سے متاثر ہونے والا شخص نہیں ہوں امی! اور زندگی گزارنے کے لیے ... ہے کومل مجھے اس حوالے سے کبھی بھی متاثر نہ کر سکی۔"

"تم جانتے بھی ہو۔ تم کیا کہہ رہے ہو... اک طوفان آجائے گا ازمیر!"

"تم کیوں ایک بار پھر ماضی کو ہم سب کے درمیان لا کھڑا کر رہے ہو؟" وہ آنے والے وقت سے خوفزدہ تھیں۔

رضی اور خالدہ کی محبت نے برسوں پہلے ایک طوفان برپا کیا تھا۔ جس کی سزا عبیو نے بھگتی تھی... اور اب ازمیر کی سونیا کے لیے پسندیدگی اور کومل کے لیے انکار، جس کی زد میں میمونہ اور سمیعہ دونوں آجائیں گی۔ اور پھر کومل... اس کا کیا قصور تھا جس کی آنکھوں میں ازمیر کے خواب تھے۔

"امی! اس طوفان کے ڈر سے کیا میں اپنی من چاہی زندگی سے دست بردار ہو جاؤں؟ ہو لیں جواب دیں۔ کیا میں نے آپ لوگوں سے کہا تھا کہ بچپن میں میرا رشتہ کومل سے طے کر دیں؟ خوشیوں کی بنیاد اولے بدلے کے رشتے پر رکھیں؟ آپس کی محبتوں کو مضبوط کرنے کا یہ کون سا فلسفہ تھا؟" اس کا دباؤ ان کے گھٹنے پر سخت ہو گیا تھا۔

فیروزہ کے پاس کہنے کے لیے کچھ بھی نہ تھا۔ شوہر اسپتال میں تھا اور بیٹا پیروں میں اپنا دل کھول کر بیٹھا تھا۔ لاکھ چاہنے پر بھی وہ اس سے منہ نہ موڑ سکی تھیں اور بیٹی کا گھر، اس کی زندگی... اس کے آگے ایک بڑا سوالیہ نشان لگا ہوا تھا۔

"امی پلیز... ابو تو شاید میری بات نہ سمجھیں مگر آپ تو... آپ تو میری بات سمجھ سکتی ہیں۔ آپ پھپھو اور پھپھا سے پلیز بات کریں کہ میں کومل سے نہیں، سونیا سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ وہ بہت اچھی لڑکی ہے۔"

سوپ کا پیالا لیے کھڑی کومل میں اس سے زیادہ سننے

[illegible]

کی۔

گھر کے دروازے کھلے رہیں تو اک نقصان یہ ... کوئی راز، راز نہیں رہ پاتا۔ دونوں گھروں کے ... کے پاس دونوں گھروں کے مرکزی دروازوں کی ... تھیں۔ اور آج یہ چابی دروازہ کھولنے کے ساتھ ... دلوں کا بھید بھی کھول گئی تھی۔

وہ تو سمجھتی تھی۔ محبت روشنی کا استعارہ ہے۔ اس کے ہاتھ سے جگنو کیوں اڑ گئے تھے۔ خالی ... کتنی بے رونق تھی... لکیروں کے جال کے ... میں کچھ نہ تھا۔

وہ سوپ کا پیالا سمیعہ بھابھی کو دے آئی ... اس کے سر میں شدید درد ہے۔ وہ فیروزہ ممانی ... ساتھ اسپتال چلی جائیں۔

وہ اپنے کمرے میں بند ہو کر بہت سارا رو ... تھی۔ اسے ازمیر سے کوئی طوفانی محبت نہ تھی مگر ... کے انکار سے اس کے نسوانی پندار کو جو ٹھیس ... تھی۔ اس کا درد سوا تھا۔

☼ ☼ ☼

انسان کو پتا ہی نہیں چلتا۔ وہ روز ایک ہی بند روٹین میں زندگی بسر کیے جاتا ہے مگر صرف ایک ... جھٹکے سے وہ حصار توڑ دیتا ہے اور پھر محبتوں کی بکھر ... جاتی ہے۔ دونوں گھر جیسے ثاقب مرتضیٰ کے کمرے ... گئے تھے۔ اسپتال سے انہیں ڈسچارج کر دیا گیا ... بات صرف مختلف ٹیسٹوں اور انجیو گرافی پر ہی ... گئی تھی۔ شکر تھا کہ انجیو پلاسٹی کی نوبت نہ ... تھی۔

رپورٹ کے مطابق دل کے شیشے صرف ساٹھ فیصد ہی کام کر رہے تھے مگر ڈاکٹرز نے مستقل طور پر استعمال کرنے کے لیے کچھ ادویات مقرر کر دی تھیں۔ بلڈ پریشر اور کولیسٹرول کو ممکنہ حد تک قابو میں رکھنے کی تاکید کی تھی۔ ساتھ ہی خوش اور پرسکون رہنے کی ہدایت کی تھی۔

وہ اپنے کمرے میں بستر پر دراز تھے اور فصیح الدین ... کے نزدیک ہی آرام دہ کرسی پر بیٹھے تھے۔

موسم بدل رہا تھا، سرد ہوائیں دستک دے رہی تھیں۔ دھیمے سروں میں ثاقب مرتضیٰ کا پسندیدہ ریکارڈ بج رہا تھا۔ جو انہوں نے فصیح الدین سے کہہ کر چلوایا تھا۔ مغنیہ، مرزا غالب کا کلام گا رہی تھی۔

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں

"کوئی بات ہے دل میں تو مجھ سے بانٹ لو ثاقب!" فصیح الدین مضطرب تھے، سچے دوست تھے۔ ان کے دوست کی نبض پر ہاتھ رکھ بیٹھے تھے۔

"مجھے معاف کر دو فصیح! پلیز مجھے معاف کر دو۔" ثاقب مرتضیٰ کا خود پر سے ضبط ختم ہو چکا تھا وہ اپنے دونوں ہاتھ جوڑے شکست خوردہ سے فصیح الدین کے سامنے تھے۔

"ارے... ارے ثاقب یہ کیا کر رہے ہو؟" فصیح الدین نے ثاقب مرتضیٰ کے بندھے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں بھینچ لیے۔

"میں مجرم ہوں تمہارا... میں رشتوں کو اچھی طرح نبھانے کی لاج نہ رکھ سکا۔"

"یہ بات کیوں کر رہے ہو ثاقب... کیا ہوا ہے؟"

"میری میمونہ تمہارے گھر میں خوش ہے۔ میری سمیعہ بھی تمہارے گھر میں بہت خوش ہے اور میں اتنا کم ظرف کہ کومل کو اپنے گھر خوش رکھنے کا وعدہ نبھانا تو دور کی بات، وعدہ کرنے سے بھی قاصر ہوں۔" ثاقب مرتضیٰ رندھی ہوئی آواز میں سب کچھ کہتے جا رہے تھے۔

میمونہ کے ساتھ اندر آتا فرجاد ٹھٹک گیا تھا۔ یوں معذرت کی تصویر بنے ثاقب ماموں آخر کس بات سے اس حال کو پہنچے تھے۔ وہ تیز تیز قدموں سے درمیانی فاصلہ پاٹتا ان دونوں کے درمیان آ پہنچا تھا۔ اسے جاننا تھا اب کچھ۔ جو وہ فصیح الدین سے کہہ چکے تھے۔ اس نے غور سے باپ کا چہرہ دیکھا جو کچھ بھی اچھا نہ ہونے کی چغلی کھا رہا تھا۔

فرجاد نے ثاقب ماموں کے منہ سے جو کچھ سنا تھا، اس کے بعد وہ وہاں اک لمحہ بھی رکنے سے انکاری تھا۔ جوانی کا جوش اسے ویسا ہی قدم اٹھانے پر اکسا رہا تھا جیسا ازمیر نے کیا تھا جبکہ میمونہ اور فصیح الدین دم سادھے بیٹھے تھے۔

☼ ☼ ☼

"نکلو یہاں سے... تمہاری اس گھر میں اب کوئی جگہ نہیں ہے۔" سمیعہ کچن میں کھانا بنانے میں مصروف تھی۔ اس اچانک افتاد پر گھبرا گئی۔ فرجاد وحشت کے عالم میں اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتا ہوا کچن سے باہر لے جا رہا تھا۔

"کیا ہو گیا ہے فرجاد! کیوں اس طرح کیوں کر رہے ہیں؟" سمیعہ نے اپنا ہاتھ چھڑانا چاہا۔ مگر فرجاد کی گرفت بہت سخت تھی۔

"پاگل ہو گیا ہوں اس لیے... میں تمہیں ایک منٹ برداشت نہیں کر سکتا۔ نکلو یہاں سے۔" فرجاد نے اسے آگے دھکیلا۔

"مگر کیوں... کیا کیا ہے میں نے۔" سمیعہ چلائی۔

"تمہارے بھائی نے اپنے نفس اور خود غرضی کے آگے کسی چیز کا خیال نہ کیا۔ اپنی برسوں پرانی منگنی بھلا کر میری بہن کو مسترد کر کے وہ اپنی نئی دنیا بسانا چاہتا ہے۔ اور میں اس کی بہن کو یہاں چاہتا رہوں اور محبت سے رکھوں؟" فرجاد غصے سے بھرا ہوا تھا۔

"کیا... ازمیر نے؟ نہیں میرا بھائی ایسا نہیں کر سکتا۔ آپ کو یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔" سمیعہ نے اپنا ہاتھ جھٹکے سے چھڑاتے ہوئے وثوق سے کہا تھا۔

"کاش! تمہارا یقین سچ ہوتا۔ مگر افسوس ایسا نہیں ہے۔ ثاقب ماموں نے امی بابا اور مجھے خود بتایا ہے اور جب وہ سارے رشتے بھلا سکتا ہے تو میں بھی اسے یہ بات سمجھا سکتا ہوں کہ میری بہن بھی کوئی گری پڑی نہیں ہے اور یہ بات اسے اچھی طرح تب سمجھ آئے

گی جب تم رامش کے بغیر اس گھر سے جاؤ گی۔" فرجاد ایک ایک لفظ پر زور دے کر بول رہا تھا۔

"میں صرف ازمیر کی بہن تو نہیں ہوں' آپ کی بیوی بھی ہوں۔ اس گھر سے میرا بھی کوئی رشتہ ہے۔ میں ازمیر کو سمجھاؤں گی..... مجھے یقین ہے' وہ مان جائے گا۔ لیکن پلیز! مجھے جانے کا نہ کہیں۔ میں آپ کے اور رامش کے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

سمیعہ ہچکیوں سے رونے لگی تھی۔ اس کے تو گمان میں بھی نہ تھا کہ ازمیر اس طرح کی کوئی بات کر سکتا ہے۔

"شکر کرو سمیعہ! کہ میں تمہیں صرف اس گھر سے بھیج رہا ہوں..... اپنی زندگی سے خارج نہیں کر رہا ورنہ....." فرجاد نے غصے سے اپنی مٹھیوں کو بھینچا اس کے ماتھے کی رگیں تن گئی تھیں۔ اگلے ہی لمحے وہ پھر اس کا ہاتھ پکڑے دروازے کا رستہ دکھا رہا تھا۔

"بھائی..... یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟" شور کی آواز سن کر کومل بھی اپنے کمرے سے نکل آئی۔

وہ گہری نیند سے جاگ کر آئی تھی۔ بخار کی تمازت سے چہرہ سُرخ اور آنکھوں میں غنودگی تھی۔ پپوٹے بھی بھاری تھے۔ شاید وہ روتی بھی رہی تھی۔

"ملی! ان سے کہو پلیز مجھے معاف کر دیں۔ میں ازمیر کو سمجھاؤں گی' اسے بتاؤں گی کہ اس کی اس حرکت سے کتنی زندگیاں داؤ پر لگ جائیں گی۔ مگر پلیز! ان سے کہو..... مجھے یوں اپنی زندگی سے اور گھر سے بے دخل نہ کریں۔" وہ روتے ہوئے اب کومل کے سامنے ہاتھ جوڑ رہی تھی۔

"بھابھی کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ پلیز میرے سامنے ہاتھ نہ جوڑیں۔ آپ کہیں نہیں جا رہیں..... یہ آپ کا گھر ہے۔ آپ یہیں رہیں گی۔" اس نے سمیعہ کے بندھے ہاتھوں کو کھول کر خود سے اسے قریب کر لیا تھا۔

"تم ہٹ جاؤ ملی..... میں ازمیر کو بتانا چاہتا ہوں کہ وہ جتنا خود کو با اختیار سمجھ رہا ہے..... اتنا ہے نہیں۔" فرجاد کا غصہ کسی طور کم نہ ہو رہا تھا۔

"تو کیا کریں گے آپ؟" وہ زور سے چلائی۔

"شادی دو خاندانوں کا ملاپ بعد میں بنتی ہے پہلے وہ دو انسانوں کے درمیان کا بندھن ہے۔ اور جب فریقین میں سے ایک اس بندھن سے ہی خائف ہو تو پھر ساتھ چلتے رہنے کا فائدہ..... پزل کے بے جان ٹکڑے اپنے مماثل ٹکڑوں کے بغیر ادھورے ہوتے ہیں تو ایک جیتا جاگتا انسان اپنی پسند کے جیون ساتھی کے بغیر کیونکر مکمل ہو سکتا ہے۔" اس نے غصے سے سر جھٹکا۔

میمونہ اور فصیح الدین بھی تھکے تھکے قدموں سے گھر واپس لوٹ آئے تھے۔ بستر پر لیٹے شخص کا وہ محاسبہ کرتے۔ ازمیر تو بینک سے لوٹا ہی نہ تھا کہ وہ اس سے بازپرس کرتے۔ لاؤنج میں زور زور سے بولتی کومل کی آواز کوریڈور کے آخری سرے تک سنائی دے رہی تھی۔

"عبیر آپی یاد ہیں آپ کو..... کوئی نہیں جانتا کہ وہ جل گئیں یا جلا دی گئیں' مگر اس فعل میں ہمارے بزرگ بھی ضرور برابر کے حصے دار ہیں۔

رضی پھپھا کے گھر میں وٹے سٹے میں کیے گئے رشتے جب ناکام ہو گئے تو اس کی سزا میں رضی پھپھا نے عبیر آپی کو بھینٹ چڑھا دیا..... اور وہ بھی ایسی کہ تاوان ادا کر کے ہی نکلیں۔" ملی کے لہجے میں دکھ تھا۔

سب چپ چاپ کھڑے سُنے جا رہے تھے۔ حقیقت بہت تلخ تھی مگر حقیقت حرف بہ حرف سچ بھی تھی۔

"اس کے باوجود ہمارے بزرگوں نے اس واقعے سے کوئی سبق نہ لیا۔ آپ کی شادی' سمیعہ بھابھی سے طے کی تو میرا بھی ازمیر کے ساتھ تعلق جوڑ دیا؟ ایک تو کم سنی کی منگنی پھر ادلے بدلے کی شادی۔

اور اس کے بعد نہ کوئی تجدید' نہ کوئی عہد و پیماں..... اور نہ ہی کوئی یاد دہانی..... ہمارے بزرگ یہ بھول ہی گئے کہ اس رشتے میں بندھے بچے جب زندگی کے سفر کی اڑان بھریں گے تو اپنے کینوس پر اپنی ہی مرضی کے رنگ بھرنے کی کوشش کریں گے' پھر بتائیں مجھے اگر ازمیر نے یہ کوشش کرنی چاہی تو کیا غلط کیا؟" وہ فرجاد کے عین سامنے آکر کھڑی ہو گئی تھی۔

"آپ..... بھائی! آپ ازمیر کی خواہش کی سزا سمیعہ بھابھی کو دیں گے؟ آپ کیا چاہتے ہیں..... اس گھر میں پھر وہ ہی کہانی دہرائی جائے..... پھر کوئی عبیر نفرت کی آگ میں جل جائے۔" آنسو اس کی آنکھوں میں آتے چلے جا رہے تھے۔

اپنی بات کہہ کر وہ رکی نہیں تھی۔ بھاگتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ فرجاد گنگ تھا اور سمیعہ متوحش۔ ہنستی مسکراتی' پل پل سے زندگی کشید کرنے والی کومل کا یہ روپ..... بہت حیران کن تھا۔

"کو..... مل" میمونہ کھڑے قد سے نیچے گری تھیں۔ خوش نصیبی کا تاج جو بزعم خود انہوں نے پچھلے اکیس سالوں سے کومل کے سر پر رکھا ہوا تھا' وہ چشم زدن میں زمیں بوس ہو گیا تھا۔ عبیر کی طرح ان کی کومل بھی ان چاہی نکلی تھی۔ تاریخ واقعی اپنے آپ کو دہراتی ہے' کہنے والے نے سچ ہی کہا تھا۔

"امی....." فرجاد تیزی سے ماں کی طرف بڑھا تھا۔ فصیح الدین نے بھی اس کی تقلید کی۔ سمیعہ بھی قریب آئی تو فرجاد نے سختی سے اسے پیچھے ہٹا دیا۔

"دفع ہو جاؤ یہاں سے..... اگر میری ماں کو کچھ ہوا تو میں ازمیر کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" وہ ماں کو بازوؤں میں بھر کر تیزی سے باہر نکلا۔ وہ اپنی سسکیاں دباتی پیچھے ہٹ گئی۔ یہ وقت ایسا نہ تھا کہ فصیح الدین فرجاد کو کچھ کہتے یا سمجھاتے' وہ دھیرے سے سمیعہ کے سر کو تھپتھپاتے فرجاد کے ساتھ باہر نکل گئے۔ دونوں کا رُخ نزدیکی اسپتال کی طرف تھا۔



"پھوپھی اماں!" وہ فون پر سسکی۔

"کیا بات ہے کومل..... سب ٹھیک ہے ناں؟" پھوپھی اماں کا دل انجانے خدشے سے لرزنے لگا تھا۔

"یہاں کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے پھوپھی اماں! امی ہاسپٹلائز ہیں۔ ان کا بی پی خطرناک حد تک لو ہو گیا تھا۔ ابھی بھی وہ غنودگی میں ہیں۔ انہیں ڈرپ لگی ہوئی ہے۔ ثاقب ماموں کی بھی طبیعت ٹھیک نہیں۔ انہیں مائنر ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔" وہ رو رہی تھی۔

"آپ آجائیں پھوپھی اماں! مجھے' ہم سب کو آپ کی ضرورت ہے۔" رونے سے آواز میں ارتعاش تھا۔

"یا اللہ خیر!" پھوپھی اماں نے بے اختیار ہی دل پر ہاتھ رکھا۔ اتنا کچھ ہو گیا اور انہیں خبر تک نہ ہوئی۔ بلکہ وہ تو کسی خوش خبری کی منتظر تھیں۔

"کومل..... بیٹا! کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں ہوئی گھر میں..... یوں اچانک یہ سب کیسے؟" وہ حد درجہ پریشان ہو گئی تھیں۔

"ازمیر نے مجھ سے شادی سے انکار کر دیا ہے اور غصے میں آکر فرجاد بھائی نے سمیعہ بھابھی کو گھر سے نکال دیا ہے اور رامش کو بھی ان سے چھین لینا چاہتے ہیں۔"

اس نے گویا ان کی سماعتوں پر دھماکا کیا تھا۔ وہ سُن سی ہو کر رہ گئی تھیں۔ ماضی کے دفن کیے پتلے حال کے وجود سے پھر سے زندہ ہو گئے تھے۔ انہیں لگا کہ ازمیر نے رضی کا روپ دھار لیا تھا' فرجاد عدیل بن گیا تھا اور عبیر کی پرچھائیں سمیعہ اور کومل میں منقسم ہو گئی تھی۔

"پھوپھی اماں! یاد ہے آپ نے کہا تھا..... حمزہ بہت سلجھا ہوا اور سمجھ دار ہے۔ اگر ملی کی بات ازمیر سے طے نہ ہوئی ہوتی تو..... اس رشتے پر آپ کو بہت خوشی ہوتی۔" اٹک اٹک کر آخر وہ اپنی بات کہہ ہی چکی تھی بہت کچھ برا ہو چکا تھا مگر بہت کچھ اچھا ہونا ابھی باقی تھا۔

"ہاں میری بچی! یہ سچ ہے..... نزہت تو ابھی بھی تمہیں بہت یاد کرتی ہے۔" پھوپھی اماں گزرے دنوں میں کہی بات کی تائید کر رہی تھیں۔

"آپ ایک بار عبیر آپی کا مقدمہ ہار گئی تھیں پھوپھی اماں! مگر اس بار آپ کو جیتنا ہے۔ میرا مقدمہ' اپنی کومل کا....."

ثاقب ماموں جو ازمیر کی نافرمانی پر دل ہار گئے

میرے ابی، بیٹا جنہیں بیٹی کی [illegible] اور
سمیعہ بھابھی، جو رامش کو یاد کر کے روتی ہیں۔ آپ
نے ان سب کو دکھ سے بچانا ہے۔ اگر آپ کے پاس
ابھی بھی حمزہ صاحب کا پروپوزل ہے۔۔۔ تو میں ان سے
شادی کے لیے تیار ہوں۔"

کتنا مشکل تھا اپنا آپ خود سے پیش کرنا۔ مگر آج یہ
مشکل کام بھی اس نے کر ہی لیا تھا۔

"پلیز پھوپھی اماں! آجائیں۔ آپ چھ سال سے
یہاں نہیں آئیں۔ کیوں کہ چھ سال پہلے یہاں عبیر
آپی کھو گئی تھیں اور اگر آپ اس بار بھی نہ آئیں تو
اس شہر میں آپ کی کومل بھی کھو جائے گی۔"

اپنی بات کہتے ہی اس نے کال منقطع کر دی تھی۔
ضبط کا بندھن ٹوٹنے کے نزدیک تھا۔ بہت برداشت
کے باوجود بھی کچھ آنسو پلکوں کی باڑھ پھلانگ کر گالوں
پر پھسلنے لگے تھے۔ جنہیں اس نے بے دردی سے
اپنے دوپٹے کے کونے سے رگڑ ڈالا تھا۔ وہ ایک بار پھر
موبائل کے نمبر پریس کر رہی تھی۔

ایک بار حمزہ نے اسے اپنا کارڈ دیتے ہوئے کہا تھا کہ
اگر مدد کی ضرورت ہو تو بلا جھجک وہ اس سے کہہ سکتی
ہے۔ آج وہ اسے آزمانا چاہتی تھی۔

وہ فون کر کے پلٹی تو ٹھٹک کر رہ گئی۔ اس کے کمرے
کے عین وسط میں نتاشا کھڑی تھی۔ مہر بہ لب۔ آنسو
اس کے گالوں پر لکیر بنائے جا رہے تھے اور لکیر کا گہرا
پن اس کمرے میں اس کے کافی دیر سے موجود ہونے
کی گواہی دے رہا تھا۔

"ملی۔" وہ بے اختیار اس سے لپٹ گئی۔

"تاشی!" کومل بھی رونے لگی تھی۔

✡ ✡ ✡

چھ سال بعد بالآخر خالدہ اس شہر میں آ ہی گئیں۔

"ثاقب بھائی۔۔۔ میں سمیعہ کو لینے آئی ہوں۔
رامش کا ماں کے بنا رو رو کر برا حال ہے۔" وہ فصیح
الدین اور میمونہ کے ساتھ ثاقب مرتضیٰ اور فیروزہ
سے ملنے آئی تھیں۔

"مگر خالدہ [illegible] فرجاد [illegible]" ثاقب مرتضیٰ اپنی بات بھی
مکمل نہ کر سکے تھے۔

"مجھ سے بہتر کون جان سکتا ہے ثاقب بھائی کہ
اولاد کی خوشی اور اولاد کا دکھ کیا ہوتا ہے؟ یہ ہمارے
بچوں کی غلطیاں نہیں ہیں، بلکہ شاید ہماری غلطیاں
ہیں۔" خالدہ آزردہ تھیں۔

آپ کے خیال میں یہ زیادہ بہتر ہے کہ ازمیر کی کومل
سے شادی ہو جائے اور ان کے درمیان شخصیت کا
تضاد، دونوں کو مختلف راستوں پر موڑ دے؟ یا انہیں
ان کی ہی پسند کا جیون ساتھی مل جائے؟" خالدہ نے
اپنی بات مکمل کر کے باری باری سب کو دیکھا۔

خالدہ کے آنے سے میمونہ کو بہت ڈھارس ملی تھی۔
انہیں لگا تھا اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔ سمیعہ اور
فرجاد، ازمیر اور کومل۔۔۔ یہ تعلق یوں ہی جڑا رہے گا
مگر خالدہ کے آخری دو جملوں نے جیسے انہیں پھر سے
ماضی کے حصار میں لا کھڑا کیا تھا۔

"خالدہ! خاندان میں سب لوگ یہ بات جانتے ہیں
کہ بچپن سے ہی ازمیر اور کومل کی بات طے ہے۔ اب
ازمیر کا یوں اچانک انکار اور سونیا سے شادی پر اصرار
۔۔۔ کیا کومل کی ذات پر سوالیہ نشان نہ بنا دے گا؟
میرے لیے جیسی نتاشا ہے، ویسی ہی کومل۔۔۔ میں ازمیر
کی بات مان کر کومل کے ساتھ یہ زیادتی نہیں کر سکتا
اور سمیعہ۔۔۔ اس کا کیا قصور ہے؟ جو وہ ازمیر کے کیے
کی سزا بھگتے۔ اس کا رو رو کر برا حال ہے، اور فرجاد کی
ایک ہی ضد ہے کہ ازمیر ہی اس سب کا قصور وار
ہے۔" ثاقب مرتضیٰ کا لہجہ اندرونی درد کا غماز تھا۔

"بھائی صاحب! کومل کے لیے آپ میں سے کوئی
فکر مند نہ ہو۔ میں اپنی بہت اچھی ہمسائی کے بیٹے کا
رشتہ لے کر آئی ہوں۔" وہ آہستہ آہستہ سب بتانے
لگیں۔

"فصیح بھائی! وہ لوگ بہت چاہت سے کومل کو مانگ
رہے ہیں۔ اسے بہت چاؤ سے رکھیں گے۔ میں چاہتی
ہوں آپ اس پر غور کریں۔" فصیح الدین غور سے ان
کی بات سن رہے تھے۔

پوری گفتگو میں اب زبان کھولی تھی۔

"فیروزہ۔۔۔ کومل کی آپ فکر نہ کریں۔ آپ سب
سے یہ بات کہنے سے پہلے میں نے اس کی مرضی معلوم
کی ہے۔ اسے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ وہ نزہت
اور حمزہ سے ملی ہوئی ہے۔ بلکہ میں تو کومل کی شکر گزار
ہوں اگر وہ مجھے نہ بتاتی تو مجھے کبھی پتا نہ چلتا کہ ان
دونوں گھروں میں کیا طوفان آچکا ہے؟" ان کے کہنے پر
فیروزہ نے انہیں چونک کر دیکھا تھا۔

ازمیر نے جس بنیاد پر کومل کو مسترد کیا تھا۔ وہ بنیاد
کتنی چھوٹی تھی اور کومل اپنے ایک چھوٹے سے عمل
سے خود کو کتنا بلند ثابت کر گئی تھی۔ کمرے میں موجود
ہر شخص گہری سوچ میں غلطاں تھا اور خاموشی اکثر نیم
رضامندی ہوتی ہے۔

✡ ✡ ✡

"بیٹا! عورت کے بہت روپ ہوتے ہیں۔ وہ ماں
بھی ہوتی ہے، بہن بھی بیٹی بھی اور بیوی بھی۔۔۔ مگر ہر
رشتے میں ایک قدر ہمیشہ مشترک رہتی ہے اور وہ ہے
ایثار۔ عورت ہر روپ میں ایثار کرتی ہے۔ مرد ہر بار
محبت کرتا ہے اور عورت زندگی میں صرف ایک بار
محبت کرتی ہے۔ مرد اظہار کر کے آگے بڑھ جاتا ہے،
عورت ریشم جیسے بولوں میں الجھی رہتی ہے۔

اللہ نے مرد کو اس کا کفیل بنایا ہے مگر مرد کو یہ حق
نہیں دیا کہ وہ اس کی حق تلفی کرے اور زندگی کی
خوشیاں اس سے چھین لے۔ اس لیے فرجاد! تمہیں
چاہیے کہ جس طرح تم نے سب کے سامنے سمیعہ
کی بے عزتی کی تھی۔ اسی طرح اب سب کے سامنے
سمیعہ سے اپنے رویے کی معافی مانگو۔" پھوپھی اماں
نے فرجاد کو مخاطب کیا جس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔

"اور ازمیر تم۔۔۔ تمہارا انتخاب غلط نہ تھا اور نہ ہی
تمہاری خواہش بے جا تھی مگر تمہارا احتجاج ضرور غلط
تھا۔ محبتوں کو کیسے سمیٹ کر رکھنا پڑتا ہے۔ یہ تمہیں
کومل سے سیکھنا چاہیے۔"

پھوپھی اماں اس وقت فرجاد کے کمرے میں بیٹھی فرجاد اور ازمیر' دونوں سے مخاطب تھیں۔ انہوں نے ازمیر کو یہاں اس لیے بلایا تھا کیونکہ وہ ازمیر کی فرجاد سے صلح کرانا چاہتی تھیں۔ دونوں اپنی اپنی جگہ نادم اور شرمندہ تھے اور پھوپھی اماں کے لیے یہی کافی تھا۔

کومل کو یقین تھا کہ پھوپھی اماں اس کا مقدمہ جیت جائیں گی اور اس کا یہ یقین کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا۔ وہ نہ صرف سمیعہ کو پھر سے محبت کے ساتھ واپس لے آئی تھیں' بلکہ ثاقب مرتضیٰ کو راضی کر کے ازمیر کا رشتہ بھی سونیا سے طے کروا دیا تھا۔

سونیا اچھی لڑکی تھی۔ انہیں پہلی نظر میں پسند آگئی تھی اور باقی سب کو بھی سونیا بہت اچھی لگی تھی۔

نزہت آرا نے بہت محبت کے ساتھ حمزہ کے لیے فصیح الدین سے کومل کا ہاتھ مانگا تھا اور فصیح الدین کے پاس انکار کا کوئی جواز ہی نہ تھا۔

نزہت آرا خود تو سفر کرنے کی پوزیشن میں نہ تھیں مگر انہوں نے حمزہ کو ضرور اسلام آباد بھیج دیا تھا۔ حمزہ انہیں اکیلا ارسل کے ساتھ چھوڑ کر آنے میں متامل تھا مگر پیچھے روحان تھا۔ جس نے اسے بھرپور یقین دلایا تھا۔

"میں آپ کی غیر موجودگی میں اپنی والدہ اور آپ کی والدہ بشمول آپ کے بھتیجے کا دل سے خیال رکھوں گا بس بدلے میں آپ کو مس نتاشا سے میرا حال دل کہنا ہے۔" اور جواباً" حمزہ بہت دیر تک ہنستا رہا تھا۔

اسلام آباد میں سب حمزہ سے مل کر بہت خوش تھے۔ پھوپھی اماں نے اس کے بارے میں جتنا بتایا تھا۔ وہ اس سے کہیں زیادہ مہذب اور سلجھا ہوا نظر آیا۔

فصیح الدین اور میمونہ دونوں خالدہ کے بے حد شکر گزار تھے اور جواباً" خالدہ نے ان سے یہ وعدہ مانگ لیا تھا کہ کومل کی منگنی اور شادی ان ہی کے گھر سے ہو گی۔ فصیح الدین اور میمونہ کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

عبیر کی موت کے بعد خالدہ پہلی بار اپنے اصلی رنگ میں لوٹ کر آئی تھیں اور فصیح الدین چاہتے تھے کہ یہ دن ہمیشہ کے لیے خالدہ کی زندگی میں ٹھہر جائے۔



"میں نے ایک فون کیا اور آپ میری مدد کے لیے چلے آئے۔ اب میں سوچتی ہوں...... شاید میں نے جلد بازی کی...... مجھے پوچھ لینا چاہیے تھا کہ آپ کی کیا مرضی ہے؟"

لان میں نصب سنگی نشست پر دو سائے ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر بیٹھے تھے' مگر ایک دوسرے کی طرف بھرپور متوجہ تھے۔ چاند کا فسوں اپنے جوبن پر تھا اور اس کی سفید روشنی پورے ماحول میں جذب ہوتی جا رہی تھی۔

"اگر آپ مجھے فون نہ کرتیں...... تو شاید مجھے زندگی بھر افسوس رہتا۔"

"پھر بھی بہت کچھ ہے...... جو آپ میرے بارے میں نہیں جانتے۔"

"جو میں جانتا ہوں مس کومل...... وہ آپ کے اس بہت کچھ سے کہیں زیادہ ہے۔ جو لڑکی ایک زخمی بچے کو بچانے کے لیے اپنی ہر ممکن کوشش کرے۔ اپنے بھتیجے کے لیے بنایا سوئیٹر اس بچے کو دے دے اور پھر اس بچے کی خواہش پر وہ اس کے لیے ماما جیسی بن جائے۔ ایسی لڑکی میں کبھی خود نہ ڈھونڈ پاتا اگر اللہ مجھے آپ سے نہ ملاتا۔

میں سمجھتا تھا...... میں زندگی میں اک بار محبت کر چکا...... اب شاید کسی کے لیے اپنے دل کے دروازے نہ کھول پاؤں گا...... مگر آپ۔" حمزہ نے جملہ ادھورا چھوڑا اور بھرپور نظر اس کے چہرے پر ڈالی۔ کومل کو خاموشی کا یہ لمحہ ٹھہرا ہوا سا لگنے لگا۔

"مگر آپ جتنی بار بھی میری راہ میں آئیں' ہر بار میرے دل کا تھوڑا تھوڑا حصہ اپنے نام کر گئیں۔"

اتنا خوب صورت اظہار محبت کومل چاہ کر بھی اسے دیکھنے سے خود کو نہ روک سکی تھی۔

"بلکہ احسان مند تو میں ہوں آپ کا کہ آپ میرے بارے میں کچھ بھی نہ جانتی تھیں' پھر بھی آپ نے مجھے پکارا۔" اب کے وہ ہی سوال' حمزہ نے اس کی جانب لوٹا دیا تھا۔

"جو شخص محبت میں بے وفائی کا زخم کھائے اور پھر بھی زندگی سے مایوس نہ ہو...... اپنا شکست خوردہ دل سب سے چھپا کر معذور ماں اور یتیم بھتیجے کو ہی اپنی ذات کا محور بنا لے' ایسے پُرخلوص شخص کے ماضی کو کریدنے کے بجائے' میں اس کے ساتھ حال میں جڑے رہنے کو زیادہ ترجیح دوں گی۔" کومل نے اس کے ہی انداز میں اس کے سوال کا جواب لوٹا دیا تھا۔

"لوگ کہتے ہیں مرد روتے ہوئے اچھے نہیں لگتے۔ پر زندگی میں بارہا ایسے موقع آئے کہ دل چاہا پھوٹ پھوٹ کر روؤں...... اور رویا بھی...... جب ساری محبتیں پاس تھیں تو خود پر رشک آتا تھا۔ اسامہ' رومیلہ بھابھی' زویا' میں' ممی اور ارسل شاید جنت ایسی ہی ہوتی ہو گی...... مگر جب ایک ایک کر کے ساری محبتیں روٹھ گئیں' تب میں اپنے کمرے میں بستر میں منہ چھپا کر بہت رویا۔ اور شاید پہلی بار خدا سے میں نے شکوہ کیا تھا کہ میں ہی کیوں؟ موت برحق ہے'...... مگر زویا' وہ کیوں چلی گئی...... بے وفائی کا دکھ میرے ہی حصے میں کیوں آیا؟" بولتے بولتے حمزہ خاموش ہو گیا تھا اس کی آنکھوں میں نمی در آئی تھی۔

"بات یہ نہیں ہے حمزہ! کہ آپ نے زویا کو کھویا اور ازمیر نے مجھے مسترد کیا۔ بات اصل میں یہ ہے کہ وہ ہم دونوں کے لیے نہ تھے۔ بلکہ ہم...... ایک دوسرے کے لیے تھے۔ یہ ازل سے طے تھا تو پھر زمین پر کیونکر یہ ہو سکتا تھا۔ بس ملانے والے کے بھید نوالے...... وہ کن کن راستوں سے انسان کو گزار کر خود تک لاتا ہے اور اپنے ہونے کا یقین دلاتا ہے۔" وہ بول رہی تھی اور حمزہ اسے دیکھے جا رہا تھا۔ نظر کا ارتکاز اتنا گہرا تھا کہ کومل بولتے بولتے چپ ہو گئی۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟" آخر اسے حمزہ کو ٹوکنا ہی پڑا۔

"تمہیں اتنی اچھی باتیں کس نے بتائیں؟" حمزہ حیران تھا۔ اس نہج پر تو اس نے بھی کبھی سوچا نہ تھا۔ وہ آپ سے یکدم تم پر آگیا تھا۔

"پھوپھی اماں کی سنگت نے بہت کچھ سکھا دیا۔ جو ہمارے ساتھ نہیں چلے حمزہ! مجھے نہیں معلوم اگر وہ ہم سفر بنتے تو زندگی کا سفر کیسا ہوتا۔ مگر اتنا یقین ہے کہ جو سفر ہم ایک دوسرے کی سنگت میں بسر کریں گے' وہ یقیناً" بہترین ہو گا۔" کومل نے مسکرا کر کہا۔

حمزہ نے مسکرا کر سر ہلا دیا۔ پزل پہلے ادھورا تھا۔ اب مکمل ہو گیا تھا۔ دونوں دور سے دیکھنے پر محبت کے فریم میں جڑے لگ رہے تھے۔

ٹیرس کے ستون سے ٹیک لگائے ازمیر پرابروالے لان کا یہ سارا منظر بخوبی دیکھ رہا تھا۔ اس کی کوشش شعوری نہ تھی مگر وہ اس منظر سے نظریں نہ ہٹا پایا تھا۔ محبت اس نے سونیا سے کی تھی' مگر محبت کا سکون کومل کے چہرے پر پھیلا ہوا تھا...... شاید اس لیے کہ اس نے صرف اپنا سوچا تھا اور کومل نے سب کا خیال رکھا تھا۔

اسے کومل بری نہ لگتی تھی مگر جب سونیا ملی تو کومل بچپن میں بندھی صرف ایک زنجیر محسوس ہونے لگی تھی۔ محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے۔ وہ یہی اصول اپنائے اپنے ماں باپ کے سامنے تن گیا تھا اور کومل نے اپنا ہر معاملہ اللہ کو سونپ دیا تھا۔ اپنی ذات پر اس نے اپنے خون کے رشتوں کو ترجیح دی تھی۔ اس لیے بلامقابلہ جیت گئی تھی۔ اور وہ جو جیتنے کے لیے میدان میں اترا تھا۔ اسے لگا وہ جیت کر بھی ہار گیا۔

واپسی کے لیے سیڑھیاں اترتے ہوئے اس کا انداز ہارے ہوئے جواری کا سا تھا۔



رخسانہ نگار عدنان

ایک گھڑی سسرال

عدیل اور فوزیہ نسیم بیگم کے بچے ہیں۔ بشریٰ ان کی بہو ہے اور ذکیہ بیگم کی بیٹی۔ عمران بشریٰ کا بھائی ہے۔ مثال ذکیہ بیگم کی نواسی اور نسیم بیگم کی پوتی ہے۔ بشریٰ اور نسیم بیگم میں روایتی ساس بہو کا تعلق ہے۔ نسیم بیگم مصلحتاً "بیٹا بہو" سے لگاوٹ دکھاتی ہیں۔ دوسری طرف ذکیہ بیگم کا کہنا ہے۔ ان کی بیٹی بشریٰ کو سسرال میں بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ ذکیہ بیگم اپنے بیٹے عمران کے لیے بھی لڑکیاں دیکھ رہی ہیں۔ پانچ سال کی مسلسل کوششوں کے بعد بشریٰ کی نند فوزیہ کا بالآخر ایک جگہ رشتہ طے پا جاتا ہے۔ نکاح والے روز بشریٰ دولہا ظہیر کو دیکھ کر چونک جاتی ہے۔

عدیل سے شادی سے قبل ظہیر کا بشریٰ کے لیے بھی رشتہ آیا تھا مگر بات نہ بن سکی تھی۔ نکاح والے دن زاہدہ اور ذکیہ بیگم بھی ایک دوسرے کو پہچان لیتی ہیں۔ بشریٰ اپنی ماں سے یہ بات چھپانے کے لیے کہتی ہے مگر عدیل کو پتا چل جاتا ہے۔ وہ ناراض ہوتا ہے مگر فوزیہ اور نسیم بیگم کو بتانے سے منع کر دیتا ہے۔ بشریٰ اور عدیل ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد جاتے ہیں۔ وہاں انہیں پتا چلتا ہے کہ بشریٰ کے ہاں سات سال بعد پھر خوش خبری ہے۔

عفان اور عاصمہ اپنے تین بچوں اور والد کے ساتھ کرائے کے گھر میں رہتے ہیں۔ عفان کے والد فاروق صاحب سرکاری نوکری سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ گریجویٹی اور گاؤں کی زمین فروخت کر کے وہ اپنا گھر خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ڈیڑھ کروڑ میں زمین کا سودا کر کے وہ عفان کے ساتھ خوشی خوشی شہر آ رہے ہیں۔ عاصمہ کو فون کے ذریعے کوئی اطلاع ملتی ہے جسے سن کر وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔

تیسری قسط



"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں زاہدہ بہن!" نسیم بیگم کے تو جیسے ہاتھوں کے طوطے ہی اڑ گئے۔
کتنی دیر تو وہ کچھ بول ہی نہیں سکی تھیں حواس جیسے گم سے ہو کر رہ گئے تھے۔
یہ جملہ تو بہ وقت ان کے منہ سے اس وقت نکلا جب زبیدہ نے پھر سے اپنی بات دہرائی تھی۔
نسیم بیگم کو خود بھی اپنی آواز کی کپکپاہٹ واضح طور پر محسوس ہوئی تھی۔
دوسری طرف سجے سنورے حلیے میں ہلکا سا میک اپ کیے موو کلر کا سوٹ پہنے فوزیہ چائے کے ساتھ ڈھیروں لوازمات کی ٹرالی لیے چلی آرہی تھی۔ماں کی کانپتی آواز سن کر جیسے وہیں گر سی گئی۔
"نسیم بہن! اتنی پریشان کیوں ہو رہی ہیں آپ۔ خدانخواستہ میں نے کچھ ایسی غلط بات تو نہیں بول دی۔" زبیدہ نے نسیم کی اڑی رنگت دیکھی تو گویا انہیں دلاسا دینے کو کہا۔
ان کا کہنے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ اس طرح کی معمولی اور عام باتیں عموماً" کرتی ہی رہتی ہیں۔
"میں اصل میں..... میں سمجھ نہیں سکی کہ آپ کس لیے مطلب..... کیوں یہ بات کر رہی ہیں۔" نسیم بیگم پسینے میں بھیگتی ہتھیلیاں آپس میں جکڑ کر بے ربطگی سے بولیں۔ ایسا جملہ جس کا کوئی بھی مطلب نہیں تھا۔
"کیوں..... بھئی ظاہر ہے اب ہم رشتہ دار ہیں۔ دکھ کی سکھ کی ہر بات تو ہم ایک دوسرے سے ہی کریں گے نا اب خدانخواستہ یہ بات میں جا کر اپنے محلے داروں سے یا تمہارے رشتہ داروں سے تو نہیں کر سکتی۔" زاہدہ بیگم نے اپنائیت کا فلسفہ پیش کر دیا۔
اور نسیم بیگم نے کچھ ایسی بے چارگی سے انہیں دیکھا جیسے کٹنے کو تیار بکری قصائی کی چھری کے نیچے پڑی ہو اور وہ قصائی اس سے پیار جتانے والی اپنائیت کی کوئی بات کرے۔
"مجھ سے تو ظہیر نے کہا تھا۔ امی جا کر کرنے والی تو بات ہی نہیں آپ خالہ جان کو بس فون کر دیں۔ عدیل بھائی کے ہاتھوں خود ہی رقم بھجوا دیں گی۔" زاہدہ نے گویا ایک پھلجڑی چھوڑی۔
اب کے نسیم بیگم کو بے چارگی اور بے بسی کے بجائے شدید غصہ کسی ابال کی طرح اپنی شریانوں میں دوڑتا محسوس ہوا۔
"فون کی بھی کیا ضرورت تھی بہن؟ کسی راہ چلتے ہرکارے سے کہلوا بھیجتیں۔ ہم تو گویا رقم ہتھیلی پر لیے دروازے میں کھڑے تھے اسی کے ہاتھ روانہ کر دیتے۔" وہ زیادہ دیر تک خوف' مروت اور لحاظ کا بوجھ اٹھا نہیں سکیں۔ تڑخ کر بول ہی اٹھیں۔
زاہدہ نے نسیم کے بدلے انداز پر ذرا سا ٹھٹک کر انہیں دیکھا۔
"ہاں تو اپنے ہی اپنوں کے کام آتے ہیں۔ ایسا ہی تو ہوتا ہے۔" وہ پھر بھی ڈھٹائی سے بولیں۔
اور نسیم بیگم کا جی چاہا' اس عورت کو کرسی سمیت اٹھا کر گلی کیا بلکہ مین روڈ پر ڈال آئیں۔ زمانے بھر کی ٹریفک اس عورت کا قیمہ بنا جاتی تو بھی انہیں ٹھنڈ نہ پڑتی۔
"ایسا نہیں ہوتا بہن' معاف کرنا۔" اب کے انہوں نے لحاظ' مروت' خوش اخلاقی سب کو اٹھا کر طاق پر رکھا اور بے لحاظ لہجے میں بولیں۔ زاہدہ تو لمحہ بھر کو کچھ بول نہ سکیں بس نسیم کے چہرے کی طرف دیکھ کر رہ گئیں۔
"میں سمجھی نہیں آپ کیا کہنا چاہتی ہو نسیم بہن؟" اب کے لہجے میں زمانے بھر کی معصومیت اور شرافت سمو کر نرمی سے بولیں مگر نسیم بیگم دوٹوک بات کرنے کا فیصلہ کر چکی تھیں۔
"ایسی کوئی مشکل بات نہیں بولی میں نے آپ کی طرح۔" وہی کٹھور لہجہ اور بدلی ہوئی نظریں۔
"یعنی میں کیا سمجھوں..... اس بات کا مطلب؟" زاہدہ کے لہجے میں اب کے کچھ دھمکی سی تھی۔
نسیم بیگم کی نظریں ایک دم سامنے دروازے کے باہر تیار حلیے میں کھڑی فوزیہ پر پڑیں جو ٹرالی کے ساتھ یوں بے بسی کی تصویر بن کھڑی تھی کہ نسیم بیگم اگلا جملہ ہی بولنا بھول گئیں۔
ان کی نظروں کے سامنے وہ منظر آگیا جب فوزیہ' ظہیر کی دلہن بنی نکاح نامے پر دستخط کر رہی تھی۔
بے اختیار ان کا جی چاہا' دھاڑیں مار کر رونے لگیں یا کہیں سے گزرے وقت کی لگامیں ان کے ہاتھ آجائیں تو وہ اس ظالم وقت کو واپس لے آئیں..... مگر اب جیسے ان کے ہاتھوں میں کچھ تھا ہی نہیں۔ نہ گزرے وقت کی لگامیں نہ آنے والے وقت کی شقاوت۔
انہیں بہت بڑا اور صاف صاف نظر آنے لگا تھا۔
"اتنی بڑی رقم..... بیس لاکھ کم تو نہیں ہوتے بہن اور ہم تو سفید پوش لوگ ہیں' جن کا اللہ نے بھرم رکھا ہوا ہے۔ میں بیوہ عورت' جو کچھ بھی ہے میرا بیٹا..... اللہ اس کی لمبی عمر کرے' بال بچے دار ہے۔ ہم ماں بیٹی کا بوجھ بھی اسی نے اٹھا رکھا ہے تو ایسے میں یہ رقم۔ ہم..... میں تو بالکل بھی انتظام نہیں کر سکتی۔"
نسیم بیگم کو پتا بھی نہیں چلا۔ کب ان کی آواز آنسوؤں میں بھیگتی چلی گئی۔ لاکھ ضبط کرنے کی کوشش کی کہ خود کو کمزور ظاہر نہیں کرنا مگر بے بسی' بے کسی کی انتہا تھی۔ آنسو بہنے لگے۔
زاہدہ بیگم نے ایک ملامتی نظر اس آنسو بہاتی ماں پر ڈالی۔
"سنا ہے. بہن! بلکہ بیتی ہے یہ جگ بیتی نہیں آپ بیتی ہے کہ ہمارے معاشرے میں بیٹیوں کی مائیں ان کے پیدا ہوتے ہی جوڑ توڑ شروع کر دیتی ہیں۔ جوڑا' کپڑا' بستر' برتن' روپیہ پیسہ' سونا چاندی جو جڑ سکے۔ خود میں نے تین بیٹیاں ایسے ہی بیاہی ہیں۔" زاہدہ تو جیسے بجلی کے ریڈیو کی طرح چل پڑیں۔
"وہ بات ٹھیک ہے مگر اتنی رقم....." نسیم بیگم نے جب اپنے آنسو بے اثر دیکھے تو زور سے آنکھیں رگڑ کر دلیل سے بات کرنے کی کوشش کی۔
"خود میں نے..... تیسری والی بیٹی بیاہی..... بیاہی کیا' بات ہی طے کی تھی کہ داماد بے روزگار بیٹھ گیا گھر میں..... اپنا زیور بیچ کر پہلے اسے کاروبار کرایا جب اس کا کاروبار جم گیا تو پھر بیٹی کو اس کے گھر رخصت کیا اور یہ نہیں کہ نوید کو گھر والوں سے توڑ لیا۔ خیر سے ابھی تک میری تینوں بیٹیاں اپنی ساس نندوں کے ساتھ رہ رہی ہیں۔ بہن! میری تربیت ایسی نہیں کہ بچیاں جاتے ہی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ سے بنا کر بیٹھنے لگیں۔" وہ تو جیسے جلال میں آگئیں فوزیہ وہ تو جیسے کھڑے کھڑے تھک گئی۔
اندر آکر آہستگی سے سلام کر کے چائے کی ٹرالی ان کے آگے کھسکا کر ماں کی طرف دیکھنے لگی۔ ماں نے بھی آنکھوں سے فی الحال ٹلنے کا اشارہ دیا۔
"چولہے پر دودھ رکھا ہے ابلنے کو' دیکھ کر آتی ہوں۔" کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔ اگرچہ زاہدہ کو یہ بات بھی بری لگی تھی مگر فی الحال وہ اس سے بڑی اور اہم بات سے دو دو ہاتھ کر رہی تھی سو جانے دیا۔
"آپ کی سب باتیں ٹھیک سولہ آنے بہن..... مگر میں۔ ہم۔ اتنی بڑی رقم یہ تو ہمارے لیے ناممکن ہے۔"
رک رک کر نسیم بیگم نے دوٹوک انداز میں نہ سہی' معذرت خواہانہ انداز میں کہہ ہی ڈالا کیونکہ وہ جانتی تھیں عدیل تو یہ سن کر ہی بھڑک اٹھے گا۔
زاہدہ کو جیسے کسی نے کھینچ کر پتھر مار دیا ہو۔
تڑپ کر نسیم کی طرف دیکھا۔
"آپ جانتی ہو نسیم بہن! جو کہہ رہی ہو آپ؟" وہ صاف دھمکانے والے انداز میں بولیں۔
"میں نے سوچ سمجھ کر ہی آپ سے یہ بات کی ہے. بہن!" نسیم نرمی سے بولیں۔
"اور میں نے تو جیسے یوں ہی بول دیا سب۔" وہ تپ کر بولیں۔

تھیں۔
اور نسیم بیگم کو ان کی سدا سہاگن 'والی دعا ایک خوفناک دھمکی لگ رہی تھی مگر وہ کچھ بول نہیں پا رہی تھیں جیسے ان کی زبان پتھر کی ہو گئی ہو۔



"کیا بات ہے عدیل! آگے کس بات کا رش ہے' سڑک بلاک ہے کیا؟" بشریٰ نے آکر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے عدیل سے بے چینی اور تھکن بھرے لہجے میں پوچھا۔ وہ لوگ مین روڈ پر تھے اور آگے لوگوں کا ہجوم ہی ہجوم تھا۔ گاڑی آگے نہیں جا سکتی تھی۔
عدیل نے کچھ دیر انتظار کیا پھر آگے جا کر پتا کر کے آیا تھا۔
"بہت ظلم ہو رہا ہے اس دنیا میں۔ بہت ظلم۔" عدیل کے چہرے پہ خوف دکھ اور وحشت سی تھی۔
"کیا ہوا... خیریت تو ہے نا!" بشریٰ گھبرا کر بولی۔
"راستہ فی الحال بلاک ہے۔ یہ دائیں طرف سے ایک چھوٹی ذیلی سڑک جاتی ہے۔ ہمیں وہاں سے جانا پڑے گا آگے۔" عدیل کے چہرے پہ بہت سنجیدگی تھی جیسے وہ مزید بات کرنا نہیں چاہتا۔
"عدیل پلیز۔ بتایئے نا میرا دل گھبرا رہا ہے۔" وہ اس کی مسلسل چپ پر بولی۔ اسے واقعی گھبراہٹ سی ہونے لگی تھی۔ عدیل ایسے کبھی چپ نہیں ہوا تھا دونوں جب ساتھ ہوتے تھے تو ان سے خاموش رہا ہی نہیں جاتا تھا۔
"قتل... دو قتل ہوئے ہیں۔" وہ بہت مشکل سے بولا تھا۔
"کیا؟" بشریٰ کا دل جیسے بند ہونے لگا' وہ مڑ کر خوف زدہ نظروں سے دیکھنے لگی۔
"اسی لیے میں تمہیں نہیں بتا رہا تھا۔ تم پلیز پریشان نہیں ہو۔" عدیل اس کی اڑی رنگت دیکھ کر بولا۔
"کک... کیسے ہوئے قتل؟" اس کی رنگت زرد ہوتی جا رہی تھی۔
"ڈکیتی کا معاملہ ہے۔ دونوں شاید باپ بیٹے تھے۔ رقم تھی کافی بڑی ان کے پاس اس کے لیے۔ رقم بھی لے گئے اور دونوں کو۔"
وہ بولتے ہوئے چپ ہو گیا۔ مزید اس سے بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔
"ابھی تو پولیس آئی ہے پوسٹ مارٹم ہو گا۔ پتا نہیں ان کے گھر والوں کو کسی نے اطلاع دی یا نہیں۔ کیا بیتے گی ان پر جب اچانک خبر... کتنے ظالم ہوتے ہیں یہ لوگ۔" عدیل کی آواز بھرا گئی اور بشریٰ تو جیسے ساکت سی ہو گئی تھی۔



دل کبھی جھوٹی گواہی نہیں دیتے۔
اور عاصمہ کا دل... جس بے ربطگی سے ان چھتیس گھنٹوں میں دھڑکا تھا جب عثمان اس سے مل کر دور جا رہا تھا اور اس کی آخری اطلاع آنے تک وہ جس بے کلی کا شکار رہی تھی' چاہتی بھی تو اسے لفظوں میں بیان نہیں کر سکتی تھی۔
زندگی میں پہلی بار دل کی معتبر گواہی... حوادث کے آخری پہر جب وہ تن تنہا سرخ آندھی کے بیچ صحن میں جیسے بیٹھی تھی... کاش وہ گواہی جھوٹی ہوتی۔
اس کے گرد بیٹھی عورتیں رو رہی تھیں۔

مگر عاصمہ تو جیسے ہوش و خرد سے بیگانہ تھی۔
اس کے دل و دماغ میں وہ رات کا آخری پہر ٹھہر سا گیا تھا۔
فاروق اور عفان کے آنے میں کتنے گھنٹے ہیں' وہ بار بار وقفے وقفے سے انگلیوں کی پوروں پر گننے لگتی۔
"مما...... مما دیکھیں نا۔ باپ اور دادا سب کہہ رہے ہیں' وہ ہمیں ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔" واثق جوان کا سب سے سمجھ دار بیٹا تھا اس وقت جیسے کچھ بھی نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ کبھی پتھر کا بت بنا ماں کی طرف دیکھتا اور کبھی روتے دھوتے ہجوم کی طرف۔
اور اس کی نگاہیں ان دو مردہ جسموں پر آکر پتھرا جاتیں جو کل تک ان کا سب کچھ تھے۔ ان کی آس۔ ان کی امید' ان کا انتظار۔
اردگرد کے ہمسائیوں اور کچھ دور پرے کے رشتہ داروں نے رسمی انداز میں پولیس کی کارروائی نپٹائی اور دونوں کو آخری سفر پر روانہ کرنے کی تیاریاں شروع کردیں۔
عاصمہ کی بیگانگی ہنوز قائم تھی۔
"اسے رونا چاہیے...... ان دونوں کے ہمیشہ کے لیے چلے جانے کی خبر اسے ہونا چاہیے' ہاجرہ خالہ اسے رلائیں۔" مالک مکان کا بیٹا ہمدردانہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا جو چارپائی کی پٹی سے گال ٹکائے بے سدھ تھی۔
چھوٹی وردہ تو ساتھ والی ہمسائی کی گود میں تھی۔
تینوں بڑے بچے ماں کے ساتھ لگے بیٹھے تھے۔
آخری وقت آگیا۔ عاصمہ کی آنکھوں میں آنسو نہیں آسکے۔
کچھ دیر کے لیے عاصمہ کے آگے دونوں کے چہروں سے کفن ہٹا کر دکھائے گئے کہ شاید اس پر کچھ اثر ہو سکے مگر وہ اسی طرح بے حس حرکت بیٹھی رہی۔
جیسے ہی دونوں کو کلمہ پڑھتے ہوئے لے جایا جانے لگا تو ساتھ کی ہمسائی نے زور زور سے عاصمہ کو جھنجھوڑ ڈالا۔
"عفان بھائی جا رہے ہیں۔ خالو جی کے ساتھ عاصمہ...... ! تمہیں اور بچوں کو اکیلا چھوڑ کر...... عاصمہ! دیکھو ان دونوں کی سنگ دلی...... انہوں نے تمہارا اور بچوں کا ذرا خیال نہیں کیا۔"
اور عاصمہ کو جیسے کسی نے پتھر کھینچ مارا۔
وہ دھاڑیں مار کر ان کے مردہ جسموں سے لپٹ کر ایسے روئی کہ پتھروں کے بھی آنسو نکل پڑے۔ کم از کم اس نے یہ نہیں سوچا تھا۔
وہ تو بڑی صابر شاکر بہت مطمئن رہنے والی روح تھی۔
اس سے یہ کڑا امتحان کیوں لیا گیا۔
عفان اور فاروق کو لے گئے اور عاصمہ کی زندگی ان چار بچوں کے ہوتے ہوئے بھی جیسے بالکل خالی ہو گئی۔ چٹیل ویران صحرا کی طرح۔



"یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ امی؟ دماغ تو نہیں خراب ہو گیا ان لوگوں کا۔" عدیل تو سنتے ہی جیسے ہتھے سے اکھڑ گیا۔
نسیم بیگم تو ان چند گھنٹوں میں نچڑ کر رہ گئی تھیں۔
نم آنکھوں میں زمانے بھر کی لاچاری سمو کر بیٹے کو دیکھنے لگیں۔
وہ زبان جو ہر وقت کسی نہ کسی بات پہ کوئی نہ کوئی تبصرہ ضرور کرتی تھی اب جیسے گنگ ہو کر رہ گئی تھی۔

[illegible]

بولے جارہا تھا۔

اس کا غصہ لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جارہا تھا۔

بشریٰ خود پریشان نظروں سے ساس اور شوہر کو دیکھتے ہوئے اپنے ڈوبتے دل کو جیسے سنبھال رہی تھی۔

ابھی تو سفر کی تھکان نہیں اتری تھی کہ یہ افتاد؟

پھر اسے تو امید تھی کہ گھر جاتے ہی شاندار استقبال ہوگا۔ اتنی اچھی خبر سننے کے بعد فوزیہ اور امی کا موڈ بہت اچھا ہوگا۔

"مگر یہاں تو جیسے کسی کو وہ "بریکنگ نیوز" یاد بھی نہیں رہی تھی۔ فوزیہ کونے میں بکھرے بالوں کے ساتھ گم صم بیٹھی تھی۔

"آپ کو ان سے بات کرنی چاہیے تھی۔ صاف منع کردینا چاہیے تھا۔ منہ پر انکار کردیتیں بلکہ انہیں سناتیں کہ انہوں نے ایسی بات کی بھی کیسے۔ حد ہوگئی ڈھٹائی کی اور بے شرمی کی۔" وہ اب مٹھیاں بھینچے کمرے میں بے چین سا ٹہلنے لگا تھا۔

"پاپا! میری ڈول نہیں مل رہی جو آپ نے مجھے اسلام آباد سے لے کر دی تھی۔" مثال اپنی پریشانی شیئر کرنے کو آنکھوں میں آنسو لیے باپ کے پاس آئی۔

"جاؤ یہاں سے، وہیں ہوگی دیکھو جاکر۔" عدیل زور سے اس کا ہاتھ جھٹک کر غصے سے بولا۔

بشریٰ کے دل پر جیسے ہاتھ سا پڑا۔

"پاپا!" مثال آنکھوں میں آنسو لے آئی۔

"بیٹا! وہیں ہوگی گاڑی میں یا پھر سامان میں جاکر دیکھو۔۔۔ بشریٰ! تم جاؤ، جاکر اسے ڈول ڈھونڈ دو۔" اسے مڑ کر کہتے ہوئے عدیل کی نظر بشریٰ کے تھکے ہوئے چہرے پر پڑی تو اس سے کچھ بھولا ہوا یاد آیا۔

"اور تم جاکر اندر کمرے میں آرام کرو۔ اتنے لمبے سفر سے تھک کر آئی ہو۔" عدیل فکر مندی سے بولا۔

"فوزیہ! تم بشریٰ کو جوس وغیرہ پی لے تو تھوڑا ریسٹ کرلے۔" وہ مڑ کر تحکم سے بولا تو فوزیہ جیسے ششدر سی رہ گئی۔

اس غم کی گھڑی میں جب فوزیہ کی زندگی داؤ پر لگی تھی۔ بھائی اسے ایسی خدمت گاری کا حکم دے سکتا ہے فوزیہ نے کبھی سوچا نہیں تھا۔ تڑپ کے رہ گئی۔

کچھ ایسی ہی کیفیت نسیم کی بھی تھی۔

مگر بے بسی ایسی تھی کہ پلٹ کر نہ تو جواب دے سکتی تھی نہ غصے کا اظہار کرسکتی تھیں۔

"ہاں فوزیہ! جاؤ بیٹا! بشریٰ کو آرام کرنا چاہیے تم اسے جوس بنادو یا جو یہ کھانے کے لیے کہے اگر بھوک لگی ہے تو کھانا گرم کردو۔ مثال سے بھی پوچھ لینا۔"

بجائے اس فوزیہ کی دل جوئی کرتی۔ اسے اس آفت سے نکل جانے کا کوئی مژدہ سنایا جاتا یا اسے جاکر آرام کرنے کو کہا جاتا، یہاں بھابھی صاحبہ کی خدمت کے مشورے دیے جارہے تھے۔

وہ بے بسی اٹھ کر چلی گئی۔

"مما! چلیں نا۔ میری گڑیا مجھے تلاش کرکے دیں۔" مثال ماں کو یونہی بیٹھے دیکھ کر مچل کر بولی۔

"بشریٰ! جاؤ لے جاؤ اسے فارغ کرو۔ ایک دم۔" عدیل جیسے زچ آکر بولا تو بشریٰ مثال کا ہاتھ پکڑ کر اسے اندر لے گئی۔

"پھر اب؟" نسیم بیگم نے بیٹے کے چہرے پر یوں نظریں گاڑ کر پوچھا جیسے اس کے پاس جادو کا چراغ ہے جس کے

ظالموں نے صرف ان کی جانیں نہیں لی تھیں۔ ان کی عمر بھر کی کمائی ان کے خواب، ان کی خواہشیں، ان کے بچوں کے مستقبل، ان کی چھت سب کچھ چھین لیا تھا۔ وہ روتی، فریاد کرتی، چیختی چلاتی اب کچھ بھی واپس نہیں آ سکتا تھا۔

عاصمہ کی آنکھیں رو رو کر سوکھ چکی تھیں۔

وہ تو جیسے خود میں گم ہو کر رہ گئی تھی۔ ایک بھائی تھا بیوی بچوں سمیت ملک سے باہر۔ اتنے سالوں میں اس نے کبھی پلٹ کر خبر نہ لی، اب بھی اس کو کسی نے اطلاع بھیجی یا نہیں۔ اسے کچھ پتا نہیں تھا۔

وہ تو اب بھری دنیا میں اکیلی ہی تھی۔

دن میں، ہمسائیاں آتی جاتی رہتیں۔ بچوں کو اور اس کو زبردستی کچھ کھلا پلا جاتیں مگر رات..... کالی لمبی سیاہ رات کسی سیاہ ناگ کی طرح پھن پھیلائے یوں اس کی طرف دیکھتی کہ وہ دیواروں میں سمٹتی جاتی۔

"مما! بھوک لگی ہے۔" چھوٹی اریشہ جانے کس وقت آ کر اس کے گھٹنے سے چمٹی تھی۔

عاصمہ نے چونک کر خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا۔

وہ تو بالکل فراموش کر چکی تھی کہ اس کے ساتھ جڑی چار جانیں اور بھی تو ہیں۔ اس کی طرح برباد ہوئی ہیں۔ ان کی زندگی اپنے سب سے قیمتی اور پیارے رشتوں سے محروم ہو چکی ہے۔

"مما! مجھے بھی بھوک لگی ہے۔" اریبہ بھی دوسری طرف آ کر بیٹھ گئی۔

واثق ان سے پرے بالکل خاموش کسی سمجھ دار بچے کی طرح بیٹھا تھا مگر اس کے چہرے سے لگ رہا تھا۔ اسے بھی بھوک لگی ہے لیکن اسے اپنی خواہش پہ بند باندھنا آگیا ہے۔

"ابھی سے۔ نہیں نہیں۔ ابھی میرے بچے کی عمر ہی کیا ہے۔ فقط گیارہ سال پانچ ماہ سترہ دن۔ اتنی عمر میں اسے غم کی بھٹی میں جھونک دوں۔ ضبط اور صبر کے امتحان میں ڈال دوں۔ نہیں نہیں۔"

وہ تڑپ کر اٹھی تھی۔ اسے اریبہ اور اریشہ کی بھوک نے نہیں تڑپایا تھا واثق کی چپ نے جیسے کرنٹ سا لگا دیا تھا۔

"واثق میری جان! ایسے کیوں بیٹھے ہو؟" وہ بے اختیار اسے ساتھ لپٹا کر تڑپ کر بولی۔

"تمہیں بھوک نہیں لگی؟" وہ اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر بولی۔

"نہیں مما..... مجھے بھوک نہیں۔ میں ان دونوں کے لیے کچن سے کچھ لے کر آتا ہوں۔ آپ پریشان نہیں ہوں۔" وہ یکدم جیسے جوان ہو گیا۔ گیارہ سال کے بچے سے بیس سال کے جوان کی طرح۔

"واثق!" وہ اسے دیکھے جا رہی تھی۔

"مما!" وہ ماں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر نرمی سے بولا۔

اور وہ جیسے کسی فرد کے سہارے کی تلاش میں تھی، اس کی ٹانگوں سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"مما! دیکھیں یہ دونوں بھی رونے لگی ہیں۔ آپ کو اب حوصلہ کرنا ہو گا..... آپ کو سب کچھ سنبھالنا ہو گا مما!"

وہ واقعی بہت بڑا ہو گیا تھا۔

اس حادثے نے واثق کے بچپن کو نگل لیا تھا اور عاصمہ جیسی مضبوط عورت کو کمزور اور ڈرپوک بنا دیا تھا۔

"واثق! میں بہت کمزور ہو گئی ہوں..... تمہارے پاپا اور دادا نے بے وفائی کی ہمارے ساتھ۔ ہمیں اکیلا چھوڑ گئے..... میں کیا کروں میں کچھ نہیں کر سکتی۔"

وہ یوں بلک بلک کر رو رہی تھی جیسے واثق کوئی دانا بزرگ ہو۔

واثق ماں کے پاس ہی زمین پر بیٹھ گیا۔

"مما! یہ سب تو اللہ کے حکم سے ہوتا ہے۔ آپ خود ہمیں سمجھایا کرتی تھیں نا کہ کچھ بھی خود بخود نہیں ہوتا۔ سب کچھ اللہ کے حکم پر ہوتا ہے۔"

"واثق!" وہ رونا دھونا بھول کر ایک چھوٹے سے بچے کے منہ سے اتنی بڑی بات، اتنی سامنے کی بات جو خود اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی، سن کر حق دق سی رہ گئی۔

اس سے جیسے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ اسے پتا بھی نہیں چلا کب وہ آہستگی سے اپنے آنسو خود اپنے ہاتھوں سے صاف کرنے لگی۔

"مما..... مجھے اچھا نہیں لگتا۔ ہم ہر روز دوسروں کے گھروں سے پک کر آنے والا کھانا کھائیں۔" واثق نے اسے دوسرا جھٹکا لگایا تھا۔

"واثق!" وہ اسے بس دیکھے جا رہی تھی۔

"مما! آج چوتھا دن ہے اور کتنے دن، ہم دوسروں کے اوپر بوجھ بنے رہیں گے؟" وہ اب بہت نرمی سے ماں کے بال سلجھا رہا تھا۔

"مما! مجھے شرم آتی ہے جب ساتھ والی آنٹی ہمیں اپنے گھر سے تھوڑا تھوڑا کھانا لا کر دیتی ہیں۔"

"میں نے تو آج صرف آدھی روٹی کھائی۔" اریبہ آگے آ کر بولی۔

"میں نے بھی۔" اریشہ بھی ساتھ آ بیٹھی۔

"اور میں..... مما! صبح سے کچھ نہیں کھایا..... مجھ سے کھایا جاتا ہی نہیں۔ مما! اچھا نہیں لگتا۔ نوالے حلق میں پھنستے ہیں۔"

واثق اسے حیران کیے جا رہا تھا۔

یقیناً اس نے بہت دھیان سے بچوں کی پرورش کی تھی۔

مکان کی بنیادیں بہت دھیان سے اٹھائی جاتی ہیں۔ اس میں روڑے پتھر، اینٹیں، سیمنٹ گارا سب کچھ ڈالا جاتا ہے۔ کچھ ٹھیک سے اندازہ نہیں ہوتا کہ مکان کیسا بنے گا لیکن اگر بنیاد مضبوط ہو تو..... پھر مکان جیسا بھی ہو، اسے کوئی آسانی سے گرا نہیں سکتا اور عاصمہ کو بھی آج اندازہ ہوا، عفان اور فاروق صاحب اسے اکیلا چھوڑ کر نہیں گئے تھے۔

وہ واثق کی بنیادوں میں اپنی مضبوطی، اپنی غیرت اور خودداری چھوڑ گئے تھے تو پھر وہ اکیلی کیسے تھی۔

"تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں کہ تم نے کچھ نہیں کھایا صبح سے۔" وہ بولی تو بالکل پہلے جیسی عاصمہ تھی۔ صرف بچوں کی فکر کرنے والی۔ اپنی ذمہ داریاں پوری تن دہی سے ادا کرنے والی۔

وہ ایک دم سے کھڑی ہو گئی۔

"اچھا کیا کھاؤ گے تم لوگ۔ کیا بناؤں میں تمہارے لیے؟" وہ پہلے کی طرح بالکل نارمل انداز میں بہت فکر مندی سے پوچھ رہی تھی۔

واثق نے دونوں بہنوں کی طرف دیکھا۔

"مما! مجھے بریانی کھانی ہے۔" اریبہ لاڈ سے بولی۔

"اور مجھے چکن فرائی کیا ہوا۔" اریشہ بولی۔

"ٹھیک ہے اور واثق! تم کیا کھاؤ گے؟"

واثق کچھ نہیں بولا اور اٹھ کر ماں کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔

"اریبہ، اریشہ! اس وقت رات کافی ہو گئی ہے۔ میرے خیال میں صرف چائے یا دودھ کے ساتھ سلائس لے

"نہیں امی! [illegible] خراب [illegible]

کتنی بیا کر بولی۔

"عدیل تو اتنے ٹینس ہیں کہ سمجھ میں نہیں آرہا کیا کریں۔"

"تم دونوں کو ٹینشن لینے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ ان ماں بیٹی کا مسئلہ ہے۔ وہ جانیں۔" وہ کٹھور پن سے بولیں۔

جس کی بشریٰ کو ان سے توقع نہیں تھی۔

"نہیں امی۔۔۔ ہم دونوں ان سے الگ تو نہیں ہیں۔"

"پاگل ہوئی ہو بشریٰ! اب خدا نے اپنی رحمت کی ہے تو تم خوامخواہ کی پریشانیاں گلے ڈال کر ناشکرا پن کر رہی ہو۔"

وہ ڈانٹ کر بولیں۔

"امی! اب میں ان کے گھر میں رہتی ہوں۔ ان کے مسائل سے کٹ تو نہیں سکتی نا۔" بشریٰ عاجزی سے بولی۔

"بھاڑ میں جائیں ان کے مسائل۔ تم یہ دیکھو خدا نے کتنے سالوں بعد اپنا فضل کیا ہے تم پر۔۔۔ بشریٰ! میری مانو تو جب تک یہ مسئلہ حل نہیں ہو جاتا، میری بچی تم ادھر ہی رہو۔" وہ پیار سے بولیں۔

"نہیں امی!" وہ ایک دم گھبرا گئی۔

"میں خود عدیل سے بات کرتی ہوں۔" وہ پختہ ارادے سے بولیں۔

"اور مجھے پتا ہے عدیل انکار نہیں کرے گا۔ اسے خود دوسرے بچے کی کتنی چاہ تھی، میں جانتی ہوں۔ وہ اپنے بچے کے لیے اتنا تو کر ہی سکتا ہے نا۔"

"امی! عدیل تو خود مجھ سے کہہ رہے تھے کہ میں آپ کی طرف آکر رہنے لگوں مگر۔"

"مگر کیا۔۔۔ بشریٰ! ابھی شروع کے دن ہیں۔ خدانخواستہ ذرا اونچ نیچ ہو گئی تو کہیں عمر بھر کے پچھتاوے نہ رہ جائیں۔ سوچ لو۔۔۔ اور پھر کل کو باتیں کرنے کو تمہاری یہی ساس اور نند آگے آگے ہوں گی۔ لکھ لو میری بات۔"

وہ زور دے کر بولیں تو بشریٰ گم صم سی ہو کر رہ گئی۔

"امی!" بشریٰ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ماں کی اس دلیل کا کیا جواب دے کہ بات میں واقعی وزن تھا۔ اس بچے کے ہونے سے پہلے ان سات سالوں میں جس طرح ان دونوں نے اسے طعنے دے دے کر ناک میں دم کیا تھا۔ اگر واقعی ایسا ویسا کچھ ہو گیا تو وہی دونوں سارا الزام بشریٰ پہ رکھ دیں گی۔

"دیکھو میری بچی! میں جانتی ہوں تیرا دل کتنا حساس ہے۔ ہونا بھی چاہیے۔ جیسی بھی بری بھلی ہیں تو وہ عدیل کی ماں بہن ہیں۔ تم بھلے عدیل کی خاطر ہر طرح سے ان کا ساتھ دو مگر اس وقت تمہیں تھوڑی سی خود غرضی دکھانا ہو گی اپنے آنے والے بچے کے لیے اپنے آنے والے کل کے لیے۔" وہ اس کو دیکھتی جا رہی تھی۔

"دیکھو یہ فوزیہ والا مسئلہ کبھی نہ کبھی کسی طرح حل ہو جائے گا۔ ابھی حل ہوا تو بھی اس کا کچھ حل تو موجود ہے نا۔ ایک دو سال پانچ سال میں فوزیہ کا گھر کسی نہ کسی طرح بس ہی جائے گا لیکن اللہ نہ کرے تمہارے ساتھ کچھ گڑبڑ ہوئی تو بیٹا! بہت مشکل ہو جائے گی۔"

اب بس ماں کی نیت پہ شک کیے بغیر کچھ سوچنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

"ان سات سالوں میں تم نے کون سا علاج، کون سا دوا دارو نہیں کیا۔ حتیٰ کہ میں ایک دو [illegible] کے پاس بھی تمہیں [illegible] دم درود کے لیے لے کر گئی مگر کچھ بھی نہیں ہو سکا۔"

"امی! [illegible] ٹھیک ہے مگر میری ساس کو آپ بھی جانتی ہیں۔ اس وقت یوں میں الگ تھلگ ہو کر بیٹھ گئی تو مجھے ساری زندگی معاف نہیں کریں گی۔"

"مسئلہ تو وہ تمہیں خدا نہ کرے، بچے کو کچھ ہو گیا تو بھی تسلیم کریں گی۔ میری بات تم لکھ لو۔" وہ ہاتھ پر ہاتھ

[illegible]

تھی۔

[illegible]

جہاں سہم کر پیچھے ہو گئیں۔

مار کر بولیں۔
"تو پھر کیا کروں آپ ہی بتائیں۔" بشریٰ نے ہتھیار ڈال دیے۔
"بتا تو چکی ہوں۔ ہفتے دس دن طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے یہاں بیٹھو، ہو سکتا ہے اس دوران یہ مسئلہ حل ہی ہو جائے۔"
وہ ترکیبیں بتانے میں تو یوں بھی ماہر تھیں۔ جھٹ بولیں۔
"اگر حل نہ ہوا تو۔"
"ڈاکٹر نے اسے بیڈ ریسٹ کا کہا ہے۔ بھئی! میرا اپنا کوئی لالچ نہیں نسیم بہن! تمہاری نسل کی حفاظت کی فکر مجھے تو، ورنہ تم سو بار رکھوانی بہو کو اپنے گھر... کہہ دوں گی خود جا کر۔" ذکیہ جھٹ سے بول اٹھیں۔
بشریٰ گم صم سی سوچنے لگی۔
"جتنا سوچو گی اتنا پریشان ہو گی۔ یوں بھی ان دنوں تمہیں خود کو ہر طرح کی فضول سوچوں سے بچانا ہے۔"
"امی! عدیل کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ ہو جاتے ہیں۔" اسے ایک اور خیال ستایا۔ اب تو وہ ظہیر سے شناسائی والی بات ماں سے شیئر نہیں کر سکی تھی۔
اس رات عدیل کا جو اتنا مختلف رویہ اس کے ساتھ تھا۔ اس کو تو وہیں سے ڈر سا لگ گیا تھا۔ کتنا بھی چاہنے والا شوہر کیوں نہ ہو اس کے دماغ میں بیوی کی کوئی کمزوری آ جائے تو پھر وہ سارا پیار، محبت بھول جاتا ہے۔
وہ ایسا دوسرا موقع عدیل کو دینا نہیں چاہتی تھی۔
"ٹھیک ہے۔ تم رہ لو دو چار دن آنٹی کی طرف۔ میں ان سے خود بات کر لوں گا۔ یوں بھی گھر میں تو اس وقت صرف پریشانی چل رہی ہے۔ تم آ کر کون سا کوئی مسئلہ حل کر دو گی۔"
وہ اتنی آسانی سے مان جائے گا، بشریٰ کو یہ بھی اندازہ نہیں تھا۔ اس نے ذکیہ کے کہنے پر ڈرتے ڈرتے عدیل کو فون کیا تھا اور ماں کے خدشے نرم زبان میں بیان کیے تھے۔
اسے تو ویسے بھی اس ماحول میں بشریٰ کا رہنا کھٹک رہا تھا کہ کہیں کوئی اونچ نیچ نہ ہو جائے۔ بشریٰ کے بات کرتے ہی وہ راضی ہو گیا۔ یوں بھی آج کل نسیم بیگم کا دم خم ختم ہوا پڑا تھا۔ بجھے ہوئے کوئلے کی طرح ہو رہی تھیں وہ۔ عدیل کو پتا تھا وہ اعتراض نہیں کریں گی۔ مگر عدیل کی دردسری تو موجود تھی کہ زاہدہ بیگم اور ظہیر اپنے مطالبے سے ایک انچ پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھے۔ عدیل نسیم بیگم کے مجبور کرنے پر ان کے گھر گیا تھا ملنے مگر ان کی وہی ایک رٹ رہی کہ بیس لاکھ ملیں گے تو ہی ظہیر کی زندگی سیٹ ہو گی اور اس کی وجہ سے فوزیہ عیش و آرام سے رہ سکے گی جبکہ وہ دونوں ماں بیٹا بار بار فوزیہ کے ایسے کسی بھی مطالبے کی نفی کر رہے تھے مگر زاہدہ بیٹے کے ساتھ یوں ثابت قدم تھیں جیسے ان کی ڈیمانڈ پوری نہیں ہوئی تو وہ کسی بھی انتہا پر جا سکتے ہیں۔ عدیل نے تھکے ہوئے انداز میں فون بند کر کے بے دلی سے آفس کا کام کرنا شروع کر دیا۔ اگرچہ ٹائم ختم ہو چکا تھا لیکن اس کا گھر جانے کو بھی جی نہیں چاہ رہا تھا۔
یوں ہی بیٹھا پریشان سوچوں میں الجھتا رہا۔



وہ بار بار گنتی جا رہی تھی اور رقم جیسے سکڑتی جا رہی تھی۔
واثق اسی مدبرانہ انداز میں اس کے پاس بیٹھا تھا۔
"مما آپ کتنی بار گنیں گی ان پیسوں کو... بس کریں نا!" وہ نرمی سے بولا تو عاصمہ تھکن بھرے انداز میں بولیں

وہ ہاتھ چھوڑ کر بیٹھ گئی۔

"واثق! ہمارا گزارہ کیسے ہوگا۔ ہم کیا کریں گے بیٹا؟" وہ پھر سے رونے لگی تھی۔

"ممّا! انکل زبیر آرہے ناشام میں آج۔ انہوں نے بابا کے آفس میں بات کی ہوگی تو کچھ نہ کچھ تو وہاں سے ملے گا۔" وہ اب ہر معاملے میں ماں کے ساتھ ساتھ تھا۔

"کتنا ہوگا۔ مستقل تو کچھ بھی نہیں نا۔" وہ بہت پریشان تھی۔ اس کی راتوں کی نیند غارت ہوچکی تھی۔ ... کا خواب بھی بکھر چکا تھا۔ اب روزمرہ کے اخراجات کیسے پورے ہوں گے۔ بچوں کے اسکول کے ڈیوز گھر کا ... اور دوسری ضروریات... سوچ سوچ کر اس کا دماغ شل ہوا جارہا تھا۔ پھر کچھ خیال آنے پر اس نے اپنا جیولری باکس نکالا۔

زیور کے نام پر ایک سیٹ اور چار چوڑیاں ہی تو تھیں۔ اس کے علاوہ واثق کی چھوٹی سی انگوٹھی، ایک عفان کی انگوٹھی اور اریبہ کی چھوٹی سی چین۔ وہ ایک ایک چیز کو جیسے تول رہی تھی۔

"فی الحال یہ جو رقم ہے۔ اس سے کچن کا کچھ ضروری سامان منگوالیں۔ باقی چیزیں بعد میں دیکھ لیں گے۔" واثق نے ماں کے ہاتھ میں پکڑے سترہ ہزار کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں تمہارے دادا کے گریجویٹی فنڈ میں سے دیکھو ہمیں کیا کچھ ملتا ہے۔ ویسے اب یہ لوگ کسی قسم کی کٹوتی نہیں کریں گے لیکن پھر بھی وقت تو جیسے کوئی انتقام لینے کھڑا ہے۔" وہ بہت تھک سی گئی تھی۔ چند دنوں میں وہ جیسے کئی سال آگے چلی گئی تھی۔ اس کا چند دن کا اکیلے رہنے کا تجربہ آئندہ کی پوری زندگی کے لیے تقدیر بن گیا تھا۔

اب واثق کی یاددہانی کے بغیر بھی وہ رات کو سونے سے پہلے سارے گھر کی کھڑکیاں دروازے سب چیک کرتی۔ رات کو اٹھ کر بچوں کو دیکھتی۔ سیڑھیاں چڑھ کر چھت کا دروازہ دیکھتی۔ دن بھر بچوں کو گھر سے باہر نہ نکلنے دیتی۔ اگر وہ کہیں دور نکل گئے تو کون ان کو ڈھونڈنے جائے گا۔

سعودی عرب سے اس کے بھائی کا فون آگیا تھا۔ اسے عاصمہ کے ساتھ بیت جانے والے سانحے کا بے حد دکھ تھا۔ مگر وہ ابھی آنہیں سکتا تھا۔ دو تین مہینوں بعد چکر لگانے کا کہہ رہا تھا۔ عاصمہ کیا کہتی۔ اب تو اس کا جیسے بالکل زور ہی نہیں رہا تھا۔ اس نے اللہ حافظ کہہ کر فون رکھ دیا۔

مالک مکان نے یکم تاریخ آجانے کے باوجود ابھی کرایہ نہیں مانگا تھا لیکن ظاہر ہے وہ ہمیشہ تو خاموش نہیں رہے گا۔

چند دن پہلے یہ سب کچھ کتنا مختلف تھا۔ پہلے تو صرف دونوں کی تنخواہوں میں مہینے بھر کے اخراجات پورے کرنے کی فکر ہوتی تھی اور اب یہ پریشانی ہے کہ آمدنی کے نام پر کہیں سے بھی کیا آئے گا کیسے آئے گا اور اپنی چھت۔ اکیلی عورت اتنے چھوٹے بچوں کے ساتھ اس معاشرے میں کیسے رہتی ہے۔ عاصمہ کو اندازہ ہی نہیں تھا۔

بڑے بڑے سوال جیسے بھوت بن کر اسے ڈرانے لگے تھے۔

وہ اندر ہی اندر سہمتی جارہی تھی۔



"امی! یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ۔" عدیل نے ابھی آفس کا بیگ کندھے سے اتار کر رکھا بھی نہیں تھا کہ نسیم بیگم کی بات سن کر وہ بیٹھتے بیٹھتے پھر کھڑا ہو گیا تھا۔

نسیم بیگم نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کردیا۔ فوزیہ پچھلے صوفے پر منہ دوسری طرف کیے بیٹھی تھی۔ یقینا...



تماشا نہ بنتی۔۔۔ اپنی ہی نظروں میں یوں نہ گرتی۔ کوئی نہیں ہے میرا۔۔۔ نہ ماں نہ باپ نہ بھائی۔۔۔ آپ کی بیوی چاہتی تھی نا کہ میں عمر بھر یونہی بن بیاہی یہیں بیٹھی رہوں تو جا کر اسے مبارک باد دیجیے گا‘ اس کی ساری حسرتیں پوری ہو گئیں۔۔۔ گھر بیٹھے طلاق کا ایوارڈ مل جائے گا مجھے‘ خوش ہو جائے وہ۔“

وہ روتے ہوئے پھٹی آواز میں بولتی چیزوں سے ٹکراتی عدیل کے بڑھے ہوئے ہاتھوں کو جھٹکتی باہر نکل گئی۔

اس نے جس زور سے جا کر اپنے کمرے کا دروازہ بند کیا تھا‘ عدیل کو یقین ہو گیا‘ اب وہ کل سے پہلے تو یہ دروازہ نہیں کھولے گی۔ عدیل بے چارگی سے ماں کو دیکھنے لگا۔

”آہ!“ وہ پھر سے نڈھال ہو کر بیٹھ گیا۔

نسیم بیگم نے زور سے اس کا ہاتھ پرے ہٹایا تو وہ اور جھنجلا گیا۔

”بتائیں کہاں سے کروں میں اتنی بڑی رقم کا بندوبست۔۔۔ جمع جتھا نکالوں۔ اِدھر اُدھر سے ادھار بھی لوں تو بھی پانچ لاکھ سے اوپر نہیں کر سکتا۔ آپ انہیں بتاتی کیوں نہیں اپنی مجبوریاں؟“

”تمہارا کیا خیال ہے۔ میں جان بوجھ کر تمہیں پریشان کر رہی ہوں۔ ماں ہوں۔ مجھے تمہاری پریشانی کا احساس نہیں ہے کیا؟“ وہ تڑخ کر بولیں۔

”نہیں امی! مجھے پتا ہے لیکن انہیں کہیں اگر میں پانچ لاکھ دے دوں تو۔۔۔“

”بات کی تھی میں نے۔ تم پانچ پر آنے کی بات کرتے ہو‘ وہ بیس لاکھ سے انیس پر بھی نہیں آ رہی ہیں۔ بتاؤ اب میں کیا کروں؟“ نسیم بیگم نے جس طرح کہا۔ عدیل سے مزید کچھ بولا ہی نہیں گیا۔ دونوں یوں چپ ہوئے جیسے اب کبھی نہیں بولیں گے۔

”آئیں نہیں بشریٰ بیگم تمہارے ساتھ؟“ بہت دیر بعد وہ طنز سے بولیں۔

”اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ میں بھی بہت تھک سا گیا تھا‘ خود ہی آ جائے گی ایک دو دن میں عمران کے ساتھ۔“ وہ لہجے میں بے زاری سمو کر بولا کہ کہیں ماں کو یہ شک نہ ہو جائے کہ وہ خود اسے وہیں رہنے کا کہہ آیا ہے۔

”ہاں! معلوم تھا مجھے۔ اسے ہمارے دکھ درد اور پریشانی کا کیا احساس ہو گا۔ اس کی ماں تو خوشی سے بغلیں بجا رہی ہو گی۔ جانتی ہوں میں اس عورت کی فطرت کو۔“ وہ زہر بھرے لہجے میں بولیں۔

”امی! میرے واقعی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کروں۔ بہت سوں سے قرضے کی بات کی ہے مگر آج کل کے دور میں جب لوگوں کے روز مرہ کے اخراجات پورے نہیں ہوتے‘ لمبی چوڑی بچت کس کے پاس ہوتی ہے۔ بیس تیس ہزار سے اوپر کوئی بھی دینے پر راضی نہیں۔“ وہ بے چارگی سے بولا۔

”ایک طریقہ ہے جس سے تم بغیر قرض لیے آدھی رقم کا تو بندوبست کر ہی سکتے ہو۔“ نسیم نے جتانے والے انداز میں کہا تو وہ ماں کو دیکھنے لگا۔



عاصمہ چادر میں منہ چھپائے صوفے پر سمٹ کر بیٹھی تھی۔ واثق بڑے چوکنا انداز میں جیسے بہت کچھ جان لینا چاہتا ہو‘ ماں کے دوسری طرف انکل زبیر کے بالمقابل بیٹھا تھا۔

زبیر عفان کا قریبی دوست بھی تھا اور دونوں گھروں میں آنا جانا بھی تھا۔ زبیر کو اگلے ماہ اپنے آبائی شہر چلے جانا تھا۔ اس کی فیملی کے کچھ مسائل چل رہے تھے۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ یہ سب کچھ زبیر کے سامنے ہوا اور دفتری کام اس کی وجہ سے بلا کسی تعطل یا تاخیر کے ہو گئے تھے۔ وہ فاروق صاحب کے آفس کے معاملات بھی نپٹا کر آیا تھا۔

”بھابھی! یہ تین لاکھ کا چیک ہے‘ جو دس تاریخ کو کیش ہو سکے گا۔ عفان کے ڈھائی لاکھ کے ڈیوز تھے۔ باقی کے پچاس ہزار آفس نے خود ہی ایڈ کر دیے ہیں۔ واثق بیٹا میٹرک کر چکا ہوتا تو یقیناً“ وہ اس کی کسی نہ کسی طرح آفس میں جگہ بنا دیتے مگر ابھی۔“

واثق نے یوں شرمندگی سے سر جھکایا جیسے اس میں اس کا قصور ہو۔ کمرے میں کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ ذرا دیر بعد زبیر نے دوسری فائل کھولی۔ کچھ دیر کچھ ورق الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔

”آفس کے گریجویٹی فنڈ سے دس لاکھ تو وہ عفان کے چھوٹے بھائی جمشید کے علاج کے لیے پہلے ہی نکلوا چکے تھے۔ آپ کو یاد ہے نا؟“ عاصمہ نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلایا۔ اب وقت کی اس ستم ظریفی کو کیا کہیے کہ پانچ سال پہلے جمشید کو اچانک کینسر تشخیص ہوا اور فاروق صاحب نے اس کے علاج پر پانی کی طرح پیسہ بہایا۔ مگر اس کی زندگی نے وفا نہیں کی۔ اب وہ دس لاکھ کا خسارہ بھی ان کی تقدیر پہ ثبت ہو گیا۔

”اب یہ سات لاکھ ہیں۔ پندرہ تاریخ کو آپ کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر ہو جائیں گے۔ باقی جو کچھ بھی ان فائلوں میں لکھا ہے‘ آپ فارغ ٹائم میں دیکھ لیجیے گا۔“ وہ جیسے سب کچھ بول کر ایک دم سے خاموش ہو گیا۔ کمرے میں پھر جامد خاموشی تھی۔

”آپ نے آگے کیا سوچا ہے بھابھی؟“ وہ بہت دیر بعد بولا۔

”ابھی تو کچھ بھی نہیں۔۔۔ کچھ سمجھ میں ہی نہیں آ رہا زبیر بھائی۔۔۔“

”کاش! وہ گاؤں جاتے ہی نہیں۔۔۔ منحوس زمین بکتی نہیں اور اس رقم کی وجہ سے انسانی جانیں نہ جاتیں۔۔ آہ!“ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی سسک اٹھی۔

”میں آپ کی پریشانی سمجھ سکتا ہوں۔“ وہ گہرا سانس لے کر بولا۔ ”مستقل آمدنی کے لیے یہی ہو سکتا ہے کہ آپ یہ ساری رقم بینک میں جمع کروا دیں اس کے پرافٹ پر گزارہ کر لیں۔“ وہ ذرا دیر بعد بولا۔

”اباجی! آپ کو جو گریجویٹی کی رقم ملے گی‘ اسے بینک میں پڑا رہنے دیجیے گا۔ اچھی بھلی ماہانہ آمدنی آنے لگے گی پرافٹ کی شکل میں۔“ وہ اباجی کے جمعہ کے لیے سفید کپڑے کلف لگا کر استری کر رہی تھی‘ جب اس نے فاروق صاحب کو مشورہ دیا تھا۔

”نہ بیٹا! عمر بھر بری بھلی ہمیشہ کوشش کی کہ حلال کھاؤں اور بچوں کو بھی حلال کھلاؤں۔ اب اس عمر میں آ کر حرام کھلا دوں؟ سب کچھ غارت کر دوں؟“ وہ نفی میں سر ہلا کر بولے۔

”کیا مطلب اباجی؟“ وہ جزبز سا ہوئی تھی۔

”بیٹا! سود ہمارے مذہب میں حرام ہے اور یہ پرافٹ سود کے زمرے میں آتا ہے۔ ایسا آئندہ کبھی سوچنا بھی نہیں۔“ وہ اسے تنبیہہ کرتے ہوئے بولے تو عاصمہ سر ہلا کر ان سے متفق ہو گئی۔ وہ تو یوں بھی ان کی ہر بات پر راضی ہو جایا کرتی تھی۔ یہ بات تو بہت بڑی تھی۔ وہ کیسے بھول جاتی۔

”بہت شکریہ زبیر بھائی! میں یہ دیکھ لوں گی۔“ وہ آہستگی سے دونوں فائلیں اپنے آگے کرتے ہوئے بولی۔

”تو ٹھیک ہے بھابھی! میں ابھی دس دن ادھر ہی ہوں۔ آپ کی رقم ٹرانسفر ہو جائے گی تو بس پھر میں جاؤں گا۔ آپ کو جو بھی مسئلہ ہو مجھ سے کہہ دیجیے گا۔“ وہ فوراً ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”ضرور۔“ وہ سر ہلا کر بولی۔

واثق بھی ساتھ کھڑا ہو گیا اور زبیر انکل کے ساتھ چلتے ہوئے باہر نکل گیا۔

عاصمہ دونوں فائلوں کو خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگی۔ اسے اب جو کچھ بھی سوچنا تھا‘ ان دس لاکھ روپوں سے سوچنا تھا کہ زندگی بار بار اس کو ایسے مواقع نہیں دے گی۔

"کچھ ایسا کروں کہ یہ رقم ضائع بھی نہیں ہو اور محفوظ بھی ہو جائے۔" اس کا ذہن اب تیزی سے کام کر رہا تھا۔

"یوں تو ہر مہینے ایک لگی بندھی رقم چاہیے ہو گی۔ اگر اس مد میں ان دس لاکھ روپوں کو وہ خرچ کرے گی تو یہ سال ڈیڑھ سال میں ختم ہو جائیں گے اور اس کے بعد۔۔۔" اس کے بعد کا خوفناک سوالیہ نشان اسے دہلا گیا۔

"کیا ہونا چاہیے اس رقم کا مصرف۔" وہ رات کا کھانا بناتے ہوئے مسلسل سوچے جا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں عدیل؟" بشریٰ کے سر پر جیسے کسی نے بم پھوڑ دیا تھا۔ وہ ششدر سی ہونٹ بھینچے عدیل کو دیکھتے ہوئے برافروختہ ہو کر بولی۔

عدیل نے کڑی نظروں سے بشریٰ کو دیکھا مگر کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

"عدیل! آپ نے خود ہی تو کہا تھا کہ مجھے ابھی امی کی طرف رہنا چاہیے کم از کم اس مسئلے کے حل ہو جانے تک۔" وہ پھر سے پہلی بات کو نظرانداز کر کے بولی۔ شاید وہ بات عدیل کے منہ سے غلطی سے نکل گئی ہو گی۔

"اور اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے بھی تو کچھ کرنا ہو گا اور تم جانتی ہو اسے صرف میں ہی حل کر سکتا ہوں۔" وہ ترشی سے بولا۔

"میں سمجھی نہیں آپ کی بات۔"

"میں ہی کمانے والا ہوں نا اس گھر کا۔ تو مجھے ہی اسے ہینڈل کرنا ہو گا۔"

"لیکن عدیل! یہ تو غلط بات ہے نا کہ ان لوگوں کی ایسی بے جا ڈیمانڈ پوری کی جائے۔" وہ تیزی سے بولی۔ اس کے لیے تو یہ بات ہی بہت حیران کن تھی کہ عدیل ان لوگوں کو رقم دینے کے لیے راضی ہو گیا۔

اور یہ یقیناً "فوزیہ اور نسیم بیگم کے واویلا کی بدولت ممکن ہوا ہو گا" ورنہ پہلے تو عدیل اس معاملے میں کوئی بات نہیں سننا چاہتا تھا۔ اسے گھر سے جانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ مگر اب پچھتانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

"تو تم کیا چاہتی ہو میں اپنی بہن کو طلاق دلوا کر ہمیشہ کے لیے گھر بٹھا لوں؟" وہ یوں اجنبی لہجے میں بولا جیسے بشریٰ کو اس سے کوئی مطلب نہ ہو۔

"عدیل مگر۔" وہ بوکھلا کر رہ گئی۔ اس رات والا عدیل پھر اس کے سامنے بیٹھا تھا۔

"بشریٰ! ان لوگوں کا مطالبہ غلط یا صحیح، ہمارے پاس اس کو مان لینے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔"

"واٹ۔۔۔ آپ کہاں سے کریں گے بیس لاکھ کا انتظام۔۔۔ سوچا ہے آپ نے؟" وہ تو بھڑک اٹھی۔ عدیل نے ایک گہری نظر اس پر ڈالی اور لحہ بھر خاموش رہا۔

"عدیل! میں کیا کہہ رہی ہوں۔"

"سوچ لیا ہے میں نے سب کچھ تو تم کیوں چیخ رہی ہو۔" وہ اسی اجنبی لہجے میں کٹھور پن سے بولا۔ بشریٰ اسے دیکھتی رہ گئی۔

"میں رات میں تمہیں واپس آنٹی کی طرف چھوڑ جاؤں گا۔"

"کیا مطلب؟"

"ہے تو بہت گھٹیا سی بات مگر مجبوری ہے۔ تم آنٹی سے دو تین لاکھ روپے ادھار کے طور پر لو گی۔" وہ بے لچک لہجے میں بولا۔

"عدیل!" یہ دھماکا پہلے سے بھی زیادہ زوردار تھا۔

"پانچ لاکھ کا انتظام میں کسی طرح کر لوں گا۔ تین لاکھ کا عمران اور آنٹی کر دیں گی۔ سات آٹھ لاکھ کا تمہارا زیور

بک جائے گا اور دو تین لاکھ کا امی کا۔۔۔ اس طرح مل ملا کر بیس لاکھ کے قریب ہو ہی جائے گا۔ کم از کم میری بہن کی زندگی اجڑنے سے بچ جائے گی تو یہ رقم بہت بڑی نہیں۔"

اور بشریٰ کسی بت کی طرح اسے دیکھے جا رہی تھی جو اپنی دھن میں بار بار دہراتے ہوئے گویا خود کو تسلی دیے جا رہا تھا۔

"اور اگر میں انکار کر دوں؟" بشریٰ بہت دیر بعد سرد لہجے میں بولی تھی۔

گاڑی کے ٹائر زور سے چرچرائے تھے۔ عدیل کے لیے یہ بات بالکل غیر متوقع تھی۔

اس نے گاڑی ایک طرف روکی اور تیز نظروں سے بشریٰ کو دیکھنے لگا۔

"تم کہنا چاہتی ہو کہ تمہیں اپنا زیور اور اپنی ماں سے لیا جانے والا قرض میری عزت سے زیادہ پیارا ہے۔" وہ رک رک کر یوں بول رہا تھا جیسے لفظوں کو تول رہا ہو۔

"بات آپ کی عزت کی ہے عدیل! تو میں بھی آپ کی عزت ہوں۔ وہ زیور آدھا آپ لوگوں کی طرف سے تھا بے شک، مگر عدیل صاحب تحفہ کسی کو دینے کے بعد اس سے چھینا جائے تو اسے کیا کہتے ہیں؟" وہ طنز سے بولی اور عدیل کا چہرہ لحہ بھر میں جیسے لال بھبھوکا ہو گیا۔

اس نے بغیر کچھ کہے گاڑی اسٹارٹ کی اور اندھا دھند دوڑانا شروع کر دی۔ گاڑی جس رفتار سے جا رہی تھی، لگتا تھا آج وہ دونوں زندہ سلامت گھر نہیں پہنچ سکیں گے میری مثال۔۔۔ بشریٰ کو آنکھیں بند کر کے بس آخری یہی خیال آیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"بیٹا! پوچھ کر بلاتے ہیں کسی کو۔ یونہی اٹھا کر تم کسی کو بھی لے آؤ اور ڈرائنگ روم میں بٹھا دو۔ اچھی بات نہیں۔ مجھے بتاتے تو۔" وہ واثق سے سختی سے بولتی اس کے ساتھ ڈرائنگ روم کی طرف آئی۔

"سوری مما! وہ انکل کہنے لگے کہ آپ کی مما انہیں جانتی ہیں بلکہ دادا ابو بھی جانتے تھے تو میں نے انہیں بٹھا دیا۔" عاصمہ ڈرائنگ کے دروازے پر ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

نمرہ احمد



اسلام آباد ایرپورٹ سے لے کر ترکی میں قیام کے دوران تک حیا کے ساتھ جتنے بھی واقعات پیش آتے ہیں اور جتنے بھی لوگ اسے ملتے ہیں، وہ جہان کی منصوبہ بندی کے مطابق ہیں البتہ حیا کو اغوا کرنے میں حبشی کی غداری کا دخل ہے جہان ۔۔ بے خبر ہوتا ہے۔ تاہم وہ اسے چھڑا لیتا ہے۔

عبدالرحمن پاشا اور عبدالرحیم پاشا، حبیب پاشا کی پہلی بیوی کے بیٹے تھے۔ حبیب پاشا نے ترکی میں امت اللہ سے شادی کی۔ ان کا بیٹا طیب حبیب پاشا المعروف پاشا بے ہے۔ طیب بڑا ہو کر مافیا کا حصہ بن جاتا ہے۔ امت اللہ اس بات سے تاحال لاعلم ہیں۔ طیب جہان کو اپنے سوتیلے بھائی عبدالرحمن پاشا کے نام سے متعارف کرواتا ہے۔ ایک ڈیل کے تحت وہ اس کا ہوٹل سنبھالنے لگتا ہے۔ طیب یونان میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ جہان اپنی ایجنسی کے کہنے پر اسے چھڑانے کی کوئی کوشش نہیں کرتا۔ بہارے اور عائشے گل، امت اللہ کی رشتے کی پوتیاں ہیں۔ امت اللہ نے بیوک ادا والا سفید محل عائشے گل کے نام کر دیا ہے۔

جہان اپنے سر درد کے حوالے سے ڈاکٹر سے رجوع کرتا ہے۔ ڈاکٹر کے مطابق جہان کے آنکھ کی پاس ایک اعشاریہ ایک کی کیل (جو اسے ڈی ایم آئی کی قید میں تشدد کے دوران) گھس گئی تھی۔ آپریشن میں جہان کی بینائی جاتے کے پچاس فیصد امکان ہیں۔ جہان یہ رسک لینے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

مکمل ناول



۱۴ — چودھویں قسط

"حیا اٹھو' میری بات سنو!" بہت دھیرے سے وہ کہہ رہا تھا۔

چاندی کے مجسمے پھر سے لوٹ آئے تھے۔ گہری کنویں کا اندھیرا چھٹتا گیا۔ چاندی کی جھیل ہر سو پھیلتی گئی۔ اس نے ایک جھٹکے سے آنکھیں کھولیں۔

کمرے میں مدھم سی زرد روشنی بکھری تھی۔ اس کے صوفے کے سامنے میز کے کنارے پہ بیٹھا جہان بہت خاموشی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے آنکھیں کھولتے دیکھ کر وہ تھکے تھکے انداز میں مسکرایا۔

"دیکھ لو..... تم میرے لیے کپادوکیہ نہیں آئیں' مگر میں ہر دفعہ تمہارے لیے آجاتا ہوں۔ پھر بھی کہتی ہو' مجھے پروا نہیں ہے؟"

وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سانس روکے' بنا پلک جھپکے وہ یک ٹک اسے دیکھنے لگی۔ پھر اچانک بہت سے آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

"جہان! آئی ایم سوری۔" وہ بھیگی آواز میں کہتی اسی طرح اسے دیکھ رہی تھی۔ کہیں پلک جھپکنے پہ منظر غائب نہ ہو جائے۔ "میں نے وہ سب جان بوجھ کر نہیں..... میں بس غصے میں....."

"میری بات سنو! اسی دھیمے لہجے میں کہتے ہوئے ہاتھ اٹھا کر اس نے حیا کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ "تمہاری ساری باتیں ٹھیک تھیں۔ تم نے صحیح کہا تھا۔ میں واقعی بہت دفعہ بہت غلط چیزیں کر جاتا ہوں۔"

"نہیں..... میرا وہ مطلب نہیں تھا' میں تو۔" اس نے احتجاجاً کچھ کہنے کی سعی کی مگر وہ نہیں سن رہا تھا۔

"میں جانتا ہوں کہ میں کوئی ہر وقت ہنسنے مسکرانے والا آدمی نہیں ہوں۔ میں پہلے بھی بہت دفعہ کہہ چکا ہوں کہ میں ایک پریکٹیکل آدمی ہوں۔ ایکسپریسو نہیں ہوں' مجھے دوسروں کے دل رکھنے نہیں آتے' میں لوگوں پہ جلدی یقین نہیں کرتا' شک کرتا ہوں اور میری جاب نے مجھے قدرے بے حس بنا دیا ہے۔ اب بہت پرائیویٹ پرسن بن گیا ہوں یا شاید ہمیشہ ایسا تھا۔ کیا تم نے دوپہر سے کچھ کھایا؟" اپنی رو میں کہتے کہتے ایک دم سے اس نے پوچھا۔ اگر وہ تو... کے بعد استفسار کرتا تو وہ کہہ دیتی کہ اس نے کھایا مگر وہ حملہ اتنا شدید تھا کہ اس کا سر خود بخود نفی میں ہل گیا۔

"نہیں..... ہاں..... بس مجھے بھوک نہیں تھی۔" اس نے بات بنانے کی کوشش کی۔ اب وہ آنسو... چکی تھی اور یہ اس کے لیے خجالت کا باعث ہوتا اگر جان لیتا کہ حیا نے اس کی وجہ سے شب سے کچھ نہیں کھایا۔ مگر وہ جان چکا تھا۔

"نہیں۔ تم نے کچھ نہیں کھایا اور مجھے پتا ہے کہ لوگوں سے جواب کیسے اگلوائے جاتے ہیں۔" وہ میز کے کنارے سے اٹھا اور دوسرے کونے میں رکھی انگیٹھی کی طرف گیا۔ وہاں ایک چھوٹی سی میز پہ بہارے کے پاپ کارن کے دو پیکٹ پڑے تھے اور اوپر دیوار میں ایک بلٹ ان مائیکرو ویو اوون نصب تھا۔

"کیسے اگلوائے جاتے ہیں؟" اس کی پشت کو دیکھتے ہوئے وہ وہیں بیٹھے بیٹھے بولی۔ وہ اب مائیکرو ویو اوون کا ڈھکن کھولے کھڑا' پاپ کارن کا ایک پتلا سا پیکٹ اندر رکھ رہا تھا جس میں صرف مکئی کے دانے تھے۔ ٹائم سیٹ کر کے اس نے اوون کا ڈھکن بند کیا' اسے اسٹارٹ کیا اور واپس اس تک آیا۔

"اگر تم کسی سے سچ بلوانا چاہتی ہو' فرض کرو اپنے ابا سے' تو ان سے سوال تب پوچھا کرو جب وہ ڈرائیو کر رہے ہوں۔ ڈرائیو کرتے ہوئے لوگ عموماً سچ بولتے ہیں۔"

"اور مجھے کیسے پتا چلے گا کہ کون سچ بول رہا ہے اور کون جھوٹ؟" وہ بس بات کو طول دینا چاہتی تھی تاکہ جہان پچھلی بات بھول جائے اور وہ اپنے الفاظ دہرائے جانے کی شرمندگی سے بچ جائے۔

"جھوٹ بولنے والے کے چہرے پہ دس عدد بہت واضح نشانیاں آجاتی ہیں۔ اس وقت جب وہ جھوٹ بول رہا ہوتا ہے۔"

اوون "زوں" کی آواز کے ساتھ چل رہا تھا۔ مکئی کے دانے چٹخنے کی آواز وقفے وقفے سے سنائی دے رہی تھی۔

"ایک تو ہو گئی نگاہیں چرانا' باقی نو کون سی ہوتی ہیں؟" وہ اب صوفے پہ پاؤں نیچے کر کے' دوپٹا ٹھیک سے شانوں پہ پھیلا کر ذرا تمیز سے بیٹھ چکی تھی۔ کھلے بال چہرے کے دائیں جانب آگے کو ڈال دیے تھے۔ جامنی پلین لمبی قمیص' زیتونی رنگ کے دوپٹے اور چوڑی دار پائجامے کی ہمراہی بھی اس کے چہرے کو بشاشت نہیں دے پا رہی تھی۔ متورم آنکھیں اور زرد پڑتی رنگت ساری دوپہر کی کہانی واضح تھی۔

"نگاہیں چرانا؟ نہیں' لوگ جھوٹ بولتے ہوئے نگاہیں نہیں چراتے' یہ غلط تاثر ہے۔ ان فیکٹ جھوٹ بولتے ہوئے لوگ آپ کی آنکھوں میں ضرور دیکھتے ہیں اور وہیں سے وہ پکڑے جاتے ہیں۔"

"تم نے آخری دفعہ سچ کب بولا تھا؟" کمرے میں اب بھنی ہوئی مکئی کی خستہ سی خوشبو پھیلنے لگی تھی۔

"ابھی ڈیڑھ منٹ پہلے' جب میں نے کہا تھا کہ تمہاری ساری باتیں ٹھیک تھیں۔"

چلو جی۔ وہ پھر وہیں پہنچ گیا تھا۔

"جہان..... آئی ایم سوری۔ میں نے وہ دل سے نہیں کہا تھا۔"

"لیکن میں دل سے ہی کہہ رہا ہوں۔ تم نے ٹھیک کہا تھا۔ شاید یہ واقعی ہمارا آخری سفر ہو۔"

اوون میں زور کا پٹاخہ ہوا۔ شیشے کی ڈش پہ رکھے پیکٹ میں پڑا کوئی دانہ بھن کر پھول گیا تھا شاید۔ اس کے اندر بھی کچھ سلگا تھا۔

"ایسے مت کہو۔" وہ تڑپ کر اسے روکنا چاہتی تھی۔ کہنا چاہتی تھی کہ اگر وہ نہیں چاہتا تو وہ ادھر نہیں رکے گی۔ صبح ہوتے ہی اسے چھوڑ کر چلی جائے گی۔ مگر وہ سن نہیں رہا تھا۔

"تم نے صحیح کہا تھا۔ ہر وقت کی پلاننگ ٹھیک نہیں ہوتی۔ میرے منصوبے بھی بہت دفعہ مجھ پہ ہی الٹے پڑے ہیں۔ اب وہ وقت آگیا ہے کہ اپنی ذاتی زندگی میں مجھے اس چیز سے باز آجانا چاہیے۔ یا کم از کم اس سفر کے لیے ہی سہی۔"

وہ سانس لینے کو رکا۔

"میں تمہیں ہمیشہ سے وہ سب بتانا چاہتا تھا' مگر نہیں بتا سکا۔ مجھے معلوم تھا کہ تم میری بات نہیں سمجھو گی' جیسے کل رات سے نہیں سمجھ رہیں' مگر تم بھی صحیح ہو۔ مجھے ہر وقت اپنی مرضی نہیں ٹھونسنی چاہیے۔"

"جہان!" وہ اسے مزید بولنے سے روکنا چاہتی تھی۔ اس کا اپنا دل بھی اوون کی شیشے کی پلیٹ کی طرح گول گول گھومتا کسی منجھدار میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔

"بہت دفعہ ایسا ہوا کہ میں تمہیں وہ سب بتانا چاہتا تھا جو میں نے اس ویڈیو میں محفوظ کیا تھا' مگر میں یہ نہیں کر سکا۔ میں کچھ پا لینے کے بعد کھونے سے ڈرتا تھا یا شاید مجھے تم پہ اعتبار نہیں تھا کہ تم مجھے سمجھو گی۔ اب شاید تم سمجھو' مگر اس وقت تم نہ سمجھتیں۔"

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اس وقت وہ واقعی نہ سمجھ پاتی۔ مگر اب وہ ایسی باتیں نہ کرے۔ اس کا دل دکھ رہا تھا۔

"جو ہو گیا' سو ہو گیا۔ میں وہ سب دوبارہ نہیں دہرانا چاہتا۔ اب بھی مجھے تمہارے یہاں رہنے سے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں صرف اس لیے فکر مند تھا کہ مجھے کل انقرہ جانا ہے ایک ہفتے کے لیے' پھر واپس کپادوکیہ آجاؤں گا اور کچھ دن بعد واپس اپنے ملک چلا جاؤں گا۔ مجھے صرف یہی پریشانی تھی کہ تم میرے بغیر ادھر اکیلی نہ رہو۔ ویسے بھی تم کپادوکیہ دیکھنے کے لیے آئی ہو' میرے لیے نہیں۔" یہاں وہ ذرا تکان سے مسکرایا۔

حیا کا دل چاہا' کہہ دے' نہیں' میں تمہارے لیے آئی ہوں مگر انا اور خودداری دیوار بن گئی۔

"میں اکیلی نہیں ہوں۔" کہنے کے ساتھ اس نے ایک نظر بستر پہ گلابی پردے کے پیچھے سوتی بہارے پہ ڈالی۔ "یہ لوگ بہت اچھے ہیں۔ بہت خیال رکھتے ہیں۔" پھر ایک دم وہ چونکی۔ "کہیں تم نے تو انہیں نہیں کہا کہ میرا خیال رکھیں؟"

"اب اتنا فارغ نہیں ہوں میں کہ ہر جگہ تم پہ نظر رکھوں گا۔ مولوت بے اس علاقے کے ڈسٹرکٹ چیف ہیں اور یہ اپنے ہر گاہک کے ساتھ ایسے ہی پیش آتے ہیں۔ مہمان نواز ترک قوم' یونو۔ لیکن تم نے اچھا کیا کہ ان کے ہوٹل آئیں۔ یہ کافی محفوظ اور اچھا ہوٹل ہے۔ ایسے مشکوک نظروں سے مت دیکھو مجھے' میں نے واقعی ان کو کچھ نہیں کہا۔" وہ ذرا خفا ہوا۔

حیا نے دھیرے سے شانے اچکائے۔ اوون کب کا بند ہو چکا تھا۔ سارے میں بھنے مکئی کے دانوں کی خوشبو پھیلی تھی۔

"تو کیا اب میں یہاں رہ سکتی ہوں؟"

"ہاں! جب تک چاہو رہ لو۔ کل میں چلا جاؤں گا' واپسی تک اگر تم ہوئیں تو ہم دوبارہ مل لیں گے۔"

"انقرہ کیوں جانا ہے؟" اس نے ایک فطری طور پہ ذہن میں آنے والا سوال پوچھا تھا' مگر جہان چند لمحے اسے بہت خاموش نظروں سے دیکھتا رہا تھا۔

"ایک کام ہے۔"

"کیسا کام؟" اس کے انداز میں کچھ تھا کہ وہ پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

"ایک کام ادھورا چھوڑ آیا تھا' جب ابا کی ڈیتھ ہوئی تھی' تب میں جرمنی میں تھا۔ اب میرے پاس چند دن ہیں تو سوچا اس کو مکمل کر لوں۔" بات ختم کر کے وہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا' جیسے وہ اس کے استفسار کا منتظر تھا۔ حالانکہ اگر وہ پوچھتی تب بھی وہ نہیں بتائے گا' پھر بھی وہ چاہتا تھا کہ وہ پوچھے۔

حیا نے چند لمحے سوچا' پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اوکے! بات ختم۔" اس نے اس موضوع کو نہ کریدنے کا فیصلہ کیا تھا۔

"مگر اب ایسے مت کہنا کہ یہ ہمارا آخری سفر ہو سکتا ہے۔"

"غلط نہیں کہہ رہا۔ میں ترکی دوبارہ نہیں آسکوں گا۔ ترکی کے لیے اب ناکارہ ہو چکا ہوں' سو اس ملک میں ہو سکتا ہے یہ آخری....."

"کہہ رہی ہوں نا کہ ایسے مت کہو۔" وہ صوفے کے اپنے دونوں اطراف ہتھیلیاں رکھ کر اٹھنے لگی تو جہان نے رکنے کا اشارہ کیا۔

"ایک منٹ۔ میری بات ابھی ختم نہیں ہوئی۔"

وہ اٹھتے اٹھتے واپس بیٹھ گئی۔

"جتنے دن ہم ساتھ ہیں' سب کچھ میری مرضی سے طے ہو گا۔ سارے پروگرام' سارے شیڈول' کہاں ملنا ہے' کہاں جانا ہے' سب میں ڈیسائیڈ کروں گا اور تم کسی بات سے انکار نہیں کرو گی۔"

حیا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کا اجازت دینا ہی بہت تھا' اب کیا بحث کرتی۔

"کیا تم پاپ کارن کھاؤ گے؟" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ جہان نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے ہولے سے ہاتھ سے کنپٹی کو مسلا۔ شاید اس کے سر میں درد تھا۔

"میں بس چلوں گا۔" وہ اٹھا' دیوار میں لگے سوئچ بورڈ پہ لائٹ کا ناب گھمایا (جیسے ہمارے ہاں پنکھے کے ناب ہوتے ہیں) کمرے میں جلتا واحد زرد بلب مدھم ہو تا گیا۔ پھر اس نے کھڑکی کا پردہ ذرا سا سرکا کر باہر دیکھا۔

حیا نے اوون کا ڈھکن کھولا اور گرم گرم پھولا ہوا پاپ کارن کا پیکٹ نکالا۔ جہان تب تک کھڑکی کے سامنے سے ہٹ کر دوبارہ سے بتی تیز کر چکا تھا۔ (اگر ڈی جے ہوتی تو کہتی کہ ایسی بتیاں ہماری یونیورسٹی میں بھی پائی جاتی ہیں۔ لیکن اگر وہ ہوتی تو پھر مسئلہ ہی کیا تھا)

"آشیانہ کے نئے مہمان آگئے ہیں غالباً" باہر روش ہے۔ اس کے چھٹنے تک انتظار کرنا ہو گا۔" وہ صوفے پہ اسی جگہ بیٹھتے ہوئے بولا جہاں ابھی وہ بیٹھی تھی۔

"تم تھکے ہوئے لگ رہے ہو' چاہو تو لیٹ جاؤ۔ میں آتی ہوں۔"

اسے وہیں چھوڑ کر وہ ڈریسنگ روم میں آئی تاکہ وہاں سنگھار میز پہ رکھا شیشے کا بڑا پیالہ اٹھالے۔ اس جگہ پہ فرش پہ ابھی تک افشاں کے ذرات دکھائی دیتے تھے' حالانکہ بہارے نے صاف بھی کیا تھا۔

پیالہ اٹھاتے ہوئے اس نے آئینے میں خود کو ایک نظر دیکھا تو جھٹکا سا لگا۔ سرخ متورم آنکھیں' زرد پڑتا چہرہ۔

اللہ' اللہ' وہ اتنی دیر سے ایسی لگ رہی تھی؟ وہ بھی کیا کہتا ہو گا کہ وہ اس کے "غم" میں رو رہی تھی؟

پیالہ چھوڑ کر وہ باتھ روم میں گئی اور سنک کے اوپر جھک کر منہ پہ پانی کے چھینٹے مارے' پھر تولیے سے چہرہ تھپتھپایا' بال برش کیے اور ذرا خود کو سنبھالتے ہوئے باہر آئی۔

جہان اسی طرح سر ہاتھوں میں دیے بیٹھا تھا۔

"جہان!" اس نے محتاط انداز میں پکارا۔

جہان نے اسی پل سر جھکائے جھکائے ہاتھ کی پشت سے ہونٹوں کے اوپر چھوا۔

خون کے قطرے۔ وہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

"جہان! تمہاری ناک سے خون آرہا ہے؟"

وہ بنا کچھ کہے تیزی سے اٹھا اور باتھ روم کی طرف لپکا۔ حیا متحیر سی پیچھے آئی اور کھلے دروازے سے دیکھا ٹونٹی پوری کھولے وہ سنک پہ جھکا' ناک اور چہرے پہ پانی ڈال رہا تھا۔

وہاں کھڑے ہونا اسے مناسب نہ لگا تو واپس صوفے پہ آکر بیٹھ گئی۔ پتا نہیں اسے کیا ہوا تھا۔ ایسے اچانک.....؟

چند منٹ گزرے کہ وہ تولیے سے گیلا چہرہ خشک کرتا باہر آیا۔

"کیا ہوا تھا؟" وہ فکر مندی سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ جواب دیے بنا اس سے ذرا فاصلے پہ صوفے پہ بیٹھا اور تولیہ اس کے ہاتھ پہ ڈال دیا۔

"نکسیر کیوں پھوٹی۔ اتنی گرمی تو نہیں ہے' کیا پہلے بھی کبھی ایسا ہوا ہے؟"

"کتنے سوال کرتی ہو!" وہ جیسے اکتا سا گیا۔

"جتنے بھی کروں' مجھے حق ہے اس کا۔ اب بتاؤ کیا ہوا تھا؟"

جہان نے نقاہت بھری نظروں سے اسے دیکھا اور پھر چند لمحے تک یونہی دیکھتا رہا۔ ایسے ہی ابھی وہ انقرہ کے "کام" کے متعلق بات کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

"اردو میں بات کرتے ہیں حیا! وہ جاگ رہی ہے۔"

حیا نے چونک کر بہارے کی طرف گردن موڑنی چاہی تو وہ جیسے بگڑ کر بولا۔

"ہاں! اب تم اس کو دیکھنے لگو تاکہ اسے پتا چل جائے کہ ہم اس کی بات کر رہے ہیں۔"

"سوری!" اس کی گردن خفیف سی آدھے راستے سے پلٹ آئی۔ "مگر تمہیں کیسے پتا کہ وہ جاگ رہی ہے؟"

"اس کے پاؤں کا انگوٹھا تناؤ کی پوزیشن میں ہے' پیشانی پہ پڑے بل اور پلکوں کی لرزش۔ مجھے پتا ہے' وہ نہیں سو رہی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی سوتی بن گئی تھی' اسے ڈر ہے کہ میں اسے ڈانٹوں گا۔"

یہ آدمی بھی نا' کبھی کسی کو انسانوں کی نظر سے نہیں دیکھے گا۔

"اچھا اب بتاؤ تمہیں کیا ہوا تھا؟"

نکسیر پھوٹنے کی وجہ کوئی عام سی بھی ہو سکتی تھی مگر اس کا انداز اس بات کا غماز تھا کہ کچھ ہے' جو وہ چھپانا چاہتا ہے مگر بتانا بھی چاہتا ہے۔

چند لمحے وہ بالکل خاموش رہا۔ مکئی کے دانوں کی خوشبو ہر گزرتے پل باسی ہوتی گئی' پھر اس نے دھیرے سے کہنا شروع کیا۔

"انقرہ میں میری سرجری ہے۔ انٹرا کرینئل (کھوپڑی کو کھول کر کی جانے والی) سرجری۔" اس نے رک کر حیا کے تاثرات دیکھے۔ وہ بنا پلک جھپکے سانس روکے اسے منتظر سی دیکھ رہی تھی۔

"جب میں جیل میں تھا تو مجھے ادھر آنکھ کے قریب ایک زخم آیا تھا۔ یہاں ایک کیل گھس گئی تھی۔ ایک اعشاریہ ایک انچ کی کیل۔ یہ سر درد' اور کچھ عرصے سے نکسیر پھوٹنے کی تکلیف' یہ سب اسی کی وجہ سے

ہے۔ اس کو نکالنے کے لیے سرجری کروانی ہوگی۔ نہ کروائی تو یہ مسلسل درد اور اس کے آگے ٹریول کرنے کا خطرہ رہے گا اور اگر سرجری ناکام ہوگئی تو بینائی جا سکتی ہے یا مستقل معذوری۔ جب ابا کی ڈیتھ ہوئی، تب میں اسی لیے جرمنی میں تھا، مگر تب میں ... ہمت نہیں کر سکا۔"

"اچھا!" جہان کی توقع کے برعکس حیا نے سمجھ کر اثبات میں سر ہلایا، کوئی شدید تاثر دیے بغیر وہ بولی۔

"پہلے جرمنی سے کروانے گئے تھے تو اب انقرہ سے کیوں؟"

"ان دنوں میرا ترکی سے باہر رہنا ضروری تھا، جبکہ ابھی مجھے کچھ دن ادھر لگ جائیں گے، میں اس وقت کو ضائع نہیں کرنا چاہتا۔"

وہ بس خاموشی سے اسے دیکھے گئی۔

"کل میری سرجری ہے۔ میں ایک گھنٹے بعد انقرہ کے لیے نکل جاؤں گا۔ اگر سب ٹھیک ہو گیا تو واپس آجاؤں گا، تب تک تم ....."

"تب تک میں تمہارے ساتھ ہوں گی۔ ابھی ہماری ڈیل ہوئی ہے کہ میں یہاں تمہارے ساتھ رہوں گی۔"

"نہیں! ہماری بات کپادوکیہ کی ہوئی تھی۔" وہ قطعیت سے کہتا منع کرنا چاہ رہا تھا مگر وہ کچھ نہیں سن رہی تھی۔

"تم نے کہا تھا یہاں اور یہاں سے مراد میں نے ترکی لیا تھا۔ ہماری ڈیل ترکی کی ہوئی تھی۔ جب تک تم یہاں، یعنی کہ ترکی میں ہو، میں ادھر رہ سکتی ہوں۔ تم بتاؤ، کون سا ہاسپٹل ہے اور کب جانا ہے؟" وہ اتنے اٹل لہجے میں کہہ رہی تھی کہ وہ زیادہ مزاحمت نہ کر پایا۔

"اس کا کیا کرو گی؟" اس نے ذرا تذبذب سے بنا اشارہ کیے بہارے کا پوچھا۔

"فکر نہ کرو، اسے ہاسپٹل نہیں لاؤں گی، کچھ کر لوں گی۔ تم بس مجھے شیڈول سمجھاؤ۔"

پھر وہ اس کی کہی ہر بات نوٹ کرتی گئی۔ جب ساری باتیں ختم ہو گئیں اور پاپ کارن کی خوشبو ہوا میں رچ بس کر فنا ہو گئی تو وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ آشیانہ کے صحن کا رش اب چھٹ چکا تھا۔

"تم ایک دفعہ پھر سوچ لو کہ تم میرے ساتھ آنا چاہتی ہو یا نہیں۔ میں تمہیں اپنی وجہ سے مسئلوں سے دوچار نہیں کرنا چاہتا۔" دروازے پہ پہنچ کر وہ یہ کہنے کے لیے رکا تھا۔

"اب جاؤ اور میرا وقت ضائع مت کرو، مجھے صبح کے لیے پیکنگ بھی کرنی ہے۔"

اس کے باہر نکلتے ہی اس نے زور سے دروازہ بند کر کے مقفل کیا اور تیزی سے باتھ روم کی طرف آئی۔ دونوں ہاتھ بیسن کے سائیڈوں پہ رکھے، چہرہ جھکائے چند گہرے گہرے سانس لے کر اس نے خود کو سنبھالنا چاہا۔

اتنی دیر سے جہان کے سامنے شدید ضبط اور مشکل سے اس نے جو آنسو روک رکھے تھے، وہ تیزی سے ابل پڑے۔ وہ ایک دم دبی دبی سسکیوں سے رونے لگی تھی۔

پانچ سال..... پانچ سال سے وہ اس تکلیف میں مبتلا تھا، اور اس نے کبھی کسی کو نہیں بتایا؟ وہ کیوں ہر شے، ہر دکھ اپنے اندر رکھتا تھا؟ کیوں باقی سب کی طرح غموں کا اشتہار لگا کر ہمدردیاں نہیں سمیٹتا تھا؟ کتنی دفعہ صائمہ تائی، تایا فرقان حتیٰ کہ ابا نے بھی اسے جتایا تھا کہ وہ اپنے باپ کے جنازے پہ نہیں آیا۔ وہ آگے سے چپ رہا تھا۔ ایک دفعہ بھی نہیں بتایا کہ وہ اس وقت آپریشن ٹیبل پہ تھا۔ کیوں تھا وہ ایسا کہ وہ محبت لینے کی کوشش نہیں کرتا تھا اور پھر بھی اس سے محبت ہو جاتی تھی؟

اس کی آنکھوں سے گرتے آنسو سنک کے دہانے سے لڑھک کر جالی دار بھنور تک پھسل رہے تھے۔ وہاں ایک کونے میں خون کا ایک ننھا سا قطرہ ابھی تک لگا ہوا تھا۔ جہان نے سارا سنک صاف کر دیا تھا، مگر یہ پھر بھی رہ گیا۔ اس نے انگلی کی پور پہ وہ قطرہ اٹھایا اور ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

"کیا اس کے ملک کے جوانوں کا خون اتنا ارزاں تھا کہ یونہی بہتا رہے اور کسی کو فرق بھی نہ پڑے؟ زندگی بھی بعض دفعہ ہم سے ہماری بساط سے بڑھ کر قربانی مانگ لیتی ہے۔"

کچھ دیر بعد وہ منہ ہاتھ دھو کر باہر آئی تو وہ صوفہ جہاں کچھ دیر قبل چاندی کے مجسموں کا بسیرا تھا، اب ادھر اس کی چھوٹی بلی بیٹھی پاپ کارن کے پیالے سے ایک ایک دانہ اٹھا کر منہ میں ڈال رہی تھی۔ اسے آتا دیکھ کر معصومیت سے مسکرائی۔

"کھاؤ گی؟" ساتھ ہی پیالہ بڑھایا۔

"نو تھینکس۔" اس کی بھوک مر گئی تھی اور بھی بہت کچھ مر سا گیا تھا۔ وہ اپنا بیگ الماری سے نکالنے لگی۔

"عبدالرحمٰن سے تم پہلے بھی ملی تھیں نا اور تم نے مجھے نہیں بتایا کیا اس نے میرے بارے میں کچھ کہا؟"

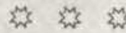
"بہارے! ہم انقرہ جا رہے ہیں۔"

پاپ کارن ٹونگتا اس کا ہاتھ رک گیا۔ بھوری آنکھوں میں شدید تحیر در آیا۔

"کیوں؟"

"بس، ایک کام ہے مجھے۔ کچھ پیپر ورک کا مسئلہ ہے۔ دو چار دن میں واپس آجائیں گے۔" اس کی تشفی و سمجھ کے مطابق جواب دیتی وہ اپنا سامان سمیٹنے لگی۔

بہارے الجھی الجھی سی بیٹھی رہ گئی۔ پاپ کارن کا پیالہ اس نے بے دلی سے میز پہ رکھ دیا۔ اسے کھانا شاید ان تینوں میں سے کسی کا نصیب نہیں تھا۔



انقرہ اتنا ہی خوب صورت اور صاف ستھرا سا شہر تھا جتنا کہ استنبول مگر اس سے نہ وہ شہر دیکھا گیا نہ ہی کچھ اور۔ آس پاس کیا ہو رہا ہے اسے کچھ خبر نہیں تھی۔ اس کا دل، دماغ اور ساری توجہ بس ایک نقطے پہ تھی۔ آج جہان کا آپریشن ہے۔

اس نے جہان کے ہاسپٹل سے دو بلاک چھوڑ کر ایک ہوٹل میں کمرا لیا تھا۔ بہارے کو البتہ وہ ہاسپٹل کے اندر لے کر نہیں جا سکتی تھی، اور اسے ہوٹل میں تنہا چھوڑنے کو دل نہیں مانتا تھا۔ وہ اس بچی کو کس کے پاس چھوڑے؟ اور ہر مسئلے کی طرح اس میں بھی اسے ہالے کا خیال آیا تھا۔

"ہالے! میں کیا کروں؟" فون پہ ہالے کو تھوڑی بہت جمع تفریق کے ساتھ ساری بات بتا کر وہ اب اس سے مدد مانگ رہی تھی۔

"یہ تو کوئی مسئلہ نہیں۔ میری نانی انقرہ میں رہتی ہیں، جو ایڈریس تم بتا رہی ہو، وہاں سے کافی قریب گھر ہے ان کا۔ تم صبح بچی کو وہیں چھوڑ دیا کرو۔ پھر شام میں لے جانا۔ چاہو تو تم بھی وہیں رہ لو۔"

اوہ! ہالے کی نانی۔ اسپرنگ بریک میں جب ایکسچینج اسٹوڈنٹس ترکی کی سیر کو گئے تھے تو ان کے ڈورم بلاک سے جو بھی انقرہ گیا، ہالے کی نانی کے پاس ضرور گیا تھا۔

"مگر تم نے واقعی اس کو اغوا تو نہیں کیا نا؟" وہ ہنستے ہوئے پوچھنے لگی، پھر اچانک جیسے اسے یاد آیا۔ "وہ ہوٹل گرینڈ والا لڑکا دو دفعہ آیا تھا۔ میں نے بتایا کہ تم نہیں ہو مگر وہ مصر تھا اور..... ایک منٹ تم تو ازمیر میں تھیں۔ پھر انقرہ.....؟"

"اوہ ہاں، وہ میں آج ہی آدھر آئی ہوں، مگر اسے مت بتانا۔" اور یہ بات تو ابھی تک اس نے جہان کو بھی نہیں بتائی تھی۔ شاید اس لیے کہ اس سے بڑے مسائل اس کے سامنے تھے۔

ہالے کی نانی صبیحہ نور اتنی ہی مشفق، ملنسار اور مہمان نواز خاتون تھیں جتنی کہ ترک عوام ہو سکتے تھے۔

اور ایک وہ لوگ تھے۔ اسلام آباد میں ان کی یونیورسٹی میں کتنی ہی غیر ملکی اور بالخصوص ترک لڑکیاں پڑھنے آئی ہوئی تھیں، مجال ہے جو وہ کبھی کسی کو اپنا شہر گھمانے لے گئی ہو۔ پتا نہیں کیوں مگر ہم پاکستانی اسٹوڈنٹس کے پاس ایسے کاموں کے لیے وقت ہی نہیں ہوتا۔

سب سے اچھی بات یہ ہوئی کہ صبیحہ آنٹی نے بتایا' مسز عبداللہ' مہر اور عروہ کل ان کے پاس رہنے آرہی تھیں۔

ڈی جے اور اس کی ہوسٹ فیملی' پہلا کھانا' پلاؤ اور مسور کی دال کا چوربہ..... بعض لوگوں کا نام بھی کسی کتاب کے سرورق کی طرح ہوتا ہے' سنتے ہی یادوں کا ایک بے کراں سمندر ہر سوامڈ آتا ہے۔

صبیحہ آنٹی کو اپنا مسئلہ سمجھا کر کہ ایک دوست کے لیے اسے اسپیشل جانا ہے اور بہارے ادھر نہیں رہ سکتی' اس نے بہارے کو علیحدہ لے جا کر چند ایک ہدایات مزید کیں۔

"تم اچھی لڑکی بن کر رہو گی نا؟"

بہارے نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ البتہ وہ خوش نہیں لگ رہی تھی۔

"تم مجھے روز چھوڑ کر چلی جایا کرو گی کیا؟ سب مجھے ایسے ہی چھوڑ کر چلے گئے۔ مجھ سے کوئی پیار نہیں کرتا۔"

اس کا پہلے سے دکھی دل مزید دکھ گیا۔ ایک دم سے اسے اس پھول سی بچی پہ بے پناہ ترس آیا۔ پاشا بے کے اعمال نے اس کی فیملی کو کسی فٹ بال کی طرح بنا دیا تھا۔ عائشے اپنی بہن کے لیے بہت پریشان تھی' مگر وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔

"میں شام میں آجاؤں گی اور تمہیں ایک فون بھی لادوں گی' اس سے تم جب چاہے' مجھ سے اور عائشے سے بات کر لینا۔"

"ٹھیک ہے۔" چھوٹی بلی مسکرا دی۔ اسے یک گونہ طمانیت کا احساس ہوا۔

صبیحہ آنٹی کے گھر سے وہ اسپتال آگئی۔ یہ ایک پرائیویٹ نیورو سینٹر تھا اور وہ ایڈمٹ ہو چکا تھا۔ اس نے لباس بھی تبدیل کر لیا تھا اور بس سرجری کا منتظر تھا۔ ابھی اسے اوٹی میں لے کر جانے میں ذرا وقت تھا' سو آپریشن سے قبل وہ آخری دفعہ اسے دیکھنے آئی تھی۔

وہ خاموش تھا۔ چہرہ بے تاثر' مگر زرد۔ اوٹی کے لباس میں تو وہ اور بھی زیادہ پژمردہ لگ رہا تھا۔

"کیسے ہو؟" اس کے سامنے کھڑے وہ بس اتنا ہی پوچھ سکی۔ جہان نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ بیڈ کے کنارے پہ بیٹھا تھا۔

"ٹھیک ہوں۔"

چند لمحے خاموشی کی نذر ہوئے' پھر وہ بولی۔

"تم نے آخری دفعہ سچ کب بولا تھا؟"

"ابھی ایک منٹ قبل جب میں نے کہا' میں ٹھیک ہوں۔"

اس کی باتیں بھی اسی کی طرح ہوتی تھیں۔ پہیلی در پہیلی۔

"میرا بیگ رکھ لو۔ اس میں میرا فون بھی ہے۔"

اس نے اپنا چمڑے کا دستی بیگ سائیڈ ٹیبل سے اٹھا کر حیا کی طرف بڑھایا جسے حیا نے تھام لیا۔

"اگر مجھے کچھ ہو جائے تو میرا فون کھولنا۔ ویسے وہ فنگر پرنٹ سے کھلتا ہے مگر تمہارے لیے میں نے تمہاری ڈیٹ آف برتھ متبادل پاس ورڈ کے طور پہ لگا دی ہے۔ پورے آٹھ ہندسے' اوکے؟ تم فون بک میں پہلے نمبر کو کال کر کے سب بتا دینا۔"

اس کے ہاتھوں میں پکڑا بیگ یکدم بہت بھاری ہو گیا۔

"اس کی نوبت نہیں آئے گی۔ تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

جہان نے جواب نہیں دیا۔ پھر زیادہ مہلت ملی بھی نہیں۔ وہ اسے لے گئے اور وہ "عملیات خانے" (آپریشن تھیٹر کا ترک نام) کے باہر ایک کرسی پہ آ بیٹھی۔

وہ کہہ رہا تھا' اگر مجھے کچھ ہو جائے اور وہ سوچ رہی تھی' اگر اسے کچھ ہو گیا تو وہ کیا کرے گی؟ زندگی میں بعض "اگر" کتنے خوفناک ہوتے ہیں نا۔ ان کو آدھا سوچ کر بھی دم گھٹنے لگتا ہے۔

وہ بس جہان کا بیگ گود میں رکھے اسے کسی واحد سہارے کی طرح مضبوطی سے تھامے کرسی پہ بیٹھی سامنے شیشے کے بند دروازوں کو دیکھے گئی۔ وہ کیسی

عجب سی کیفیت ہوتی ہے کہ جب دعائیں مانگی جاتی۔ دعا کے لیے اٹھے ہاتھوں کو دیکھ کر انہی ہاتھوں سے کیے جانے والے گناہ یاد آجاتے ہیں تب لگتا ہے کہ معافی ابھی تک نہیں ملی۔ کیا واقعی سارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں؟ ہمیں کیوں لگتا ہے کہ ہم گناہوں سے توبہ کر لیں گے اور پھر انہیں بھلا کر سب ٹھیک ہو جائے گا گناہ ایسے نہیں پیچھا چھوڑتے۔ ان کے آثار ہمیشہ ان جگہوں پہ موجود رہتے ہیں۔ گناہ تو ساری عمر پیچھا کرتے ہیں۔ کیا ان سے کوئی رہائی تھی؟ کیا ان کی ملکیت سے کوئی آزادی تھی؟ ایسا کیوں نہ ہو سکا کہ وہ عائشے گل کی طرح ہوتی؟ ہمیشہ سے سچی' ہمیشہ سے باحیا اور نیک۔

اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور پھر انہیں گرا دیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ کیا مانگے یہ گرہ کہاں لگی تھی؟ دعا کب روٹھی تھی؟ شاید ڈی جے کے وقت ہاں تب بھی وہ ایسے ہی ایک اسپتال کے عملیات خانے کے باہر بیٹھی تھی۔

وہ گرہ اب کیسے کھلے گی؟

فون کی گھنٹی بجی تو وہ ذرا چونکی۔ پھر موبائل دیکھا۔ ابا کالنگ۔

"السلام علیکم ابا!" اس نے فون کان سے لگایا تو اپنی آواز بے حد پست اور بھاری لگی۔

"وعلیکم السلام! کیا حال ہے اور کدھر ہو؟" پھر وہ رسمی علیک سلیک' حال احوال اور تمہید کے بعد پوچھنے لگے۔

"تم واپس کب آرہی ہو؟"

فون کان سے لگائے' اس نے زور سے آنکھیں بند کر کے بہت سے آنسو اپنے اندر اتارے' پھر آنکھیں کھولیں۔ سامنے کا منظر دھندلا گیا تھا۔

"ابا! مجھے ایک ہفتہ مزید لگ جائے گا۔"

"حیا!" ابا کو جیسے اکتاہٹ ہوئی۔ "اتنے دن ہو چکے ہیں' کیا ابھی تک تمہارا ٹور ختم نہیں ہوا۔"

"آپ نے خود ہی تو کہا تھا کہ..... کہ لندن جانے کے بجائے ترکی میں جتنا چاہے وقت گزار لوں۔"

"ہاں! ٹھیک ہے مگر تمہاری اماں روحیل کا ولیمہ کرنا چاہتی ہیں' سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں اور ہاں! جہان کا کیا پروگرام ہے' کیا وہ تمہیں ملا؟" حیا نے ایک نظر آپریشن تھیٹر کے بند شیشے کے دروازوں کو دیکھا۔

"جی! وہ یہیں ہے۔ وہ..... وہ بھی ساتھ ہی آئے گا۔" اس کی آواز میں خود بھی اتنی بے یقینی تھی کہ ابا نے جیسے دوسری طرف استہزائیہ سر جھٹک دیا۔

"مجھے پتا ہے۔ وہ تمہیں نہیں ملا ہو گا۔ خیر! اس کو چھوڑو' تم جلد آنے کی کوشش کرو۔"

وہ کتنے پر یقین تھے کہ جہان ان کی بیٹی سے قطع تعلق کرنا چاہتا ہے۔ حالانکہ وہ تھے تو ان دونوں کی منگنی پہ مگر نہیں لوگ اپنی آنکھوں کے بجائے اپنے کانوں پہ یقین کرنے کو ترجیح دیا کرتے ہیں۔

"ابا! میں جلد نہیں آسکتی۔ ایک' ایک دوست ہاسپٹل میں داخل ہے' اس کی انٹرا کرینئل سرجری ہے' میں اسے یہاں نہیں چھوڑ سکتی ابا۔" آنسو بے اختیار اس کی آنکھوں سے لڑھک کر نقاب کے اندر جذب ہونے لگے تھے۔

ابا چند لمحے کو بالکل خاموش ہو گئے۔

"اس کا یہاں کوئی نہیں ہے ابا! اس کی ماں' رشتے دار' فیملی' یہاں اس کا کوئی نہیں ہے ابا! میں اسے تنہا نہیں چھوڑ سکتی۔ اس نے ان پانچ ماہ میں استنبول میں میرا بہت خیال رکھا ہے' ہر موقع پہ اس نے میرا ساتھ دیا ہے' اب کیا میں اسے آپریشن تھیٹر میں چھوڑ کر آجاؤں؟"

"اوہ آئی سی!" وہ ذرا دھیمے پڑے "کیا وہ لڑکی..... ہالے نور..... کیا اس کا آپریشن ہے؟"

وہ ذرا چونکی۔ "آپ ہالے کو کیسے.....؟" ساتھ ہی دوسرے ہاتھ سے بھیگی آنکھیں صاف کیں۔

"تمہیں کیا لگتا ہے' جب تم کچن میں کھڑی ہو کر نور بانو کو ترکی نامہ سنا رہی ہوتی تھیں تو سارا گھر برداشت سے سننے کے علاوہ اور کیا کر رہا ہوتا تھا؟"

"اوہ اچھا۔" ہالے کا نام تو وہ بہت لیتی تھی' ابا اس سے واقف تھے۔ پھر بھی اس نے تردید یا تصدیق نہیں کی۔ جھوٹ وہ بولنا نہیں چاہتی تھی اور سچ کہنے کا حوصلہ نہیں تھا۔

"ابا جب تک وہ اسٹیبل (stable) نہ ہو جائے' میں ادھر ہی رہوں گی۔ روحیل کو اتنی جلدی ہے تو کر لے میرے بغیر اپنا ولیمہ۔"

"اچھا ٹھیک ہے مگر پھر جیسے ہی وہ ٹھیک ہو' تم واپس آجانا۔" چند مزید نصیحتیں کر کے انہوں نے فون بند کر دیا۔

حیا چند لمحے فون کو دیکھتی رہی' پھر پھپھو کا نمبر ملایا۔

"ہیلو؟" پھپھو نے تیسری بیل پہ فون اٹھا لیا تھا۔

اس نے کچھ کہنا چاہا' مگر کہہ نہ سکی۔ حلق میں کچھ پھنس سا گیا تھا۔ آنسو بار بار ابل رہے تھے۔

"ہیلو! حیا؟" پھپھو اس کا نمبر پہچاننے کے باعث اسے پکار رہی تھیں مگر اس کے سارے الفاظ مر گئے تھے۔ وہ انہیں بتانا چاہتی تھی کہ ان کا بیٹا کہاں ہے' کیسا ہے' وہ اس کے لیے دعا کریں' مگر...... کچھ کہا ہی نہیں گیا۔

"ہیلو؟"

اس نے کال کاٹ دی اور پھر فون بند کر دیا۔ جہان نے کسی کو بھی بتانے سے منع کیا تھا اور وہ اس کا اعتبار نہیں توڑنا چاہتی تھی۔ عجیب بے بسی سی بے بسی تھی

سیکنڈ' منٹ' گھنٹے...... وقت گزرتا جا رہا تھا۔ اس نے ذہن پہ زور دینے کی سعی کی کہ جب کسی کا آپریشن ہو تو کیا پڑھنا چاہیے؟ صائمہ تائی کہتی تھیں کہ پہلے کلمے کو "سوا لاکھ" دفعہ پڑھنا چاہیے۔ جب بھی کوئی بیمار ہوتا یا کسی کزن کا انٹری ٹیسٹ یا ایڈمیشن کا مسئلہ ہوتا' تائی کے لاؤنج میں وہی ایک ماحول بج جاتا۔ چاندنیاں بچھا کر کھجور کی گٹھلیوں کے ڈھیر لگا دیے جاتے۔

اسپتال کا وہ کاریڈور اب سرد پڑتا جا رہا تھا۔ جولائی کی شام بھی بہت ٹھنڈی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے سوچنا چاہا کہ وہ اس وقت کیا پڑھے؟ بغیر حساب رکھے بغیر گنے توجہ اور یکسوئی سے کیا مانگے؟ مگر وہ گرہ کھلنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ ڈی جے کے بعد اس نے دعا مانگنی چھوڑ دی تھی اور پردے کے بعد شکوہ کرنا چھوڑ دیا تھا۔ مگر ابھی وہ شکوہ کرنا چاہتی تھی۔ جیسے ایوب علیہ السلام نے کیا تھا۔

اس نے کرسی کی پشت پہ دیوار سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ بس یہی ایک شکوہ تھا جس پہ لب مہر بند نہیں رہے تھے۔

"میں اپنے دکھ اور ملال کی شکایت صرف اللہ سے کرتی ہوں۔"

دھات کی کرسی جیسے مقناطیس بن گئی تھی اور چاندی کے مجسمے کا قطرہ قطرہ اپنے اندر جذب کر رہی تھی۔

"میں اپنے دکھ اور ملال کی شکایت صرف اللہ سے کرتی ہوں۔"

کرسی نے اس کی ساری چاندی نچوڑ لی تھی۔ لوہے کا ایک خول باقی رہ گیا تھا جسے مقناطیسی نشست نے خود سے جوڑ لیا تھا۔

"میں اپنے دکھ اور اپنے ملال کی شکایت صرف اللہ سے کرتی ہوں۔"

اس کے قدموں میں جیسے بیڑیاں ڈل گئی تھیں۔ وہ چاہ کر بھی نہ حرکت کر سکتی تھی' نہ ہی سانس لے سکتی تھی۔ ہر طرف جیسے اندھیرا تھا۔ اس ایک شخص کو کھو دینے کا صرف احساس بھی اس تاریک سرنگ کی طرح تھا جس کا کوئی اختتام نہ تھا۔ اس کی ساری چاندنی اس اندھیرے میں ڈوب گئی تھی۔

"میں اپنے دکھ اور اپنے ملال کی شکایت صرف اللہ سے کرتی ہوں۔"

پانچ' ساڑھے پانچ گھنٹے گزر گئے تھے' اور تب ہی شیشے کا وہ دروازہ کھلا۔ اس نے سرجن ڈاکٹر کو اپنی جانب آتے دیکھا۔ اس کے لوہے کے خول کو کرسی کے مقناطیس نے یوں چپکا رکھا تھا کہ وہ چاہنے کے باوجود

بھی اٹھ نہ سکی۔

"کیا ہوا ڈاکٹر؟" اس نے خود کو کہتے سنا۔

"سرجری پیچیدہ تھی مگر گولی بہت اندر تک نہیں گئی تھی' ہم نے اسے نکال لیا ہے۔" ڈاکٹر اس کو بتانے لگے تھے۔ اس کی کھوپڑی کا جو حصہ ڈیمج ہوا تھا اسے titanium mesh کے ساتھ ری پلیس کر دیا گیا ہے اور......"

"وہ ٹھیک ہے یا نہیں؟" اس نے بے قراری سے ان کی بات کاٹی۔ وہ بھی پتا نہیں کون سی زبان بولے جا رہے تھے۔

"ہاں! آف کورس۔ وہ ٹھیک ہے۔ سرجری کامیاب رہی ہے۔ جیسے ہی انستھیزیا اترے گا اور وہ اسٹیبل ہو جائے گا' تو آپ اس سے مل سکیں گی۔"

زندگی میں بعض خبریں انسان کو کیسے ملتی ہیں؟ شاید جیسے اوپر سے بہتی کوئی آبشار ہو جس کا دھارا اسے بھگو دے یا پھر جیسے آسمان سے سونے کے تنکے گر رہے ہوں یا جیسے لہلہاتے سبزہ زار کے ساتھ کسی چشمے کے ٹھنڈے پانی میں پاؤں ڈال کر بیٹھنا ہو۔

مرہم' ٹھنڈ' سکون۔

"شکریہ' بہت شکریہ!" اس کی آنکھیں اور آواز دونوں بھیگ گئیں۔ نقاب کے اوپر سے اس نے لبوں پہ ہاتھ رکھ کر جیسے ابلتے جذبات کو قابو کرنے کی کوشش کی پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ لوگ سکون پانے پہ نڈھال سے ہو کر بیٹھ جایا کرتے ہیں' مگر وہ اس کیفیت میں اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

مقناطیس غائب ہو گیا تھا اور چاندی کا مجسمہ پھر سے چمکنے لگا تھا۔

"اللہ آپ کو بہت خوش رکھے۔" زندگی میں کسی کو اس کے منہ پہ اتنے دل سے اس نے شاید پہلی دفعہ دعا دی تھی۔

وہ ایک پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ سر کو جنبش دے کر آگے بڑھ گئے۔

جس شیشے کے دروازے سے وہ آئے تھے' اس کے پار عملے کے دو افراد ایک اسٹریچر دھکیلتے لے جا رہے تھے

وہ دوڑ کر دروازے تک آئی اور چہرہ شیشے کے دروازے کے قریب لے جا کر دیکھا۔ وہ جہان ہی تھا۔ لیٹے ہوئے اس کی گردن ایک طرف کو ڈھلکی تھی یوں کہ چہرہ حیا کے سامنے تھا۔ بند آنکھیں' نیچے گہرے حلقے۔ سر پٹیوں میں جکڑا۔ ایک پٹی آنکھ کے قریب سے گزرتی تھی۔ بے ہوش بے خبر۔ اسٹریچر آگے بڑھ گیا۔ وہ بس اسے دیکھتی رہ گئی۔

دونوں کے درمیان اس دفعہ بھی شیشے کی دیوار تھی' ایسی ہی جیسے بہت پہلے ان کے درمیان رہی تھی۔ تب وہ دھندلی تھی۔ آر پار کا منظر مبہم تھا' لیکن اب وہ صاف تھی۔ سب واضح تھا۔ مگر دیوار تو دیوار ہوتی ہے اور ہاتھ زخمی کیے بغیر اس دیوار کو ہٹانا ممکن بھی تو نہ تھا۔

بہت تھکی تھکی سی وہ واپس کرسی پہ آ کر بیٹھ گئی۔ اس نے ٹھیک سے دعا نہیں کی تھی' مگر اب وہ ٹھیک سے شکر تو کر سکتی تھی نا۔

☆ ☆ ☆

سلطنت ترکیہ کے دارالحکومت انقرہ پہ شام کا نیلگوں' سرمئی پن چھا رہا تھا۔ اس کے پرائیویٹ روم تک آنے سے قبل وہ اپنے ہوٹل کے قریب ایک فلورسٹ سے سفید گلابوں کا ایک بڑا سا بوکے لے آئی تھی اور اب اس کے کمرے میں کھڑی ایک کارنر ٹیبل پہ رکھے گلدان میں وہ پھول سیٹ کر رہی تھی۔

سفید گلاب جب کانچ کے گلدان میں جلوہ گر ہو چکے تو اس نے چہرہ ان کے قریب کر کے آنکھیں موندے سانس اندر کو اتاری۔ تازہ' دلفریب مہک سارے وجود میں اندر تک گھل گئی۔

پھر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ سو نہیں رہا تھا' بس گردن سے ذرا نیچے تک شیٹ ڈالے' آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ سر ویسے ہی پٹی میں جکڑا تھا اور اوپر سفید جالی دار سی ٹوپی تھی۔

"کیا تمہیں کچھ چاہیے؟" کہنے کے ساتھ حیا نے

گلدستے سے ایک ادھ کھلی کلی علیحدہ کی۔
"اوں ہوں!" وہ بند آنکھوں سے زیر لب بڑبڑایا۔
"اوکے!" وہ کلی ہاتھ میں لیے اس لمبے سے کاؤچ پہ آ ٹکی جو بیڈ کی پائینتی کے قریب ہی دیوار کے ساتھ لگا تھا۔ عبایا اس نے نہیں اتارا تھا، بس نقاب نیچے کر لیا تھا۔

"ڈاکٹرز کہہ رہے تھے، تم بہت جلد ری کور کر لو گے۔" چند لمحے گزرے تو اس نے گلاب کی ٹہنی کو انگلیوں پہ گھماتے ہوئے بات کرنے کی ایک اور سعی کی۔
"پتا ہے مجھے۔" اس نے آنکھیں نہیں کھولیں، البتہ ماتھے پہ ایک اکتاہٹ بھری شکن کے ساتھ جواب دیا۔
وہ پروا کیے بغیر ہاتھ میں پکڑے سفید گلاب کو اسی طرح گھمائے گئی۔ بہت کچھ یاد آ رہا تھا۔
"تمہیں یاد ہے، جب ہم پہلی دفعہ استنبول میں ملے تھے، تب تم نے پوچھا تھا کہ کون حیا۔" ذرا سا مسکرا کر کہتے ہوئے اس نے جہان کو دیکھا جس نے اس بات پہ آنکھیں کھول کر ایک اچٹتی نظر اس پہ ڈالی تھی۔
"جیسے کہ تم جانتے ہی نہیں تھے کہ کون ہے حیا۔"
"تو تم نے آگے سے کیا کہا؟ پھپھو کی بھتیجی۔ یعنی پھپھو سے ملنے آئی ہو۔"
"ہاں تو؟ ان ہی سے ہی ملنے آئی تھی نا۔" اسے ان باتوں کو دہرانے میں مزا آنے لگا تھا۔
"بالکل! جیسے ابھی کیا دو کیہ دیکھنے آئی ہو۔"
"سو تو ہے۔" اس نے ذرا سے شانے اچکائے۔
"اور کوئی تھا جو تایا کے گھر جوتے اتار کر داخل ہو رہا تھا اور ایپل ٹی کے علاوہ تو اسے کسی چائے سے واقفیت نہ تھی۔"

جہان نے آنکھیں واپس بند کر لیں۔ کاؤچ کے اس طرف شیشے کا ایک دروازہ تھا جو باہر کھلتا تھا۔ اس کے پار انقرہ کا موسم جیسے بہت کھلا کھلا لگ رہا تھا، یوں جیسے اس دفعہ بہار جولائی میں اتری ہو۔
"اور میرا چولہا ٹھیک کرتے وقت مجھے تم میرے الفاظ لوٹا رہے تھے، مگر مجھے کیا پتا تھا کہ کوئی میری میلز بھی پڑھتا ہے۔"
"اگر تم یہ سب کہہ کر مجھے شرمندہ کرنا چاہتی ہو تو وہ میں نہیں ہوں گا۔ سو بولتی رہو۔"
"اور کوئی کہتا تھا کہ وہ بہت غریب آدمی ہے۔" اس نے اثر لیے بنا اپنا مشغلہ جاری رکھا۔
"سو تو ہوں۔"
"اور جب تمہارے ڈرائیور نے "جہان سکندر" کا نام لیا تو کیا میں اس کے ساتھ نہ آتی؟" وہ اب پھول کو ٹہنی سے پکڑے اس کی کلی کو اپنی ٹھوڑی پہ گھما رہی تھی۔
"اس نے صرف نام لیا تھا، یہ نہیں کہا تھا کہ اسے جہان سکندر نے بھیجا ہے، تمہیں پوچھنا چاہیے تھا۔"
"اور مجھے نہیں پتا تھا کہ تم تایا فرقان سے اتنا ڈرتے ہو۔" موسم کی شادابی اس کے چہرے پہ بھی نظر آ رہی تھی۔ مسکراہٹ دبائے وہ ساری باتیں دہرانا بہت اچھا لگ رہا تھا۔
"میں کسی سے نہیں ڈرتا۔"
"ویسے پھپھو کہتی ہیں کہ جہان کی مت سنا کرو، وہ تو خوامخواہ کہتا رہتا ہے۔"
"ممی کی مت سنا کرو، وہ یونہی بولتی رہتی ہیں۔"
وہ ایک دم چونکی، پھر بے اختیار ہنس دی۔ جہان نے آنکھیں کھول کر، گردن ذرا اٹھا کر اسے تعجب سے دیکھا۔
"ہنسیں کیوں؟"
"کچھ نہیں۔" حیا نے مسکراتے ہوئے سر جھٹکا۔
"اور یاد ہے کس طرح تم نے اور عائشے نے ظاہر کیا تھا تم ایک دوسرے کو نہیں جانتے؟" گلاب کی پتیوں کو اپنے رخسار اور ٹھوڑی پہ محسوس کرتے ہوئے اس نے اس وقت کا حوالہ دیا جب عائشے اور وہ، جہان کے لیے بندرگاہ تک آئی تھیں۔
"غلط، ہم نے کچھ ظاہر نہیں کیا تھا۔ اگر تم پوچھتیں تو ہم بتا دیتے۔"
"وہ بتا دیتی، مگر تم....."

"میرا ایک کام کرو گی؟" اس نے بات کاٹ کر بہت سنجیدگی سے حیا کو دیکھتے ہوئے کہا۔
"ہاں! کہو۔" وہ بہت توجہ سے سنتی کاؤچ پہ ذرا آگے کو ہوئی۔ پہلے ایک دفعہ جہان نے اس سے چائے بنوائی تھی، ورنہ وہ کوئی کام نہیں کہتا تھا۔
"مجھے فارمیسی سے تھوڑی سی کاٹن لا دو۔"
"شیور۔" وہ مستعدی سے اٹھی۔ اس کا کام کرنے کی خوشی بہت قیمتی تھی۔ دروازے تک پہنچ کر وہ کسی خیال کے تحت رکی اور پلٹ کر جہان کو دیکھا، جو ابھی تک اسے ہی دیکھ رہا تھا۔
"کس لیے چاہیے کاٹن؟"
"کان میں ڈالنی ہے۔"
وہ جو پرجوش سی باہر جانے کے لیے تیار کھڑی تھی، پہلے آنکھوں میں حیرت ابھری، پھر اچنبھا اور پھر سمجھ میں آنے پہ ڈھیر ساری خفگی۔ لب خود بخود بھنچ گئے اور پیر پٹختی واپس کاؤچ پہ آ کر بیٹھ گئی۔ بازو سینے پہ لپیٹے، ٹیک لگائے، خاموش مگر ناراض نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔
"بہت شکریہ۔" اس نے گردن سیدھی کر کے آنکھیں پھر سے موند لیں۔
"یہ آدمی بھی نا ذرا دو چار دن مہذب بنا رہے تو شاید بیمار پڑ جائے، اس لیے اپنے اصل روپ میں بہت جلد واپس آ جاتا ہے۔"
وہ اس طرح خفا خفا سی بیٹھی اسے دیکھتی رہی۔

☼ ☼ ☼

صبح بہارے کو صبیحہ خانم کے پاس چھوڑنے سے قبل اس نے ایک موبائل فون بمع سم — خرید کر اسے ایکٹیویٹ کروا دیا تھا۔
"کیا میں تمہارے ساتھ ہاسپٹل نہیں جا سکتی؟" بہارے خفا ہوئی تھی۔ وہ دونوں ٹیکسی میں صبیحہ خانم کے گھر جا رہی تھیں۔
"تم نے کہا تھا، تم اچھی لڑکی بنی رہو گی اور میری ساری باتیں مانو گی۔"
"اوکے! میں کیا کہہ رہی ہوں۔" بہارے فوراً دھیمی پڑ گئی۔
"اچھا یہ فون اپنے بیگ میں رکھو، میں تمہیں اس پہ کال کر لوں گی.... اور چاہو تو اس سے عائشے کو بھی کال کر لینا۔"
بہارے نے فون اس کے ہاتھ سے تھاما، اسے الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر "شکریہ" کہہ کر اپنے گلابی پرس میں ڈال لیا۔ چھوٹا سا پرس تھا مگر اس میں وہ دنیا جہان کی چیزیں لیے گھومتی تھی۔
کنگھی مانگو یا قینچی، اس کے پرس میں سے سب نکل آتا تھا۔
بہارے کو صبیحہ خانم کے گھر چھوڑ کر وہ دوبارہ ٹیکسی میں آ بیٹھی (جسے وہ انتظار کرنے کا کہہ گئی تھی) آج مسز عبداللہ وغیرہ کو بھی آ جانا تھا سو بہارے کو کمپنی رہے گی۔

وہ اسپتال کے راستے میں تھی جب فون بجنے لگا۔ وہ جو کھڑکی سے باہر انقرہ کی بھاگتی عمارتیں دیکھ رہی تھی، چونک کر فون کی طرف متوجہ ہوئی۔
اماں کالنگ۔
"حیا.... واپسی کا کیا پروگرام ہے؟" چھوٹتے ہی انہوں نے استفسار کیا تھا۔ ایک تو اس کے گھر والوں کو بھی اس کی واپسی کی بہت فکر تھی۔ سکون سے نہیں رہنے دینا انہوں نے۔
"بس ایک ہفتہ مزید لگے گا۔"
"اب آ بھی جاؤ۔ روحیل کا....."
"اماں! یہ وہی نتاشا نہیں ہے جس کی وجہ سے ہمارے گھر میں طوفان آ گیا تھا؟ اب وہ اتنی امپورٹنٹ کیوں ہو گئی ہے کہ اسے ساری دنیا سے ملوانے کی آپ لوگوں کو اتنی جلدی ہو رہی ہے؟" اسے ابھی تک ابا اور اماں کا نتاشا کو قبول کرنا ہضم نہیں ہوا تھا۔
"اسی لیے تو چاہتے ہیں کہ جو لوگ باتیں بنا رہے ہیں ان کے منہ اس طرح بند ہو جائیں۔"
وہ گہری سانس لے کر رہ گئی۔ پھپھو ٹھیک کہتی تھیں۔

"وہ بیٹے ہوتے ہیں جن کے بارے میں باتیں بنانے والوں کے منہ بند کرنے کے لیے جتن کیے جاتے ہیں۔ بیٹیوں کو تو اپنے لیے ساری جنگیں خود ہی لڑنی پڑتی ہیں۔"

فون بند کرکے اس نے روحیل کو کال ملائی۔ ٹیکسی ابھی بھی سگنل پہ رکی تھی۔

"ہیلو جامعہ حفصہ! کیسی ہو؟" وہ دوسری جانب بہت ہی خوش گوار موڈ میں بولا تھا۔

"میری بات سنو اور کان کھول کر سنو۔" وہ جواب میں اتنے غصے سے بولی تھی کہ ادھیڑ عمر ٹیکسی ڈرائیور نے بے اختیار بیک ویو مرر میں اسے دیکھا تھا۔

"کیا ہوا؟" وہ چونکا۔

"تمہیں اگر اپنے ولیمے کی اتنی جلدی ہو رہی ہے ناتو کرلو میرے بغیر۔ بلکہ میری طرف سے آج ہی کرلو مگر اماں' ابا سے کہو! مجھے بار بار واپس بلانا چھوڑ دیں۔ اگر تم میرا صبر سے انتظار نہیں کرسکتے تو نہ کرو۔"

"اچھا' اچھا کیا ہو گیا ہے یار! ریلیکس! میں تمہارے آنے تک کچھ نہیں کرنے لگا۔"

"بہت شکریہ! بعد میں بات کرتے ہیں۔" وہ اسے پکارتا رہ گیا' مگر اس نے کال کاٹ دی۔

وہ اسپتال سے ذرا فاصلے پہ اتری تھی۔ پوری اسٹریٹ عبور کرکے آگے اسپتال تھا۔ وہ ارادتاً" دکانوں کی شیشے کی دیواروں کو دیکھتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی تاکہ اگر کچھ خریدنا ہو تو یاد آجائے۔ ابھی وہ اسٹریٹ کے درمیان میں ہی تھی کہ ایک دم سے رکی۔

وہ ایک گفٹ شاپ تھی جس کے شیشے کے پار اسے کچھ دکھائی دیا تھا۔ وہ تیزی سے اس شاپ تک آئی اور گلاس ڈور دھکیل کر اندر داخل ہوئی۔ اس دوران ایک لمحے کے لیے بھی اس نے نگاہ اس شے سے نہیں ہٹائی تھی' مبادا کہ وہ اسے کھو نہ دے۔

اندر دروازے کے دائیں جانب ہی وہ چھت پہ نصب ایک ہک سے لٹکا تھا۔ ایک بہت خوب صورت ساونڈ چائم۔

وہ گردن پوری اٹھائے ونڈ چائم کے اطراف میں گھوم کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ ایک فٹ لمبا تھا۔ اوپر ایک سلور گول پلیٹ تھی جس سے لڑیاں لٹک رہی تھیں۔ پانچ لڑیاں تو دراصل لکڑی کی ڈنڈیاں تھیں جن کو سلور پالش کیا گیا تھا۔ باقی کی پانچ لڑیاں کرسٹل کی بنی تھیں۔ جیسے ایک دھاگے میں پنکھڑیاں پرو دی گئی ہوں۔ گلاب کی پنکھڑیاں۔ چاندی کی سی چمکتی' بے رنگ کرسٹل کی روز پیٹلز' ہر دو پنکھڑیوں کی لڑیوں کے بیچ ایک سلور اسٹک لٹک رہی تھی۔

اس نے ہاتھ اٹھا کر ہولے سے نازک کانچ کی لڑی کو چھوا۔ وہ اسٹک سے ٹکرائی اور لکڑی اور کانچ کی کوئی عجب سی دھن بج اٹھی۔ موسیقی کی کسی بھی قسم سے مختلف وہ کوئی انوکھی سی آواز تھی۔ اس کے لمس سے لڑیاں جو گول گول دائرے میں گھومنے لگی تھیں اب آہستہ آہستہ ٹھہرنے کے قریب آرہی تھیں اور تب ہی اس نے دیکھا۔ اوپر کی سلور پلیٹ پہ انگریزی میں کھدا تھا۔

"Must every house be built
Upon love what about loyality
and appreciation?"
(Omer Bin Khitab)

کیا ضروری ہے کہ ہر گھر کی بنیاد محبت پہ ہی ہو؟
توپھر محبت اور قدر دانی کا کیا؟
(عمر بن خطاب)

اس نے زیر لب ان الفاظ کو پڑھا۔ اسے وہ واقعہ یاد تھا۔ ایک شخص اپنی بیوی کو صرف اس وجہ سے چھوڑنا چاہتا تھا کہ وہ اس سے محبت نہیں کرتا تھا۔ اس کے جواب میں یہ الفاظ سیدنا عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمائے تھے "کیا ضروری ہے کہ ہر گھر کی بنیاد محبت پہ ہی ہو؟ توپھر وفاداری اور قدر دانی کا کیا؟"

"مجھے یہ چاہیے"۔ اس نے ایک دم جذبات سے معمور ہو کر بہت زور سے سیلز گرل کو مخاطب کیا' پھر احساس ہوا کہ شاپ میں اکیلی ہی تو ہے سو اتنا اوور ہونے کی کیا ضرورت ہے۔

"مجھے یہ پیک کردیں۔" سیلز گرل مسکرا کر اس کی طرف آرہی تھی' اب کے اس نے ذرا دھیمے انداز میں اپنی بات دہرائی۔ ڈی جے ہوتی تو کہتی "میں' ہم وہی پاکستان کے پینڈو"۔

پورے دس منٹ بعد جب وہ اسپتال کے اس پرائیویٹ روم میں داخل ہوئی تو ہاتھ میں پکڑے شاپنگ بیگ میں وہ ونڈ چائم نفاست سے پیک کرکے رکھا تھا۔

"السلام علیکم!" عادتاً" اس نے دروازہ بند کرتے ہوئے سلام کیا' مگر اگلے الفاظ لبوں میں رہ گئے۔

جہان کمرے میں نہیں تھا' اس کا بستر خالی تھا۔ اس نے سب سے پہلے باتھ روم کے دروازے کو دیکھا' جو ذرا سا کھلا تھا۔

"جہان؟" پرس اور شاپر میز پہ رکھتے اس نے ذرا فکرمندی سے پکارا۔ جواب ندارد' اس نے باتھ روم کا دروازہ کھٹکھٹایا' پھر دھکیلا' بتی بجھی تھی' وہ وہاں بھی نہیں تھا۔

"کدھر چلا گیا؟" وہ متعجب سی کاؤچ پہ آبیٹھی' شاید ڈاکٹرز کسی ضروری چیک اپ یا ٹیسٹ وغیرہ کے لیے لے کر گئے ہوں' یہ سوچ کر ذرا تسلی ہوئی' کچھ دیر وہ یوں ہی بیٹھی رہی' پھر ونڈ چائم پیکنگ سے نکالا اور سنگل دروازے تک آئی جو باہر کھلتا تھا' اس کے عین اوپر دیوار پہ ایک پینٹنگ آویزاں تھی' حیا نے وہ پینٹنگ اتاری' میز پہ رکھی' اور ونڈ چائم کی رنگ اس کیل میں ڈال دی۔ ونڈ چائم کی چین دروازے کے سر تک ختم ہوتی تھی اور وہاں سے سلور پلیٹ اور لڑیاں لٹکتی تھیں۔

اس نے مسکرا کر پیچھے جا کر اپنے تحفے کو دیکھا' جسے وہ صرف جہان کے لیے لائی تھی' اچھا لگ رہا تھا' ارتعاش کے باعث ذرا سا حرکت میں گول گول گھومتا' دروازہ چونکہ سلائیڈنگ والا تھا' سو اس کے کھلنے کی صورت میں ونڈ چائم سے ٹکرانے کا خدشہ نہ تھا۔

فون کی گھنٹی بجی تو اس نے پرس سے موبائل نکالا' اسلام آباد' پنڈی کے کوڈ کا لینڈ لائن نمبر تھا۔ اللہ' آج تو روحیل قتل ہو جائے گا' اس کے ہاتھوں۔

"ہیلو؟" اس نے فون کان سے لگایا اور بہت سے سخت جملے تیار کیے ہی تھے کہ۔۔۔

"جی میڈم ایم ڈی! کیسی ہیں آپ؟" اس لہجے کو وہ کیسے بھول سکتی تھی؟ اس نے کھڑے کھڑے بے اختیار بیڈ کی پائنتی کے اسٹینڈ کو تھاما۔

"کون بول رہا ہے؟" بظاہر لہجے کو مضبوط اور بے پروا رکھے' اس نے سوال کیا۔ اسے کیسے ملا اس کا ترکی کا نمبر؟ وہ کوئی میجر احمد تو نہیں تھا کہ۔۔۔

"آپ ہر دفعہ مجھے پہچان جاتی ہیں' اس دفعہ بھی پہچان لیا ہوگا۔ خیر! آپ کی تسلی کے لیے' ولید بات کررہا ہوں۔"

"آپ ابھی تک گرفتار نہیں ہوئے؟ حیرت ہے۔" وہ نڈھال سی جہان کے بیڈ کی پائنتی پہ بیٹھی۔

"بلیک میلر۔۔۔" یہ خیال ہی ساری توانائی نچوڑ گیا تھا۔

"حیرت نہ کریں' شکر کریں' جب تک میں باہر ہوں آپ عزت سے ہیں' جس دن میں نے۔۔۔"

"عزت دینے اور عزت چھیننے والا اللہ ہوتا ہے' جب تک وہ میرے ساتھ ہے' مجھے آپ کی پروا نہیں ہے۔" دبے دبے غصے سے وہ بولی تھی۔ "اور آپ کو کیا لگتا ہے' آپ کوئی بھی مووی اٹھا کر' اس پہ میرا نام لگا کر پیش کردیں گے تو ساری دنیا یقین کرلے گی؟ ان فیکٹ' آپ جو کرنا چاہتے ہیں کرلیں' مجھے کوئی پروا نہیں ہے۔"

"میں آپ کو آخری موقع دے رہا ہوں' آپ لوگ میرے خلاف کیس واپس لے لیں اور جو پٹیاں آپ نے سلیمان انکل کو میرے بارے میں پڑھائی ہیں نا' جس میں مجھے اور ہیڈ آرکیٹیکٹ کو آپ انوالو کر رہی ہیں' اس معاملے کو بھی یہیں ختم کردیں' ورنہ میں برا پیش آؤں گا۔"

وہ ایک ایک لفظ چبا کر کہہ رہا تھا۔ (تو ابا نے اس معاملے پہ بھی اس کو آڑے ہاتھوں لینا شروع کر دیا تھا؟)

"مثلاً" "کیا کرلیں گے آپ؟" اس نے پھر سے اپنے لہجے کو مضبوط بنانے کی سعی کی مگر دل کی لرزش نے ذرا سا زبان کو چھوا تھا۔ الفاظ لڑکھڑا گئے تھے۔

"میں کیا نہیں کر سکتا اس ویڈیو کے ساتھ؟ میں جانتا ہوں آپ کتنی خوف زدہ ہیں اس سے سو میں اس کی سی ڈی بنوا کر اسے آپ کے گھر کے سارے مردوں میں تقسیم کر سکتا ہوں۔ وہ شاید آپ کو کچھ بھی نہ کہیں مگر وہ دل سے آپ کی عزت کبھی نہیں کر سکیں گے، آپ رسوا ہو کر رہ جائیں گی۔"

"جہنم میں جاؤ۔" اس نے پھٹ پڑنے والے انداز میں کہا اور فون بند کر دیا۔ تب ہی کانچ، اسٹیل اور لکڑی کے باہم ٹکرانے کی آواز آئی۔ فضا میں ایک مدھر سا ارتعاش ہوا، وہ تیزی سے پلٹی۔

جہان بالکونی کے دروازے سے اندر داخل ہو رہا تھا اس کا سر شاید ونڈ چائم کو چھوا تھا۔ ایک نظر حیا پہ ڈال کر وہ مڑا، گلاس سلائیڈ بند کی اور پھر پلٹ کر بیڈ تک آیا۔

"تم..... کہاں تھے؟" اس نے بمشکل خود کو سنبھالا کہیں اس نے کچھ سنا تو نہیں؟

"ایک کال کرنے گیا تھا، سوچا ذرا اوپن ایر میں کر لوں۔" موبائل بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ رکھتے ہوئے اس نے ایک نظر پھر حیا کو دیکھا۔ گہری اندر تک اترتی نظر اور پھر خاموشی سے بستر پر تکیہ ٹھیک کرنے لگا۔

"تمہیں یوں نہیں جانا چاہیے تھا، سسٹر کو پتا چلا تو برا مانے گی ابھی تم ٹھیک نہیں ہو۔"

"تم بتاؤ! تم ٹھیک ہو؟" وہ اب تکیے کے سہارے لیٹے لیٹے بہت غور سے حیا کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

بس ایک پل لگا اسے فیصلہ کرنے میں، وہ بیمار تھا، پھر اس کے دوسرے مسائل بھی تو تھے، کیا اب اسے ایک نیا ایشو کھڑا کر کے اس کا مزید بوجھل کرنا چاہیے؟ کیا وہ اتنی خود غرض تھی؟

"ہاں! میں ٹھیک ہوں اور یہ تمہارے لیے لائی تھی۔" اس نے زبردستی مسکرانے کی سعی کرتے ہوئے ونڈ چائم کی طرف اشارہ کیا جو جہان سے ٹکرانے کے باعث ابھی تک گول گول گھوم رہا تھا۔

"شکریہ!" اس نے کرسٹل کے اس خوب صورت تحفے کو دیکھا تک نہیں، بس اسی طرح حیا کو کھوجتی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ وہ ابھی تک بیڈ کے پائنتی کھڑی تھی۔ اضطراری انداز میں انگلیاں مروڑتی، ذرا بے چین اور مضطرب سی۔

"کیا گھر سے فون تھا؟" اس نے جیسے بہت سوچ سمجھ کر سوال پوچھا۔ حیا کا دل زور سے دھڑکا۔ اس نے کمرے کے باہر سے کچھ تو لازمی سنا تھا۔ ایڈیٹ نہ ہو تو۔

"نہیں! ولید لغاری تھا۔" اس نے سچ بول دیا۔ وہ ذرا سا چونکا۔

"وہی؟" ابرو اٹھا کر یک لفظی استفسار کیا۔ حیا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تم نے کہا تھا کہ آفس جایا کرو، سو میں نے آفس جا کر اس کی کچھ بدعنوانیاں پکڑیں اور ابا کو بتا دیا۔ وہ اسی پہ مجھے دھمکانے کے لیے بار بار کالز کر رہا ہے۔" لاپروائی سے کہتے ہوئے اس نے ذرا سے شانے اچکائے۔

جہان کے چہرے پہ ناگواری ابھری، مگر جیسے ضبط کر گیا۔

"ابھی یہی کہہ رہا تھا؟"

"ہاں۔ مگر میں اس کی زیادہ دیر نہیں سنتی۔ دو چار سنا کر فون رکھ دیتی ہوں ابھی بھی پی ٹی سی ایل سے کیا تھا تو میں نے اٹھا لیا، ورنہ موبائل کے غیر شناسا نمبر تو اب میں اٹھاتی ہی نہیں ہوں۔"

"کیا اس نے تمہیں کبھی موبائل سے فون نہیں کیا؟"

اب کی بار وہ چونکی۔ کچھ تھا جہان کی آواز میں، کچھ ایسا جسے وہ کوئی نام نہ دے سکی۔

"اگر تمہیں مجھ پہ شک ہے تو میرا فون چیک کر لو۔"

"نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے، میں یہ کہہ رہا ہوں کیونکہ میں نے شاید اس کا موبائل نمبر دیکھا تھا تمہارے فون میں، لیکن اگر مجھے تم پہ شک ہوتا تو اسی وقت کہتا۔"

"اس کا موبائل نمبر! کدھر؟" اس نے حیرت سے دہراتے ہوئے اپنا فون اس کی جانب بڑھایا۔ جہان نے بنا کسی ہچکچاہٹ کے فون تھاما، چند ایک بٹن دبائے اور پھر اسکرین حیا کے سامنے کی وہاں کال لاگ کھلا پڑا تھا۔ پچھلے ہفتے کی کوئی تاریخ تھی۔

"کیا؟" وہ ناسمجھی سے اسکرین کو دیکھنے لگی۔ وہاں کوئی غیر شناسا نمبر تھا جس پہ کال ٹائم آدھے گھنٹے سے ذرا اوپر کا تھا۔

"یہ کس کو....." وہ تعجب سے بڑبڑاتی ایک دم چونکی "یہ تو ارم نے کال کی تھی..... یہ کس کا نمبر ہے؟" اس نے فون ہاتھ میں لے کر قریب سے لاگ کو پڑھا۔

جہان بہت غور سے اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

"حیا! یہ ولید کا نمبر ہے!"

لمحے بھر کو حیا کا تنفس بالکل تھم سا گیا۔ وہ سانس روکے ہق دق سی جہان کو دیکھنے لگی۔

تو وہ ولید تھا جس کے ساتھ ارم.....؟

"ارم اور ولید..... او گاڈ..... مگر تمہیں کیسے پتا کہ یہ ولید کا نمبر ہے؟" جہان سے ایسے سوال پوچھنا بے کار تھا، پھر بھی وہ پوچھ بیٹھی۔ اس نے ذرا سے شانے اچکائے۔

"جب سلیمان ماموں اسپتال میں تھے تو ان کے فون پہ اس کی کال آئی تھی، میں نے تب اسکرین پہ آیا نمبر اور نام دیکھا تھا۔ مجھے نمبرز کبھی نہیں بھولتے۔ یہ اسی کا نمبر ہے۔ اب تم بتاؤ کہ ارم کا اس معاملے سے کیا تعلق ہے؟ ایک دفعہ پہلے بھی وہ تمہارا فون لے کر گئی تھی، مجھے یاد ہے۔"

حیا کا سر چکرا رہا تھا۔ وہ نیم جان قدموں سے چلتی کاؤچ پہ آ بیٹھی۔ ارم اپنی کام کے لیے اپنے گھر کا کوئی فون استعمال نہیں کرتی تھی، اس لیے نہیں کہ وہ پکڑی نہ جائے بلکہ اس لیے کہ وہ ولید کے ساتھ پکڑی نہ جائے۔ بہت کچھ تھا جو اس کی سمجھ میں اب آ رہا تھا۔

"ارم کا....." وہ پھر بولتی گئی۔ جو بھی معلوم تھا بتاتی گئی۔ جہان خاموشی سے سنتا رہا۔ وہ چپ ہوئی تو وہ بس اتنا بولا۔

"مجھے ارم اور ولید میں کوئی دلچسپی نہیں ہے، مجھے صرف یہی بات کھٹک رہی ہے کہ اس نے بار بار تمہارا فون کیوں استعمال کیا؟"

"کیا تم مجھ پہ شک کر رہے ہو؟"

"نہیں بھئی۔" وہ جیسے اکتایا۔ "میں ارم کی بات کر رہا ہوں۔ بجائے کسی ملازم، کسی دوست کا فون استعمال کرنے کے اس نے تمہارا کیوں کیا؟"

"پتا نہیں، مگر میں ارم سے بات ضرور کروں گی۔"

وہ ٹیک لگا کر بالکل خاموش سی ہو کر بیٹھ گئی، جیسے کچھ سوچ رہی ہو۔ اس کی نگاہیں ونڈ چائم کی لڑیوں پہ مرکوز تھیں مگر ذہن کہیں اور بھٹکا تھا۔ وہ ویڈیو کس نے دی ولید کو؟ کس نے بتایا ولید کو کہ حیا اس وڈیو سے اس حد تک خوف زدہ ہو سکتی ہے کہ اس کو دبانے کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہے؟ حیا نے ہر جگہ سے ویڈیو ہٹوا دی تھی، مگر دو جگہیں ایسی تھیں جو رہ گئی تھیں۔

ارم اور حیا کے لیپ ٹاپس۔

جس دن ویڈیو نیٹ پہ ڈالی گئی تھی، اسی دن ان دونوں نے اسے اپنے اپنے کمپیوٹر میں ڈاؤن لوڈ کر لیا تھا۔

ارم نے ہی ولید کو وہ دی ہو گی، مگر اس طرح تو ارم کی اپنی بدنامی بھی ہو گی، پھر؟ پتا نہیں۔

جہان بیڈ پہ تکیے کے سہارے لیٹا گردن اس کی طرف موڑے بغور اس کے چہرے کا اتار چڑھاؤ دیکھ رہا تھا۔ وہ محسوس کیے بغیر گلاس ڈور کے پار دیکھتی کہیں اور گم تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ بہت تیزی سے صحت یاب ہو رہا تھا۔ ٹھیک سے چل پھر بھی سکتا تھا۔ اس کا اپنا خیال تھا کہ وہ بغیر رکے

دو میل تک بھاگ سکتا ہے۔ مگر ایسا کرنے کی اسے اجازت نہ تھی۔ البتہ وہ بستر پر لیٹنے سے سخت بے زار ہوتا تھا۔

اس صبح وہ اسے اسپتال کے لان میں واک کے لیے لے گئی۔ وہ خاموشی سے اس کے ساتھ چلتا رہا۔ سر پہ وہی سفید ٹوپی اور نیچے اسپتال کا ہلکا نیلا ٹراؤزر اور شرٹ عام دنوں کی نسبت وہ ذرا آہستہ چل رہا تھا، مگر اب تو اسے خود بھی لگنے لگا تھا کہ جہان بالکل ٹھیک ہے۔

"اس روز ہم فون نمبرز کی بات کر رہے تھے۔ تمہیں پتا ہے مجھے نمبرز بھول جاتے ہیں۔ بلکہ یاد ہی نہیں رکھ سکتی۔" وہ دونوں ساتھ ساتھ واک کر رہے تھے جب اس نے کہا۔ جہان نے جواب نہیں دیا۔ بس خاموشی سے قدم اٹھاتا رہا۔

صبح کی ٹھنڈی ہوا گھاس کے تنکوں کے اوپر بہہ رہی تھی۔ پرندوں کے مدھر نغمے اور درختوں کے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ۔ سب کچھ بہت پرسکون تھا۔ اتنا پرسکون کہ وہ اپنے سارے مسئلے اور پریشانیاں بھلا کر اس ماحول کا حصہ بننا چاہتی تھی۔

"میں نے تمہیں اس رات اسی لیے کال نہیں کی تھی، کیونکہ میرے دوسرے فون میں تمہارا نمبر نہیں تھا۔ مجھے نمبرز زبانی یاد نہیں رہتے۔ میرے پاس عثمان شبیر کا کارڈ تھا، سو ان کو فون کیا۔" ساتھ ہی اسے سفیر والی بات کا خیال آیا مگر ابھی وہ اسے پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی، سو اسے بعد کے لیے اٹھا رکھا۔

"اچھا۔" جہان نے سر کو اثبات میں ذرا سا ہلایا۔ جیسے اس ساری تفصیل میں کوئی دلچسپی نہ ہو۔

"اور میں ولید کے ساتھ صرف اس لیے بیٹھی تھی کیونکہ میں اسے رشتہ بھیجنے سے منع کرنا چاہتی تھی، مگر وہ میری غلطی تھی۔"

وہ دونوں اب جنگلے کے ساتھ واک کر رہے تھے۔ جنگلے کے پار سڑک اور درختوں کی قطار تھی۔ جہان جیسے اس کی بات سن ہی نہیں رہا تھا۔

"لیکن اب میں نے زندگی سے یہ سیکھ لیا ہے کہ ہمیں پسند سب کو کرنا چاہیے لیکن اعتبار بہت کم لوگوں پہ کرنا چاہیے۔ کیا دیکھ رہے ہو؟" اپنی رو میں بولتے اسے احساس ہوا کہ جہان رک کر ذرا سا رخ موڑے، جنگلے کے پار سڑک پہ کچھ دیکھ رہا تھا۔ حیا نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا۔

وہاں درختوں کے ساتھ پولیس ایک جگہ کو فیتہ لگا کر سیل کر رہی تھی۔ لوگوں کا ذرا سا رش فیتے کے اطراف میں جمع ہو رہا تھا، اور وہ گردنیں اونچی کر کے ممنوعہ قطع اراضی کو دیکھ رہے تھے۔ حیا نے بھی ذرا آگے ہو کر دیکھا۔ وہاں زمین پہ ایک شخص چت گرا پڑا تھا، ہاتھ میں پستول، کنپٹی پہ گولی کا نشان اور ڈھیر سارا خون۔

"اللہ اللہ!" اس نے بے اختیار ہاتھ لبوں پہ رکھا۔ "اپنی جان خود لے لینا، مایوسی کی انتہا۔ کیوں کرتے ہیں کچھ لوگ ایسا؟"

"نہیں!" جہان نے اسی منظر کو دیکھتے ہوئے نفی میں گردن ہلائی۔ "میرا نہیں خیال یہ خودکشی ہے۔ کسی نے اسے قتل کر کے لاش کے ہاتھ میں پستول دے دیا ہے۔"

اللہ اللہ، یہ شکی مزاج آدمی بھی نا۔

"اور تمہیں کیسے پتا کہ یہ قتل ہے، خودکشی نہیں؟" وہ پوری اس کی طرف گھومی۔ جہان نے مڑ کر اسے دیکھا۔

"یہی بات، پستول اس کے ہاتھ میں ہے۔"

"ہاں تو یہی بات ظاہر کرتی ہے کہ یہ خودکشی ہو سکتی ہے۔"

"ایک تو ایسی عقل مند بیوی اللہ ہر ایک کو دے۔" جہان نے بہت افسوس بھری نظروں سے اسے دیکھتے نفی میں سر ہلایا۔ حیا کی آنکھوں میں ناراضی ابھری۔

"مطلب؟"

"نیوٹن کا تھرڈ لاء آف موشن تو پڑھ رکھا ہو گا تم نے؟"

"اب مجھ کم عقل کو کیا پتا کہ نیوٹن کون تھا؟" وہ اسی خفگی سے بولی۔

"ہاں! بالکل، تمہیں تو اتنا بھی نہیں پتا ہو گا۔

بہرحال وہ جو بھی تھا اس نے ایک قانون دیا تھا کہ۔۔۔"

"یاد آگیا، نیوٹن وہی تھا نا جس کا سیبوں کا کاروبار تھا؟" اب کے اس نے ذرا معصومیت سے پوچھا۔ جہان نے ایک بے ساختہ مسکراہٹ لبوں پہ روکی۔

"ہاں، بالکل، وہی تھا۔ بہرحال اس کا تیسرا قانون کہتا ہے کہ ہر ایکشن کا ایک برابر اور مخالف ری ایکشن ہوتا ہے۔ جب انسان گولی چلاتا ہے تو گولی آگے اور گن پیچھے کو جھٹکا کھاتی ہے۔ خودکشی کرنے والے نے چونکہ خود کو ہرٹ کیا ہوتا ہے، اس لیے بمشکل بیس فیصد خودکشیوں میں پستول ڈیڈ باڈی کے ہاتھ میں رہتا ہے، ورنہ عموماً وہ اس انسان سے تیس سینٹی میٹر کے فاصلے پہ جا گرتا ہے۔"

"اچھا مگر ہو سکتا ہے کہ یہ ان بیس فیصد کیسز میں سے ایک ہو؟" وہ بھی ہار نہیں ماننا چاہ رہی تھی۔ مگر وہ نہیں سن رہا تھا۔

"دوسری بات، یہ جو اس کا زخم کا نشان ہے، یہ ذرا فاصلے سے آیا ہوا لگتا ہے، خودکشی میں انسان کنپٹی پہ پستول رکھ کر چلاتا ہے اور اس کا نشان بالکل مختلف ہوتا ہے۔"

پولیس آفیسرز اب ڈیڈ باڈی کی تصاویر بنا رہے تھے ایک آفیسر جائے وقوعہ کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔

"تیسری بات، اگر گولی اس نے خود چلائی ہے تو ہاتھ پہ گن پاؤڈر ضرور گرا ہو گا اور اگر میں ذرا قریب سے دیکھ پاتا تمہیں مزید ثبوت لا کر دیتا مگر تم تب بھی نہ مانتیں۔"

"تم بھی تو نہیں مانتے۔" اس نے شانے ذرا سے اچکائے اور واپس مڑ گئی۔ اس کا موڈ آف ہو چکا تھا جہان سر جھٹک کر اس کے ساتھ چلنے لگا۔

اس نے اتنا کچھ کیا، مگر وہ اب بھی یہ ماننے کو تیار نہ تھا کہ اس کی بیوی "عقل مند" ہے۔ چلو! کبھی کسی دن وہ اس پہ یہ ضرور ثابت کرے گی کہ وہ جہان سے زیادہ اسمارٹ ہے۔ کبھی نہ کبھی اسے موقع ضرور ملے گا۔

☼ ☼ ☼

آج وہ شام میں بہارے سے مل کر واپس آ گئی تھی۔ جہان کو ذرا سا بخار تھا، سو وہ اس کے پاس رکنا چاہتی تھی۔ جہان نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا تھا۔ البتہ بہارے نے ذرا سا منہ بنایا تھا۔

"تم مجھے بالکل بھول گئی ہو۔"

"میں اپنی چھوٹی بلی کو کیسے بھول سکتی ہوں۔" جاتے وقت اس کے دونوں گال چومتے ہوئے حیا نے کہا تھا۔

"ہم آشیانہ واپس کب جائیں گے؟"

"کیوں، تمہیں عروہ کے ساتھ مزا نہیں آ رہا؟" اس نے مسز عبداللہ کی نواسی کا نام لیا، جو اپنی ماں اور نانی کے ہمراہ صبیحہ نور کے گھر آج کل آئی ہوئی تھی۔

"اوں ہوں!" بہارے نے ناک سکیڑی۔ "وہ اتنی چھوٹی اور بے وقوف ہے، مجھے اس کے ساتھ ذرا بھی مزا نہیں آتا۔"

"ہاں! تم تو بہت بڑی ہو جیسے!" اس نے ہنس کر بہارے کے سر پہ چپت لگائی اور پھر اپنی چیزیں سمیٹنے لگی تھی۔

رات تک جہان کا بخار قدرے اتر گیا تھا، اس نے ایک دو دفعہ کہا بھی کہ وہ چلی جائے مگر وہ اب ہوٹل جا کر کیا کرتی؟ خوامخواہ فکر لگی رہتی سو وہیں کاؤچ پہ بیٹھی رہی۔

گلاس ڈور کے آگے سے پردہ ہٹا ہوا تھا۔ باہر سے آتی چاندنی سے دروازے کے اوپر لٹکتا ونڈ چائم چمک رہا تھا۔ یوں جیسے قطرہ قطرہ چاندی پگھل کر اس کی لڑیوں سے ٹپک رہی ہو۔

جہان کافی دیر سے دوا کے زیر اثر پرسکون سو رہا تھا۔ وہ وہیں کاؤچ کے سرے پہ ٹکی، اس کو دیکھ رہی تھی۔ عبایا بھی ساتھ ہی رکھا تھا جامنی قمیص کے اوپر اس نے شاکنگ پنک دوپٹا لے رکھا تھا۔ جہان کا موبائل اس کے سرہانے سائیڈ ٹیبل پہ رکھا تھا۔ اس کو دیکھتے ہوئے اسے بار بار ارم اور ولید کا خیال آ رہا تھا۔ جہان نے کہا تھا کہ اس نے پھپھو کو حیا کے نمبر سے کال کرنے کے لیے اس کا فون اٹھایا تھا، مگر پھر کال ملا کر بند کر دیا۔ شاید اس نے ویسے ہی اس کا فون چیک کیا ہو۔

شاید اسے ایسے کاموں کی عادت تھی۔
اور اگر وہ اس کا فون چیک کر سکتا تھا تو وہ بھی کر سکتی تھی۔ اسے متبادل پاس ورڈ بھی معلوم تھا۔ جاسوس کی جاسوسی بھی دلچسپ کام تھا اور پھر اسے جہان پہ کچھ ثابت بھی تو کرنا تھا نا۔
اس نے بنا کسی آہٹ کے جھک کر پیر جوتوں سے آزاد کیے پھر ننگے پاؤں اٹھی، بغیر چاپ کے دبے قدموں چلتی اس کے سرہانے آ کھڑی ہوئی۔ اس کا فون پانی کے جگ اور گلاس کے ساتھ ہی رکھا تھا۔ جہان سو رہا تھا۔ آنکھیں بند، ہولے ہولے چلتا سانس۔
حیا نے آہستہ سے ہاتھ فون کی طرف بڑھایا۔ ابھی وہ موبائل سے بالشت بھر دور ہی تھا کہ..... ایک جھٹکے سے اس نے اس کی کلائی پکڑی۔
"امی!" بوکھلا کر کراہتی، وہ ایک قدم پیچھے ہٹی۔
اس کی کلائی پکڑے، جہان کہنی کے بل ذرا سا اٹھا، اور نیند بھری آنکھوں سے اسے دیکھا۔
"کیا کر رہی تھیں؟" وہ جیسے حیران ہوا تھا۔ اندھیرے میں بھی حیا کے چہرے پہ اڑتی ہوائیاں صاف نظر آرہی تھیں۔
"تم تو سو رہے تھے!" وہ اتنی شاکڈ تھی کہ پتا نہیں کیا بول گئی۔
"تم کر کیا رہی تھیں؟"
"پانی..... پانی لے رہی تھی۔" اس کا سانس ابھی تک جیسے رکا ہوا تھا۔
جہان نے ایک نظر پانی کے جگ پہ ڈالی پھر گردن پھیر کے کاؤچ کی میز کو دیکھا جہاں پانی کی چھوٹی بوتل رکھی تھی۔
"وہ گرم ہو گیا تھا، یہ ٹھنڈا ہے، اس لیے یہ لے رہی تھی۔" اس کی نگاہوں کا سفر دیکھتے ہوئے اس نے جلدی سے وضاحت دی۔
جہان نے ایک خاموش نظر اس پہ ڈالی، پھر اس کی کلائی چھوڑ دی۔ اس نے جلدی سے ذرا لرزتے ہاتھوں سے جگ سے پانی گلاس میں انڈیلا اور گلاس پکڑے واپس کاؤچ پہ آبیٹھی۔
"آر یو شیور۔ تمہیں پانی ہی چاہیے تھا؟" سر واپس تکیے پہ ڈالے وہ اب بھی اسے ہی دیکھ رہا تھا۔
"ہاں، آف کورس!" اس نے ذرا سا شانے اچکاتے ہوئے گلاس لبوں سے لگایا۔ دل ابھی تک دھک دھک کر رہا تھا۔ "یہ آدمی آخر سوتا کب تھا؟"
"ویسے اگر ادھر جگ نہ پڑا ہوتا تو تم کیا کہتیں؟" وہ بہت دلچسپی سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا۔ پتا نہیں وہ کیا سمجھ رہا تھا۔
"ادھر جگ نہ ہوتا تو میں ادھر آتی ہی کیوں؟" وہ پانی کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھر رہی تھی۔ آدھا گلاس تھا مگر ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔
"بہارے کہاں ہے آج رات؟"
"وہاں، نانی کے پاس!"
"اس کو ساتھ لانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟" وہ پھر سے کسی نئے جھگڑے کے موڈ میں تھا شاید۔
"چھوٹی سی بچی کیا کہہ رہی ہے تمہیں؟"
"اپنی بہن کی جاسوس ہے وہ۔ ایک ایک بات کی رپورٹ دیتی ہوگی ادھر۔"
"اگر میں اسے نہ لاتی تو زیادہ برا ہو سکتا تھا۔ سفیر نے اس سے کہا تھا کہ وہ اپنا پاسپورٹ جلا دے، تاکہ تم واپس آجاؤ۔ اس نے خود مجھے بتایا ہے۔" گلاس میز پر رکھتے ہوئے اس نے اپنے تئیں ایک بڑی خبر دی تھی۔
"اور تم نے یقین کر لیا؟"
"کیا مطلب؟" حیا کے لب حیرت سے ذرا سے کھل گئے۔
"اس ٹانگ برابر جتنی لڑکی نے تمہیں بے وقوف بنایا اور تم بن گئیں۔ ویری اسمارٹ حیا!" اس نے پھر سے ان ہی تاسف بھری نگاہوں سے حیا کو دیکھ کر نفی میں سر ہلایا جیسے جنگلے کے ساتھ کھڑے ہوئے کہا تھا۔
"جہان! اس کو سفیر نے....."
"اس کو سفیر نے واقعی یہ کہا تھا مگر جب وہ اپنا پاسپورٹ جلا چکی تھی، تب! اور وہ بھی غصے سے کیونکہ ایسی صورت میں مجھے واپس آنا پڑتا۔ بہارے نے تم

سے جھوٹ نہیں بولا، اس نے صرف تمہیں آدھی بات بتائی ہے۔ بچے ایسے گول مول بات کر دیتے ہیں، تم تو بڑی تھیں۔ تم ہی عقل استعمال کرتیں۔"
پھر وہی عقل کا طعنہ؟
"مگر تم نے کہا تھا کہ وہ لالچی ہے اور وہ....."
"ہاں! لالچی ہے، اس لیے تو وہ نہیں چاہتا کہ عبدالرحمٰن واپس جائے۔ پاشا بے جیسے لوگ جب مشکل میں پھنستے ہیں تو ان کی ساری فیملی خمیازہ بھگتتی ہے۔ سب کچھ بیچ کر، نامحسوس انداز میں ایک ایک کو باری باری اس ملک سے نکلنا ہوتا ہے۔ ایک ساتھ سب نہیں جا سکتے۔ بہارے نے سب سے کہا تھا کہ وہ آخر میں جائے گی، اور عائشے کے پاس ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ مگر بہارے نے اپنا پاسپورٹ خود ہی جلا دیا۔ نتیجتاً سفیر کی پریشانی بڑھ گئی۔ ہمارے وہاں سے نکلنے کے بعد سب کچھ اسی کا تو ہو گا۔ ہوٹل میں شیئرز، گھر میں اور کیا نہیں دیا ہم نے اس کو۔ وہ کبھی نہیں چاہے گا کہ میں یا پاشا بے کی فیملی کا کوئی شخص وہاں واپس آئے۔"
"مگر وہ ہمارے پیچھے ڈورم بلاک تک آیا اور....."
"میں اس لڑکی کو اس کی ذمہ داری میں چھوڑ کر گیا تھا، اسے تمہارے پیچھے آنا چاہیے تھا۔ بہارے نے تمہیں ایک طرف کی بات بتائی، اگر تم دوسری طرف کی بات سن لیتیں تو اتنا مسئلہ نہ ہوتا۔"
کاؤچ پہ بیٹھی حیا کو لگا، وہ اس دنیا کی سب سے کم عقل اور بے وقوف لڑکی ہے۔ اسے بہارے پہ بالکل غصہ نہیں آیا۔ اپنی چھوٹی بلی سے خفا ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ مگر اسے خود سفیر سے بات کرنی چاہیے تھی۔
مگر نہیں..... مسئلہ یہ بھی نہیں تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ وہ بہارے کو کپادوکیہ کے بارے میں بتا چکی تھی، مگر یہ بات وہ اس وقت جہان کو نہیں کہہ سکتی تھی۔ ایک دم اسے ڈھیر سارا رونا آیا تھا۔
"میں نے وہی کیا، جو مجھے صحیح لگا۔" بہت مشکل سے یہ الفاظ کہہ کر اور "جہنم میں جاؤ تم سب" کے الفاظ لبوں تک روک کر وہ اٹھ گئی۔
"تم سو جاؤ، مجھے کام ہے۔" وہ تیز تیز قدموں سے چلتی باہر نکل گئی۔ وہی غصے یا دکھ میں جگہ چھوڑ دینے کی عادت۔
باہر کاریڈور میں ذرا آگے جا کر ایک بینچ سا نصب تھا۔ وہ اس بینچ پہ دونوں کہنیاں گھٹنوں پہ رکھے ہاتھوں میں چہرہ چھپائے بیٹھ گئی۔ بار بار دل بھر آرہا تھا۔ شرمندگی کہ وہ جان گیا تھا، وہ اس کا فون چیک کرنے آئی تھی۔ بدتمیز کبھی سوتا بھی تھا یا نہیں؟ اتنی زور سے ہاتھ پکڑا۔
اس نے چہرے سے ہاتھ ہٹا کر کلائی کو دیکھا۔
اتنی سرخ بھی نہیں پڑی تھی، مگر پھر بھی اسے رونا آرہا تھا۔
دفعتاً دائیں جانب آہٹ ہوئی۔ حیا نے بے اختیار سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ کمرے سے نکل کر اس کی طرف آرہا تھا۔ تو یہ طے تھا کہ ہر دفعہ وہ اس کے پیچھے آئے گا۔
"تم کیوں نکل آئے؟ جاؤ! جا کر لیٹو۔ ابھی نرس نے دیکھا تو سو باتیں سنائے گی مجھے۔" وہ پریشانی سے بولی تھی۔ جہان جواب دیے بنا اس کے ساتھ بینچ پہ آکر بیٹھ گیا۔
"تم باہر کیوں آئیں؟" اس کی طرف چہرہ کیے، وہ ذرا دھیمے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔
کاریڈور میں روشنی تھی، سفید روشنی، مگر وہ چاندنی کی سی نہیں تھی۔
"کیونکہ، تمہیں میں اندر بیٹھی، بہت بری لگ رہی تھی۔"
"ہاں خیر! لگ تو رہی تھیں، مگر اتنی بھی نہیں کہ باہر آجاؤ۔ میں برداشت کر ہی لیتا۔" وہ بہت سنجیدگی سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔
اگر اس وقت اس کے ہاتھ میں کوئی بھاری چیز ہوتی تو وہ اس کے پٹی والے سر کا لحاظ بھی نہ کرتی۔
"تم جاؤ، میں یہیں ٹھیک ہوں۔" وہ رخ سیدھا کیے سامنے دیوار کو دیکھنے لگی۔
"اب نیا مسئلہ کیا ہے تمہارا؟"

"میرے مسئلے کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔ میری زندگی بھی ایک پہیلی ہے جس کو میں کبھی حل نہیں کر سکتی۔" پتا نہیں اُسے اتنی مایوسی اور بے زاری کس بات پہ تھی، مگر تھی ضرور۔

"تمہارا مسئلہ پتا ہے کیا ہے؟" وہ اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "تم ایک بات سمجھ نہیں پا رہیں، کہ تم کسی چیز کی کتنی ہی صفائی کیوں نہ کر لو، اس پہ جالے پھر سے بن جائیں گے۔ یہ جو تم بار بار اسٹرگل کرتے کرتے تھکنے اور اداس ہونے لگتی ہو نا، یہ اسی وجہ سے ہے۔ اور یہ سب کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس فیز میں یوں بے زار ہو کر بیٹھ نہیں جاتے، بلکہ خود کو منفی ردعمل سے بچائے رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ صبر اسی چیز کا نام ہے۔ خود کو منفی ردعمل سے روکنا اور مثبت سوچ پہ جمائے رکھنا۔"

جب اس نے "جالے" کا لفظ استعمال کیا تھا، وہ تب ہی چونکی تھی۔ کچھ یاد آیا تھا۔

"ڈاکٹر ابراہیم نے بھی ایسی ہی باتیں کی تھیں مجھ سے۔ مکڑی کے جالوں کی۔" وہ بولی تو اس کی آواز سے ناراضی مفقود تھی، صرف گہری سوچ پنہاں تھی۔

سرد، خاموش کاریڈور میں ایک دم ہلکا سا اندھیرا ہو گیا تھا، اور دور کہیں سے پگھلی ہوئی چاندی فرش پہ گرنے لگی تھی۔

"ضرور کہی ہوگی۔ قرآن کو سمجھ کر پڑھنے والے اس کی پہیلیوں پر اسی طرح غور کیا کرتے ہیں۔" وہ اثبات میں سر ہلا کر کہہ رہا تھا۔

کتنے عرصے بعد اسے لگا تھا، اسے میجر احمد پھر سے مل گیا ہے۔ وہی دھیما، ٹھہرا ہوا لہجہ، وہی باتیں۔

"تو پھر میں قرآن کی پہیلیاں کیوں حل نہیں کر سکی؟ سر ابراہیم کا کہنا ہے کہ سورۃ الاحزاب کی آیت میں کچھ ہے، جو میں مس کر گئی ہوں۔"

دور کاریڈور کے سرے پہ گری چاندی بہہ کر اس طرف آ رہی تھی۔ ساری دیواریں ساتھ میں چاندی کے ورق میں لپٹتی جا رہی تھیں۔

"ہر آدمی ایک ہی آیت کو اپنے طور پر دیکھتا ہے اور خود سے ریلیٹ کرتا ہے۔ وہ اسے کسی اور اینگل سے دیکھ رہے ہوں گے، مگر وہ جو بھی چیز ہوگی، وہ اس آیت کا آخری رمز کبھی نہیں ہوگا، تمہیں ہر دفعہ وہ آیت یا وہ سورہ یا صرف وہ ایک لفظ کوئی نیا رمز دے سکے گا اور کوئی بھی رمز آخری نہیں ہوگا۔"

چاندی کا پانی سا فرش پہ بہتا اب ان کے بینچ سے ذرا سا ہی دور تھا۔

"کیا تم میرے لیے اس پہیلی کو حل کر سکتے ہو؟"

"حیا! قرآن اور نماز، یہ دو وہ چیزیں ہیں، جو ہر انسان کو اپنے لیے خود ہی کرنا ہوتی ہیں۔ یہ کبھی کوئی دوسرا آپ کے لیے نہیں کر سکتا۔"

چاندی کا ورق ان کے قدموں کو چھوتا ان کو بھی خود لپیٹنے لگا۔ چاندی کے مجسمے پھر سے لوٹ آئے تھے۔

"لیکن میں تمہیں قرآن کی کچھ پہیلیاں بتا سکتا ہوں، جو بہت سے لوگوں نے حل کی ہیں، جیسے۔ جیسے......"

چاندی کے مجسمے نے لمحے بھر کو دانت سے نچلا لب دبائے، کچھ سوچا، پھر کہنے لگا۔

"جیسے تم نے سورۃ الفلق تو پڑھی ہوگی۔"

"او جہان! کس کو الفلق اور الناس زبانی یاد نہیں ہوں گی؟"

"او کے، پھر الفلق کی تیسری آیت یاد کرو، ومن شر غاسق اذا وقب۔ اس آیت کا ترجمہ ہمارے ہاں عموماً" یوں کیا جاتا ہے کہ میں (پناہ مانگتا ہوں) رات کے شر سے، جب وہ چھا جاتی ہے۔"

"ہوں، ٹھیک!"

چاندی کی تہہ پورے کاریڈور پہ چڑھ چکی تھی۔ ہر سو دم بخود سی جگمگاہٹ تھی۔

"یعنی کہ "غاسق" کے شر سے پناہ مانگی گئی ہے۔ یہاں غاسق کا مطلب ہوتا ہے، اندھیرا کرنے والا، یعنی کہ رات۔ لیکن......" وہ لمحے بھر کو ٹھہرا۔ "غاسق کا ایک اور مطلب بھی ہوتا ہے، کیا تم وہ مطلب جانتی ہو؟"

"نہیں۔" چاندی کے مجسمے نے ہولے سے نفی میں سر ہلایا۔ وہ پلک جھپکے بنا پہلے مجسمے کو دیکھ رہی تھی کہ کہیں وہ سحر ٹوٹ نہ جائے۔

"میں تمہیں اس کا دوسرا مطلب بتاتا، بلکہ دکھاتا ہوں۔ ادھر آؤ!" وہ اٹھا۔ وہ اس کے پیچھے کھڑی ہوئی۔ وہ اس کے آگے چلتا اپنے کمرے میں واپس آیا اور دروازہ بند کیا۔

کمرے میں نیم اندھیرا تھا، صرف گلاس ڈور سے چاندنی اندر جھانک رہی تھی۔ جہان اس دروازے کے پاس جا کھڑا ہوا، اور جب وہ اس کے پہلو میں آ کھڑی ہوئی تو اس نے انگلی سے باہر، اوپر کی سمت اشارہ کیا۔

"وہ ہے غاسق!" حیا نے اس کی انگلی کے تعاقب میں دیکھا۔ وہاں سیاہ آسمان پہ چاندی کی ایک ٹکیہ جگمگا رہی تھی۔

"چاند؟ غاسق کا دوسرا مطلب چاند ہوتا ہے؟" اس نے بے یقینی سے دہراتے ہوئے جہان کو دیکھا۔

جہان نے ذرا سا مسکرا کر سر کو اثبات میں ہلایا اس کا چہرہ آدھا اندھیرے، اور آدھا سلور روشنی میں تھا۔

"چاند کے شر سے پناہ مگر چاند میں کون سا شر ہوتا ہے؟" یہ بات ابھی تک اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

"ہر چیز میں خیر اور شر دونوں ہوتے ہیں۔ چاند بہت پیارا، بہت خوبصورت ہے۔ لیکن تم نے کبھی دیکھا ہے، سمندر کی لہروں کا مدوجزر؟"

حیا نے اثبات میں سر ہلایا۔ ہاں، یہ تو وہ جانتی تھی کہ......

"چاند کھینچتا ہے ان لہروں کو، چاند میں بہت کشش ہوتی ہے۔"

"مگر وہ سمندر کی بات ہے، اس کا انسان سے کیا تعلق؟" کہتے ہوئے حیا نے پھر گردن پھیر کر شیشے کے پار آسمان پہ چمکتے چاند کو دیکھا۔

"حیا۔ چاند سمندر کو نہیں چاند پانی کو کھینچتا ہے۔ چاند "ہر" پانی کو کھینچتا ہے۔ اور......" اس نے ایک انگلی سے حیا کی کنپٹی کو چھوا ادھر تمہارے دماغ میں بھی فلیوڈز (Fluids) ہوتے ہیں، پانی ہوتا ہے، چاند اس کو بھی کھینچتا ہے۔ جن لوگوں کا دماغی نظام غیر متوازن ہو جاتا ہے، وہ پاگل کہلاتے ہیں، اور پاگل کو ہم انگریزی میں کیا کہتے ہیں؟" وہ لمحے بھر کو رکا، وہ کسی سحر کے زیر اثر سن رہی تھی۔

"چاند کو ہم لیونا (Luna) کہتے ہیں، اور پاگل کو لیونیٹک (Lunatic) کہتے ہیں۔ چاند اور دماغی امراض کا بہت گہرا تعلق ہوتا ہے۔ یہ انسان کے حواس پہ اثر انداز ہوتا ہے۔ اس لیے جو لوگ مرض عشق میں مبتلا ہوتے ہیں، یا شاعر وغیرہ، وہ چاند کا ذکر بہت کرتے ہیں۔ چاند بہت خوبصورت ہے، یہ اندھیرے میں ہمیں راستہ دکھاتا ہے۔ اس کی خیر ہمیں سمیٹنا چاہیے، مگر اس کے شر سے پناہ مانگنا چاہیے۔ کیا اب تم مانتی ہو کہ قران کی پہیلیاں زیادہ گہری ہوتی ہیں؟"

حیا نے ہولے سے سر اثبات میں ہلایا۔ اس وقت سارے میں ایسا جادوئی اثر چھایا تھا کہ اسے لگا اس کے کچھ کہنے سے وہ ٹوٹ جائے گا۔

"اور ہاں، میں نے اپنے فون کا متبادل پاس ورڈ ہٹا دیا تھا۔" اس نے کہا اور ایک دم سے سحر ٹوٹا۔ چاندی چیخ گئی، اور اس کی پرتیں کہیں ہوا میں تحلیل ہوتی گئیں۔

وہ جیسے کسی خواب سے جاگی، پھر ذرا سے شانے اچکائے اور واپس کاؤچ پہ جا بیٹھی۔

جہان دھیمی مسکراہٹ سے اسے دیکھتا بیڈ کی طرف چلا گیا۔ حیا نے پھر سے گردن پھیر کر شیشے کے پار دکھتے چاند کو دیکھا۔

ونڈ چائم کی پنکھڑیاں ابھی تک چاندنی میں نہائی ہوئی تھیں۔



صبح اس نے بہارے کی اچھی خاصی کلاس لی تھی۔

"تم نے مجھے یہ تاثر دیا کہ سفیر نے تم سے یہ سب

کہا تھا جبکہ اس نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔ تم نے مجھے مس گائیڈ کیا۔"

"میرا مطلب وہی تھا۔" وہ منمنائی مگر حیا اس کے سامنے کمرے میں ادھر سے ادھر ٹہلتی سن ہی نہیں رہی تھی۔

"تم نے جھوٹ بولا مجھ سے۔ تم نے جھوٹ بولنا نہیں چھوڑا۔"

"اچھا' سوری! آئندہ نہیں بولوں گی۔" وہ بار بار سوری کرتی اس کو منانے کی کوشش کر رہی تھی' مگر حیا خفا خفا سی سامنے صوفے پہ جا بیٹھی۔

جہان کے سامنے اٹھائی جانے والی شرمندگی کا بدلہ کسی سے تو لینا تھا۔

"کیا تم مجھ سے ناراض ہو؟" وہ اٹھ کر اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی اور ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ حیا نے ابرو اٹھا کر ایک سخت نگاہ اس پہ ڈالی۔

"نہیں! میں تم سے بہت خوش ہوں اور اگر میں نے یہ سب عائشے کو بتا دیا' تو......؟"

اس بات پہ بہارے نے اپنی سب سے معصوم شکل بنائی' اور بہت ہی ناصحانہ انداز میں بولی۔

"اچھی لڑکیاں شکایت نہیں لگایا کرتیں۔"

"ہاں! مگر اچھی لڑکیاں تھپڑ بہت اچھی طرح لگا سکتی ہیں' اور میں تمہیں بتا رہی ہوں' کسی دن تم میرے ہاتھوں بہت پٹو گی۔"

بہارے لپک کر اس کے پیچھے سے آئی اور اس کی گردن میں بازو ڈال کر چہرہ اس کے گال سے لگایا۔

"بہارے گل تم سے بہت پیار کرتی ہے حیا سلیمان!"

"اچھا! مکھن مت لگاؤ۔ مجھے ابھی جانا ہے' پھر میں شام میں آؤں گی۔"

بہارے نے بازو ہٹا کر خفگی سے اسے دیکھا۔

"اور میں اس چھوٹی چڑیل کے ساتھ رہوں گی پھر سارا دن؟"

"میں اب تمہاری کسی بات کا یقین نہیں کروں گی۔" اپنی مصنوعی ناراضی طاری رکھتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اور چلو! اب کچھ گفٹس لینے ہیں میں سے [illegible] اور باقی سب کے لیے۔"

"میں اس چھوٹی چڑیل کے لیے کچھ نہیں لوں گی۔" بہارے نے ناک سکوڑتے ہوئے احتجاج [illegible] مگر حیا نے رک کر اسے گھورا تو وہ "سوری" [illegible] ہوئے ساتھ چل پڑی۔ کل جہان نے ڈسچارج ہونا تھا سو ان کو واپس کیادو کیہ چلے جانا تھا یقیناً" یہ مسز عبداللہ کی فیملی سے اس کی آخری ملاقات تھی' اور ان [illegible] میں ان کی طرف سے دکھائے گئے خلوص اور مہمان نوازی کا بدلہ تو وہ نہیں اتار سکتی تھی' پھر بھی سوچا' کچھ تحائف خرید لے۔ ان کے دیے گئے تحائف بھی اس کے پاس تھے' اور تحفہ تو محبت کا وہ نشان ہے جس کی واپسی ضروری ہوتی ہے۔

نانی' مسز عبداللہ اور مہر نے اپنے تحائف لیتے ہوئے اس سے کہا بھی کہ اس تکلف کی کیا ضرورت تھی' مگر وہ اس کی محبت پہ مسرور بھی تھیں۔ عروہ کے لیے اس نے کیپٹن پلانیٹ کارٹونز کی کچھ ڈی وی ڈیز لی تھیں۔ اس معصوم بچی نے دھیمی آواز میں شکریے کے ساتھ انہیں وصول کیا۔ پھر اس نے شرمیلی مسکان کے ساتھ بہارے گل کو اپنا گفٹ دکھانے کی کوشش کی مگر ادالار کی شہزادی ناک سکوڑے بیٹھی رہی' جیسے اسے عروہ میں کوئی دلچسپی نہ ہو۔ اور تب حیا کو سمجھ آیا کہ بہارے نے یہ "مسوڑی انداز" کس سے کاپی کیا ہے۔

جہان۔ وہ بھی ایسا ہی تھا اور بہارے اس کے ہر انداز کو اپنانے کی کوشش کرتی تھی۔

سہ پہر میں وہ جہان کی طرف چلی آئی۔ اس کے پرائیویٹ روم کا دروازہ وہ کھولنے ہی لگی تھی کہ وہ اندر سے کسی نے کھولا۔ وہ رک گئی۔ اندر سے ایک ترک لڑکی باہر آ رہی تھی۔ ساتھ ہی کمرے کا منظر نمایاں ہوا۔ وہ لوگ ایک معمر مریض کو بیڈ پہ لٹا رہے تھے۔ حیا کا سانس جیسے کسی نے روک دیا۔ اس نے دوبارہ سے روم نمبر دیکھا۔

"سسٹر! میرا...... میرا مریض کہاں ہے؟" ایک بتاسا نرس دکھائی دی تو وہ دوڑ کر اس تک گئی۔ پریشانی' فکرمندی' خوف' کیا تھا جو اسے اس وقت محسوس نہیں ہوا تھا؟

"وہ صبح ڈسچارج ہو گیا تھا۔"

وہ حق دق سی نرس کو دیکھنے لگی۔

"مگر اسے تو کل جانا تھا۔"

"ہاں! مگر وہ ٹھیک تھا۔ اور تین ہفتے بعد تو بالکل پہلے جیسا ہو جائے گا۔"

"لیکن...... وہ گیا کہاں؟" اس بات پہ نرس نے شانے اچکائے اور ٹرے لیے آگے بڑھ گئی۔

حیا کا دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے پلٹی اور واپس جانے لگی۔ اب کیا کرے گی' کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

ابھی کاریڈور کے وسط میں تھی کہ ایک دم سے کچھ یاد آیا۔ وہ بھاگ کر اس روم کی چوکھٹ تک واپس آئی۔ دروازہ ابھی تک نیم وا تھا۔ گلاس ڈور سامنے ہی نظر آ رہا تھا' اور اس کے اوپر کیل سے وہی پینٹنگ آویزاں تھی۔

"میرا...... میرا ونڈ چائم تھا ادھر؟" باہر آتی اسی نرس کو اس نے پھر روکا۔

"میں نہیں جانتی۔ وہ اپنی ساری چیزیں لے گیا ہے۔"

اور پتا نہیں وہ ونڈ چائم لے کر گیا تھا یا اسے کہیں پھینک دیا تھا؟ جہان سکندر کا کچھ پتا نہ تھا۔ یہ تو طے تھا کہ ان کو دوبارہ کیادو کیہ ہی جانا تھا' اور انقرہ دیکھنے میں تو اسے ویسے بھی دلچسپی نہ تھی' اس لیے وہ اسپتال سے نکل آئی۔

ہوٹل میں آ کر سب سے پہلا کام اس نے ارم کو فون کرنے کا کیا تھا۔

"ارم! وہ ویڈیو ولید کو کس نے دی؟" تمہید کے بعد اس نے تیزی سے پوچھا تھا۔ ارم ایک ثانیے کو خاموش ہوئی۔

"جب سارے شہر میں پھیل سکتی ہے تو ہو سکتا ہے اسی ویب سائٹ پہ اس نے بھی دیکھ لی ہو۔"

"یو نو واٹ ارم! میں نے تو یہ کہا ہی نہیں کہ میں کس ویڈیو کی بات کر رہی ہوں۔"

"تمہارے درمیان ایک ہی ویڈیو کا ایشو تھا' اور ظاہر ہے تم اسی کی بات......"

"جہنم میں جاؤ تم ارم!" وہ سنبھل کر بات بنانا چاہ رہی تھی مگر حیا نے ٹھک سے فون بند کر دیا۔ اسے اس کا جواب مل گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تمہارے درمیان ایک ہی ویڈیو کا ایشو تھا اور ظاہر ہے تم اسی کی بات......" وہ کہنا چاہ رہی تھی مگر دوسری جانب سے حیا نے بہت غصے سے "جہنم میں جاؤ تم ارم!" کہہ کر کال کاٹ دی تھی۔

ارم نے ایک لمحے کے لیے ریسیور کو دیکھا' اور پھر شانے اچکاتے ہوئے اسے واپس کریڈل پہ ڈال دیا اور وہاں رکھا چائے کا کپ پھر سے اٹھا لیا۔

یقیناً" حیا کو معلوم ہو گیا تھا کہ وہ ویڈیو اس نے ہی ولید کو دی ہے لیکن اسے اب اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس کے پاس کھونے کو اب مزید کچھ نہیں رہا تھا۔

اس نے چائے کا کپ لبوں سے لگایا۔ گرم' کڑوا سا سیال مائع جیسے اندر تک اترتا گیا۔

"جہنم میں جاؤں میں؟ نہیں حیا! یہ تم ہو گی جس کو اب اسی طرح بہت کچھ کھونا ہو گا جیسے میں نے کھویا تھا۔ وہ بھی صرف تمہاری وجہ سے۔ اب اپنی دوائی کا مزا تم بھی چکھو!"

وہ دل ہی دل میں اپنی کزن سے مخاطب ہوئی۔

وہ دونوں چچازاد بہنیں تھیں' فرسٹ کزنز' اور وہ بالکل ایسی ہی تھیں' جیسی کزنز ہوتی ہیں' جب ماؤں کے تعلقات خراب ہوئے تو ان کے بھی ہو گئے' مگر جب فضا موافق ہوئی تو دونوں پھر سے ایک ہو گئیں' دوستی بھی ان کی بہت تھی اور بڑے سے بڑے فیملی کلیش کے بعد بھی وہ پھر سے ایک ہو جایا کرتی تھیں۔

کزنز۔۔۔ ایک بہت پیارا رشتہ جو بڑوں کی سیاست اور منافقت کی گرد میں بہت میلا ہو جایا کرتا ہے۔

پچھلے دو، تین برسوں میں ان کی ماؤں کے تعلقات خوش گوار تھے، سو ان کی دوستی بھی اپنے عروج پہ رہی۔ اور یہ ان ہی دنوں کی بات ہے جب داور بھائی کی شادی بہت قریب تھی کہ وہ پہلی دفعہ ولید سے ملی۔

اس روز داور بھائی نے اسے یونیورسٹی سے پک کیا تھا مگر درمیان میں ایک کام آن پڑا تو وہ آفس کی طرف آ گئے، ابا ان دنوں ویسے بھی آفس نہیں جا رہے تھے، داور بھائی بلڈنگ میں چلے گئے اور وہ باہر گاڑی میں بیٹھی رہی۔

تب ہی کوئی اس کے پاس آ کر رکا تھا۔

وہ اسمارٹ گڈ لکنگ سا نوجوان داور بھائی کی کار کو پہچان گیا تھا، اس لیے خیریت پوچھنے رک گیا۔

جلدی جلدی ساری بات بتا کر ارم نے شیشہ اوپر چڑھا دیا، اگر جو بھائی نے دیکھ لیا کہ وہ کس لڑکے سے بات کر رہی ہے تو اس کی خیر نہیں تھی، وہ نوجوان چلا گیا، مگر اسی دن شام میں اس نے ان کے لینڈ لائن پہ فون کر دیا۔

ارم کی تو جان ہی نکل گئی، پہلے تو وہ گھبرا گئی، مگر اس نے بہت شائستگی سے جتایا کہ اس کا نام ولید ہے، وہ ان کے بزنس پارٹنر کا بیٹا ہے، اور اس سے کچھ بات کرنا چاہتا ہے۔

اسی وقت ابا کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا، وہ اگر فون رکھتی تو ولید دوبارہ کر لیتا اور تب ابا اٹھا لیتے کہ وہ اندر آنے ہی والے تھے، سو جلدی میں اس نے یہی کہا کہ وہ بعد میں بات کرے گی اور اتنی ہی جلدی میں ولید نے اس کا موبائل نمبر پوچھ لیا۔

ارم نے بنا سوچے سمجھے نمبر بتایا اور فون رکھ دیا، ابا جب تک اندر آئے وہ اپنے کمرے میں جا چکی تھی، دل ابھی تک دھک دھک کر رہا تھا۔

مگر ولید نے پھر لینڈ لائن پہ کبھی فون نہیں کیا۔ وہ اب اسے موبائل پہ فون کر لیتا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس کے والد اس کا رشتہ ان کے گھر میں کرنا چاہتے ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ سلیمان صاحب، زاہد صاحب یا فرقان صاحب میں سے کس کی بیٹی کا ذکر کر رہے تھے۔ (یا اگر وہ جانتا تھا، تب بھی اس نے ظاہر کیا کہ وہ نہیں جانتا، لیکن اس کا خیال ہے کہ وہ ارم ہی تھی۔)

شروع میں وہ کشمکش کا شکار رہی، مگر پھر آہستہ آہستہ اس کا ذہن خوش گمانیاں بننے لگا، اسے اب ولید سے بات کرتے ہوئے کسی قسم کا ڈر یا خوف محسوس نہیں ہوتا تھا۔

بعض گناہ اس لمبی سڑک کی مانند ہوتے ہیں جن پہ کوئی اسپیڈ بریکر نہیں ہوتا، ان پہ چلنا شروع کرو تو بس انسان پھر چلتا ہی جاتا ہے اور جب تک کوئی بڑا ایکسیڈنٹ نہ ہو جائے وہ رک نہیں پاتا۔

ارم کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔

وہ حیا کے ہمراہ شاپنگ پہ جانے کا پلان کرتی تو حیا کو وہیں کسی شاپ میں چھوڑ کر قریب کسی ریسٹورنٹ میں آ جاتی جہاں ولید کو اس نے بلوا لیا ہوتا تھا، ایسا موقع گو کہ ہفتے میں ایک ہی بار آتا، مگر آ ضرور جاتا۔

ولید ایک، دو دفعہ ہی آفس گیا تھا۔ پھر نہیں گیا۔ اس کی فرقان صاحب سے کوئی ملاقات نہ تھی، آج کل ذرا فارغ تھا اور باقاعدہ کام شروع کرنے میں ابھی وقت تھا، سو وہ اس کے لیے ڈھیروں وقت نکال لیا کرتا تھا۔

سب ٹھیک جا رہا تھا، مگر پھر داور بھائی کی مہندی والے دن اس نے اماں کی زبانی سنا کہ عمیر لغاری اپنے بیٹے ولید لغاری کا رشتہ حیا کے لیے مانگنا چاہ رہے ہیں اور ارم کو لگا، وہ مٹی کا ڈھیر بن کر ڈھے گئی ہے۔

اس کے بعد زندگی عجیب سی ہو گئی۔ وہ اس کی پہلی محبت تھا اور وہ اسے کسی اور کا ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ وہ اس کو حیا سے جتنا برگشتہ کر سکتی تھی، اس نے کیا اس کے نکاح کے بارے میں بھی بتایا اور بظاہر تو ولید یہی کہتا کہ وہ حیا میں انٹرسٹڈ نہیں ہے اور پھر اس کے نکاح کا جب اس کے والد کو علم ہوا تو یہ رشتے والا معاملہ از خود دب گیا، مگر ارم محسوس کرتی تھی کہ وہ حیا

کے بارے میں سوالات بہت کرتا تھا۔ وہ کیا کر رہی ہے کدھر ہے، اس کی پسند ناپسند، اس کی کوئی کمزوری۔ وہ سب اتنے نامحسوس انداز میں پوچھا کرتا تھا کہ وہ بتا دیتی مگر پھر بعد میں الجھ بھی جاتی۔ وہ ولید سے کہتی رہتی کہ وہ اس کے لیے رشتہ بھیجے اور وہ بس چند دن اور کہہ کر ٹال دیا کرتا۔ مگر اس کا اندر بتاتا تھا کہ وہ ارم سے زیادہ حیا میں دلچسپی رکھتا ہے۔ وہ اسی میں خوش تھی۔ سب سے بڑی بات جو ولید سے شادی کرنے میں تھی، وہ یہ تھی کہ اس کو اس اسکارف سے نجات مل جائے گی۔ وہ اپنی مرضی کا پہن اوڑھ سکے گی۔ اسے ابا کا خوف نہیں ہو گا۔ آزادی ایک نعمت تھی جو اس جبری پردے کے باعث اس کی دسترس میں نہیں تھی۔

مگر پھر ایک رات سب کچھ الٹ گیا۔

وہ اپنے کمرے میں کرسی پہ بیٹھی آدھی رات کے بعد تک ولید سے فون پہ بات کر رہی تھی۔ کمرہ لاک کرنا وہ بھول گئی تھی یا پھر اب معمول سے یہ کام کر کر کے اس کا خوف ختم ہو گیا تھا۔ یہ خوف واپس تب آیا جب اس نے ابا کو چوکھٹ میں کھڑے دیکھا۔

گھبرا کر ایک دم کھڑے ہوتے ہوئے ارم نے فون بند کیا مگر وہ دیکھ چکے تھے۔

"اس وقت کس سے بات کر رہی ہو؟" وہ سخت تیوروں کے ساتھ اس کی طرف آ گئے اور اس کے ہاتھ سے موبائل تقریباً" چھینا۔ وہ کپکپاتے دل کے ساتھ بمشکل کھڑی ان کو کال لاگ کھولتے دیکھ رہی تھی۔ اس نے ولید کا نمبر حیا کے نام کے ساتھ محفوظ کر رکھا تھا۔ اس کی وہ تمام کلاس فیلوز جو "چھپے دوست" رکھتی تھیں وہ اپنے ان دوستوں کا نام لڑکیوں کے نام سے محفوظ کرتی تھیں۔ سعد کا نام رکھ دیا سعدیہ یا فائز کا رکھ دیا فضا۔

"حیا سے اس وقت کیا کام تھا؟" انہوں نے نمبر دیکھا، پھر کڑی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ٹائم کا فرق ہے، ان کی اتنی رات نہیں ہوتی۔"

"یہ حیا کا نمبر تو نہیں ہے، یہ پاکستان کا نمبر ہے۔" وہ نمبر چیک کرتے ہوئے بولے تھے۔

"رومنگ پہ ہے اس کا فون، ابا! یہ اس کا دوسرا نمبر ہے۔" وہ تھوک نگلتے ہوئے بمشکل کہہ پائی تھی۔ اسی وقت موبائل بجنے لگا۔ حیا سلیمان کالنگ۔ ولید اسے کال بیک کر رہا تھا۔ کبھی ایسی صورت حال پیش جو نہیں آئی تھی سو وہ سمجھ نہ سکا کہ ارم نے کال ایک دم کیوں کاٹی۔

اس لمحے اس نے بہت دعا کی کہ ابا کال نہ اٹھائیں یا ولید آگے سے کچھ نہ بولے مگر ابا نے کال اٹھائی، مگر کچھ بولے نہیں۔ وہ ابا سے چند فٹ دور کھڑی تھی، مگر اسے ولید کا "ہیلو۔۔۔ ہیلو؟" سنائی دیا تھا۔

"کون بول رہا ہے؟" وہ درشتی سے بولے۔ دوسری جانب چند لمحے خاموشی چھائی رہی، پھر کال کاٹ دی گئی ابا نے شعلہ بار نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے دوبارہ کال ملائی، مگر اس کا فون بند جا رہا تھا۔

"یہ کوئی لڑکا تھا اور تم کہہ رہی ہو کہ یہ حیا کا نمبر ہے؟" وہ اس پہ غرائے تھے۔ صائمہ بیگم بھی آواز سن کر ادھر آ گئی تھیں۔ ارم منمنا رہی تھی، مگر ابا اس کی نہیں سن رہے تھے۔

"اگر حیا کے ساتھ اس وقت کوئی لڑکا تھا تو اس میں

ارم کا کیا قصور ہے؟" اماں نے بات کو نیا رخ دینے کی کوشش کی' جس پہ لمحے بھر کو ابا شبہے میں پڑے۔

"ہو سکتا ہے' حیا بیین کے گھر ہو' بیین کے بیٹے نے فون اٹھالیا ہو۔ لائیں مجھے دیں فون' میں پوچھتی ہوں حیا سے۔" مگر ابا نے اماں کو فون نہیں دیا۔ انہوں نے خود اپنے فون سے حیا کو کال ملائی۔

کسی سوکھے پتے کی طرح لرزتی ارم نے شدت سے دعا کی کہ حیا فون نہ اٹھائے یا پھر اسے بچالے۔ پہلے تو اس نے واقعی فون نہیں اٹھایا' مگر دوسری بار ملانے پہ اٹھالیا۔ ابا اسی طرح غصے میں بھرے کھڑے اس سے پوچھنے لگے اور حیا نے اس کی عزت نہیں رکھی۔ اس نے صاف صاف انکار کردیا۔

فون رکھتے ہی ابا نے ایک زوردار تھپڑ اس کے چہرے پہ مارا تھا۔ تھپڑ سے زیادہ تکلیف وہ وہ الفاظ تھے جو انہوں نے اسے اور اس کی تربیت کو کہے تھے۔ وہ اپنی عزت اور مقام ابا کی نظر میں کھو چکی تھی اور یہ سب صرف اور صرف حیا کی وجہ سے ہوا تھا۔ کیا تھا اگر وہ جھوٹ بول دیتی' کیا تھا جو اگر وہ اسے بچالیتی؟ مگر نہیں۔ اس نے دوستی' رشتے کسی چیز کا پاس نہیں کیا۔ اماں تھیں جو ابا کے سامنے اس کا دفاع کرنے کی کوشش کرتی رہیں' مگر ان کے جاتے ہی وہ بھی پھٹ پڑیں کہ اپنی اولاد کو سب بہت اچھے سے جانتے ہوتے ہیں۔

زندگی اس کے بعد بہت تنگ ہو گئی تھی۔ اس کا انٹرنیٹ اور موبائل بند ہو گیا' دوستوں کے گھر جانے یا کہیں باہر جانے پہ پابندی لگ گئی۔ اٹھتے بیٹھتے ابا کی ناراضی' بے اعتباری سہنا' سب کچھ بہت تکلیف دہ تھا اور پھر ولید سے دوری۔

اس نے بس ایک دفعہ لینڈ لائن سے ولید کے لینڈ لائن پر فون کر کے اسے صورت حال بتادی تھی' پھر دوبارہ بات نہیں ہو سکی۔ ولید نے وہ نمبر ہی بدل لیا تھا۔ اب اس کے پاس صرف اس کا آفیشل نمبر تھا جو ابا کے پاس بھی تھا۔ وہ اب کسی کے موبائل یا لینڈ لائن سے اسے کال نہیں کر سکتی تھی کہ سب کے موبائلز پوسٹ پیڈ تھے اور ابا سارے بل ایک دفعہ ضرور دیکھتے تھے۔ البتہ جب حیا اپنی دوست کی ڈیتھ پہ آئی تو کچھ سوچ کر اس نے حیا سے تعلقات بحال کر لیے۔ وہ حیا کے موبائل سے ولید سے بات کرے گی تو حیا پھنسے گی' وہ نہیں۔ مگر جب حیا سب کے سامنے اپنا موبائل واپس لینے آئی اور اس کے جانے کے بعد ابا کی تفتیش اور ڈانٹ کو سہنا..... اس سب نے اسے مزید ڈھیٹ بنا دیا۔

حیا کے جون میں واپس آجانے کے بعد اسے جب موقع ملتا وہ حیا کا فون استعمال کر لیتی۔ بہت دفعہ تو حیا کو معلوم بھی نہ ہوتا تھا۔ جیسے سکندر انکل کی ڈیتھ اور سلیمان چچا کی بیماری والے دنوں میں حیا اتنی مصروف اور پریشان تھی کہ اسے پتا بھی نہ چلتا اور اس کا فون وہ استعمال کر کے واپس اسی جگہ پہ رکھ بھی دیا کرتی تھی۔ پھر بھی کبھی کبھی اسے لگتا' ولید اس سے بور ہو گیا ہے۔ شاید وجہ اس کی منگنی تھی۔ زبردستی کی منگنی جو ابا نے "فوراً" ہی کردی تھی۔ ان کو کیا لگتا تھا' وہ کسی کے ساتھ بھاگ جائے گی' ہونہہ۔ وہ بھاگنے والوں میں سے نہیں تھی۔ اگر ولید اس کا ساتھ دیتا تو اس کے لیے وہ ابا اور بھائیوں کے سامنے ڈٹ کر کھڑی ہو جاتی' مگر ولید ساتھ دیتا تب نا۔ پھر بھی وہ اس سے بات کرنا ترک نہیں کر سکی تھی۔

اور پتا نہیں وہ کون سا کمزور لمحہ تھا جب اس نے باتوں باتوں میں ولید کو اس ویڈیو کے بارے میں بتادیا تھا۔ تب تک ویڈیو ہٹ چکی تھی' سو ولید اس کو دیکھ نہ پایا' مگر ہاں' وہ جانتی تھی کہ ویڈیو حیا نے ہٹوائی تھی اور یہ بھی کہ حیا میجر احمد سے ملنے گئی تھی۔ حیا کا خیال تھا' کسی کو نہیں پتا' مگر اسے پتا تھا۔ اس نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے حیا کو اس گراؤنڈ کی طرف جاتے دیکھا تھا جہاں سے ایک کار نے اسے پک کیا اور پھر اسی دن ویڈیو ہٹ گئی۔ وہ جانتی تھی کہ میجر احمد نے حیا سے رپورٹ کرنے کے لیے آنے کا کہا تھا' ساری بات اس کے سامنے ہی تو ہوئی تھی۔ کڑی سے کڑی ملا کر اسے ساری کہانی سمجھ میں آگئی تھی۔ بھی نہ کبھی وہ یہ بات حیا کے خلاف ضرور استعمال کرے گی اور شاید اسی لیے اس نے ولید کو اس بارے میں بتایا تھا۔

ولید نے بہت دفعہ وہ ویڈیو مانگنا چاہی' مگر وہ کیسے دے سکتی تھی؟ مگر وہ دن جب ابا کا ایکسیڈنٹ ہوا' اس سے پچھلے ہی دن اس نے سونیا کے کمرے سے نیٹ استعمال کر کے ولید سے بات کی تھی اور وہ بضد تھا کہ ارم وہ ویڈیو اسے دے دے تاکہ وہ اسے حیا کے خلاف استعمال کر کے اس زبردستی کی شادی اور ابا کی نظروں سے گرائے جانے کا بدلہ لے سکے۔ چاہے تو اپنا پارٹ ایڈٹ کردے۔

اس خیال پہ وہ ایک دم چونکی تھی۔ ہاں' یہ ہو سکتا تھا۔ وہ اپنا پارٹ ایڈٹ کر سکتی تھی۔ اس کو یہ کام آتے تھے۔ اپنی تصویر یا ویڈیو وہ ولید کو دینے کا رسک بھی نہیں لے سکتی تھی۔ ریسٹورانٹس اور دیگر جگہوں پہ اس نے اپنے کیمرے سے اپنی اور ولید کی ڈھیروں تصاویر اتاری تھیں' مگر اس کو کبھی اتارنے نہ دی' نہ ہی وہ تصاویر اس کو کبھی بھیجیں۔ وہ تصاویر اس کے لیپ ٹاپ میں ایک پاس ورڈ لاکڈ فولڈر میں محفوظ تھیں۔ اب بھی اس نے خود کو نکال لیا۔ ویڈیو صرف حیا کی رہ گئی' ارم اس میں سے غائب ہو گئی اور وہ ویڈیو ولید کو میل کرنے کے بعد اس نے حیا کے ڈرائیور کے فون سے اسے کال کر کے بتا بھی دیا۔

اس رات ابا کو زخمی حالت میں حیا اور فرخ گھر لائے تھے۔ حیا اس سارے قضیہ کا الزام ولید کے سر رکھ رہی تھی' مگر اسے یقین نہیں آرہا تھا ولید ایسا کیسے .....؟ نہیں' ہرگز نہیں۔ بہت مشکل سے دو روز بعد اسے حیا کا فون استعمال کرنے کا موقع ملا اور اس نے ولید کی ٹھیک ٹھاک کلاس لینی چاہی' مگر وہ کہہ رہا تھا کہ اس نے کچھ نہیں کیا' اس کی گاڑی تو قریب سے گزری تھی' جب کہ فرقان اصغر کو چوٹ گرنے کے باعث آئی تھی۔ شاید وہ چکرا کر گرے تھے۔ حیا خوامخواہ اسے اس معاملے میں گھسیٹ رہی ہے۔ ارم نے یقین کر لیا۔ اس کے پاس یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

اور آج حیا اس کو فون کر کے یہ بتانا چاہ رہی تھی کہ وہ سب جان گئی ہے۔ اس کی بلا سے۔ اب خود بھگتے سب۔ اس وقت حیا نے اس کا ساتھ نہیں دیا تھا' سو آج ارم بھی اس کے ساتھ کھڑی نہیں ہو گی' یہ طے تھا اس نے چائے کا آخری گھونٹ بھرا۔ بھورا مائع ابھی تک کڑوا اور گرم تھا۔ اندر تک جلا دینے والا اور پھر جلنے سے زیادہ رسوا کن عذاب کون سا ہو سکتا ہے؟



کپادوکیہ کا پراسرار حسن ویسا ہی تھا' مگر ایک دفعہ پھر اس میں اداسیاں گھل چکی تھیں۔ "آشیانہ" کے مکینوں نے ان کا استقبال اسی گرم جوشی اور محبت سے کیا جو ان کا خاصا تھا' مگر اس کا دل اداس تھا۔ وہ اسے کچھ بھی بتائے بغیر چلا گیا تھا' بار بار وا ہمے ستا رہے تھے۔ اضطراب' بے چینی اور فکر مندی۔ دنیا بس ان تین جذبوں تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔

وہ دو دن کس کرب میں گزرے' کوئی اندازہ نہیں کر سکتا تھا۔ رات میں وہ اسی صوفے پہ' جس کے عقب میں کھڑکی کھلتی تھی' بیٹھ کر اسی طرح رونے لگی' مگر کوئی نہیں آیا جو اس کو کہتا کہ وہ پھر سے اس کے لیے آ گیا ہے۔ بہارے نیچے پنار کے ساتھ تھی۔ وہ سامنے ہوتی تو حیا یوں نہ روتی' مگر اکیلے میں اور بات ہوتی ہے۔

بہارے کے آنے کے بعد بھی وہ اسی طرح بیٹھی رہی اور جب بیٹھے بیٹھے تھک گئی تو وہیں سو گئی۔ شاید کہ کوئی اسے اٹھائے۔ کوئی اس کے سامنے میز پہ آ بیٹھے اور ہولے سے اس کا شانہ چھو کر اسے آواز دے۔ مگر خواب ہر دفعہ پورے نہیں ہوتے۔

صبح اس کی آنکھ کسی شناسا سا آواز سے کھلی تھی۔ وہ آواز بہت دیر تک اس کی سماعت میں گونجتی رہی تھی' یہاں تک کہ وہ ایک دم چونک کر اٹھ بیٹھی یہ آواز اتنی مانوس' مگر نئی..... یہ تو۔

وہ تیزی سے اٹھ کر صوفے کے پیچھے آئی اور کھڑکی کے سامنے سے پردہ ہٹایا۔

کھڑکی کے باہر کسی ہک سے اس کا ونڈ چائم لٹک رہا

تھا۔ دور کپادوکیہ کے افق پہ طلوع ہوتے سورج کی کرنوں سے اس کی کرسٹل کی پنکھڑیاں سنہری پڑ رہی تھیں، جیسے سونے کے پتنگے جھول رہے ہوں۔ اسٹیل کانچ اور لکڑی کے ٹکرانے کی آواز مانوس آواز۔

اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ بے اختیار اس نے لبوں پہ دونوں ہاتھ رکھ کر جذبات کو قابو کرنا چاہا، مگر آنسو پھر سے ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے تھے۔

وہ آگیا تھا۔ وہ کپادوکیہ واپس آگیا تھا اور اس طرح سے اس کو اپنی خیریت بتا رہا تھا۔ وہ اب اس کی زبان سمجھنے لگی تھی۔

دفعتاً اسے محسوس ہوا، ونڈ چائم کی ایک لڑی کے ساتھ کوئی کاغذ سا بندھا ہے اس نے کھڑکی کا پٹ کھولا، اور ہاتھ بڑھا کر وہ کاغذ اتارا۔

وہ ایک ٹور گائیڈ کے کسی ٹور کا معلوماتی پرچہ تھا۔ اس پہ جہان نے خود سے کچھ نہیں لکھا تھا، مگر وہ سمجھ گئی تھی کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اسے کل صبح اس ٹور کو لینا ہے، کیونکہ وہیں وہ جہان سے مل سکے گی۔

حیا نے ایک نظر پھر اس پرچے پہ بنی تصاویر پہ ڈالی، اور بے اختیار ایک اداس مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھوگئی۔

ڈی جے اور اس کا سب سے بڑا خواب سب سے بڑی ایکسائٹمنٹ۔

ہاٹ ایئر بیلون۔

☼ ☼ ☼

اگلی صبح ابھی سورج نہیں نکلا تھا اور فجر کپادوکیہ کے میدانوں پہ قطرہ قطرہ اتر رہی تھی۔ حیا نے کھڑکی کا پردہ ذرا سا سرکا کر دیکھا۔

کپادوکیہ کے پہاڑ ابھی تک جامنی اندھیرے میں ڈوبے تھے۔ وہ خود بھی ابھی ابھی نماز پڑھ کر ہٹی تھی۔ پردہ برابر کر کے اس نے وال کلاک پہ ایک نظر ڈالی۔ صبح کے ساڑھے تین۔

بہارے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی مندی مندی آنکھوں سے خود کو آئینے میں دیکھتی بال برش کر رہی تھی۔ حیا اپنی اجرک والی لمبی قمیص پہ عبایا پہن چکی تھی اور اب سیاہ اسکارف چہرے کے گرد لپیٹ رہی تھی۔

"حیا! کیا وہ مجھے ڈانٹے گا؟" برش سنگھار میز پہ رکھتے ہوئے بہارے نے تشویش سے پوچھا۔

"نہیں، میں ہوں نا۔ وہ کچھ نہیں کہے گا۔"

بہارے نے سر ہلا کر اپنے گلابی پرس سے بینڈ نکالا اور بال پونی کی طرح سمیٹے، پھر بینڈ لگانے سے قبل مڑ کر حیا کو دیکھا۔

"اگر میں بال نہ باندھوں تو کیا تم عائشے کو بتاؤ گی؟"

"ہو سکتا ہے بتا دوں۔ ویسے اگر تمہیں بال کھولنے ہی ہیں تو کھول کر ان کے اوپر اسکارف لے لونا۔"

اس مشورے پہ بہارے نے ناپسندیدگی سے ناک سکوڑی اور "اس سے تو پونی بہتر ہے" والی نظروں سے حیا کو دیکھتے ہوئے بالوں کو پونی میں جکڑ لیا۔

"آبلہ ۔۔۔ وین آگئی ہے۔" فاتح نے باہر سے آواز لگائی۔ حالانکہ وہ اس سے بہت بڑی نہیں تھی، پھر بھی وہ اسے آبلہ کہتا تھا۔ (ترک آپا کو آبلہ اور بھائی کو آبی بولتے تھے۔)

"ہم تیار ہیں۔" وہ جلدی جلدی نقاب کو پن لگاتی، بہارے کا ہاتھ تھامے باہر نکل آئی۔

آشیانہ کے باہر ان کو ٹور کمپنی کی وین لینے آئی تھی جس نے انہیں ہاٹ ایئر بیلون کی سائیٹ پہ پہنچانا تھا۔ سارے انتظامات مولوت بے نے کروائے تھے، یوں ان کو ڈسکاؤنٹ بھی مل گیا تھا۔

ہاٹ ایئر بیلون فجر کے وقت اڑا کرتے تھے۔ ڈیڑھ دو گھنٹے کی فلائٹ تھی، یعنی کپادوکیہ کے اوپر اڑ کر، وہ سارا خطہ دیکھ کر واپس اتر جانا تھا۔

وین نے انہیں بیلون سائٹ پہ جب اتارا تو فجر ابھی تک تازہ تھی۔ وہ ایک ہائی وے تھی، اور اس کے دونوں اطراف کھلا، صاف علاقہ تھا۔ سڑک پہ ان کی وین کے ساتھ قطار میں بیسیوں وین کھڑی تھیں۔ بہت سے سیاح ادھر ادھر آجا رہے تھے۔

وہ بھی بہارے کا ہاتھ تھامے سڑک سے اتر کر

بائیں طرف کے کھلے میدان میں آگئی۔ وہاں ایک قطار میں ہاٹ ایئر بیلون زمین پہ رکھے تھے۔ یوں کہ ان کی ٹوکریاں سیدھی رکھی تھیں، جبکہ ٹوکری سے ننھی غبارہ، بچوں کے پلاسٹک کے ننھے سے، بغیر ہوا کے غبارے کی مانند ایک طرف ڈھلکا ہوا، زمین پہ سجدہ ریز پڑا تھا۔ بڑے بڑے غبارے اور بڑی بڑی ٹوکریاں۔

"اب ہم کو کیا کرنا ہے حیا؟" بہارے کا سوال نامہ شروع ہو چکا تھا۔

"مجھے کیا پتا میں تو خود پہلی دفعہ ہاٹ ایئر بیلون میں بیٹھنے لگی ہوں۔"

"اوہ ۔۔۔ میں بھی پہلی دفعہ بیٹھوں گی۔" بہارے چہکی۔ حیا نے چونک کر اسے دیکھا۔ بے اختیار اسے اپنی اور ڈی جے کی پہلی فلائٹ یاد آئی تھی۔

فلائٹ کے اڑنے میں وقت کم رہ گیا تھا۔ وہ دونوں گائیڈ کے کہنے کے مطابق اپنی ٹوکری میں جا بیٹھی تھیں۔ یہ پانچ سے سات افراد کی ٹوکری تھی۔ اگر خود ارینج کرتیں تو بیس افراد کی ٹوکری میں جگہ ملتی۔ مگر مولوت بے کی وجہ سے "کھلے کھلے سفر کرنے" کی خواہش پوری ہو گئی تھی۔

ٹوکری کے اوپر ایک آڑ نما چھت تھی، جس کے اوپر آگ جلانے کا انتظام تھا۔ جب آگ جلتی تو گرم ہوا غبارے میں بھرتی اور اسے اوپر اٹھا دیتی۔ فی الوقت ان کا نیلا اور زرد غبارہ زمین پہ بے جان سا ڈھلکا پڑا تھا۔

"وہ دیکھو!" تب ہی بہارے نے اس کی کہنی ہلائی۔ حیا نے بے اختیار اس طرف دیکھا جہاں وہ اشارہ کر رہی تھی۔

دور، سیاحوں کے درمیان وہ چلتا آ رہا تھا۔ سر پہ پی کیپ، آنکھوں پہ سیاہ گلاسز، ذرا سی بڑھی شیو۔ سفید پوری آستین کی ٹی شرٹ کو کہنیوں تک موڑے، نیلی جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، وہ سر جھکائے قدم اٹھا رہا تھا۔ بیگ کندھے پہ تھا اور ماتھے پہ پٹی نظر نہیں آ رہی تھی۔ ہفتہ تو ہو گیا تھا اس کے آپریشن کو، اب تک اس کی پٹی کھل ہی جانی چاہیے تھی۔

وہ ان کے ساتھ آ کر ٹوکری میں بیٹھا اور حیا کو لگا، خوب صورت گھوڑوں کی سرزمین کو اس کی ساری رعنائی واپس مل گئی ہے۔

"کیسے ہو؟" وہ جہان کی طرح سامنے سیدھ میں دیکھتی، بہت آہستہ سے بولی تھی۔ بہارے ان کے مقابل ہی سر جھکائے بیٹھی تھی۔ باقی کے دو سیاح ابھی ٹوکری میں چڑھ رہے تھے۔

"ٹھیک ہوں۔" وہ سامنے دیکھتے ہوئے زیر لب بولا۔

"آخری دفعہ سچ کب بولا تھا؟"

"ابھی دس سیکنڈ پہلے جب میں نے کہا کہ میں ٹھیک ہوں۔"

حیا نے ذرا سی گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ وہ اسی طرح سامنے دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھ کے قریب incision کا نشان گلاسز کے سائیڈ سے صاف نظر آ رہا تھا۔ اس نشان کے سوا پہلے سے وہ بہتر لگ رہا تھا۔

"کیا ہمیں یہ ظاہر کرنا ہو گا کہ ہم تمہیں نہیں جانتے؟" وہ دوبارہ چہرہ سیدھا کیے اسی طرح مدھم سا بولی تھی۔

"جب تک بیلون اوپر نہیں چلا جاتا، تب تک ہاں!"

پائلٹ اب بیلون کے اڑنے کا اعلان کر رہا تھا۔ ٹوکری اطراف اور چھت سے کھلی تھی، سوائے اس چھجے کے جس کے اوپر آگ جلائی جا رہی تھی۔ جیسے جیسے شعلے بڑھتے گئے، گرم ہوا اس پھسے ہوئے غبارے تک پہنچنے لگی۔ زمین پہ اوندھے منہ گرا غبارہ ہولے ہولے پھڑپھڑانے لگا۔

"کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ اس دن تم بغیر بتائے اسپتال سے کیوں چلے گئے؟"

"نہیں!" وہ اتنی قطعیت سے بولا کہ وہ بالکل چپ ہو گئی۔

گرم ہوا اب ڈھلکے ہوئے غبارے کو اٹھانے کی سعی کر رہی تھی۔ جیسے جیسے ہوا کا زور بڑھتا گیا، غبارہ ذرا پھول کر سیدھا ہونے لگا۔ گرم ہوا ٹوکری کے اندر بیٹھے سیاحوں کو نہیں چھو رہی تھی۔ ان کے لیے تو فجر

کی تازہ ٹھنڈی ہوا ہر سو چل رہی تھی۔

ان گزرے دو دنوں میں، جب وہ اس کے ساتھ نہیں تھی، اسے بہت سی باتوں کا خیال آیا تھا جو وہ ہسپتال میں وہ نہیں پوچھ سکی تھی۔ معلوم نہیں یہ سوالات اس وقت کیوں یاد آتے ہیں جب مسئول ہمارے ساتھ نہیں ہوتا۔

"ایک بات پوچھوں؟" چند لمحے گزرے تو اس نے پھر سے سلسلہ کلام جوڑا، بہارے اب سر جھکائے اپنے گلابی پرس میں کچھ تلاش کر رہی تھی۔

"ہوں؟"

غبارہ اب ہوا سے پھول کر عین ان کے سروں پہ، ٹوکری کے اوپر، بالکل سیدھا، آسمان کی جانب رخ کیے کھڑا ہو چکا تھا۔ اعلان کرنے والا اب ان کو سفر کی مزید تفصیلات سمجھا رہا تھا جس میں اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

"تم نے روحیل سے پیسے کیوں منگوائے تھے؟" اب تک وہی اسے وضاحتیں دیتی آئی تھی، لیکن آج جہان کی باری تھی۔

"کچھ اکاؤنٹس کا مسئلہ تھا، نکلوا نہیں سکتا تھا، سو روحیل سے لے لیے۔ پھر واپس بھی بھجوا دیے تھے۔"

"ایک اور بات بھی بتاؤ۔ کیا تمہیں واقعی میرا پردہ کرنا برا لگتا ہے؟"

"میں نے کب کہا، برا لگتا ہے؟" وہ دونوں دھیمی آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ غبارہ گرم ہوا سے بھر چکا تھا اتنا زیادہ کہ وہ زور لگا کر اب ٹوکری کو ہوا میں اٹھانے لگا تھا۔ جیسے ہی ٹوکری اوپر اٹھی، اندر بیٹھے سیاحوں میں شور سا مچا۔ جوش، خوشی، چہک۔ مگر بہارے گل اسی طرح اپنے پرس میں کوئی ایسی شے تلاش رہی تھی جو وہ ڈھونڈنا ہی نہیں چاہتی تھی۔

"میں نے تو یونہی ایک بات پوچھی تھی، اگر مجھے پتا ہوتا کہ ارم سن رہی ہے تو میں ایسا کبھی نہ کرتا۔"

"اور تم نے مجھے برگر کنگ میں اس لیے بلایا تھا تاکہ میں تمہیں پاشا بے کے ساتھ دیکھ لوں؟"

"ہاں مگر میں چاہتا تھا کہ تم میرا مسئلہ سمجھو، کر مجھے برا سمجھو، مگر تم کسی کو جہنم میں بھیجتے ہوئے کسی کی سنتی ہو؟" وہ سن گلاسز اتار کر سامنے شرٹ کے گریبان پہ اٹکاتے ہوئے بولا تھا۔ حیا نے خفگی سے سر جھٹکا۔ بس ایک بات پکڑ لی تھی اس نے اور اب ساری زندگی اسے دہراتا رہے گا۔

ٹوکری اب ہوا میں چار، پانچ فٹ اوپر اٹھ چکی تھی۔ پائلٹ اپنے پروگرام کے مطابق ابھی کم اونچائی پہ فضا میں بیلون گویا تیرا رہا تھا۔ پھر کافی دیر بعد اس نے آہستہ آہستہ بیلون اوپر اٹھانا تھا۔

"بہارے گل!" وہ اب سرد لہجے میں پکارتا اس کی طرف متوجہ ہوا۔ بہارے نے سر اٹھایا، پھر تھوک نگلا۔

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تم نے میری بات کیوں نہیں مانی؟"

"میں نے کیا کیا ہے؟" وہ منہ بسورے بولی تھی۔

"تم حیا کے ساتھ کیوں آئی ہو؟"

"حیا اور میں کپادوکیہ دیکھنے آئے ہیں۔ ہمیں تو پتا بھی نہیں تھا کہ تم بھی ادھر ہو۔ کیا تم ہمارے لیے ادھر آئے ہو؟" کہہ کر اس نے تائیدی نگاہوں سے حیا کو دیکھا جس نے اثبات میں سر ہلایا۔ صبح ہی اس نے یہ بیان بہارے کو رٹوایا تھا۔

"تم ہمیشہ میرے لیے مسئلے کھڑے کرتی ہو۔ تمہیں اندازہ ہے کہ تمہاری بہن کتنی پریشان ہے؟" برہمی سے اسے جھڑکتا اب وہ جہان نہیں، عبدالرحمن لگ رہا تھا یا پھر شاید ترکی میں پہلے دنوں کا جہان۔

"اگر تم نے مجھے ڈانٹا تو میں ٹوکری سے نیچے کود جاؤں گی۔" وہ ناراضی سے ایک دم بولی تو حیا کا گویا سانس رک گیا۔

"بہارے ....." اس نے اسے منع کرنا چاہا مگر۔

"یہ تو بہت اچھا ہو گا۔ شاباش! کود و۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔" وہ ٹیک لگا کر بیٹھا اور کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی۔

بہارے خفا خفا سی کھڑی ہوئی اور ٹوکری کی منڈیر پہ دونوں ہاتھ رکھ کر نیچے جھانکا، پھر مڑ کر ان دونوں کو دیکھا۔

"جہان..... مت کرو۔" اس کا دل کانپ اٹھا تھا۔ وہ اٹھنے لگی، مگر جہان نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا۔

"تم درمیان میں مت بولو۔ ہاں تو بہارے خانم! میں انتظار کر رہا ہوں۔ جلدی کودو۔ میرا وقت نہ ضائع کرو۔"

ان کی طرف دوسرے سیاح قطعاً متوجہ نہ تھے۔ وہ اپنی تصاویر میں مشغول تھے۔ بہارے منڈیر پہ ہاتھ رکھے جھکی۔ زمین کو دیکھا، جو چھ سات فٹ دور تھی اور پھر ایک دم دھپ سے آ کر واپس بیٹھ گئی۔

"عائشے گل کہتی ہے خود کشی حرام ہوتی ہے۔" منہ پھلائے وہ خفا خفا سی بولی۔

حیا کی اٹکی سانس بے اختیار بحال ہوئی۔ یہ چھوٹی بلی بھی نا۔

"میں تمہیں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔" جہان نے سر جھٹکا اور پھر گردن پھیر کر ٹوکری سے باہر دیکھنے لگا۔ تاحد نگاہ کپادوکیہ کی چاند سی سرزمین دکھائی دے رہی تھی۔ پہاڑ، میدان عجیب و غریب ساخت کے نمونے جن کا بیان الفاظ میں ناممکن ہے۔

غبارہ اب درختوں کی ایک قطار کے ساتھ فضا میں تیر رہا تھا۔ درختوں کے سرے اور ٹوکری کی منڈیر برابر سطح پہ تھے۔ وہ خوبانی کے درخت تھے۔ پھلوں کے بوجھ سے لدی شاخیں اور ان کی رسیلی مہک۔

"کیا ہم یہ توڑ سکتے ہیں؟" چھوٹی بلی کو اپنی ساری ناراضی بھول گئی۔

"نہیں!" حیا نے قطعیت سے نفی میں سر ہلایا۔

"ہاں!" جہان کہتے ہوئے کھڑا ہوا اور منڈیر پہ جھک کر قریب سے گزرتے درخت کی ایک ٹہنی کو ہاتھ بڑھا کر پکڑا۔

"یہ مہمان نوازی کے درخت ہیں اور ادھر بیلون اس لیے اڑایا جا رہا ہے تاکہ تم ان کو توڑ سکو۔" حیران سی حیا کو وضاحت دیتے ہوئے اس نے ایک خوبانی کھینچ کر توڑی۔ پھل شاخ سے الگ ہوا تو شاخ فضا میں جھول کر رہ گئی۔

غبارہ آہستہ آہستہ اسی طرح ہوا میں تیرتا رہا۔ دنیا جیسے ٹرانسفارم ہو کر ہیری پوٹر کی کتابوں میں جا پہنچی تھی۔

"کیا تم کھاؤ گی؟" اس نے پوچھا، مگر انکار سن کر پھل بہارے کو تھما دیا۔ اس نے اپنے پرس سے پہلے رومال نکالا۔ اس سے خوبانی اچھی طرح رگڑ کر صاف کی، پھر کھانے لگی۔ عائشے گل کی بہن۔

"تمہیں کس نے بتایا روحیل کے ولیمہ کا؟" اسے اچانک یاد آیا، دیرین کیو کے زیر زمین شہر میں جہان نے ذکر کیا تھا۔

"جب تم اس سے فون پہ بات کر رہی تھیں تو میں وہیں تھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ واپس آ چکا ہے اپنی بیوی کو لے کر؟" اس نے ابرو سوالیہ انداز میں اٹھائی۔ حیا نے اسے دیکھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی آنکھ کے قریب لگا نشان دیکھ کر ہی تکلیف ہوتی تھی۔

"ہم روحیل کے ولیمہ تک واپس پہنچ جائیں گے نا جہان؟"

"ہاں شیور! بس دو دن مزید لگیں گے کپادوکیہ میں۔ پھر مجھے یہاں سے جانا ہے۔"

غبارہ اپنے پنجوں میں ٹوکری کو اٹھائے اب اوپر اٹھتا جا رہا تھا۔ دور صبح کی سفیدی آسمان پہ پھیلنے لگی تھی۔ درخت نیچے رہ گئے تھے۔

"پھر کہاں جاؤ گے؟"

"یہاں سے انقرہ۔ وہاں ایک کام ہے۔ پھر وہاں سے ایک چھوٹا سا گاؤں ہے ترکی کے بارڈر پہ۔ ادھر جانا ہے۔ پھر ادھر سے شام۔"

"تو انقرہ سے ڈائریکٹ شام چلے جاؤ۔"

"انقرہ اور شام کا بارڈر نہیں ملتا حیا!"

"بارڈر سے کیوں جاؤ گے؟ ایئرپورٹ سے چلے جاؤ۔" اپنے تئیں اس نے اچھا خاصا مشورہ دیا تھا۔ جہان نے گردن موڑ کر تاسف بھری نگاہ سے اسے دیکھا۔

"مادام! ایئرپورٹ پہ پاسپورٹ دکھانا ہوتا ہے اور

میں ادھر ال لیگل ہوں۔ بارڈر کراس کر کے آیا تھا رات میں۔ ایسے ہی واپس جاؤں گا۔"

اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی خیز لہر دوڑ گئی۔

"تم... تم غیر قانونی طریقے سے سرحد پار کر کے جاؤ گے؟" اس نے دبی آواز میں دہرایا۔ وہ دونوں اپنی زبان میں بہت آہستہ آواز سے باتیں کر رہے تھے۔

"مجھے قانون کی پاس داری پہ کوئی لیکچر مت دینا۔ مجھے اسی طرح واپس جانا ہے۔ ویسے بھی شام کے لیے ترکوں کو ویزا درکار نہیں ہوتا، مگر پاسپورٹ دکھانا پڑتا ہے۔"

"اچھا! ٹھیک ہے۔ میں سمجھ گئی۔ پھر کب جانا ہے؟"

"ابھی نہیں۔ کل بتاؤں گا۔"

دور، نیچے، زمین بہت چھوٹی نظر آ رہی تھی وہ اب Fairy chimneys کے اوپر سے اڑ رہے تھے۔ فیری چمنی یا "پری بجلاری" (Peri Bacalari) ایک قدرتی ساخت تھی، جو لاوا سوکھنے کے بعد اس سرزمین پہ تشکیل پا گئی تھی۔ کافی فاصلے پہ اونچے اونچے ستون سے کھڑے تھے، جن کے سروں پہ ٹوپیاں تھیں، بالکل جیسے مشروم (کھمباں) ہوتے ہیں۔ بس ان کھمبیوں کی ڈنڈیاں بہت اونچی تھیں۔

"مطلب، بارڈر تک ہم ساتھ جائیں گے؟"

"حیا... ہم انقرہ تک ساتھ گئے، یہ بہت ہے۔ تم اب ادھر آ کر کیا کرو گی؟" وہ جیسے اکتا رہا تھا۔

"ہماری بات ترکی کی ہوئی تھی۔ ڈیل، ڈیل ہوتی ہے۔ بس ہم بارڈر تک ساتھ ہیں۔"

"ویسے تم تو صرف کپادوکیہ دیکھنے آئی تھیں... نہیں؟"

اس کے انداز پہ حیا کا دل چاہا، زور سے کہے کہ نہیں، ہرگز نہیں۔ مگر انا...

انا ہر دفعہ اڑے آ جاتی تھی۔

"ہاں! اور اب تمہاری وجہ سے میں زیادہ دن کپادوکیہ میں رہ بھی نہیں پاؤں گی، اس لیے اس کو میرا احسان گرداننا۔" وہ بے نیازی سے شانے اچکا کر بولی۔

"ہاں! میں نے یقین کر لیا۔ ویسے اب اس جگہ کو دیکھ کر بتاؤ۔ دنیا کا سب سے زیادہ خوب صورت شہر کون سا ہے؟"

"اسلام آباد۔ آف کورس۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"تم دونوں کیا باتیں کر رہے ہو؟" بہارے یقیناً ان سے بور ہو کر پنار کو مس کرنے لگی تھی۔ انسان کا ازل سے ابد تک کا مسئلہ۔ اپنی تعریف کرنے والے اسے ہمیشہ اچھے لگتے ہیں۔

"میں آتا ہوں تمہارے پاس۔" پھر وہ حیا کی طرف مڑا۔ "اسے کچھ بھی مت بتانا۔ غلطی سے بھی نہیں۔"

"فکر نہ کرو۔ مجھے راز رکھنے آتے ہیں۔"

جہان نے ایک نظر اس کو دیکھتے ہوئے تائیدی انداز میں سر ہلا دیا۔ وہ ایک نظر بہت اپنی اپنی سی تھی۔ جیسے وہ دونوں شریک راز تھے۔ اپنے تھے۔ رازوں کی اپنائیت۔ اسے بہت اچھا لگا۔

"تمہیں لگتا ہے میں بہت کم عقل ہوں۔" وہ اسی خوش گوار موڈ میں کہنے لگی۔ "اور تمہیں یہ بھی لگتا ہے کہ میں تمہاری باتیں سمجھ نہیں سکتی، مگر یو نو واٹ جہان! اصل میں تم ماننا ہی نہیں چاہتے کہ تمہاری بیوی تم سے زیادہ اسمارٹ ہو سکتی ہے۔" روانی میں "تمہاری بیوی" کب اس کے لبوں سے نکلا، اسے پتا بھی نہیں چلا۔

جہان اس سارے میں پہلی دفعہ مسکرایا۔

"میری بیوی جتنی بھی اسمارٹ ہو، مجھ سے دو قدم ہمیشہ پیچھے رہے گی۔ ویسے آپ کا پاؤں کیسا ہے؟"

"میرے پاؤں کو کیا ہوا؟ بالکل ٹھیک تو ہے۔" اس نے شانے اچکا کر کہا۔ اس کا پاؤں اتنا ہی درد کر رہا تھا، جتنا پہلے دن کر رہا تھا، مگر وہ ظاہر ہونے دے، یہ نہیں ہو سکتا تھا۔

جہان نے مسکرا کر سر جھٹکا اور اٹھ کر بہارے کے ساتھ خالی جگہ پہ جا بیٹھا۔

"جہان! اسے مت ڈانٹنا۔ میں اسے لے کر آئی ہوں... اور پھر..."

"حیا! تمہیں معلوم ہے، تم مجھے کب بہت اچھی لگتی ہو؟"

وہ جو بولے جا رہی تھی، ایک دم رکی۔ آنکھیں ذرا سی حیرت سے پھیلیں۔

"کب؟"

"جب تم خاموش رہتی ہو۔"

حیا کے ہونٹ بھنچ گئے اور وہ چہرہ پورا موڑ کر خاموشی سے ٹوکری کے پار دیکھنے لگی۔

وہ دونوں اب دھیمی آواز سے اپنی زبان میں بات کر رہے تھے۔ بیلون اب پری بجلاری کے عین اوپر ہوا میں کسی کشتی کی طرح تیر رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

رات کا کھانا ان دونوں نے آشیانہ کے قالینوں والے ڈائننگ روم میں کھایا تھا۔ جہان صبح بیلون سائیٹ سے ہی واپس ہو گیا تھا۔ اسے موہوم سی امید تھی کہ شاید وہ کھانے کے وقت کہیں سے نمودار ہو جائے گا مگر ایسا نہیں ہوا۔ اس کا دل کسی پنڈولم کی طرح امید اور ناامیدی کے درمیان گھومتا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے خود کو سمجھا لیا کہ وہ سارا دن ان کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ اسے اپنے بھی کام تھے۔

آشیانہ میں آج دو تین مزید فیملیز آئی ہوئی تھیں، پھر بھی مولوت بے اور مسز سوتا ان کا پہلے دن جتنا خیال رکھ رہے تھے۔ رات میں وہ سوئی تو فجر کے لیے اٹھی۔ پھر نماز پڑھ کر دوبارہ سو گئی۔ قریباً" دو تین گھنٹے بعد دستک سے آنکھ کھلی۔

"آبلہ، آبلہ!" فاتح پکار رہا تھا۔

ایک تو یہ آبلہ کا زبردستی کا بھائی بھی نا، آرام نہیں کرنے دے گا۔ وہ جب تک کلستی ہوئی دروازے تک آئی، وہ جا چکا تھا۔ دروازے کی درز سے البتہ اس نے ایک چھوٹا سا لفافہ ڈال دیا تھا۔

اس نے جھک کر لفافہ اٹھایا، اسے کھولا اور اندر رکھا سفید، موٹا کاغذ نکالا۔ اوہ یہ لکھائی جو وہ ہمیشہ پہچان سکتی تھی۔

"I Hope Ladies Are
Rejoining At 2:pm"

سطر پڑھ کر وہ بے اختیار مسکرا دی۔ یعنی وہ دو بجے مل رہے تھے۔ کدھر؟ جگہ اس نے نہیں لکھی تھی، مگر وہ سمجھ گئی تھی۔ وہ ان کے پاس آئے گا پھر اکٹھے وہ کہیں جائیں گے۔

بعد میں جب اس نے کمرے کا دروازہ کھولا تو سفید گلابوں کا بوکے بھی پڑا تھا، جو فاتح نے لفافے کے ساتھ ہی رکھا ہو گا۔ وہ ان کو بھی اندر لے آئی اور صوفے کے ساتھ رکھی میز کے گلدان میں سجا دیا۔

گلاب کی تازہ، دلفریب مہک دنیا کی سب سے الگ مہک ہوتی ہے۔ بچپن میں اسے گلاب کی پتیاں کھانے کا بہت شوق تھا۔ وہ نہ میٹھی ہوتیں، نہ نمکین، بس کوئی الگ سا ذائقہ تھا۔ ابھی وہ یہ حرکت کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اگر بہارے اٹھ کر دیکھ لیتی تو کتنی شرمندگی ہوتی۔

بہارے نے ناشتے کے بعد وہ پھول دیکھے۔

"یہ کہاں سے آئے؟"

"عبدالرحمٰن نے بھجوائے ہیں۔" وہ بستر سمیٹ رہی تھی۔

"کتنے پیارے ہیں..." بہارے ذرا رک کر بولی۔ "کیا تم نے کبھی گلاب کی پتیاں کھائی ہیں؟"

وہ جو بیڈ کور تہہ کر رہی تھی، پلٹ کر اسے دیکھا۔

"تمہیں لگتا ہے مجھ جیسی ڈیسنٹ لڑکی ایسا کر سکتی ہے؟" سچ بولنے کا موڈ نہیں تھا اور جھوٹ وہ بولنا نہیں چاہتی تھی، سو الٹا سوال کر لیا۔

ڈیڑھ بجے وہ تیار ہو کر اپنے صوفے پہ بیٹھی تھیں۔ انتظار اس دنیا کی سب سے تکلیف دہ شے ہے۔ بار بار گھڑی کو دیکھنا۔ جانے کب آئے گا وہ؟

اس نے پھر سے اس کا خط نکال کر پڑھا۔ دو بجے کا وقت ہی لکھا تھا اس نے وہ کاغذ واپس ڈالنے لگی، پھر ٹھہر گئی۔

یوں تو وہ عام سی سطر تھی، مگر کچھ تھا اس سطر میں جو غلط تھا۔ بہارے اس کے کندھے کے اوپر سے جھانک

کر پڑھنے لگی۔

"ہاں! یہ اسی نے لکھا ہے۔ یہ اسی کی لکھائی ہے۔ دیکھو! ہر ورڈ کا پہلا حرف بڑا لکھا ہے۔" جو چیز اسے الجھا رہی تھی بہارے نے اس کی نشان دہی کر دی۔ وہ ذرا سی چونکی۔

"ہاں! مگر کیوں؟"

"جب اس نے مجھے سیاروں کے نام سکھائے تھے تو ایسے ہی لکھا تھا۔ دکھاؤں تمہیں؟" وہ جھٹ سے اپنا گلابی پرس اٹھا لائی اور اندر سے ایک گلابی ڈائری نکالی' پھر کھول کر ایک صفحہ حیا کے سامنے کیا۔ اس پہ لکھا تھا

My Very Elegant Mother Just

Served Us Nine Pizzas"

"یہ کیا ہے؟" اس نے اچنبھے سے وہ عبارت پڑھی ہر لفظ کا پہلا حرف بڑا تھا۔

"دیکھو! ہر بڑے حرف سے سیارے کا نام بنتا ہے' مائی کے ایم سے مرکری' ویری کے وی سے وینس' ای سے ارتھ' اور اس طرح یہ فقرہ یاد کرنے سے مجھے سیاروں کی ترتیب یاد ہو گئی۔۔۔ سناؤں؟"

"نہیں' مجھے یہ دیکھنے دو۔" اس نے جلدی سے ایک قلم اٹھایا اور جہان کے اس فقرے کے ہر بڑے حرف کو علیحدہ نیچے اتارا۔

"اس سے بھی کوئی دوسرا فقرہ بنے گا شاید۔۔۔۔"

الفاظ اس کے لبوں میں رہ گئے۔ وہ چھ حروف ایک ساتھ لکھے ہوئے اس کے سامنے تھے۔

I.H.L.A.R.A.

"اہلارا؟" اس نے بے یقینی سے دہرا کر بہارے کو دیکھا۔

"اہلارا۔" بہارے گل چیخی۔

"اللہ اللہ!" قریبا" بھاگتے ہوئے اس نے اپنا پرس اور عبایا اٹھایا۔ پھر گھڑی دیکھی۔ دو بجنے میں زیادہ وقت نہیں تھا۔



وادی اہلارا کا نام "اہلارا" گاؤں کے نام پہ تھا' جو اس وادی کے قریب واقع تھا۔ یہ وادی یوں تھی کہ دو دیو ہیکل چٹانیں چند کلو میٹر کے فاصلے پر آمنے سامنے کھڑی تھیں۔ ان کے درمیان سے دریا بہتا تھا اور جنگل ہی تھا۔ اطراف میں پہاڑ تھے۔ یہ درمیان کی وادی اہلارا وادی تھی۔ سیاح اکثر کپادوکیہ میں "عشق وادی" (لوویلی) گل شہر (روزویلی) اور اہلارا ویلی وغیرہ میں ٹریکنگ کے لیے آیا کرتے تھے۔

اہلارا کا ٹریک یہ تھا کہ ایک چٹان سے دوسری چٹان تک' دریا کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے جانا تھا۔ اصل ٹریک سولہ کلو میٹر لمبا تھا' مگر دو شارٹ کٹ بھی بنے تھے۔ ایک سات کلو میٹر جبکہ دوسرا ساڑھے تین کلو میٹر لمبا تھا۔

یہ اس کا اندازہ تھا کہ آپریشن کے باعث وہ بہت زیادہ پیدل نہیں چل سکتا ہو گا' اس لیے وہ انہیں سب سے چھوٹے ٹریک کے دہانے پہ مل جائے گا۔ مولوت بے نے انہیں وہیں ڈراپ کر دیا تھا۔ دو کب کے بج چکے تھے اور ان کو کافی دیر ہو چکی تھی۔ وہ ان سے پہلے کا پہنچ چکا تھا۔ سیاحوں کی چہل پہل میں بھی دور سے حیا نے اسے دیکھ لیا تھا۔

ایک بڑے پتھر پہ بیٹھا' سر پہ پی کیپ' کندھے پہ بیگ اور گلاسز سامنے کرے شرٹ پہ اٹکے ہوئے۔ وہ ان ہی کو دھوپ کے باعث آنکھیں سکیڑ کر دیکھ رہا تھا۔

وہ درمیانی رفتار سے چلتی' بہارے کا ہاتھ تھامے' اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ بھاگ کر اس کے پاس نہیں جانا چاہتی تھی۔ اسے جہان پہ غصہ تھا۔ کیا تھا اگر وہ انسانوں کی زبان میں بتا دیتا کہ اہلارا ویلی آجاؤ۔ اگر جو وہ یہ کوڈ نہ جان سکتی' اگر جو وہ نہ مل سکتے تب؟ لیکن تب بھی وہ اسی پہ ملبہ ڈال دیتا۔ آخر وہ اس جیسی اسمارٹ تھوڑی تھی۔

وہ دونوں اس کے قریب آئیں تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"میری لغت میں دو بجے کا مطلب ایک بج کر پچپن منٹ ہوتا ہے۔۔۔ اور اب ٹائم دیکھو!" وہ سنجیدگی سے سرزنش کر رہا تھا۔

کاش! اس کی یہ لغت کتابی شکل میں دستیاب ہوتی تو وہ اسے اٹھا کر۔۔۔ اف!

"اچھا! پھر واپس چلی جاتی ہوں۔"

"خیر! اب تو میں نے اتنا وقت ضائع کر لیا۔ اب چلتے ہیں۔" ہاتھ سے درختوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ اسی جانب چل پڑا۔

"تم نے مجھ سے پوچھا ہی نہیں کہ میں کیسی ہوں؟" بہارے نے احتجاجا" اپنی موجودگی کا احساس دلانا چاہا۔

"سوری! تم کیسی ہو؟" بجائے جھڑکنے کے وہ معذرت کرنے لگا۔

بہارے "بہت اچھی" کہہ کر اسے آشیانہ کے بارے میں بتانے لگی' جہاں دنیا کی سب سے اچھی لڑکی پنار رہتی تھی۔

"اچھا۔۔۔ ہاں۔۔۔ حیا!" اس کی بات سنتے سنتے اس نے ایک دم حیا کو پکارا۔ وہ سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

"تمہیں آئیڈیا نہیں ہوا کہ ہم کو ٹریک پہ جانا ہے؟ میں نے تو صبح ہی بتا دیا تھا۔"

(میری سمجھ میں اب آیا ہے' ایڈیٹ!)

"ہاں! تو؟"

"اور تم ان جوتوں کے ساتھ آئی ہو؟" ذرا خفگی سے کہتے ہوئے اس نے حیا کے قدموں کو دیکھا۔ حیا نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں گردن جھکائی اور ایک کراہ اس کے لبوں سے نکلتے نکلتے رہ گئی۔

اللہ' اللہ! وہ جلدی میں وہی سرخ ہیل پہن آئی تھی۔

"ہاں! میں ان جوتوں میں بھی دو گھنٹے پیدل چل سکتی ہوں۔"

اور ڈی جے نے ہی تو کہا تھا کہ انسان کو کوئی چیز نہیں ہرا سکتی' جب تک کہ وہ ہار نہ مانے' پھر وہ کیسے ہار مان لیتی؟

"شیور؟ تمہارا پاؤں۔۔۔۔"

"ٹھیک ہے میرا پاؤں۔ چلو اب!" وہ اکتاہٹ سے

کہہ کر آگے بڑھ گئی۔ بہارے نے سلسلۂ کلام وہیں سے جوڑ دیا۔

وہ گھنے درختوں میں آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ دریا ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ دونوں اطراف خشک اونچی چٹانیں تھیں جن میں غار کی صورت چرچ بنے تھے۔ تھوڑی دور جا کر ہی اس کا پاؤں جواب دینے لگا تھا۔ وہ موچ جس کو وہ کب سے نظر انداز کرنے لگی تھی شاید موچ سے بڑھ کر تھی۔

ابھی وہ زیادہ دور نہیں گئے تھے، جب جہان نے کہا کہ ذرا رک جاتے ہیں۔ بائیں جانب چٹان میں سیڑھیاں بنی تھیں جو اوپر ایک غار نما چرچ میں جاتی تھیں۔ وہ ان سیڑھیوں پہ چڑھتے اوپر آگئے۔ بہارے کو اس نے اپنا کیمرا دے کر چرچ کی تصاویر بنانے اندر بھیج دیا اور خود وہ سیڑھیوں کے دہانے پہ اوپر نیچے بیٹھ گئے۔

"کیا تم مجھ سے خفا ہو؟" وہ جو نیچے گہری وادی، دریا اور چٹانیں دیکھ رہی تھی، اس کے دوستانہ انداز پہ پلٹ کر اسے دیکھنے لگی۔

"تمہیں ایسا کیوں لگا؟"

"یوں ہی۔ حالانکہ اب تو میں تمہیں اپنے ساتھ بارڈر تک بھی لے جا رہا ہوں، مگر تم ہمیشہ خفا رہتی ہو۔" کہنے کے ساتھ اس نے کندھے سے اپنا بیگ اتارا اور اندر سے ایک تہہ شدہ کاغذ نکالا۔

"نہیں! میں خفا نہیں ہوں اور تمہارا پروگرام ــــ؟" اس نے اسے نقشہ کھول کر دونوں کے درمیان میں پھیلاتے دیکھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

"دیکھو..... یہ کپادوکیہ ہے۔ جہاں ہم ہیں۔" اس نے نقشے پہ ایک جگہ انگلی رکھی۔ حیا نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس پل وادی اہلارا پہ ہر سو چھایا سی تن گئی تھی۔ ٹھنڈا میٹھا سا موسم اور نیچے بہتے دریا کا شور۔

"یہ رہا ترکی اور شام کا بارڈر۔" اس نے بارڈر کی موٹی لکیر کو انگلی سے چھو کر بتایا۔ "یہاں ترکی کا چھوٹا سا قصبہ ہے کیلیس (Kilis) نام کا۔ ہمیں کیلیس جانا ہے۔ وہاں سے یہ بارڈر کراس کر کے میں ادھر شام کے شہر ایلیپو (Aleppo) چلا جاؤں گا۔ کیلیس سے بارڈر قریباً تین کلومیٹر دور ہے۔ منگل کی رات ٹھیک ڈھائی بجے مجھے یہ بارڈر کراس کرنا ہے۔ وہاں سے تم واپس چلی جاؤ گی اور پھر میں خود ہی پاکستان آجاؤں گا۔"

اللہ، اللہ! وہ اتنی خطرناک باتیں کتنے آرام سے کر لیتا تھا۔

"کیا بارڈر کراس کرنا اتنا آسان ہو گا؟" وہ متذبذب تھی۔ دل کو عجیب سے واہمے ستانے لگے تھے۔

"حیا! ترکی اور شام کا بارڈر آسان ترین بارڈر ہے۔ یہ نو سو کلومیٹر لمبا ہے۔ اب کیا سارے نو سو کلومیٹر پہ پہرہ لگا سکتے ہیں بارڈر فورسز والے؟ نہیں نا۔ سو یہاں صرف خاردار تاریں ہیں جن میں بہت سے سوراخ ہیں۔ ہر رات کتنے ہی لوگ اس بارڈر کو پورے پورے اہل و عیال سمیت کراس کر لیتے ہیں۔" وہ بہت بے نیازی سے انداز میں نقشہ لپیٹتے ہوئے بتا رہا تھا۔ حیا نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔

"اور بارڈر سیکیورٹی فورسز؟ وہ کیوں نہیں ان لوگوں کو پکڑتیں؟"

"وہ صرف ان کو پکڑتی ہیں جو خود چاہیں۔ اگر ہم نہ پکڑے جانا چاہیں تو فورسز ہمیں نہیں پکڑ سکتیں۔"

"مگر جہان! میں نے تو سنا ہے کہ اس بارڈر پہ بارودی سرنگیں ہوتی ہیں، جو پاؤں پڑنے پہ پھٹ سکتی ہیں۔" وہ جتنی پریشان ہو رہی تھی، وہ اتنا ہی پُرسکون تھا۔

"اوہ! مجھے پتا ہے کون سی سرنگ کہاں ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ فکر مت کرو۔"

وہ کچھ دیر اسی طرح کی باتیں کرتے رہے، پھر اس نے گردن اٹھا کر سورج کو دیکھا۔

"میں ذرا نماز پڑھ لوں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ جہان نے اس کے سرخ جوتوں کو دیکھا۔

"جب تم وضو کرنے کے لیے یہ جوتے اتارو گی تو میں انہیں دریا میں پھینک دوں گا۔" حیا نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

"تو میں انہیں اتاروں گی ہی نہیں۔ میرا دین بہت آسان ہے۔"

وہ نیچے اتری اور دریا سے وضو کر کے، صاف جوتوں کو پھر سے صاف کر کے ان ہی میں نماز پڑھی۔ جب وہ واپس آئی تو جہان اور بہارے آمنے سامنے چرچ کے داخلی دروازے کے پاس کھڑے تھے۔

"تمہاری عادت نہیں گئی چھپ کر باتیں سننے کی؟ تم کیوں کر رہی تھیں ایسا؟" وہ غصے سے اسے کہہ رہا تھا۔ سر جھکائے کھڑی بہارے نے منمنانا چاہا۔

"میں نے کچھ نہیں سنا۔ بس تھوڑا سا خود بخود ــــ"

"میں تمہارا خود بخود اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ میری بات کان کھول کر سن لو۔ اگر تم نے اس بات کا ذکر کسی سے بھی کیا، تو میں بہت برا پیش آؤں گا۔ تمہیں سمجھ میں آیا، جو میں نے کہا؟"

تب ہی جہان نے حیا کو دیکھا، تو سر جھٹک کر اس تک آیا۔

"کیا وہ ہماری باتیں سن رہی تھی؟" حیا نے تعجب سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں! میرا نہیں خیال کہ اس نے کچھ اتنا خاص سنا ہے۔ بہرحال میں اسے خبردار کر رہا تھا۔"

"تم پریشان مت ہو۔ اگر اس نے کچھ سنا بھی ہو تو سمجھ میں کہاں آیا ہو گا۔" جہان نے خاموش نظروں سے اسے دیکھا اور پھر نفی میں سر ہلایا۔

"وہ اپنی بہن کی جاسوس ہے۔ ایک ایک بات ادھر بتائے گی۔ اس پہ نظر رکھنا! یہ اس کو فون نہ کرے۔"

"اس کا فون تو آشیانہ میں پڑا تھا، چارج پہ لگا تھا۔ تم فکر نہ کرو۔ واپس جا کر میں فون ہی لے لوں گی۔"

جہان کچھ کہے بنا سیڑھیاں اترنے لگا۔

حیا نے پلٹ کر بہارے کو دیکھا، پھر آنے کا اشارہ کیا۔

وہ خاموشی سے سر جھکائے، اپنا گلابی پرس مضبوطی سے پکڑے ان کے پیچھے چلنے لگی۔

اس کا موبائل اس کے گلابی پرس کے اندرونی خانے میں رکھا تھا۔

☆ ☆ ☆

عائشے گل بڑے صوفے کے ایک کونے پہ ٹکی، اون کے گولے کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی نگاہیں دھاگے پہ جمی تھیں، مگر ذہن کہیں دور بھٹک رہا تھا۔ زندگی اب اون کے گولے کی سی لگتی تھی۔ کوئی اسے کب بن دے، کب اُدھیڑ دے۔ سلائیاں اس کے ہاتھ میں تو تھی ہی نہیں۔

"عائشے! تمہارا فون بج رہا ہے۔" آنے کے پکارنے پہ وہ چونکی۔ گود میں رکھا موبائل کب سے بج رہا تھا۔

اس نے نمبر دیکھا اور پھر ایک معصوم سی مسکان نے اس کے لبوں کو چھو لیا۔

"بہارے!" نمبر پہ لکھا نام بہت محبت سے لے کر اس نے آنے کو بتایا اور سبز بٹن دبا کر فون کان سے لگایا۔

"سلام علیکم!" اس نے مسکرا کر سلام کیا۔

"میں ٹھیک ہوں، تم سناؤ! لڑکی والے کیسے ہیں؟" اس کی مسکراہٹ اور بھی خوب صورت ہو گئی۔ آنکھوں میں طمانیت کے سارے رنگ اتر آئے۔

"ہاں! بتاؤ، کیا ہوا؟" اس کے الفاظ سن کر آنے نے بے اختیار سلائیاں چلاتے ہاتھ روک کر اسے دیکھا۔

اسی پل عائشے سیدھی ہو کر بیٹھی۔ اس کی مسکراہٹ ایک دم سمٹی تھی۔

"کون سا بارڈر؟ ترکی اور شام کا؟" اس نے آہستہ سے دہرایا تھا۔ آنے فاصلے پہ بیٹھی تھیں۔ ان کو سنائی نہیں دیا تھا۔

(جاری ہے)

ناولٹ

فرحانہ ناز ملک

یہ پاگل دل میرا

اسے کہتے ہیں "مقدر کے کھیل" یا پھر "تقدیر کا ہیر پھیر" یہ بھی نہیں تو "قسمت کا پانسہ پلٹنا۔"

شدید ترین سکتے کی کیفیت کے باوجود بھی میرے دماغ کا سوئچ آن تھا۔ اس گھڑی میں بھی جبکہ مجھے دماغی طور پر بھی سن ہو جانا چاہیے تھا۔ میرا دماغ ایک کے بعد ایک تقدیر اور قسمت سے متعلق مشہور عام و خاص الفاظ ڈھونڈنے میں لگا ہوا تھا۔ حالانکہ یہ نہ وقت تھا نہ موقع اور نہ دستور زمانہ۔

خصوصاً" ایسے لمحے کہ جب حاضرین محفل اجتماعی طور پر صدماتی سکتے میں مبتلا ہو گئے تھے۔ گو کہ میں بھی اس "ساکت اجتماع" کا حصہ بنا ہوا تھا۔ مگر دل کے الاپ سماعتوں میں اودھم مچائے ہوئے تھے کہ۔۔۔

"کیوں میاں۔۔۔ مردہ کیوں ہو گئے؟ ارے اچھلو، کودو، پنڈال میں جا کر بھنگڑے ڈالو، بتاؤ دنیا کو کہ تمہاری مراد بر آئی ہے۔"

میں بری طرح سے سٹپٹا کر دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ دل بد تہذیب محفل میں چاروں شانے چت ہو جانے کے ورس دے رہا تھا۔ چہار اطراف گردن گھما کر دیکھنے پر معلوم ہوا کہ حاضرین محفل کا سکتہ مجھ سے پہلے ٹوٹ چکا تھا اور اب۔۔۔ بہت سے ستائشی نظروں کا ہار پہنا رہے تھے تو چند ایک ہمدردانہ پھول نچھاور کرتے نظر آئے۔ کسی کی نظریں سکڑ کر اصل حقائق جاننے کی خواہش مند ہو رہی تھیں تو کوئی کوئی میری دماغی حالت پر مشکوک ہو رہے تھے۔

اور پیشتر اس کے کہ ان تمام نظروں کے جواب میں ان ہی کی زبان میں دیتا کہ اماں کا ایک آہنی ہاتھ میری گردن پر آپڑا۔ دوسرے سے انہوں نے میرا دوسرا ہاتھ تھاما تھا۔

"تو بھی کچھ بول دے سعد۔۔۔ منہ میں گھنگھنیاں لئے کانہ کوا، ساویلا ہے۔" اور میں ٹھہرا مشرقی باحیا



لڑکا کچھ بولنے کے بجائے ان کے پیچھے چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

یوں تو ہمیں گاؤں میں بھی کوئی تکلیف نہیں

تھی۔ اچھا بھلا رہ رہے تھے، کم از کم میں تو خوش ہی تھا۔ چاچی کے آجانے سے، چاچا کی نظروں اور رویے میں جو غیریت آئی تھی اس نے بھی مجھے بددل نہیں ہونے دیا تھا اور نہ ہی چاچی کے کڑوے لہجے میں نازل کیے گئے احکامات مجھے باغی کرپائے تھے۔ میں خوشی خوشی دوڑ دوڑ کر ان کے کام کیے جاتا۔ اماں کی ماتھے تک پہنچی آنکھوں کی پروا کیے بغیر۔

گھر میں موجود گائے اور پانچ چھ بکریوں کی اچھی خاصی ذمہ داری میرے ناتواں کندھوں پر آگئی تھی۔ اماں حتی المقدور میرے ساتھ کام ہلکا کرنے کی کوششوں میں لگی رہتیں، پر میں شاید بچپن سے ہی ان کا حد سے زیادہ سمجھ دار بیٹا تھا۔ شعور نہ ہونے کے باوجود نامحسوس طریقے سے خود ہی اپنے ذمے لگائے کام چابک دستی سے سرانجام دے لیتا اور اماں...

"رہن دے سعد! یہ میں کرلوں گی۔ تجھ سے کہاں ہوسکے گا۔" کہتی ہولتی رہ جاتیں، پھر میں ہوتا اور میرا پسندیدہ شغل۔

گاؤں کے دیگر لڑکوں کے ساتھ مل کر ہلڑ مچائے رکھتا۔ والی بال، گولا گنڈا، کرکٹ کھیلنے سے فرصت ملتی تو چاچے وسائے کا گدھا پکڑ کر اس کی سواری کا باری باری لطف لیتے۔ جب تک گدھے کی ہمت جواب نہ دے جاتی، یا چاچے وسائے تک کسی حاسد کی زبان سے ہماری مخبری نہ ہوجاتی۔ ہم ان کے گدھے کی جان نہیں چھوڑتے تھے۔

گرمیوں کی لمبی دوپہریں پانی سے بھرے کھیتوں میں تیراکی کرتے گزارتے یہاں سے جی اوبتا تو دور نہر پر پانی بھرنے کی غرض سے جانے والی مٹیاروں کے مٹکے اپنی غلیل کی مدد سے پھوڑ دیتے۔

یہ وہ سہانی و خوش گوار ساعتیں تھیں، جو مجھے گاؤں میں سدا رہنے پر مجبور کررہی تھیں۔ مگر...... ہوا وہ جس کا کبھی اشارہ بھی نہیں ملا تھا۔

اماں ایک روز انگلی پکڑے مجھے میرے پیارے گاؤں سے دور، بہت دور انجانے دیس میں لے گئیں کہ جہاں سانس لیتے ہوئے بھی گھٹن کا احساس ہوتا تھا۔

"کیوں اماں! کیوں، ہم کیوں جائیں یہاں سے۔ یہ ہمارا گھر ہے۔ ہم اپنا گھر چھوڑ کر کیوں جائیں؟"

میں اس روز اماں کا پلو پکڑ کے کتنی ہی دیر تلک رٹ لگائے رہا۔ یہاں تک کہ اماں کو تھپڑ مار کر چپ کرانا پڑا۔

"نہیں ہے یہ ہمارا گھر۔ یہ تیرے چاچے، چاچی کا گھر ہے۔ ہمارا نہیں۔" آنسو برساتے ہوئے انہوں نے درد بھرے لہجے میں کہا تھا۔ دادی، اماں سے گلے لگیں تو الگ ہونا بھول گئیں۔

"قسم سے، مجبوری ہے جو تجھے جانے دے رہی ہوں۔ ورنہ یہ سب سے پہلے سعد کا گھر ہے۔" اماں کو چھوڑنے کے بعد دادی مجھے چٹاچٹ چومنے لگیں۔

"اپنی بوڑھی دادی سے ملنے آتے جاتے رہنا۔ جب تک زندہ ہوں شکل دکھاتے رہنا۔" مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ دل کررہا تھا سب کے بیچ سے بھاگ نکلوں اور کسی ایسی جگہ جا چھپوں کہ پھر ان کے ہاتھ نہ آؤں۔ آناً فاناً ماموں کی گاڑی آگئی۔ لپک جھپک وہ اماں اور مجھ سے ملے۔

"جب میں زندہ ہوں، آپ کو بے قدری کی زندگی جینے کی ضرورت ہی کیا ہے اور پہلے بھی میرے دل اور گھر کے دروازے آپ کے لیے کھلے تھے۔ آج بھی کھلے ہیں۔ آپ ہر وسوسہ، ہر خدشہ یہیں پھینک کر میرے ہمراہ چلیں۔ آپ کو ذرا بھی تکلیف نہیں دوں گا۔"

وہ بہن کے آنسو مہربان ہاتھوں سے پونچھتے ہوئے گویا مرہم کا سا کام دینے لگے۔ اماں تو اس گھر سے خالی ہاتھ ہی جانا چاہتی تھیں، پر دادی آڑے آگئیں۔

گاؤں کی موسمی سوغاتوں کے علاوہ دیسی گھی کا ڈبا،

پنجیری، ایک دو اچار اور بہت کچھ... میرے ننھی بیلی ہمیشہ کی طرح ماموں کی گاڑی کو حسرت بھری نظروں سے تک رہے تھے۔ مگر میرے دل کی حالت نرالی تھی مجھے یہ پسماندہ سا گاؤں، اس کی مٹی سے اٹی گلیاں کچے گھر، ہرے بھرے کھیت اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔

گاؤں کی حدود ختم ہونے تک میں شیشے سے ناک چپکائے لاچاری سے جانے پہچانے رستوں کو بوجھل دل لیے الوداع کہتا رہا۔ ماموں کی زبانی کھینچے گئے نئی زندگی کے نقشے صرف اماں ہی سنتی رہیں۔ اور پھر گاؤں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑنے کے بعد گاؤں چھوڑنے کی وجہ بھی مجھ سے پوشیدہ نہ رہی۔ وہی روایتی سی داستان!

بیوہ بھاوج، ساس کے زیر سایہ دیور کے ہوتے ہوئے خود اعتمادی سے سر اٹھا کر سسرالی گھر میں زندگی گزارتی رہی۔ مگر جوں ہی دیورانی نے اس گھر میں قدم رکھا۔ اماں کے قدم لڑکھڑا گئے۔ دیورانی یعنی میری چاچی نے الزام تراشیاں ہی ایسی رکھیں کہ اماں کو اپنا ہی گھر بے سائباں محسوس ہونے لگا۔

چاچی جن قہربار نظروں سے مجھے گھورتی تھی، وہ ایک طرف۔ اماں کے لیے تو اس کے پاس زہر میں ڈوبے خنجر نما لفظ ہی لفظ ہوتے تھے۔ اماں کو بدکردار عورت، دیور کے ساتھ ناجائز مراسم رکھنے والی۔ غرضیکہ وہ، وہ کچھ کہا کہ جسے سنتے ہی اماں ماموں کے عالیشان بنگلے میں آگئیں۔ گو کہ زندگی یہاں بھی بانہیں وا کیے منتظر نہیں ملی۔ لیکن گاؤں سے دربدری کی اصل وجہ جان لینے کے بعد مجھے یہاں رہنا ہر صورت گوارا تھا۔ گاؤں اور گاؤں کی زندگی میری پسندیدہ سہی لیکن اپنی پیاری ماں سے بڑھ کر نہیں تھی۔ سو میں نے آنے والے دنوں میں ماضی کو طاق پر سجا دیا۔

ماموں کی پیروی میں جس وقت ہم نے ان کے لاؤنج میں قدم رکھا، شام سرنہوڑا رہی تھی۔ لاؤنج میں موجود دو سنجیدہ ہستیاں دیکھ کر ہم گھبرا سے گئے۔

یہ پہلا موقع تھا میں ماموں کے عالیشان بنگلے میں آیا تھا اور آکر سحرزدہ سا ہوگیا تھا۔ بلاشبہ ماموں کا گھر ان کی امارت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔

اس سے پہلے ہمیں ماموں کے گھر اس لیے آنے کا موقع نہیں ملا تھا کہ ماموں خود ہی مہینہ دو مہینہ بعد گاؤں کا چکر لگا لیا کرتے تھے۔ ہر چکر پہ اماں سے اپنے ہمراہ چلنے کی ضد کرتے اور ہر بار ہی اماں طریقے سے انکار کردیتیں۔ یہ ہی نہیں مجھے بھی کبھی ماموں کے ساتھ آنے کی اجازت نہیں دی اور کیوں نہیں دی، یہ مجھے اس وقت اپنے سامنے موجود ان دو ہستیوں کو دیکھ کر اندازہ ہوگیا تھا۔ خیر سے ان دونوں عظیم ہستیوں کو میری مامی اور ماموں زاد ہونے کا شرف حاصل تھا۔ جن کے چہرے عام دنوں میں کوئی شک نہیں، خوب صورتی کے ہر معیار پر پورے اترتے ہوں گے۔ مگر اس وقت تو اللہ جھوٹ نہ بلوائے، مجھے اپنی گائے بھوری اور بکری رانی سے مشابہ لگ رہے تھے۔ وہ دونوں بھی جب اڑیل ہو کر غصے میں آتی تھیں تو یوں ہی چتون بنا لیتی تھیں۔ جیسے مامی اور ماموں زاد کے ابرو تنے ہوئے تھے۔ دونوں کے تیور بتا رہے تھے کہ ہماری آمد ان کے لیے شاک کا سبب بنی تھی۔

"ملو بھئی...... یوں اسٹل کیوں ہوگئی ہو؟ آپا کا استقبال کرو۔" بالآخر ملازم کو سامان کے بارے میں ہدایات دیتے ماموں کو ہی خیال آیا تو مامی کے بت میں جنبش ہوئی۔ یہ ذرا سی جنبش ہی اماں کے لیے بہت تھی۔ باقی کا ملن انہوں نے خود ہی پورا کرلیا۔

"اے شاہنواز...... وہٹی تیری ہوا پانی پہ گزارہ کر رہی ہے کیا؟ ہڈیوں پہ ماس ہے بس......" ماموں مسکرائے، مامی سے ہونٹ پھیلانا دوبھر ہوگیا۔ نہ جانے لحاظ تھا یا خفت کہ وہ جواب بھی نہیں دے پائیں۔

"ڈولی...... اپنی پھپھو سے ملیں بیٹا!" ماموں نے دوسرے ساکت بت میں جنبش پیدا کرنے کا بیڑہ اٹھایا مگر وہ کچھ زیادہ ہی شاک میں تھا۔ آنکھیں ماتھے پہ

رکھے اس نے ذرا جو اثر لیا ہو اس بار بھی اماں نے ہی گرمجوشی دکھائی۔ چٹاچٹ چوم ڈالا۔

"نٹ..... یہ کارٹون کون ہے؟"

بالآخر اس کے منہ میں زبان کی موجودگی کا ثبوت اس جملے کی صورت مل ہی گیا۔ اب میں کوئی ان پڑھ جاہل تو تھا نہیں۔ اپنی یہ پذیرائی جہاں میرے ماتھے پر سلوٹیں لانے کا باعث بنی وہیں ماموں قہقہہ لگا کر ہنس دیے۔

مسکراہٹ تو مامی کے لبوں پر بھی ابھر آئی تھی۔ تب ہی تو اماں بھی یوں کھلکھلائیں گویا ان کی بھتیجی صاحبہ نے مجھے کوئی اعزاز بخش دیا ہو۔

"بری بات بیٹے!" قہقہہ تھما تو ماموں نے پیار بھری گھرکی پلائی۔

"یہ آپ کا بھائی ہے سعد..... آپ کی پھپھو کا بیٹا۔"

"نیور..... یہ میرا بھائی نہیں ہو سکتا میری فرینڈز مذاق اڑائیں گی میرا۔" اس نے ناک بھوں چڑھا کر گویا مجھے خود سے مزید متنفر کر دیا۔

"اس سے زیادہ بہتر حالت تو ہلاکو کی ہے۔ یہ تو آثار قدیمہ کا لگتا ہے کوئی۔"

میں نے آنکھیں سکیڑ کر اس کا جائزہ لیا۔

وہ ویسی ہی تھی جیسا اسے ہونا چاہیے تھا یعنی بلا کی پر اعتماد، گلابی گلابی، خوب صورت سے ریڈی میڈ فراک میں ملبوس۔ مگر میرے دل میں اس کے خلاف محاذ کھل چکا تھا۔

"سعد کے لیے ڈولی کے روم کے برابر والا روم ہلاکو سے سیٹ کروا دو اور آپا کے لیے ہمارے بیڈ روم کے سامنے والا۔ یہ اب یہیں رہیں گے۔"

ماموں کو "یہ یہیں رہیں گے۔" کہنے کی ضرورت تو نہیں تھی۔ یہ اعلان ہمارے ارد گرد رکھا سامان پہلے ہی کر رہا تھا۔ جس کی طرف مامی دلدوز آنکھوں سے دیکھتی نہیں تھک رہی تھیں۔

"آپا! آپ ریسٹ کریں۔ میں بھی فریش ہو لوں۔ رات کے کھانے پر ملاقات ہو گی۔"

"جیتے رہو۔" اماں نے ماموں کی پشت کو جاں نثار نظروں سے دیکھا۔

مامی انہیں ان کے منتخب کردہ کمرے کی جانب لے گئیں۔ پیچھے میں اور ڈولی ایک دوسرے کو یوں کینہ توز نظروں سے گھورنے لگے جیسے برسوں کی دشمنی ہو.....

ایک اڑتی پڑتی نظر یوں ہلاکو پر بھی ڈال لیتا تو گویا اور زیادہ دہک اٹھتا۔ اس نوکیلے دانتوں والے ہلاکو کو ابھی کچھ دیر پہلے میری ذات سے زیادہ مار کس دیے گئے تھے۔ گویا ناقابل تلافی اعتراض تھا ڈولی صاحبہ کا.....

شام کا وقت تھا۔ لان میں چائے پی جا رہی تھی۔ جب سے ہم آئے ہوئے تھے، ماموں آفس سے جلد اٹھ آتے تھے۔ ابھی بھی وہ اماں کے ساتھ ماضی کی خوشگوار یادوں میں گم تھے۔ مامی خاموشی سے چائے پی رہی تھیں۔ جبکہ میرے اور ڈولی کے درمیان اول روز والی نظروں کا تبادلہ جاری تھا اور نہ جانے کتنی ہی دیر جاری رہتا کہ ماموں نے میرے اسکول کے ایڈمشن کا تذکرہ چھیڑ کر میری توجہ بانٹ لی۔

"میرے خیال میں ڈولی کا ہی اسکول بہتر رہے گا۔ دونوں کزنز ایک ساتھ رہیں گے تو ہمیں بھی سہولت ہو جائے گی اور ڈولی کے اسکول میں ہونے کی وجہ سے سعد کو بھی ایڈجسٹمنٹ میں پرابلم نہیں ہو گی۔"

"واٹ؟" ماموں کا مشورہ ڈولی صاحبہ کو آگ ہی لگا گیا۔ کئی فٹ اوپر اچھلی اور اتنی ہی اونچی آواز میں چیخی میں معصوم سا بنا بیٹھا رہا۔

"کیوں بیٹے..... کوئی پرابلم ہے کیا؟" بیٹی کا عناد ماموں سمجھ نہیں پائے تھے۔

"یہ پینڈو، جاہل میرے اسکول میں پڑھنے کے لائق ہے بھلا؟"

"کیوں..... تمہارے اسکول میں صرف شہروں والے جاہل ہی پڑھ سکتے ہیں کیا؟" میں نے واضح اس پر چوٹ کی تھی۔ ماموں اور اماں تو ہنس دیے مگر اس کی بلبلاہٹ لطف اندوز کر دینے والی تھی۔

ماموں اور اماں کے نزدیک ہماری یہ بے ضرر سی نوک جھونک کم عمری کی وجہ سے تھی، مگر وہ بے خبر تھے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کے دشمن بنتے جا رہے تھے۔

"اتنا بڑا انگلش اسکول اور یہ ٹھہرا پینڈو۔ اسے کہاں سے انگلش آئے گی۔"

"میری انگریزی بہت اچھی ہے۔ چاہو تو مقابلہ کروا لو۔"

میرے لہجے میں سچائی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ ہمارے گاؤں کا اسکول لاوارث شمار ہوتا تھا۔ لیکن جیسا تیسا بھی تھا۔ میں دل لگا کر وہاں پڑھنے جایا کرتا تھا۔

"یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ سعد جیسا ذہین بچہ خود مینج کر لے گا سب۔ مجھے اس سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔" نہ جانے کیوں ماموں کو مجھ سے امیدیں ہو گئی تھیں۔ یوں میرے اسکول کا معاملہ بھی اس شام سیٹ ہو گیا۔

مامی بھی گو کہ ڈولی کی ہم نوا تھیں۔ لیکن انہوں نے بھی اعتراض نہیں کیا اور اتنا تو میں سمجھ ہی گیا تھا کہ اپر کلاس کی عام بیویوں کی طرح مامی، ماموں پر حکم چلانے کی عادی نہیں تھیں۔ یا یوں کہنا چاہیے کہ ماموں نے یہ عادت مامی کو پڑنے ہی دی تھی۔ کیونکہ ماموں کی یہ ساری جائیداد، دولت ان کے اپنے زور بازو کا نتیجہ تھی مامی کے جہیز کا کرشمہ نہیں..... بے شک مامی کا میکا بھی اعلا حیثیت کا حامل تھا۔ مگر ماموں کے اسٹیٹس کے ساتھ لگا "اعلا" ان کی اپنی محنت کا نتیجہ تھا۔ وہ بہت نیچے سے اتنی اوپر تک آئے تھے۔ رشتوں کی اہمیت و تقدس سے واقف تھے۔ سو مصروفیات کے ریلے میں گم ہو جانے کے باوجود بھی گاؤں بیٹھی بیوہ بہن اور یتیم بھانجے سے بھی ملنے نہ صرف جا پہنچتے تھے، بلکہ وقت ضرورت اپنے پاس بھی لے آئے تھے اور یہاں لا کر صرف فرض کی ادائیگی سمجھ کر بری نہیں ہو گئے تھے بلکہ ہر ممکن طور پر ان کی خیر خبر بھی رکھتے تھے۔

یقیناً مامی، ماموں سے دلی انسیت رکھتی تھیں کہ اپنے اسٹیٹس سے میل نہ کھانے کے باوجود انہوں نے ہماری یہاں مستقل رہائش کو درد سر نہیں بنایا تھا۔ گو کہ اماں کی باتیں، ان کا طرز زندگی، مامی کی ذاتی زندگی میں بلا خوف و خطر مشورے دینا، "آپا" کی حیثیت کا ادراک رکھتے ہوئے کبھی سخت بات بھی کہہ دینا..... یہ سب درد سر کا باعث بننے کے لیے کافی تھا۔ مگر یا تو مامی، ماموں کی محبت میں سب برداشت کر جاتی تھیں۔ یا پھر انہیں حقیقتاً "رشتوں کا پاس تھا۔ یوں جناب سعد فراز یعنی کہ مجھ ناچیز کا ایڈمیشن ارسہ شاہنواز یعنی کہ ڈولی کے اسکول میں اسی کے سیکشن میں ہو گیا۔ ایڈمشن کے لیے دیے جانے والے انگلش کے ٹیسٹ میں میرے نمبر قابل ستائش آئے تھے۔

"کلاس میں یا اسکول میں کسی اسٹوڈنٹ یا ٹیچر کو یہ بتایا کہ تم میرے کون ہو تو بچو گے نہیں مجھ سے۔"

پہلے دن اسکول کی تیاری کرنے کے دوران وہ آندھی بن کر میرے کمرے میں آئی تھی اور شیر بن کر غرائی تھی۔

"مجھے بھی تم جیسی ال مینرڈ لڑکی سے رشتے داری دکھانے کا شوق نہیں۔"

میں نے بھی کندھے اچکا کر بے نیازی سے کہا تھا۔ وہ تنتنا کر کمرے سے نکل گئی۔

"سعد فراز..... آپ بہت کیوٹ ہو۔" پہلے ہی روز کلاس ٹیچر نے یہ ریمارک دے کر گویا مجھے میری خوب صورتی بلکہ پوشیدہ خوب صورتی کا احساس دلایا تھا۔ جہاں مجھے شرم نے آلیا وہیں ارسہ نے پہلو بدل بدل کر پیریڈ اٹینڈ کیا۔ میری شکل کا دیہاتی پن تو جاتے جاتے ہی جاتا۔ ہاں! مگر نئے ہیئر کٹ اور خوب صورت صاف ستھرے یونیفارم نے میری گوری رنگت اور معصوم نقوش ضرور ابھار دیے تھے۔

"سعد فراز جیسا ڈیسنٹ اور ویل مینرڈ بچہ پوری کلاس میں کوئی نہیں۔"

ٹھیک ایک ہفتے کے بعد میڈم فاخرہ کے ریمارکس میں یہ ردوبدل آیا۔ اس روز کلاس مانیٹر ارسہ شاہنواز نے میتھ کے پیریڈ میں نوٹ بکس اکٹھی کرنے کے لیے سب سے پہلے مجھ پر دھاوا بولا۔ حالانکہ میرے بہت سارے سوالات باقی تھے اور ٹائم بھی مگر ارسہ

شاہنواز کلاس ٹیچر کے پیریڈ کے بعد سے ہی کچھ مشتعل سی ہو رہی تھی۔ نوٹ بک چھین کر بھی اسے سکون نہیں ملا۔ بریک سے پہلے اس نے خوامخواہ میرا نام شور کرنے والے بچوں میں لکھ کر نہ صرف میری بریک بند کروائی بلکہ مجھ سے سوبار سوری بھی لکھوایا۔ اس روز وہ مجھے ہمیشہ سے زیادہ بری لگی۔

"اس ٹرم میں سعد کی پوزیشن ضرور آئے گی۔ اس کے منتھلی ٹیسٹ میں ارسہ سے بھی زیادہ مارکس آئے ہیں۔"

ڈیڑھ ماہ بعد میڈم فاخرہ نے یہ کہہ کر گویا ارسہ کو جلبلانے پر مجبور کر دیا۔

"او گاڈ!..... یہ لڑکا کیوں آگیا میری کلاس میں۔ یہ وہیں اپنے گاؤں کے پھٹیچر سے اسکول میں ہی پڑھتا۔" میڈم کی موجودگی کا لحاظ کیے بغیر اس نے زچ ہو کر یہ سب کہا تھا۔ اور ہمیشہ کی طرح اس روز بھی میری بریک پہ کرفیو لگا دیا' بلاوجہ ہی۔

اب میرا دبو پن قدرے کم ہو چکا تھا۔ سو اگلی صبح میں نے میڈم فاخرہ سے اس کی شکایت لگانے میں ذرا بھی تامل نہ کیا۔

"ارسہ.....! بہت بری بات ہے۔ ادھر آیئے۔" میڈم کی خشمگیں نظریں اس پر تھیں۔ وہ غالباً" خون کے گھونٹ پیتی ان کے پاس گئی تھی۔

"یہ میں کیا سن رہی ہوں؟" انہوں نے گوشمالی شروع کی۔ مجھے سکون سا ملنے لگا۔

"میڈم! یہ مجھے بالکل بھی اچھا نہیں لگتا۔" اس نے بجائے گھبرانے کے صاف بات کر دی۔ میڈم کا منہ ہی کھل گیا۔

"تو جو آپ کو اچھا نہ لگے' آپ اس کی بریک بند کر دیں گی؟ اور یہ اچھا نہ لگنے کی وجہ بھی یہ ہی ہے کہ سعد فراز آپ سے ٹیسٹ میں زیادہ مارکس لے رہا ہے' ہے ناں؟"

"میں اسے خود سے آگے بڑھتا نہیں دیکھ سکتی۔" اتنی صاف گوئی میڈم سے ہضم نہ ہو سکی۔

"کلاس کی طرف منہ کر کے ہاتھ اوپر کر کے کھڑی ہو جائیں۔"

انہوں نے سزا سنانے کے ساتھ ہی پڑھانے کا آغاز کر دیا۔ میں بڑا پر سکون سا کتاب کھول کے دل جمعی سے پڑھنے لگا۔ گاہے بگاہے نظریں اس پر بھی پڑ جاتی تھیں۔ میری ہر نظر کے جواب میں اس نے شکلیں بگاڑ بگاڑ کر مجھے دیکھا تھا۔ گویا سزا کی حالت میں بھی وہ مجھے نہیں بخش رہی تھی۔ مجھے پھر سے غصہ آنے لگا۔

وہ دن کلاس میں تو میرے لیے یادگار اور خوش گوار رہا' مگر گھر جا کر جو اس نے میرے خلاف زہر بھری گل افشانی کی۔ اس نے مجھے اماں کے سامنے ہی نہیں' مامی کے سامنے بھی شرمندہ سا کر دیا۔ کیا کیا نہیں الزام تراشے تھے کہ میں کس گھٹیا طریقے سے اسے میڈم کی نظروں میں گرانے کی کوشش میں لگا رہتا ہوں۔ یہی نہیں' آج کی سزا کا اس نے الگ ہی قصہ بنا کر سب کے گوش گزار کیا۔ نتیجتاً" اماں نے میرے کان کھینچنے پر ہی اکتفا نہیں کیا تھا بلکہ دو ہتھڑ جڑنے میں بھی عار محسوس نہیں کیا۔

مامی نے حسب عادت و توفیق نظروں کی زبان میں اپنی ناراضی جتلائی۔

میں اسکول میں کھلا کھلا رہا تھا اور وہ مرجھائی مرجھائی.....

اسکول سے واپسی کے بعد وہ اڑی اڑی پھرتی رہی اور میں دبکا ہوا۔ اس دن کے بعد ہمارے درمیان ایسا محاذ کھلا جو بچپن تک تو صرف ہم دونوں تک ہی محدود تھا مگر بڑے ہونے پر گھر والے بھی ہماری اس جنگ عظیم سوئم سے آگاہ ہو گئے۔ صرف آگاہ ہی نہیں' زچ بھی..... کیونکہ ان کے بہت سارے ارادے ہماری اس جنگ کی ہی وجہ سے ملیامیٹ ہو گئے۔

مجھے بچپن میں اس سے پرخاش تھی تو صرف اس وجہ سے کہ وہ بہت بد اخلاق' بدلحاظ ٹائپ کی تھی۔ یہ پرخاش چڑ میں تب بدلی' جب میں نے اپنی ذات کے ساتھ جڑے سب سے قریبی رشتے اماں کو اس پر جان نچھاور کرتے دیکھا۔

چڑ نے نفرت کا روپ اس وقت اختیار کیا' جب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ چالاک بڑے طریقے سے' بڑی صفائی سے..... بھولی بن کر مجھے اماں سے پٹوا بھی دیتی ہے۔

اور وہ مجھ سے اس وجہ سے خار کھاتی تھی کہ میں نے اسکول میں اس کی پوزیشن پر قبضہ جما لیا تھا۔ ٹیچرز کا ہی نہیں' پرنسپل کا بھی چہیتا بن گیا تھا۔ میری غیر معمولی ذہانت اور قابلیت کے ڈنکے ہر اس جگہ بجنے لگے' جہاں تک نام پیدا کرنے کی اس کی خواہش تھی۔

سب سے بڑا دھچکا اس کو میری ذات کی وجہ سے یہ ملا کہ ماموں مجھ پر زیادہ مہربان ہو گئے تھے۔ یعنی میری حیثیت گھر میں اس کے برابر ہو گئی اور یہی بات سب سے زیادہ ناقابل برداشت ثابت ہوئی۔ اسکول تو اسکول گھر میں بھی مجھے سر آنکھوں پر بٹھایا جانے لگا۔

ماموں ہی نہیں' مامی بھی آہستہ آہستہ خول سے باہر نکل کر تعریف و توصیف کے لائق سمجھنے لگیں تو جیسے ارسہ شاہنواز کی دنیا ہی کسی اور کی ملکیت ہو گئی۔ ایسے میں وہ مجھ سے نفرت نہ کرتی تو کیا پھولوں کے ہار پہنا کر اپنی دنیا کا نیا مالک بننے کی مبارک باد دیتی؟



"شاباش میری چندا..... پی لے..... ضد نہیں کرتے۔ اتنی موٹی موٹی کتابیں پڑھ کے دماغ بھی تھک جاتا ہو گا۔ میں تو کہتی ہوں بس چھوڑ یہ ڈاکٹری پڑھنا اور سکون سے گھر بیٹھ۔ لڑکی کا پڑھا لکھا کس کام کا' جب کرنی وہی۔"

"لائیں' دیں پھپھو! میں یہ پی لیتی ہوں۔"

اس سے زیادہ ارسہ میں سننے کا حوصلہ نہیں تھا۔ طبیعت اتنی مضمحل بخار سے نہیں ہو رہی تھی' جتنی پھپھو کی اس تیمارداری نے کر دی تھی۔ اوپر سے ان کے لیکچر..... تب ہی تو اس نے دودھ میں دیسی گھی گھلے ہونے کے باوجود غٹاغٹ ایک ہی سانس میں چڑھا لیا۔

قریب ہی لیپ ٹاپ پر مصروف' سعد فراز نے باقاعدہ سر ہلا کر اپنی اماں کے حوصلے کی داد دی تھی۔ جو ارسہ جیسی پھنے خان لڑکی کو رام کرنے میں ہمیشہ

کامیاب رہتی تھیں۔

"لا سر دبا دوں۔۔۔ بلکہ اٹھ' تیل کی مالش کردوں سر میں۔ کیسے سوکھے سڑے بال ہو رہے ہیں۔ موئی پڑھائی یہ تو نہیں کہتی کہ سر میں تیل بھی نہ لگایا کرو۔ بالوں کا ستیاناس کر دیا۔ ذرا سہارے سے اٹھ کر بیٹھ میں۔۔۔"

"نہیں نہیں پھپھو!" سعد کی توقع کے عین مطابق ارسہ نے اماں کی چلتی زبان سے گھبرا کر بیچ میں ہی انہیں روک دیا تھا۔ "یہ جو اتنا بھاری برف دودھ آپ نے پلایا ہے۔ یہ مجھے اگلے دو گھنٹے تک نہیں اٹھنے دے گا۔ اٹھوں گی تو قے آجائے گی۔ سچ میں میرے دل پہ جم گیا ہے۔"

واقعی اس کی شکل بھی ایسی ہی بے چاری سی ہو رہی تھی۔ اماں کی انگلی ناک پر ٹھہر گئی۔

"یہ آج کل کی نسل ہے۔" انہوں نے دائیں بائیں سر ہلا کر شدید تاسف کا اظہار کیا۔ "دیسی گھی والے دودھ سے اس کو قے آرہی ہے۔ ارے! طاقت والی غذائیں نہیں کھاتی ہو تب ہی تو ہڈیاں ہی ہڈیاں ہیں۔ ایک ہمارا زمانہ تھا۔ یہی دودھ' مکھن' دیسی گھی کھا کھا کر کیا صحت بن جاتی تھی ہماری اور آج کل کی لڑکیاں۔۔۔"

اس موضوع کو زیادہ طول پکڑنا تھا۔ ارسہ نے بڑی بے چارگی سے ان کے گھٹنے پر دھرا اپنا سر ایک طرف کو ڈھلکا لیا تھا۔

"اچھا چل۔۔۔ میں اپنی بچی کا سر دبا دوں۔ کچھ تو سکون ملے گا۔" سعد نے اچٹتی سے نظر اپنی ماں اور ماموں زاد پر ڈالی۔ جس کے نخرے بیماری میں آسمان کو چھونے لگتے تھے اور اس کے لیے غصہ کا باعث اپنی اماں کا رویہ بنتا۔ اتنے لاڈ اس نواب زادی کے مامی نہیں اٹھاتی تھیں جتنے اماں۔۔۔ اور وہ محترمہ بھی حق سمجھ کر وصول کیے جاتیں اوپر سے نخرے الگ۔۔۔!

چھینک آنے پر بھی محترمہ پریشان ہو جاتی تھیں۔ اب تو تین دن سے ٹمپریچر تھا۔ کیسے نہ لاڈ اٹھواتیں۔

ابھی بھی اماں زبردستی اسے کمرے سے پکڑ کر یہاں لاؤنج میں لے آئی تھیں کہ بچی اپنے کمرے میں پڑی پڑی تھک گئی ہے۔ تھوڑا آب و ہوا بدل لے۔ لاؤنج میں پہلے سے بیٹھے سعد کے حلق تک میں اماں کی اس عنایت کو دیکھتے ہوئے کڑواہٹ گھل گئی تھی۔

"آب و ہوا کا تو یوں کہہ رہی ہیں جیسے مری میں لے آئی ہوں۔" بظاہر اپنی مصروفیت میں مگن وہ خود کو یہ سوچنے سے باز نہ رکھ سکا۔ "اور ان محترمہ کی اداؤں کے کیا کہنے' یوں ڈھیلی ہوئی پڑی ہیں۔ جیسے آخری وقت قریب آگیا ہو۔"

اور چونکہ یہ تو طے تھا کہ جب تک اماں' ارسہ سے لاڈ جتلائیں گی۔۔۔ وہ یوں ہی کڑھتا رہے گا۔ سو اس سے بہتر اس نے لاؤنج سے اٹھ جانا ہی بہتر سمجھا۔



"اب ہو گئے کام!" اماں کے کچن میں آتے ہی ہلاکو بڑبڑایا تھا مگر یوں کہ اماں نہ سن سکیں۔ پر کیا کیا جا سکتا تھا کہ انہیں ہلاکو کے ہلتے لب ہی مشکوک کر گئے۔

"کیا بولا تو؟" ان کے تیور کڑے ہونے میں لمحہ لگا بس۔

"یہی کہ آپ نے کچن میں قدم رنجہ فرما لیا۔ اب سارے کام آرام سے ہو جائیں گے۔" ہلاکو نے لفظ چبائے تھے۔

"جا رے بڑا فرمانبردار کہیں کا۔ جیسا نام ویسے کام اتنا پکاتا نہیں جتنا کھاتا ہے۔ اسی واسطے تو کچن میں آجاتی ہوں' تجھے دیکھ کر شرما حضوری تیری اس سرنگ پہ پھاٹک تو لگ جاتا ہے۔"

اماں لحاظ کرنے کی عادی تو تھیں ہی نہیں۔ ہلاکو کے بڑبڑانے میں مزید اضافہ ہوا۔

"جا اب باہر' سعد بلا رہا تھا تجھے۔" اس کے بڑبڑانے سے اماں کا سر دکھنے لگتا تھا۔ تب ہی چلا کر بولی تھیں۔ وہ صافی سلیب پر پھینکتا پھولے منہ کے ساتھ کچن سے باہر نکلا۔

"میرے بجائے ہلاکو نام ان ہی کا ہونا چاہیے تھا۔ زبان سے چنگاریاں چھوڑتی ہیں۔ مجال ہے اگلا بچ جائے۔"

یہ جملے ہلاکو نے محض سوچنے پر اکتفا کیا۔ کہنے کی غلطی کرتا تو بچت مشکوک ہو جاتی۔ لاؤنج میں مامی سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ جلدی میں معلوم ہوتی تھیں۔

"سنو۔"

"مجھے بھائی بلا رہے ہیں۔" ہلاکو نے حکم سننے سے پہلے اطلاع دی۔

ارے ہاں!" مامی کو کچھ اور یاد آگیا۔ "سعد کی ہی طرف تو بھیج رہی تھی تمہیں۔ اب خود ہی چلی جاتی ہوں۔"

اس کا مطلب تھا ہلاکو کا سعد کے پاس جانا اب بیکار تھا۔ مامی نے کہتے ہی قدم بھی سیڑھیوں کی جانب موڑ لیے تھے۔ ہلاکو وہیں لاؤنج میں ٹی وی کے آگے جم گیا۔ کچن کی فضا ناموافق تھی ورنہ اس کا کام کچن میں ہی ہوتا تھا اس وقت جو کہ اماں کی موجودگی کی وجہ سے ممنوعہ بن چکا تھا۔

ہمیشہ ٹپ ٹاپ سے رہنے والے سعد کو بالکل رف سے حلیے میں دیکھ کر مامی بے ساختہ مسکرانے لگیں۔ نہائے' دھوئے' شیو بنائے بغیر' نائٹ سوٹ میں وہ اگرچہ کاغذ قلم کے ساتھ نبرد آزما تھا مگر تھا بستر میں۔

"ہوں تو سنڈے منایا جا رہا ہے!" مامی نے پیار بھرے انداز میں کہا تھا۔ پھر بھی وہ جھینپ سا گیا۔

"نہیں۔۔۔ بس وہ۔" کمبل آہستگی سے پرے ہٹاتا' بکھرے بالوں میں انگلیاں چلاتا وہ بیڈ پر سے اتر آیا۔ مامی کا رویہ اب لاکھ خوش گوار سہی مگر اسے ان سے بات کرتے ہوئے جھجک ضرور ہوتی تھی۔ اوپر سے اس کے کمرے میں بھی خال خال آیا کرتی تھیں اور اتوار کو تو کبھی آئی ہی نہیں تھیں۔ تب ہی تو اپنے "اجڑے حلیے" کی وجہ سے شرم آرہی تھی۔

"ناشتا کر لیا تم نے؟" دن چڑھ آیا تھا۔ سعد پر ایک بار پھر شرم حملہ آور ہوئی۔

"نہیں! ابھی جو۔۔۔ ابھی ابھی۔۔۔"

"چلو' کوئی بات نہیں۔ میں ہلاکو کو بھیجتی ہوں۔" اس کی بات کاٹ کر انہوں نے کہا۔ وہ ہونٹ سکوڑ کر انہیں دیکھے گیا۔

"لیکن پھر تمہیں ایئرپورٹ جانا ہوگا۔"

"وہ کس سلسلے میں؟" اس کے کان کھڑے ہوئے۔ لگ رہا تھا خاص مہمانوں کی آمد ہے۔ پھر بھی پوچھ لیا۔

"ہاں! آپا آرہی ہیں میری ناروے سے۔ تم انہیں ریسیو کر لینا۔ اپنے ماموں کی مصروفیات کا تو تمہیں پتا ہی ہے۔ میں بھی نہیں جا سکتی۔ اب تم ہی ہو جو انہیں لینے جا سکتے ہو۔"

"چلا جاؤں گا۔ آپ ٹائم بتا دیجئے۔"

اس قسم کے فضول کاموں سے چڑ ہونے کے باوجود بھی اسے ہاں کہتے ہی بنی کہ ناں کہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مامی کو کبھی کبھی ہی ضرورت پڑتی تھی کسی کام کے لیے اور وہ ان کے ان "کبھی کبھی" کے کاموں پر انکار کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

ابھی بھی مامی اس کی تابع داری پر سر تاپا نثار ہوتی فلائٹ کا ٹائم بتا کر باہر چلی گئیں تو وہ دھپ سے بیڈ پر گر سا گیا۔

"مامی کی یہ آپا آج سے پہلے تو ظہور پذیر نہیں ہوئیں کبھی؟" جو باتیں سوچنے کی عادت نہیں تھی۔ وہ وہی باتیں سوچنے لگا۔



کمرے میں داخل ہوتے ہی دھچکا سا لگا۔

الماری سے کپڑے ابلے پڑے تھے تو بک ریک سے کتابیں باہر آہ و فغاں میں مصروف تھیں۔ یہی نہیں اس کی رائٹنگ ٹیبل پر ترتیب وار رکھی ہر شے جنگ و جدل کے بعد کا سا منظر پیش کر رہی تھی۔ سائیڈ ٹیبل پر ہمیشہ شان سے سجی رہنے والی اس کی تصویر کا فریم اوندھا ہوا پڑا تھا۔ کون ہو سکتا تھا اس تخریب کاری کا ذمے دار سوائے اس کے۔

"ارسہ شاہنواز۔" اس نے باقاعدہ دانت پیس کر کہا۔ "کون کہہ سکتا ہے تم اتنے ڈیسنٹ آدمی کی بیٹی ہو؟"

تیر کی طرح باہر کی جانب لپکا اور دھڑا دھڑ سیڑھیاں

روندیں۔

لاؤنج میں ہی وہ نظر آ گئی۔ مگر اس کی طرف تیزی سے اٹھتے اس کے قدموں کو زبردستی تھمنا پڑا۔

"مائی گاڈ۔" سعد کا دل دھک سے رہ گیا۔ اسکول کے زمانے کی اس کی ڈائری اس وقت ارسہ کے ہاتھوں میں تھی۔ یہ ڈائری اسے بہت عزیز تھی۔ اس میں اس نے اپنی یادداشتیں ہی نہیں..... کم عمری کے دور کی اپنی شاعری بھی لکھ رکھی تھی۔ جو اس وقت ارسہ لہک لہک کر حاضرین محفل یعنی ماموں، ممانی، اماں اور ہلا کو سنانے میں مصروف تھی۔

ہر شعر کے خاتمے پر باقی سب تو مسکراتے، اس کی قل قل کرتی ہنسی گونج اٹھتی۔ سعد کا فشار خون تیز کرنے کے لیے یہی بہت تھا۔ وہ ایک دم سے آگے بڑھا۔

"ارے سعد! تم۔" سب سے پہلے مامی کی ہی نظر اس پر پڑی۔ ارسہ چند قدم فاصلے پر جا کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے تاثرات لگ ہی اتنی خوفناک رہے تھے۔

"سعد باؤ..... آپ تو کمال کے شاعر ہو، وہ کیا کہتے ہیں چھپے رستم۔" ہلا کو کی یہ تعریف اسے جلا ہی گئی۔

"ہلا کو ٹھیک کہہ رہا ہے، سعد یقین نہیں آرہا، ایم بی اے کے اسٹوڈنٹ کے یہ شوق بھی رہے ہوں گے۔" ماموں کی مسکراہٹ اسے اپنا مذاق اڑاتی محسوس ہوئی۔

"آگے سنیے..... یہ والا۔" کہتے ہی ارسہ نے اسے مزید سیخ پا کر دیا۔

"ڈائری دو میری۔" بنا کسی کا لحاظ کیے وہ اس کے سر پہ جا کے غرایا۔

"کیوں..... اتنی اچھی شاعری سے تم نے دوسروں کو کیوں محروم کر رکھا ہے۔ سنانے دو ناں۔" آنکھیں پٹپٹا کر اس نے یوں کہا کہ سعد کا دل اس کا گلا دبانے کو مچل اٹھا۔

"میں کہہ رہا ہوں، میری ڈائری دو۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا۔

"اتنا گرم کیوں ہو رہے ہو؟ کوئی گناہ تھوڑی کیا ہے۔ بلکہ الٹا میرا احسان مانو میں نے تمہاری پوشیدہ خوبی سب پر آشکار کر دی بلکہ اگر تم یہ ڈائری مجھے دے دو تو میں ساری شاعری اخبار میں چھپوا دوں۔ مشہور ہو جاؤ گے۔"

"تم میرے کمرے میں کیوں گئی تھیں..... بلا اجازت تم نے میری چیزوں کو چھیڑا، میری ڈائری بغیر پوچھے اٹھا لائیں اور ابھی بھی کہہ رہی ہو گناہ نہیں کیا۔"

اسے کتنی مشکل ہو رہی تھی، اپنا اشتعال چھپا کر یوں ٹھنڈے لہجے میں بات کرنا..... یہ وہ خود اندازہ کر سکتا تھا یا سامنے کھڑی ارسہ شاہنواز جس کے چہرے کے تاثرات چیخ چیخ کر بتا رہے تھے کہ وہ اسے یوں مشتعل کر کے کتنا حظ اٹھا رہی ہے۔

"ڈیڈی..... سمجھائیے ناں اسے۔" ارسہ نے منمنا کر ماموں کو مدد طلب نظروں سے دیکھا۔

"وے سعد۔" ڈیڈی..... تو نہیں اماں ضرور بول اٹھیں۔ "چھوڑ ناں۔ چھوٹی سی تو ڈائری ہے۔ دے دے بچی نوں۔"

"ایسے ہی دے دوں۔" اس کی ناراضی حد سے سوا ہو گئی۔

"تم برائے مہربانی ڈائری واپس کرو۔" ساتھ ہی دو قدم آگے بڑھا۔ "نہیں تو اپنے نقصان کی ذمہ دار تم خود ہو گی۔" یہ جملہ اتنی آہستگی سے کہا کہ صرف ارسہ کی سماعتیں ہی سن سکیں۔

"لو..... مر رہے ہو اس فضول سی چیز کی خاطر۔ جس میں کچھ بھی نہیں سوائے بسوں ٹرکوں کے پیچھے لکھی شاعری کے اور تمہاری عظیم یادداشتوں کے..... آج مجھے میری گاں (گائے) کی اتنی یاد آئی..... آج میری کالو (مرغی) نے انڈا دیا ہو گا۔"

نہایت شرافت سے اس کے ہاتھ میں ڈائری تھماتے ہوئے وہ با آواز بلند بڑبڑائی تھی۔ وہ کینہ توز نظروں سے اسے گھورتا رہا۔

"اب دیکھنا..... کیا کرتا ہوں میں؟" پلٹنے سے پہلے وہ ہلکے سے نرایا تو ایک پل کے لیے ارسہ کی دلیری

دھیمی پڑی پھر "بڑوں" کی موجودگی کا سہارا محسوس ہوا تو پھر سے گردن اکڑا لی۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا سیڑھیاں چڑھ گیا۔

"لے..... ایویں ہی غصہ ہو جاتا ہے۔ بچی بے چاری کے کام آئی۔ لے گیا چھین کر۔" اماں کف افسوس ملتی رہیں۔ ارسہ کی شکل پہ اب فکر مندی نمایاں تھی۔ سعد نے اسے بخشا نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

اور سعد واقعی نہ بخشتا..... اگر خصوصی مہمانوں کی آمد نہ ہو جاتی۔ ان مہمانوں کو وہ خود ہی ایرپورٹ سے لے کر آیا تھا۔ چاق و چوبند سی آنٹی جنہیں مامی کی آپا ہونے کا اعزاز حاصل تھا۔ سارا راستہ اس کا انٹرویو لیتی آئی تھیں۔ تعلیمی قابلیت سے لے کر شجرہ نسب تک..... اور کمرے سے لے کر پسندیدہ کھانے تک..... انہوں نے کیا کچھ نہیں اگلوا لیا تھا اس سے۔

"لگتا ہے کونڈولیزا رائس کی اسسٹنٹ رہی ہیں۔" صحیح معنوں میں اسے پسینہ آگیا تھا۔ رہی سہی کسر آنٹی کی بیٹی نے پوری کر دی تھی۔

"واؤ..... " اپنے اماں ابا کا لحاظ کیے بنا اسے دیکھتے ہی وہ پھیکی مولی کی رنگت والی ادا سے بولی تھی "اٹالین لک!"

سن کر اس نے ایکسیلیٹر پر دباؤ بڑھا دیا تھا۔ ناپسندیدہ لوگوں کے درمیان وقت کیسے کھینچ تان کر گزرتا ہے۔ اس کا احساس اسے اس دن ہوا۔

گھر کی طرف جانے والا راستہ ضرورت سے زیادہ لمبا ہو گیا تھا۔ آنٹی کے شوہر البتہ خاموش رہے۔ ننھی سی جان پر بڑا سارا سر اور اس سر پر ہیٹ لگائے وہ اچھے خاصے مسکین سے لگ رہے تھے۔ انہیں گھر چھوڑنے کے بعد سعد نے بھی گھر "چھوڑنے" میں تاخیر سے کام نہیں لیا۔ جس وقت آنٹی ارسہ کو لپٹا چمٹا کر سوئٹ ہارٹ..... مائی باربی ڈول" کا ورد کیے جا رہی تھیں۔ وہ چپکے سے باہر کھسک گیا۔ اس کی برداشت سے باہر ہو رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"بیٹھو۔" ماموں کے کہنے پر اسے بیٹھنا بھی پڑ گیا۔ حالانکہ اتنی تھکاوٹ ہو رہی تھی کہ صرف نیند کا خیال تابعداری پر حاوی ہوا جا رہا تھا۔

"بہت مصروف رہنے لگے ہو آج کل؟" ماموں کی نظریں کتاب پر تھیں۔ سرسری سا جتلایا، وہ شرمندہ ہو گیا۔ واقعی بہت دن ہو گئے تھے ماموں کا سامنا کیے ہوئے۔ حالانکہ مامی کی بہن اور بھانجی کے آنے سے پہلے وہ رات میں تو ضرور ہی ماموں کو سلام کے بہانے شکل دکھانے آجایا کرتا تھا۔ پر اب گھر میں ٹکتا تو یہ فریضہ سرانجام دے پاتا۔ منہ اندھیرے جب گھر سے نکلتا آنٹی اور آنٹی کی بیٹی سو رہی ہوتیں اور رات گئے بھی تب آتا جب وہ سو رہی ہوتیں۔

اگر جو کبھی خرابی قسمت کی بنا پر کسی ایسے ویسے ٹائم گھر پر آجاتا تو گویا آنٹی اور آنٹی کی دختر نیک اختر "کائنات" عرف "کیٹی" اس کی شامت اعمال بن کر سر پہ سوار ہو جاتیں۔ اور تب چھوڑتیں جب بول بول کر خود تھک جاتیں۔ سو اسی مصیبت سے بچنے کے لیے اس نے گھر آنے کے اوقات تبدیل کر لیے۔ یہ پتا نہیں تھا کہ ان مخصوص اوقات میں گھر آنے کی وجہ سے وہ ماموں کی نظروں میں مشکوک ہو گیا ہے۔

"مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔"

وہ جو ماموں کی زبان سے ایک لمبی سی "جھاڑ" سننے کا منتظر تھا۔ یہ جملہ سن کر ناسمجھ انداز سے انہیں دیکھنے لگا۔ بیڈ پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے، نیم دراز ہوئے ماموں کے انداز میں ہچکچاہٹ اسے حیرانی میں مبتلا کیے جا رہی تھی۔ یعنی بات خاص تھی۔

"سمجھ میں نہیں آرہا، کیسے کہوں؟" ماموں نے ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں پھنسا لیں۔ سعد کو ان کے چہرے کی رنگت ضرورت سے زیادہ سرخ ہوتی محسوس ہوئی۔

"پلیز ماموں۔" وہ صوفہ چھوڑ کر بیڈ کی پائنتی پر ٹک گیا۔ "شرمندہ مت کریں۔ میں آپ سے الگ

نہیں۔ آپ کا ہر مسئلہ میرا مسئلہ ہے۔ آپ کے ذہن میں جو بھی بات ہے بلا جھجک کہیے۔ میں اپنی سی کوشش کروں گا آپ کی مشکل میں کام آنے کی۔"

ان کے پیروں پر ہاتھ رکھنے کے بعد اس نے محبت سے چور لہجے میں کہا۔ ماموں نے پہلے پاؤں سمیٹے اور پھر یک ٹک اسے دیکھنے لگے۔ ان کی نظروں میں کوئی ایسا سوال ضرور تھا کہ سعد کو اپنی نظروں کا زاویہ ان پر سے ہٹا کر ادھر ادھر کرنا پڑ گیا۔

"یہ جو تمہاری مامی کی بہن آئی ہوئی ہیں۔"

"جی...۔"

"ارسہ کا ہاتھ مانگنے پر مُصر ہیں۔" اس نے بے اختیار جھٹکا سا کھایا تھا۔

"یوں تو کوئی ایسی ان ہونی بات نہیں ارسہ کی خالہ ہیں۔ غیر نہیں۔ رشتہ مانگ سکتی ہیں۔ مزید یہ کہ مجھے تو تمہاری مامی کا جھکاؤ بھی ان کی جانب محسوس ہوا ہے۔ خوب تعریفیں کر رہی تھیں ..... حالانکہ بھانجے شریف کو دیکھے ہوئے دس سال تو بیت گئے....."

ماموں اپنی کہے جا رہے تھے اور سعد خیالات کی سُرور آگیں رو میں بہتا چلا جا رہا تھا۔ یعنی کہ..... اس کی زندگی کی سب سے بڑی "چڑ" سب سے بڑی دشمن ارسہ شاہنواز یکایک آنکھوں سے دور، اتنی دور چلی جائے گی۔

"ماموں! ہاں کہہ دیں" کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ ان کے اگلے جملے بلکہ جملوں نے کھلے منہ کے ساتھ چاروں شانے چت کر دیا۔

"مگر..... میرے لیے، میری نظر میں، ارسہ کے لائف پارٹنر کے طور پر تم سے زیادہ کوئی نہیں جچ سکتا۔ سچ تو یہ ہے کہ میرے ذہن میں ہی کبھی نہیں آیا کہ میرے داماد کی حیثیت تمہارے علاوہ کسی اور کو مل سکتی ہے۔ اس سوچ کو لے کر میں مطمئن تھا۔ یہ خیال کبھی نہیں آیا کہ آپا یا تم کیا چاہتے ہو۔ اب بھی میں اپنے منہ سے کہہ کر شرمندہ ہو رہا ہوں..... دل میں کہیں تھا کہ آپا خود کبھی نہ کبھی..... وقت آنے پر اپنی خواہش جتاتے ہوئے ارسہ کو مجھ سے مانگیں گی مگر یار! میری سالی صاحبہ نے آ کر مجھے حواس باختہ کر دیا۔ ایسا کہ بیٹی کا باپ ہونے کے باوجود میں بے شرم بن کر تم سے وہ بات کہنے پر مجبور ہو گیا۔ جو مجھے آپا سے کرنی چاہیے تھی۔ مگر مجھے لگا..... براہ راست تم سے ہی بات کرنی چاہیے کیونکہ اپنی آپا کا تو مجھے پتا ہے۔ انہوں نے مجھے انکار کرنا ہی نہیں تھا۔ بلکہ تم سے پوچھے بنا راضی ہو جاتیں۔ مگر در حقیقت مجھے تمہاری رضا ہی نہیں خوشی بھی مطلوب ہے..... اس لیے۔"

ماموں اگر پوری بات کے دوران اپنی نظریں کبھی نیچے تو کبھی ادھر ادھر ڈالنے کے بجائے اس کے چہرے پر بھی ڈال لیتے تو جان جاتے کہ اس کی رضا اور خوشی کیا ہے۔

وہ یک ٹک بے یقین سا ان کے خفت بھرے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے تھا کہ جن کے ہر جملے نے سر پہ ہتھوڑے برسا برسا کر دماغ ہی شل کر دیا تھا۔ دل تو پہلے ہی دھاڑیں مارنے لگا تھا۔

ایک پل کو خیال آیا کہ صاف انکار کر دے۔

"نہیں ماموں! قطعی نہیں۔ یہ ظلم ہو گا مجھ پر، میرے دل پر۔"

بہت تڑپ کر وہ یہ کہہ بھی دیتا، اگر دماغ اور ضمیر بروقت نہ جاگتے۔ یکایک آنکھوں کے سامنے بچپن کا ایک ایک لمحہ گھوم گیا۔

"بے سائبان ہو کر تین کپڑوں میں یہاں آنا..... اور پھر ارسہ سے بڑھ کر اہمیت اختیار کر جانا۔ سخت ناپسندیدگی کے باوجود بھی مامی کا اسے ایک جھڑکی تک نہ دینا کہ ماموں کی بے لوث محبت و شفقت کا مضبوط و پائیدار سہارا اس کے ساتھ تھا۔ بھاری بھاری فیسوں کے انسٹی ٹیوٹس میں اس کی تعلیم..... اور کتابوں کی قیمتیں پڑھائی کا سارا خرچا ماموں کی جیب سے جا رہا تھا۔

اس سے بھی بڑھ کر اماں کو گھر کی بڑی کا درجہ دے کر ان کا مان بڑھانا۔ یہ کم نہیں تھا۔ یہ "احسان" سے بھی اوپر کا کوئی درجہ تھا۔ جس کا بدلہ وہ شاید ہی کبھی چکا پاتے۔

ضمیر اور دماغ کا ایکا اپنی جگہ..... ان کے دلائل بے شک سچے تھے۔ مگر اس وقت دل دبک گیا تھا۔ سو وہ بے قراری سے کھڑا ہوا تو ماموں چونک اٹھے۔ اس نے چہرہ جھکا رکھا تھا۔ دھواں دھواں تاثرات چھپ سے گئے تھے۔

"یہ مت سمجھو کہ صرف ہاں ہی چاہیے مجھے۔ صرف ایک آپشن دیا ہے تمہیں۔ جو چاہو وہی کرو۔ تمہاری اپنی زندگی پر صرف تمہارا حق ہے اسے ایموشنز کی نذر ہرگز نہ کرنا۔ جاؤ جا کر سوچو، دل کرے تو ہاں..... ورنہ پھر بھی میں خوش ہی ہوں گا۔"

ماموں نے اس کے عین سامنے آ کر یہ سب کہا۔ اس سے سر اٹھانا دوبھر ہو گیا۔ بہت بوجھل قدم اٹھاتا وہ بدقت تمام اپنے کمرے تک آیا تھا۔

"دل کرے تو ہاں....." ماموں کے الفاظ سماعتیں بجا رہے تھے۔ "دل کرے تو....." اور یہاں دل ہی روٹھنے پہ آگیا تھا۔ دماغ اور ضمیر کے لاکھ دستک دینے پر بھی جیسے سو گیا تھا۔ اور دل کے اس "سونے" کا مطلب تھا۔ اس کی زندگی سے چین، سکون، آسودگی اور خوشی ہر جذبے کا کبھی نہ جاگنے کے لیے "سو جانا"۔

وہ رات اس کی زندگی کی سب سے طویل اور کٹھن رات بن کر آئی۔



"پھپھو! مجھے جیم کی شیشی پکڑائیں۔" ایک سلائس ختم نہیں ہوا تھا۔ وہ دوسرے کے لیے پہلے سے اتاؤلی ہونے لگی تھی۔ جیم کا جار اب سعد کے قبضے میں جانے والا تھا کہ جس کی ناشتے کی ٹیبل پر ابھی ابھی آمد ہوئی تھی۔

"کیوں نہیں۔ لا میں لگا دوں اپنی بچی کو۔" اماں نے فدا ہوتے ہوئے کہا۔

سعد کا دل راکھ ہو گیا۔ ساری رات کا جاگا ہوا... جلتی لال انگارہ آنکھوں کے ساتھ یہاں آ بیٹھا تھا۔ اس کی شکستہ کیفیت ہر ہر انداز سے عیاں تھی اور یہاں اماں اس سے بے پروا بھتیجی کے نخرے اٹھا رہی

"لے یہ بھی کوئی خوراک ہے کھانے والی" ارسہ کو سلائس دیتے ہوئے اماں حسب عادت چارج ہوئیں

"نہ طاقت نہ ذائقہ، پیٹ بھی نہیں بھرتا ہو گا۔"

"پھپھو۔" بھتیجی نے لاڈ سے سر اماں کے کندھے پر لڑھکایا۔ سعد کی شکل کچھ اور بگڑ گئی۔

"آپ چاہتی ہیں میں آپ کے بیٹے کی طرح کھا کھا کر پہلوان بن جاؤں تو یہ ممکن نہیں۔ اس کو جاپانی کشتی لڑنی ہو گی، مجھے نہیں۔"

یوں ہی کرتی تھی وہ۔ بات کیا ہو رہی ہوتی وہ ذکر اس کا لے آتی۔ اس کی برداشت کا امتحان بن کر جواب ختم ہو چلی تھی۔ کرسی زوردار آواز کے ساتھ گھسیٹ کر وہ کھڑا ہو گیا۔

"ناشتا کرو سعد! خالی پیٹ جاؤ گے کیا۔" ٹیبل پر مامی بھی موجود تھیں۔ اس کے کھڑے ہونے کا نوٹس سب سے پہلے انہوں نے لیا۔

"اور یہ حالت کیا بنا رکھی ہے تم نے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟" بالآخر اس کی دگرگوں ہوتی حالت صرف مامی ہی نہیں، اماں اور ارسہ کی نظروں میں بھی آ گئی۔ وہ بہت ٹپ ٹاپ سے رہنے والا اس وقت خاصی مخدوش حالت میں تھا۔

"ہائے ہائے..... تیری طبیعت تو ٹھیک ہے۔ بخار تو نہیں ہو رہا۔ موسم بھی آیا ہوا ہے بخار کا۔ آتی سردیاں یونہی پکڑ لیتی ہیں۔ ضرور....."

"اماں پلیز....." اس نے اکتا کر اماں کو چپ کرایا۔ شکر تھا کہ ماموں ابھی تک نہیں آئے تھے ناشتے پر ورنہ وہ ضرور بات کی تہہ تک پہنچ جاتے۔ کیٹی اور آنٹی تو بارہ سے پہلے جاگنا حرام سمجھتی تھیں۔

"اچھا بیٹھو تو' خالی پیٹ کیوں جا رہے ہو' دودھ ہی پی لو۔" اس کے بڑھتے قدم مامی کو بوکھلاہٹ میں مبتلا کر گئے۔ اس کا بازو پکڑ کر لجاجت سے اصرار کرنے لگیں۔

"دل نہیں کر رہا۔" اس کا لہجہ بجھا بجھا سا تھا' ارسہ نے خوب آنکھیں سکوڑ سکوڑ کر اسے سر تاپا جانچا۔

"جانے دیجئے۔۔۔ موصوف کو عشق ہو گیا ہے۔" اور اس جانچنے کا جو نتیجہ اس نے با آواز بلند نکالا' وہ سعد کو آگ ہی لگا گیا۔

بلا تاخیر وہ اس کے سر پر جا کھڑا ہوا۔

"شپ اپ' شٹ اپ۔" دانت پیس پیس کر اس نے اس انداز سے کہا' جیسے بہت جبر کر رہا ہو خود پر' ورنہ بوٹیاں کر ڈالتا اس کی۔ اس کی آنکھوں سے نکلتے شرارے دیکھ کر ارسہ فوراً" سنجیدہ ہو گئی۔ وہ بہت بدلا ہوا سا لگ رہا تھا۔ روٹھا روٹھا' بیمار اور شکست خوردہ۔ ارسہ سے اس کی چپقلش ضرور رہتی تھی۔ مگر جو چنگاریاں اس وقت اس کی آنکھوں سے نکل رہی تھیں' وہ آج سے پہلے اسے کبھی محسوس نہ ہوئیں۔

"کھسک گیا ہے۔ پھپھو۔۔۔ ڈونٹ وری۔" اسے ساکت کھڑا دیکھ کر وہ روانی میں کہہ کر تیزی سے باہر چلی گئی۔

"مائی فٹ۔۔۔" وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا' کرسی کو ٹھوکر مار کر کہیں سے کہیں لڑھکاتا باہر چلا گیا۔ پیچھے اماں اور مامی "سعد۔۔۔ سعد" کرتے لپکی تھیں۔



چند لمحے پیشتر صاف شفاف نظر آنے والا آسمان پل بھر میں غبار آلود ہو گیا تھا۔ سیاہ بادلوں کے مرغولے آناً فاناً" چھا گئے تھے۔ وہ شکن آلود ماتھا لیے اماں کو ان کے حال پر چھوڑ کر بے زار ہوتا برآمدے میں ہرے بھرے بڑے بڑے گملوں کے ساتھ رکھی کرسی پر جا بیٹھا۔

اماں کی وجہ سے وہ آج گھر پر موجود تھا اور اماں ہی اس کے ہاتھ نہیں آ رہی تھیں۔

"آپا کو ہلکی ہلکی حرارت ہو رہی ہے۔ میرے کہنے پر تو نہیں چلیں۔ تم ہی ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ۔" صبح میں مامی نے بتایا تھا اور وہ کام چھوڑ کر اماں کو ڈاکٹر کے پاس لے جانے کی غرض سے گھر میں پابند ہوا بیٹھا تھا۔ کیٹی اور آنٹی کی موجودگی کے باوجود یہ رسک لیا اور اماں۔۔۔۔

"اے ہے۔۔۔ کہاں کا بخار' کیسا بخار۔۔۔ ہٹی کٹی ہوں۔ ایسی چھوٹی موٹی بیماریاں ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ یہ تم نئی نسل نزاکت کا اشتہار لگائے پھرتی ہو۔۔۔ ایک چھینک آتی نہیں ڈاکٹر کے پاس پہلے دوڑتے ہیں۔ ٹھیک ہوں میں۔۔۔ تو خوامخواہ۔" اماں کے یوں ڈپٹ کر کہنے کے باوجود بھی وہ برابر اصرار کرتا رہا۔

اس لمحے ساری فیملی آنٹی کے ہمراہ لان میں موجود تھی۔ سعد کی توجہ بظاہر اماں پر تھی۔ مگر اڑتی پڑتی نظر لان میں اودھم مچاتی ارسہ شاہنواز پر بھی پڑ جاتی تو حلق میں کونین سی گھل جاتی۔ محترمہ مالی بابا کے سر کو آئی ہوئی تھی۔ وہ گوڈی کر رہا تھا۔ لان کے ایک حصے پر گھاس کاٹنے والی مشین موجود تھی۔ مالی کے لاکھ منع کرنے پر بھی ارسہ صاحبہ نے دوڑ لگا کر مشین سے آدھا لان گنجا کر دیا۔ ساتھ ہی اس کی قل قل ہنسی۔ سعد دانت پہ دانت جمائے ضبط کی تفسیر بنا رہا۔

حالانکہ کیٹی سے اسے بہت گلے تھے' مگر اس وقت وہ بڑی سلجھی ہوئی لگی۔

اماں کی ناں۔۔۔ ناں سے تو وہ جو زچ ہوا' سو ہوا۔ دماغ میں دھواں ارسہ شاہنواز کی یہ اوچھی حرکتیں دیکھ کر بھر گیا۔ وہ تھک ہار کر لان میں دور کرسی پہ جا بیٹھا اندر کی کھولن آس پاس کی کسی شے میں دلچسپی ہی نہیں لینے دے رہی تھی۔ اوپر سے آن کی آن میں دھند آلود ہو جانے والا آسمان۔۔۔۔

بارش۔۔۔ اور وہ بھی سردیوں کی' اسے بہت خوب صورت لگتی تھی۔ مگر کیا کیا جا سکتا تھا کہ آج دل کی ویرانیاں باہر کی ہر خوب صورتی پر حاوی ہو گئیں۔

"بارش۔" ارسہ کی خوشی سے بھرپور چیخ اس کے کان جھنجھنا گئی۔ اس نے خالی خالی نظریں لان کی طرف مرکوز کیں۔ جہاں وہ مالی بابا اور اس کی موجودگی کو خاطر میں لائے بغیر چھلانگیں لگا رہی تھی۔

"یہ وہ نہیں' جسے میرے دل کی خواہش ہو۔۔۔ یہ وہ نہیں' جو میری ذات پہ حکمرانی کرے۔ یہ وہ ہو بھی نہیں سکتی' جس کے نام کے ساتھ سعد فراز کا نام سجایا جائے۔" اس کے دل کا ورد تجاوز کر گیا۔

"اندر چلو! بارش ہو رہی ہے۔ سب اندر چلو۔" مامی تیز تیز قدم اٹھاتی اس کی جانب آ رہی تھیں۔ پیچھے دوڑتی ہوئی اماں اور آنٹی بھی تھیں۔

"ارے! تم کہاں جا رہی ہو۔ رکو۔۔۔ بارش میں نہانے سے کتنا مزا آتا ہے۔" ارسہ نے چیخ کر کیٹی کو مخاطب کیا۔ وہ قلانچیں مارتی برآمدے میں آ رہی تھی۔

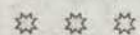
"نو۔۔۔ میرے لیے یہ انجوائے منٹ نہیں' ناقابل برداشت ہے۔" اس نے بھی حلق پھاڑ کر جواب دیا۔

"ارسہ! اندر آؤ۔" مامی نے قدرے سختی سے چلا کر کہا۔

"اندر آ میری بچی! کہا مان لے۔ یہ سردیوں کی بارش ہے۔ فوراً" بیمار ہو جاتا ہے بندہ۔"

پر بچی اتنی تابع دار نہیں تھی کہ کہا مان لیتی۔ ڈھیٹ بنی پھلتی رہی۔ سعد کی برداشت جواب دے گئی۔ وہ کرسی دھکیلتا لمبے لمبے ڈگ بھرتا اندر کی جانب بڑھ گیا۔ جس کشمکش میں وہ ہفتہ بھر سے تھا۔ وہ ایک دم سے سلجھی۔ دل نے ابھی ابھی فیصلے پر مہر لگا دی۔

وہ سنجیدہ اور صاف ستھری شخصیت کا مالک ارسہ شاہنواز جیسی غیر سنجیدہ' امیچور اور شوخ لڑکی سے شادی نہیں کر سکتا تھا۔ کسی بھی حال میں نہیں۔



"سعد پتر۔۔۔" لیپ ٹاپ کی اسکرین سے توجہ ہٹ کر دروازے کی جانب مبذول ہوئی۔ جہاں اماں سر دیے کھڑی تھیں۔ "تو جاگ رہا ہے؟" ان کا چہرہ تمتما رہا تھا۔

"جی۔" گھڑی بارہ بجا رہی تھی۔ اتنی جلدی وہ کبھی نہیں سویا تھا۔

"کام کر رہا ہے تو؟" وہیں کھڑے کھڑے ایک اور سوال موصول ہوا۔ سعد نے بے ساختہ آہ بھری۔

اماں کی موجودگی بلا سبب نہیں تھی۔ دو وجوہات ہو سکتی تھیں۔ یا تو ان کی طبیعت گراں تھی یا پھر کوئی خوشی کی خبر شیئر کرنے آئی تھیں۔ ان کی لو دیتی آنکھوں سے تو لگ رہا تھا کہ موخر الذکر وجہ ہو سکتی ہے۔

"نہیں اماں! آپ آجائیے۔" وہ کرسی چھوڑ کر اماں کے پاس آیا اور ان کا ہاتھ پکڑ کر بیڈ تک لے آیا۔ انہیں بیڈ پر بٹھا کر خود ان کے سامنے کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

"اتنی اتنی رات تک پڑھتا ہے۔ اسی واسطے ہڈیاں نکلتی آ رہی ہیں۔ نیند جو پوری نہیں ہوتی۔ آنکھیں دیکھ' صاف تھکی ہوئی لگتی ہیں۔" حسب عادت تمہید باندھی گئی۔ وہ مسکرائے بنا نہ رہ سکا۔

"ٹھیک ہے میری ڈاکٹر اماں! اب بتا بھی دیں آپ کیوں خوش ہیں۔" اماں کی خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔

"ہاں۔۔۔ وہ۔" اتنا کہہ کر اماں نے قدرے توقف کیا۔ پھر اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر ماتھے پر بوسہ لے ڈالا۔

"محبت کے یہ غیر ضروری مظاہرے۔" سعد کو دال میں کچھ کالا کالا سا محسوس ہوا۔

"ابھی میں تیری مامی کے پاس سے اٹھ کر آئی ہوں۔ بڑی ضروری باتیں کر کے۔"

"اچھا۔۔۔ کون سی؟" اس نے بھنویں چڑھائیں۔

"تیری مامی کی یہ نیلے ڈیلوں والی بہن اپنے پتر کا رشتہ لے کر آئی ہے ارسہ کے لیے۔"

سعد کے اردگرد خطرے کی گھنٹیاں ٹناٹن گونجنے لگیں۔

"پر میں نے سنتے ہی کہہ دیا کہ ارسہ ادھر ادھر کہیں نہیں جائے گی۔"

"کیوں؟" اس نے ماں کی خوشی سے بے نیاز ہو کر رکھائی سے پوچھا۔

"اے بھولے پتر! وہ میرے سعد کے ساتھ جچے گی اور کسی کے ساتھ نہیں۔ تیری مامی کے کان میں ڈال

دی بات۔ سن کر مجھے تو خوش لگ رہی تھی اور خوش ہو گی کیوں نہیں۔ آخر میرے سعد میں کوئی کمی ہے کیا؟"

وہ مضطرب سا کھڑا ہو کر ٹہلنے لگا۔ چہرے کا تناؤ اندر کی کیفیت کھول رہا تھا۔ تب ہی تو ماں کو چپ لگ گئی۔ حیران سی وہ اسے دیکھنے لگیں۔ وہ ان کے گھٹنے پہ ہاتھ رکھ سامنے آبیٹھا۔

"اتنی بڑی بات کہنے سے پہلے آپ نے اپنے بیٹے سے پوچھا بھی نہیں کہ وہ کیا چاہتا ہے؟" وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ اماں کا صرف منہ ہی کھلا تھا۔ الفاظ شاید گم ہو گئے۔

"مجھے ارسہ سے شادی نہیں کرنی۔"

اماں پتھرا سی گئیں۔ گویا کچھ سن، سمجھ ہی نہ پا رہی ہوں۔

"کیوں....؟" کافی دیر کے بعد بولیں تو آواز گلوگیر ہو گئی۔

"بس میرا دل نہیں مانتا۔ مجھے ارسہ پسند نہیں۔ میں نے اسے کبھی اس نظر سے نہیں دیکھا۔ اگر آپ کو مجھ سے محبت ہے تو دوبارہ نہیں کہیں گی۔" وہ سفاکی کی حد تک صاف گوئی سے بولا۔

اماں کا تمتماتا چہرہ بجھ گیا۔ سعد نے غور ہی نہیں کیا جس بے پایاں خوشی سے گھری وہ کمرے میں آئی تھیں۔ اب اس سے زیادہ افسردہ و رنجیدہ جا رہی تھیں۔

"یہ اچھا نہیں کیا سعد! تیرا ماموں...." آنسوؤں کے گولے نے آگے بولنے نہیں دیا۔ وہ تیزی سے دروازہ پار کر گئیں۔

ان کے جانے کے بعد وہ ڈھیلے سے انداز میں چت بیڈ پر گر گیا۔ اماں کو خبر ہی نہیں تھی کہ ماموں اور اس کے بیچ یہ بات پہلے سے نہ صرف ہو چکی تھی، بلکہ یقیناً" ماموں اس کی جانب سے مستقل خاموشی اور اس کی حد سے بڑھی سنجیدگی کو اس کا انکار سمجھ کر مایوس بھی ہو چکے تھے۔



پھر یوں ہوا کہ سب کے نہ چاہنے کے باوجود بھی ارسہ کا رشتہ اپنے خالہ زاد عاشر سے طے ہو گیا۔ کوئی بھی دل سے خوش نہیں تھا۔ حتیٰ کہ ہلا کو بھی اٹھتے بیٹھتے آنکھیں پونچھتا نظر آتا۔ سب کے خیال میں ناروے بہت دور تھا۔

مگر وہی بات کہ رشتے آسمانوں پر بنتے ہیں۔ یہ جوڑ بھی اوپر کہیں لکھا تھا اور پھر آنٹی یقیناً" ناروے سے طے ہی یہی کر کے آئی تھیں۔ صبح و شام ایک ہی ورد لے کر بیٹھ گئیں۔ کبھی اپنی تعریفیں، کبھی بیٹے کی.... ہاں کروا کے ہی دم لیا۔

"اداکارہ لگتی ہے پوری۔ لچھے دار باتوں سے بھابھی کو پھنسا لیا۔" اماں کو ارسہ کا سعد کے ساتھ رشتہ نہ ہونے کا غم ایک طرف تھا تو اس کا عاشر سے رشتہ طے پا جانے کا غم دوسری طرف۔ اتنی دور کے حق میں وہ ہرگز نہیں تھیں۔ اس سارے معاملے سے اگر کوئی لاتعلق رہا تو صرف سعد.... اس کی بلا سے، ارسہ چیچہ وطنی جائے کہ ناروے۔ بس اس گھر سے جائے۔

اور زیادہ حیران کن بات تو یہ تھی کہ ارسہ کا اس سے سامنا بھی کم کم ہوا تھا۔ تب ہی وہ اس کے تاثرات و خیالات کے بارے میں بھی لاعلم ہی تھا۔

لیکن اس شام....

کوچنگ سے واپسی پر اسے لاؤنج میں ہی ارسہ کے خیالات کا پتا چل گیا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے سسک رہی تھی۔ قریب ہی اماں اور مامی بھی ہراساں چہرے لیے موجود تھیں۔ یقیناً" آنٹی اور کیٹی کہیں گئی ہوئی تھیں۔ ورنہ یہ محفل یوں سرعام نہ بجتی۔

"ارسہ! بس چپ ہو جاؤ بیٹا۔ تمہارے ڈیڈی آنے والے ہوں گے.... اور آپا بھی نہ آجائیں کہیں" مامی کی آواز میں گھبراہٹ کا عنصر تھا۔

وہ ٹی وی کے سامنے والے صوفے پر بیٹھا بظاہر نظریں ٹی وی پر مرکوز کیے ہوئے تھا، مگر سماعتیں تینوں خواتین کی جانب تھیں۔

"آجائیں.... سن لیں سب۔ انہیں بھی پتا چل جائے کہ میں کتنی خوش ہوں ان کی بہو بننے سے۔"

ارسہ کی آواز رونے سے بھاری ہو رہی تھی۔ چیخ کر اس نے یہ سب کہا اور پھر سے رونے کے شغل میں مصروف ہو گئی۔

"نہ میری بچی۔ برا نہ بول۔ سننے والا وقت ہوتا ہے کوئی۔ کیا خبر آہی نہ جائے۔"

"پھپھو! آپ بتائیں۔" وہ اماں کی جانب مڑی۔ "کوئی یوں بھی کرتا ہے اپنی بیٹی کے ساتھ؟ بھیڑ بکری سمجھ کر حوالے کر دیا بہن کے ان پڑھ جاہل لوگ بھی بچوں کی مرضی پوچھ کر رشتے طے کرتے ہوں گے.... اور یہاں...." ایک بار پھر اس پر رقت سوار ہوئی۔ سعد کی پیٹھ بھی اس کی جانب۔ اسے ارسہ کا رونا ذرا نہ بھایا۔

"ڈھکوسلے ہیں سب۔" دل میں سوچا۔

"مجھے نہیں جانا ناروے۔ مجھے کہیں بھی نہیں جانا۔ میں اس گھر کو چھوڑ کر کہیں بھی نہیں جانا چاہتی۔" مسلسل روتے ہوئے وہ نان اسٹاپ بولتی گئی۔ اماں اور مامی نے بے بسی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اس کے یہ جملے اماں کے دل میں ٹیسیں بڑھا گئے۔ کچھ اسی قسم کی ہلچل سعد کے دل میں بھی مچ گئی۔

"یہ گھر نہیں چھوڑنا چاہتی.... کہیں نہیں جانا چاہتی.... کیوں بھلا۔" اپنے ساتھ جڑے اس کے رشتے کا تذکرہ ابھی پرانا نہیں ہوا تھا۔ اس قسم کی باتوں پر اس کے کان کھڑے ہونے ہی تھے۔

"کوئی بھی مجھ سے پیار نہیں کرتا۔ نہ ممی ڈیڈی اور نہ پھپھو! آپ.... اگر کرتے ہوتے تو میرا رشتہ جان بوجھ کر اتنی دور نہ کرتے۔ وہ بھی ایسے بندے کے ساتھ کہ جس کی عادات کا بھی کسی کو نہیں پتا۔ ناروے میں رہتا ہے۔ ضرور اسی رنگ میں رنگا ہو گا۔" اب کی بار اماں اور مامی ہی نہیں، سعد بھی دہل گیا۔

"اللہ نہ کرے لڑکی! کیا بد لے جا رہی ہے۔ اب ایسا بھی اندھیر نہیں۔"

"سعد! تم بتاؤ۔" بالکل اچانک اماں اور مامی کو چھوڑ کر وہ اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ سعد کو یہ امید نہیں تھی۔ فوراً" سیدھا ہو بیٹھا۔

"یہ سب صحیح کیا ممی ڈیڈی نے؟ ایسے کوئی کرتا ہے تم ڈیڈی کو منع نہیں کر سکتے تھے؟" وہ متورم جھلمل سی آنکھیں اس پر جمائے نہ جانے کیوں ایسا کر رہی تھی۔

"میں؟" نظر بھر کر اسے دیکھنے کے بعد وہ گڑبڑا ہی نہیں ڈگمگا بھی گیا۔ بھیگی آنکھیں.... گلابی رنگت کچھ زیادہ ہی لال ہو رہی تھی۔ چھوٹی سی سوں سوں کرتی ناک.... سعد کو نظر پھیرنے میں صدیاں لگ گئیں۔



مہمان آچکے تھے۔ وقت بیتتا جا رہا تھا اور سعد کا نام و نشان کہیں نہیں تھا۔

"کہاں جا سکتا ہے؟ جب پتا بھی تھا آج کی تقریب کا۔ اتنا غیر ذمہ دار تو نہیں۔" مامی اندر آرہی تھیں تو کبھی لان میں جا رہی تھیں اور کبھی ان کی انگلیاں موبائل پر سعد کا نمبر ملانے لگتیں، مگر مسلسل بند جا رہا تھا۔

"اللہ خیر کرے۔ ایسی نالائقیاں کرتا تو نہیں۔" اماں کے سوچنے کا اپنا ہی انداز تھا۔

ہلکے پھلکے میک اپ اور نفیس کامدار سوٹ میں ملبوس ارسہ کے قریب بیٹھ کر وہ سعد ہی کے متعلق بڑبڑائے جا رہی تھیں۔ تقریب اتنے وسیع پیمانے پر منعقد نہیں کی گئی تھی۔ چیدہ چیدہ لوگ تھے۔ دوست احباب اور رشتے دار جو گھر کی "نرینہ اولاد" کے درجے پر فائز تھا، وہ غائب تھا۔

تھک ہار کر اماں کو ہی نہیں، مامی کو بھی ہولناک وسوسے ستانے لگے۔ شہر کے حالات سدھرے ہوئے نہیں تھے، نہ سعد کی ڈرائیونگ۔ بہت رش ڈرائیونگ کرتا تھا وہ۔

تب ہی تو صرف اماں اور مامی ہی نہیں.... سجی سنوری ارسہ بھی انجانے خدشات میں گھر کر زرد ہوئی جا رہی تھی اور قبل اس کے کہ ان میں سے کوئی ایک آنسو بہانے بھی لگ جاتی، ماموں نے اندر آکر اطلاع دی۔

"ابھی ابھی سعد کا فون آیا ہے۔ وہ اپنے کسی دوست کے ساتھ ہسپتال میں ہے۔ ایکسیڈنٹ ہوا ہے اس کے دوست کا اور وہ بلڈ ارینج کروانے میں ہیلپ کر رہا ہے۔ کہہ رہا تھا' رات نہیں آسکے گا۔" اماں اور مامی کا چہرہ بجھ گیا۔ ارسہ ٹھس سی بیٹھی رہی۔

"اس نے کہا ہے فنکشن نہ روکا جائے۔" ماموں نے ایک اور بات پہنچائی۔ مگر اس بات کے لیے اماں یا مامی ہرگز تیار نہیں تھیں۔

"سعد کی غیر موجودگی میں تو نہیں..... سوچ بھی نہیں سکتے۔" اماں اور مامی اس ارادے پر مضبوطی سے جمی رہتیں اگر آنٹی معترض نہ ہوتیں۔

"آپ دونوں بدشگونی کر رہی ہیں۔ ایک طے شدہ پارٹی ڈسٹرب ہو جائے گی۔ لوگ کیا کہیں گے۔ نہیں بھئی میں اس تقریب کو....."

آنٹی کا انداز کچھ ایسا اکھڑ تھا کہ اماں اور مامی دونوں کو سانپ سونگھ گیا۔ ماموں نے ایک آخری کوشش کرتے ہوئے سعد کا نمبر دوبارہ ملایا۔ مگر اب وہ بند تھا۔

"ٹھیک ہے..... رسم کر لیں۔" بالآخر ماموں نے گرین سگنل دکھایا۔ یہ الگ بات تھی کہ وہ خود بھی مضمحل نظر آرہے تھے۔

یوں ایک اہم ترین تقریب سعد فراز کی غیر موجودگی میں خوش اسلوبی سے اختتام پذیر ہوئی۔ اگرچہ یہ "خوش اسلوبی" صرف آنٹی اور کیٹی کی ہی طرف سے تھی۔ افرادِ خانہ سارے ارسہ سمیت سب ہی بے حد خاموش تھے۔ بیش قیمت ڈائمنڈ رنگ انگلی میں پہن لینے کے بعد بھی ارسہ کی جامد چپ نہ ٹوٹی۔ کیٹی کی اس کو گدگدانے کی ساری کوششیں بے سود گئی تھیں۔ اور پھر..... رات گئے ٹیرس کی ریلنگ تھام کر اندھیرے میں جھانکتے ہوئے اس نے بہت چڑ کر سوچا تھا۔

"تو سعد فراز..... تم واقعی میرے پکے دشمن نکلے۔"



"یہ تم نے اتنا زیادہ سفید جھوٹ کیوں بولا؟" اس کے فون بند کرنے کی دیر تھی۔ نوفل نے چھوٹتے ہی کہا۔

"شرم کر..... ارسہ کی آج منگنی ہے اور تو یہاں لمبا پڑا ہے۔ جھوٹ کیوں بولا؟ یہ نہیں بول سکتا تھا کہ تیری دھڑکنیں رک رہی ہیں۔ دل بیٹھا جا رہا ہے اس وجہ سے کہ تیری ہیروئن تیرے رقیب کے ساتھ منگنی رچا رہی ہے۔"

"بکواس نہ کر۔" اس نے نگاہیں چرائیں۔

"بکواس نہیں کر رہا۔ حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ گھر میں اتنا اہم ایونٹ ہے اور تو یہاں اداس غزلیں سن کر اداس ہو رہا ہے۔ سچ بتا..... سچ بتا! دال کالی تو نہیں؟" نوفل کو بال کی کھال اتارنے میں ملکہ حاصل تھا۔ ابھی بھی وہ پژمردہ ہوئے پڑے سعد کا ایکسرے نکالے جا رہا تھا۔

"میرے یہاں رکنے سے تجھے تکلیف ہو رہی ہے تو میں دفع ہو جاتا ہوں۔" سعد چڑ گیا۔

نوفل نے اسے صوفے پر دھکیلا "مجھے کوئی تکلیف نہیں ہو رہی۔ بے شک رات ساری یہ دکھی غزلیں سنتا رہ۔ جو تیری مجنوں جیسی حالت ہو رہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تو رستے میں اپنا ایکسیڈنٹ کر بیٹھے۔"

"فار گاڈ سیک اپنا یہ گھوڑے جیسا منہ بند کر۔" دفعتاً سعد دھاڑا تو نوفل کی زبان تھمی۔

الجھا الجھا سا' بکھرا بکھرا سا..... اس کی حالت نئی کہانیاں آشکار کر رہی تھی۔

"ایسا ہی درد ہو رہا ہے تو اس رقیب کی بجائے خود کیوں نہیں منگنی کر لی ارسہ سے؟ کیوں اتنی آسانی سے دستبردار ہو گئے؟" نوفل نے اسے نظروں میں تول کر چبھتے ہوئے لفظوں میں کہا تو سعد پہلو بدلنے لگا۔

"یو نو..... ارسہ سے مجھے شدید نفرت ہے۔ آئی ایکسٹریملی ہیٹ ہر۔"

"ہا ہا ہا۔" اس کے کہنے کا انداز ہی ایسا تھا کہ نوفل کی ہنسی چھوٹ گئی۔ مرچیں لگاتی ہنسی۔ سعد نے ہونٹ بھینچ کر خشمگیں نظروں سے اسے گھورا۔

"بڑی چیز ہے تو..... شکل تو تیری کچھ اور اعلان کر رہی ہے۔ اور زبان سے تو..... چل ٹھیک ہے میرا بچہ تسلی دے لے خود کو۔ کیا خبر ایسے ہی تجھے قرار آئے۔" سعد نے تھک ہار کر آنکھیں موند لیں۔

"نگ مائنڈ اٹ میری جان! یہ دونوں کا نہیں پوری زندگی کا معاملہ ہے۔ میری مانو تو ابھی بھی بہت دیر نہیں ہوئی۔ منگنی ہوتی ہی کیا ہے۔ جا کر پاکستانی فلمی ہیروز کی طرف انٹری مارو اور خود کو پرسکون کرو۔"

"آئی تھنک آئی ہیو ٹو گو۔" نوفل کا مشورہ کچھ زیادہ ہی ناقابلِ سماعت لگا۔ وہ ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا۔

نوفل اس کے پیچھے پیچھے گیٹ تک آیا تھا۔ اس نے رخ پھیر کر اللہ حافظ کہنا بھی گوارا نہیں کیا اور اپنی گاڑی لے کر نکل گیا۔

دماغ تھا کہ سن ہوا جا رہا تھا اور آنکھوں میں مرچیں سی چبھتی جا رہی تھیں۔ ونڈ اسکرین کے اس پار کشادہ سڑک کی بجائے "چھم چھم بہتے دو نیناں" نظر آرہے تھے۔ وہ پھر بھی سڑکیں ناپتا رہا۔



اس کے بعد گویا زندگی تھم سی گئی.....

جس گھر میں ہمہ وقت سعد فراز اور ارسہ شاہنواز کے معرکتہ الآرا جھگڑے گونجا کرتے تھے۔ اب اس گھر کی دیواریں بھی سکوت میں تھیں۔ ایک ہلا کو ہی تھا جو کچھ نہ کچھ بولتا رہتا تو زندگی سانس لیتی محسوس ہوتی۔

وقت کچھ اور آگے سرکا۔

اس کا ایم بی اے مکمل ہوا تو وہ ایک دم باہر جانے پر بضد ہو گیا۔

اماں نے رو رو کر آنکھیں سجا لیں اور مامی نے چہرہ۔ مگر یہاں ماموں آڑے آگئے۔

"ہمیشہ میں نے تمہاری خواہش' تمہاری مرضی کو اولیت دی۔ کبھی نہیں چاہا کہ تم میری خواہشات کے مطابق اپنی زندگی کی ترجیحات متعین کرو' لیکن اب میں تم کو اتنا بڑا اور میرے نزدیک ناقابلِ قبول فیصلہ ہرگز نہیں کرنے دوں گا۔ تم اس گھر کے واحد چراغ ہو۔ تم سے اس گھر کی روشنی ہے۔ تم یہاں سے چلے گئے تو سمجھو! ہم چراغ کی روشنی سے ہی محروم ہو جائیں گے۔ میں تمہیں ایسا ہرگز نہیں کرنے دوں گا۔ میرا کاروبار صرف ارسہ کا نہیں۔ تمہارا بھی ہے۔ اسے اب تمہیں ہی سنبھالنا ہے۔ اپنی تعلیم کا فائدہ اپنے کاروبار کو پہنچاؤ' باہر کے بینکوں کو نہیں۔ تم کل سے آفس جاؤ گے۔ یوں بھی میں اب بڈھا ہو گیا ہوں' تھک گیا ہوں۔" ماموں کا لہجہ پہلے دبنگ اور جارحانہ تو آخر میں افسردہ سا ہو گیا۔ وہ مارے شرمندگی کے پانی پانی ہو گیا۔ فرشتوں جیسے ماموں کی محبت کا وہ یہ صلہ دینے جا رہا تھا؟

خود پر تف بھیجنے کے بعد اس نے سر جھکائے جھکائے معافی مانگی اور کل سے آفس جانے کا عندیہ دیا تو سب کے چہروں پر مسرت دوڑ گئی۔

یوں اس کی عملی زندگی کا آغاز ہوا تو جیسے دل کی وحشتوں نے کسی حد تک منہ موڑ لیا۔ یہ الگ بات تھی کہ صبح سویرے سے سفید اوور آل پہنے ارسہ شاہنواز کو ہسپتال کے لیے نکلتے دیکھ کر دل میں دھکم پیل کی انتہا ہو جاتی۔

اور وہ ایسی ظالم..... کہ نک سک سے تیار ہوئے سوٹڈ بوٹڈ' ہینڈسم بزنس مین کا روپ دھارے سعد فراز پر ایک نگاہ غلط تک ڈالنا حرام تصور کرتی۔ اول تو دونوں کا سامنا ہی کم کم ہوتا۔ عموماً وہ پہلے نکل جایا کرتی تھی۔ لیکن جب کبھی سامنا ہوتا' ارسہ شاہنواز کی بے نیازی و لاتعلقی سعد فراز کو مار ڈالتی۔

اور وہ سارا دن آفس میں یا رات گئے بستر پر پڑا اپنے دل کو گالیاں کوسنے دیے جاتا کہ وہ پینترا بدل کر کیا سے کیا ہو گیا تھا۔

ایک وہ وقت تھا جب ارسہ خود بخود اسے سونپی جا رہی تھی۔ تب یہ دل ہی تھا' جو اکڑ گیا تھا اور اب یہ وقت..... کہ ارسہ پوری کی پوری پرائی ہو گئی تھی.....

اتنی پرائی کہ اس سے بول چال تک ترک کردی تھی تو اب یہ دل اس کے لیے ہمکنا شروع ہو گیا تھا۔ مگر اس کا یہ ہمکنا۔۔۔ یہ جاں نثاری دکھانا سب۔ بے کار تھا کہ وقت ہی ہاتھ سے پھسل گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس دن اتنا اچھا موسم ہو رہا تھا کہ ایک عرصے کے بعد وہ لان میں مالی بابا کے سر پر جا پہنچی اور اس کی آمد سے ہمیشہ نالاں رہنے والے مالی بابا اس گھڑی نہال ہی ہو گئے۔ وہ مسکراتی ہوئی کیاریوں میں لہلہاتے پھول دیکھنے لگی۔ پر اوپر والے کو شاید اس کی برداشت کا امتحان لینا تھا۔

لنچ سے ذرا پہلے کیٹی اور آنٹی معہ اپنے لخت جگر کے آن وارد ہوئیں۔

اس کا موڈ بگڑتے دیر نہیں لگی۔ خود اماں اور مامی تک کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ آنٹی اور کیٹی کی ناروے واپسی کے بعد یہ دوبارہ آمد تھی اور شاید وہ آئی ہی اس شاہکار کو دکھانے تھیں کہ جسے ارسہ کے منگیتر کا رتبہ حاصل تھا۔ اسے دیکھ کر ارسہ کے جو ابرو چڑھے تو ابھی تک صحیح حالت میں نہیں آئے تھے۔

دونوں نے ایک دوسرے کو محض تصویروں میں ہی دیکھ رکھا تھا۔ تصویر میں نظر آنے والا "عاشر" اصل زندگی میں تصویر کی طرح ہونق تو نہیں، ہاں سرد مہر اور سپاٹ ضرور نظر آ رہا تھا۔ اوپر سے اس کی بے حد پتلی جسامت۔۔۔ بالکل اپنے باپ کے جیسی۔ جو اس بار ناروے ہی میں مقیم تھے۔ ارسہ کے حلق میں کڑواہٹ عاشر کے حلیے سے زیادہ اس کے رویے کو پرکھ کر گھلی۔ تصویر سے کہیں زیادہ حسین و جمیل ارسہ شاہنواز کو دیکھنے کے باوجود بھی اس کے ماتھے کے بل کم نہیں ہوئے۔ ارسہ کو وہ عجیب سنکی سا محسوس ہوا۔

"اور بیٹا! آپ ٹھیک ہیں۔ طبیعت۔۔۔ صحت۔۔۔؟" اماں نہ جانے کیوں بار بار اس کی طبیعت کا پوچھے جا رہی تھیں اور وہ ہر بار ہی ایک لفظ میں جواب دے کر ہونٹ سی لیتا تھا۔

"عاشر بیٹا! کیا کر رہے ہیں آج کل؟" ارسہ کی امی نے پوچھا تو لہجے سے حلاوت ٹپک رہی تھی۔

"میں اپنا بزنس سنبھالتا ہوں۔" عاشر یوں بولا جیسے الفاظ ادھار مانگ کر لایا ہو۔

ارسہ کی اکتاہٹ میں اضافہ ہو گیا۔ پھپھو اور ماں کا لحاظ آڑے آ رہا تھا، ورنہ وہ اٹھ جاتی یہاں سے۔

عاشر کے برعکس آنٹی اور کیٹی نہایت پیار و شفقت کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔

عاشر کے بے مروت و سپاٹ سے جوابات نے اماں کا جوش جھاگ کی مانند بٹھا دیا تھا۔

"ہماری ارسہ ہاؤس جاب کر رہی ہے۔ آخری سال ہے اس کا۔ اس کے بعد شاہنواز اس کو امریکا بھجوا دے گا۔ ڈاکٹری کی کوئی اور پڑھائی کرنے کے لیے۔ پڑھنے کے ساتھ ساتھ ارسہ ہر کام میں ماہر ہے۔ کچن کے کام بھی۔۔۔"

عاشر کی بے زاری کے باوجود بھی اب اماں ارسہ کی خوبیاں گنوانا شروع ہو گئیں۔ ان خوبیوں میں سارا سچ تھا۔ ماسوائے کچن کے کاموں کے۔ اسے ایک انڈا تک ابالنا نہیں آتا تھا۔ اور پھپھو صاحبہ کئی ڈشز گنوا رہی تھیں۔ اسی "ارسہ نامہ" کے دوران سعد کی انٹری ہوئی، جو طبیعت کی خرابی کی وجہ سے جلدی اٹھ آیا تھا۔

مہمان ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ سعد کو یقیناً ہلاکو نے بتا دیا تھا۔ سو وہ کپڑے بدل کر اب یہاں آیا تو مہمان خصوصی یعنی عاشر کو دیکھ کر ٹھٹھک کر رہ گیا۔

"آؤ آؤ سعد بیٹا! تمہاری کمی بہت فیل ہو رہی تھی۔" اسے دیکھ کر صرف آنٹی ہی نہیں، کیٹی بھی کھل سی گئی۔ وہ خیر مقدمی مسکراہٹ سجاتا آگے بڑھا۔

"عاشر! یہ سعد ہے۔ تمہارے انکل شاہنواز کا بھانجا اور سعد! یہ میرا بیٹا۔۔۔ ارسہ کا فیانسی۔۔۔ عاشر۔"

دونوں کے تعارف کی ذمہ داری آنٹی نے بخوبی نبھائی۔ سعد نے ہونٹ بھینچ کر اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ جسے عاشر نے سوچ سوچ کر تھاما اور بلا تاخیر یوں چھوڑ دیا، جیسے اس میں کرنٹ دوڑ رہا ہو۔

"ہم دو، تین ہفتوں کے بعد چلے جائیں گے۔ پھر

تب آئیں گے، جب شادی کا پروگرام ہو گا۔" اس کے بیٹھنے کے بعد آنٹی برابر اس کے دل کو کچوکے لگانے والی باتیں کرتی رہیں۔ بالکل غیر ارادی طور پر اس کی نظریں ارسہ پر بھی اٹھ جاتیں۔ وہ ان سب سے لاتعلقی بنی بیٹھی اپنے ناخنوں کو یوں بغور دیکھے جا رہی تھی۔ جیسے سب سے اہم کام کر رہی ہو۔ چہرہ ہر تاثر سے عاری تھا۔ چند ثانیے بیٹھنے کے بعد وہ سہولت سے معذرت کر کے وہاں سے اٹھ آیا۔

"آپ نے دیکھا اپنی ارسہ بی بی کی منگیتر کو۔ یوں لگتا ہے جیسے ٹی بی بھگتا کر آیا ہو۔"

وہ کچن کے فرج میں سے بوتل نکال کر گلاس میں پانی انڈیل رہا تھا، جب ہلاکو نے اپنا زریں خیال ظاہر کیا۔ اس نے تنبیہی نظروں سے اسے گھورا اور پانی پینے کے بعد اوپر اپنے کمرے میں آ گیا۔

طبیعت پہلے ہی مضمحل تھی۔ عاشر کا دیدار کرنے کے بعد تو وہ اور زیادہ اپ سیٹ ہو گیا۔

"تو یہاں اطمینان سے بیٹھا ہے۔ ارسہ کب کی گئی ابھی تک نہیں آئی۔" اماں کی اس اطلاع پر وہ فوراً سیدھا کھڑا ہو گیا۔

"کہاں گئی ہے؟"

"کہہ رہی تھی، باہر باغ تک جا رہی ہے۔"

"آپ نے جانے کیوں دیا اور اگر ایسی ہی ضد کر رہی تھی تو کسی کو ساتھ کر دیتیں۔" اسے یکلخت غصہ آ گیا۔

"آپ کی بھتیجی اپنی ان ہی حرکتوں کی وجہ سے کسی دن قتل ہو جائے گی میرے ہاتھوں۔" اس کا اشتعال اماں کو ہی نہیں چاچی کو بھی دہلا گیا۔

"موسم نہیں نظر آ رہا تھا کیا؟ ابھی ابھی بارش شروع ہو جائے گی۔ بلکہ لیں۔۔۔ ہو بھی گئی۔" بوندیں کیا ٹپکیں اماں کا دل لرز کر رہ گیا۔

"تو جا سعد پتر! اسے دیکھ، نہ جانے کدھر گئی ہے۔ وہ اللہ رکھے کی بیٹی بلانے آئی تھی۔ اس کے گھر نہ گئی ہو۔ اس کی ماں بیمار تھی۔۔۔" اماں کی بات نامکمل ہی سنی۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہ کچا صحن عبور کر گیا۔ باہر جیپ کھڑی تھی۔ آناً فاناً موڑ کر کچے راستے پر ڈالی۔

تین روز قبل ارسہ اور اماں سعد کے ساتھ اس کے چاچو کے یہاں آئی تھیں۔ اپنے بچپن میں ایک دو بار وہ اماں کے ہمراہ آئی تھی۔ اس کے بعد اب موقع ملا تھا۔ وہ بھی اس وجہ سے کہ وہ یہاں اپنی ڈاکٹری کا فائدہ پہنچانے آئی تھی۔ پچھلے دو دنوں میں اس نے فی سبیل اللہ بہت سے لوگوں کو چیک بھی کیا۔

آج بھی شاید اسی خلق خدمت کے جذبے سے مغلوب ہو کر کہیں روانہ ہوئی تھی۔

بارش یکایک تیز ہو گئی تھی اور سعد کا غصہ بھی۔ کچی، اونچی، نیچی گلیاں ننگ دھڑنگ بچوں کے شور سے گونجنے لگیں۔

سرما کی بارش تھی۔ پھر بھی بچے نہا رہے تھے۔ سعد دور کھیتوں میں جیپ بھگا لے گیا۔ وہیں کسی بچے سے ارسہ کی بابت پوچھا تو پتا چلا کہ ابھی تک اللہ رکھے کے گھر میں ہے۔

وہ اشتعال سے بل کھاتا، جیپ وہیں تنگ سی گلی کے منہ پر روک کر پیدل ہی بچ بچاتے آگے بڑھا۔ تھوڑا سا ہی چلنے پر حشر برا ہو گیا۔

مسلسل برستی بارش نے اسے پوری طرح سے بھگو دیا تھا۔ گلی لمبی تھی۔ اور اللہ رکھے کا گھر گلی پار کر کے آگے میدان میں بنے اکا دکا گھروں میں سے ایک تھا۔

وہ وہاں تک گیا تو حالت مزید ابتر ہو گئی۔

"ارسہ بی بی کو باہر بھیجو۔" دروازہ بجانے پر جو لڑکا باہر آیا، اسے کہہ کر وہ آسمان سے برستی بوندوں کو دیکھنے لگا۔ وہ ارسہ کے بارش میں نہانے سے چڑتا تھا۔ آج خود سرعام بھیگ رہا تھا۔

"چلیں۔" اچانک ہی ارسہ کی کپکپاتی آواز ابھری تو اس کی توجہ بارش سے ہٹی۔

"نہیں، نہیں... آپ خدمت خلق انجام دیں۔"
اس سے غصہ برداشت کرنا دو بھر ہو گیا تھا۔ بنا یہ دیکھے کہ بڑی ساری سیاہ چادر اوڑھے ہونے کے باوجود وہ کپکپا رہی ہے، وہ غصہ ہونے لگا۔

بارش کی شدت میں کمی آ گئی تھی۔ لیکن سردی میں نہیں۔
گلی میں داخل ہوتے ہی وہ اس سے اتنی دور نکل آیا تھا کہ ارسہ کو باقاعدہ آواز لگا کر کہنا پڑا۔
"سعد پلیز! آہستہ چلو۔" وہ اس کی پکار پر کان دھرے بغیر چلتا رہا۔ یہاں تک کہ ارسہ ایک چیخ مار کر وہیں گلی میں بیٹھ گئی۔ سعد نے فوراً" پیچھے دیکھا۔ وہ گیلی زمین پر بیٹھی پاؤں پر جھکی ہوئی تھی۔
"کیا ہوا؟ بیٹھ کیوں گئی ہو؟" کیا اس گلی میں بھی تمہارا کوئی مریض بستا ہے۔" وہ اس حالت میں بھی ارسہ کو سنانے سے باز نہیں آیا تھا۔
وہ بھل بھل رونا جو شروع ہوئی تو سعد کی ساری طرم خانی غائب ہو گئی۔
اس نے اس کا کیچڑ زدہ پیر ٹٹولا تو ایک بڑا سارا کانٹا ایڑی پہ چبھا نظر آیا۔
"مائی گاڈ۔" وہ اس کی تکلیف پر تڑپ اٹھا۔ "یہ چپل پہنی ہے تم نے، جب پتا بھی تھا کہ گاؤں کے رستے کتنے خراب ہوتے ہیں۔ ہٹاؤ ہاتھ، مجھے کانٹا نکالنے دو۔"
"نہیں... درد ہو گا۔" وہ بس اتنی سی بہادر تھی۔ سعد نے لمحہ بھر کو اس کے بھیگے بھیگے روپ کو آنکھوں میں بھرا اور...
"اماں پریشان ہو رہی ہوں گی۔ کم از کم اتنے خطرناک موسم میں تمہیں نہیں نکلنا چاہیے تھا۔ آج ماموں کا بھی فون آیا تھا۔ مجھے بلا رہے تھے... اور مامی تمہیں۔ دونوں کا کہنا تھا، بہت چھٹیاں ہو گئیں۔ اب واپس آ کر اپنے اپنے کام دھندے سنبھالو... تو ہم بس کل ہی..." باتوں میں لگا کر سعد نے نہایت پھرتی سے اس کا کانٹا نکال دیا۔ وہ جو غور سے اس کی بات سن رہی تھی، کانٹا نکل جانے کے بعد بہتا خون دیکھ کر پھر سے سسکیاں بھرنے لگی۔ سعد نے اپنا رومال اس کے پیر پر باندھا۔
"تم بہت ظالم ہو۔ ہمیشہ... درد ہی دیتے ہو۔" وہ جب اس کی طرف ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ وہ روتے ہوئے، بہت بوجھل سے لہجے میں بولی۔ سعد کی نظریں اس پر سے پلٹنا بھول گئیں۔
بھیگی بھیگی سی... روئی روئی سی... اتنا پیارا شکوہ کرتی ارسہ شاہنواز کیا جان سکتی تھی کہ وہ ہار گیا تھا۔ ارسہ کے سامنے... صرف اپنا دل نہیں، اپنی پوری ذات ہار گیا تھا۔ اس کی بولتی نگاہیں ارسہ کی دو لال، بوجھل سی نظروں کے اندر اتر رہی تھیں۔
اسے سہارا دے کر کھڑا کرنے کے بعد وہ یونہی اس کا ہاتھ تھامے آگے بڑھنے لگا۔ گھر تک خاموشی ان دونوں کے بیچ تنی رہی تھی اور دونوں کے ہی دل اس خاموشی سے زچ ہوتے رہے تھے۔



اب کسی سے کچھ کہنا سننا، کوئی گلہ شکوہ کرنا بیکار تھا کہ اپنا دل ہی پاگل ہو رہا تھا۔ جب وقت تھا "چاند" کو من آنگن میں سجانے کا، تب دل نے اپنے پیروں پر کلہاڑی مار کر بے وقوفی دکھائی تھی اور اب جب سب کچھ ہاتھ سے پھسل گیا تھا تو دل کو بے ایمانی سوجھ رہی تھی۔ اس نے نوفل کے سامنے اپنے دل کا حال بیان کیا تو وہ بھڑک اٹھا۔
"اب بیٹھ کے چین کی بنسی بجا۔ سارا کیا دھرا تیرا اپنا ہے۔ کسی کو ہلیم نہیں کر سکتا تو اور نہ ہی ارسہ کی زندگی پہ محبت کا انکشاف کر کے اس کا سکون تباہ کر سکتا ہے۔ سو بہتر ہو گا کہ خاموش رہ۔"
گھر میں کسی سے کچھ کہنا عبث تھا۔ ارسہ کی شادی کی تیاریاں اس کے سامنے زور و شور سے ہو رہی تھیں۔ اماں اور مامی آج کل جب بھی سعد کے پاس آ کر بیٹھتیں تو موضوع گفتگو ارسہ کے جہیز کا سامان ہی ہوتا۔ دونوں میں سے کوئی بھی اس کے دھواں دھواں چہرے کی طرف دیکھ کر اس کے کرب سے آشنا ہونا نہیں چاہتی تھیں۔
ماموں بھی ارسہ کی شادی تک کے ذکر محدود ہو گئے تھے اور اسے بھی ایک اسی بات کا پابند کر دینا چاہتے تھے۔
رہ گئی ارسہ تو وہ نظر ہی کم کم آتی تھی۔ اس نے آج کل خود کو اسپتال میں کچھ زیادہ ہی مصروف کر لیا تھا۔ جب کبھی وہ سامنے آتی، کترا کر گزر جاتی۔ وہ پہلے جیسا لڑنا، بھڑنا، چھینا جھپٹی، نوک جھونک، سب ختم ہو گیا تھا۔
اس کا یہ بے اعتنا رویہ سعد کے دل کو قبرستان بنا گیا۔
چھ ماہ کے اندر اندر "ارسہ شاہنواز" کی شادی کی تیاریاں مکمل ہو گئیں اور لڑکے والے بھی پاکستان آ گئے۔ سعد کو ایک دم سے وحشت و گھٹن کے دورے پڑنے لگے۔



"آج تو کہیں جا کر دیکھ۔ نیند والی گولیاں ساری پھانک کر سو مروں گی۔ پھر روتے رہنا "اماں" کر کے۔" بارات والے روز بھی وہ غائب ہونے کے چکروں میں تھا۔ لیکن ہلا کو جانے کیسے اس کے ارادوں کی خبر مل گئی۔ اس نے باقیوں کو خبردار کرنے میں منٹ بھی نہیں لگایا۔
"غضب خدا کا، گھر کی شادی ہے اور گھر کا بیٹا ہی کام میں دلچسپی نہیں لے رہا۔
"آج ـــ کے فنکشن کا انتظام تم دیکھو۔ اتنے دنوں سے تمہارے ماموں اکیلے سارا کچھ دیکھتے رہے۔ تمہیں ذرا بھی ان کی ہیلپ کرنے کا خیال نہیں آیا۔"
مامی بھی شرمندہ کرنے کو لپکیں۔ وہ ٹھنڈی آہیں بھرنے لگا۔
"یعنی خوب رہی... انتظامات کی فکر ستا رہی ہے دونوں کو اور بیٹے کی نہیں کہ جس کی شیو کتنے دنوں سے نہیں بنی تھی۔ جو خوشی کا موقع ہونے کے باوجود جوگی بنا پھر رہا ہے۔ اندر کا درد چہرے سے چھلک چھلک کر بہہ رہا ہے اور ان دونوں کو یہ دگرگوں حالت نظر ہی نہیں آئی۔
صحیح معنوں میں اس کا دل دھاڑیں مار مار کر رونے کو بے تاب ہوا۔ اپنی بے وقوفی، کم عقلی کا آج یقین آ گیا تھا۔
بڑے بھاری دل کے ساتھ اس نے انتظامی امور سنبھالے۔
"شرم کر۔ کچھ اپنے بوتھے کی پالش کر۔ لوگ کیا کہیں گے۔" نوفل بھی آیا ہوا تھا۔ اس کے لتاڑنے کا بھی اس پر اثر نہ ہوا۔

رات ساڑھے دس بجے کے قریب دلہن کیل کانٹوں سے لیس پنڈال میں آئی تو جیسے ہر منظر مٹ گیا۔ باقی رہا تو صرف ارسہ شاہنواز کا سجا سنورا قاتل روپ اور اس کی نگاہیں... وہ اردگرد سے بے خبر بے خود سا ہو کر اسے تکے گیا۔ اس پل یہ بھی بھول گیا کہ یہ آتشیں روپ کسی اور کا ہونے جا رہا ہے... وہ اس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دور ہو رہی ہے۔ وہ شاندار، پر تمکنت سی ارسہ شاہنواز زندگی میں پہلی بار اتنی سجی سنوری تھی تو کسی اور کی خاطر...
"بس بھی کر... سب تجھے دیکھ رہے ہیں۔" نوفل کے کندھے ہلانے پر وہ ہوش کی دنیا میں واپس لوٹا تو پورا وجود درد کی تفسیر محسوس ہوا۔
"عاشر کو بزنس کے سلسلے میں کچھ ضروری کام ہے۔ وہ عین ٹائم پر آ جائے گا۔" بارات کے آتے ہی اماں اور مامی کے استفسار پر آنٹی نے باچھیں پھیلا کر جواب دیا۔
اماں اور مامی اس لمحے تو خاموش ہو گئیں۔ مگر وہ رات کے ساڑھے بارہ بجے بھی نہ آیا تو لڑکی والے ہی

نہیں لڑکے والے بھی پریشان نظر آنے لگے۔ اسٹیج پر ارسہ اپنی سہیلیوں کے حلقے میں سنجیدہ صورت لیے بیٹھی تھی۔

اس پر سے توجہ ہٹا کر وہ وہاں چلا گیا' جہاں بڑوں کے بیچ دولہے کی آمد میں تاخیر پریشانی کا سبب بنی ہوئی تھی۔

"مجھے نمبر دیں عاشر صاحب کا؟" اس نے جاتے ہی ماموں سے کہا اور ان کے نمبر بتانے کے بعد اپنے سیل سے ٹرائی کرنے لگا۔ مگر بارہا کوشش کے باوجود بھی نمبر آف ہی ملا۔ سب کے چہروں پر فکر اور پریشانی تھی اسے عاشر پر بے تحاشا غصہ آنے لگا۔

"آپ بتائیے! یہ کیا تک تھی؟ آپ خود آگئے' دولہا نہیں آیا۔ مسئلہ کیا ہے؟ بزنس اس نے یہاں کب سے سیٹ کر لیا....؟ اور اب پریشان ہونے کی ایکٹنگ بھی کیے جا رہے ہیں۔" اس کا غصہ آنٹی اینڈ فیملی پر نکلنے لگا۔

"سعد.... حوصلے سے بیٹا! اتنی جلدی ٹمپر لوز نہیں کرتے۔" ماموں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ نامعلوم ان میں کون سی روح گھسی ہوئی تھی۔ پیچیدہ ترین صورت حال میں بھی ان کے ہوش و حواس گم نہیں ہوتے تھے۔ مگر یہ وقت ہاتھ پہ ہاتھ دھرے رہنے کا بھی نہیں تھا۔ لوگوں کی چہ مگوئیاں بڑھ رہی تھیں۔ اور ارسہ کے چہرے پہ سراسیمگی بھی۔ اسے اور زیادہ تاؤ آنے لگا۔

"کہہ تو رہا تھا' وہ عین ٹائم پہ آجائے گا۔" عاشر کے ابا اس بار گھگھیا کر بولے تو اس کو آگ سی لگ گئی۔

"کیا مطلب کہہ رہا تھا۔ آپ تو یوں بات کر رہے ہیں جیسے کسی اور کی شادی پر آئے ہوئے ہوں۔ یہ اپنی ٹائپ کا اکلوتا دولہا ہے جو بارات کے ساتھ نہیں' بلکہ بعد میں آنے والا ہے۔ فار گاڈ سیک.... ادھر ادھر کی کہنے کے بجائے اصل حقیقت بتائیں۔" سعد کا لہجہ خاصا تیز ہو گیا تھا۔ ٹوہ لینے والے ارد گرد جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ اس کے طیش میں آنے کا اثر آنٹی اینڈ فیملی شاید لے ہی لیتیں اگر ہلا کو نہ حاضر ہو جاتا۔ اس کے ہاتھ میں تہہ کیا ہوا کاغذ تھا۔

"کوئی صاحب دے گئے ہیں۔ کہہ رہے تھے کہ آپ کے نام ہے۔" اس نے آتے ہی کاغذ آنٹی کو پکڑا دیا۔ جسے تھامتے ہوئے انہوں نے پہلے سب کی جانب دیکھا اور پھر کپکپاتے ہاتھوں کے ساتھ کاغذ کی تہہ کھولنے لگیں۔

سب کی نظریں ان کے چہرے کا احاطہ کیے ہوئی تھیں۔ وہ جوں جوں پڑھتی جا رہی تھیں توں توں زرد ہوتی جا رہی تھیں۔

"او مائی گاڈ۔" کاغذ ان کے ہاتھ سے نیچے گر گیا اور وہ کیٹی کے کندھے پر سر گرا کر ہانپنے لگیں۔ ان کے ہاتھ سے گرنے والا کاغذ ماموں نے اٹھا لیا۔

"کیا لکھا ہے؟" مامی اور اماں برابر ان سے سوال کرتی رہیں۔ حالانکہ ان کی شکل سے عیاں تھا کہ جو بھی لکھا ہے' اچھا نہیں ہے۔

"بہت شرمندہ ہیں مسٹر شاہنواز! بے حد شرمندہ ہیں۔ فار گاڈ سیک ہمیں معاف کر دیں۔ ہم معافی کے قابل تو نہیں بٹ...." انکل تحریر پڑھے بنا ہی معافیاں مانگنے لگے تھے۔ گویا عاشر صاحب کا جو بھی رویہ تھا' وہ سب اس سے آگاہ تھے۔ بس انہیں ہی بے خبر رکھا گیا تھا۔ وہ بھی جان بوجھ کر۔ سعد کا بس نہیں چلا کہ عاشر کے تو چیتھڑے اڑائے ہی.... سامنے کھڑے انکل اور آنٹی کو بھی بھون ڈالے جن کے نزدیک اپنے آوارہ منش بیٹے کو لگام ڈالنے کا ایک یہی راستہ بچا تھا کہ ایک معصوم لڑکی کی زندگی تباہ کر دی جائے۔

"عاشر اس شادی کے حق میں بالکل بھی نہیں تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ وہیں ناروے میں ہی عاشر نے دو دو شادیاں کر رکھی ہیں۔ پہلی کو طلاق دے دی ہے جبکہ دوسری سے اس کی بیٹی بھی ہے۔"

"یو...." سعد انکل پر جھپٹنے کو ہی تھا کہ نوفل نے پکڑ لیا۔

"ہم سب اس کی ان شادیوں سے خوش نہیں تھے۔ یہ فضیلہ ہی ہے جس نے ارسہ بیٹی کو دیکھ کر عاشر کو زچ کر دیا کہ وہ یہیں شادی کرے۔ حالانکہ وہ آج کے دن تک یہ رٹ لگائے رہا کہ وہ اس شادی سے

راضی نہیں۔ لیکن فضیلہ کو اپنی کرنے کی عادت ہے اور اب یہ اپنی کر کے بھگتے گی بھی۔ عاشر کچھ دیر پہلے کی فلائٹ سے واپس چلا گیا۔"

اماں اور مامی سسک پڑیں۔ سعد مٹھیاں بھینچنے کھولنے لگا۔

لوگ جتنی بھی عزت کریں.... اپنی نوعیت کے اس انوکھے واقعے پر چٹخارے لینے لگے۔ سعد کی سماعتوں میں "دولہا بھاگ گیا" کے الفاظ پڑے تو وہ جیسے سن ہی ہو گیا۔ ماموں کا وہ پہاڑوں جیسا مضبوط حوصلہ ایک دم سے ڈھے گیا۔ وہ بے ساختہ سعد کے کندھے سے آلگے اور مامی' اماں کے گلے لگ کر زار و زار رونے لگیں۔ اسٹیج پر بیٹھی ارسہ شاہنواز یقیناً تقدیر کے اس وار سے آگاہ ہو چکی تھی۔ تب ہی تو پھٹی پھٹی آنکھوں کے ساتھ ہر طرف دیکھے جا رہی تھی۔

کتنی ہی دیر تک فضا سوگوار رہی۔ آنٹی' اپنی بیٹی اور شوہر کے ہمراہ کھسک چکی تھیں۔ مہمان جوں کے توں موجود تھے۔ کچھ ہمت بندھا رہے تھے' کچھ انجوائے کر رہے تھے۔ پھر جب ماموں اور مامی نے ارسہ کو اندر لے جانے کو کہا۔ تب اماں اچانک ہی بلند آواز میں بولیں۔

"ارسہ یہیں بیٹھی رہے۔ قاضی صاحب بھی نہیں جائیں گے اور سارے مہمان بھی تھوڑی دیر رک جائیں۔ یہ شادی آج ہی ہو گی.... میرے سعد کے ساتھ.... ہاں! میری برسوں کی خواہش' سعد کے دل کی خواہش آج یوں پوری ہو گی۔ ابھی اور اسی وقت ارسہ کو میرے سعد کے نام کر دو۔"

اماں کے ان الفاظ نے محفل میں ہی نہیں' سعد میں بھی نئی روح پھونک دی۔ نوفل کا سہارا نہ لے لیتا تو یقیناً" چکرا کر گر پڑتا۔

سوگوار فضا میں قہقہے ابل پڑے۔ ماموں اور مامی کے فق چہروں کی رونق لوٹ آئی۔ نوفل کے بھنگڑے اسے گدگدانے لگے۔ اماں سعد کے اوپر پیسے وار وار کر ہلا کو اور دیگر کام کرنے والیوں کو دے رہی تھیں اور اس بے تحاشا خوشی میں اسے ارسہ شاہنواز کے چہرے کو

جانچنے کا خیال ہی نہیں آیا کہ وہاں کی مردنی دھنک رنگوں میں بدلی یا نہیں۔



حجلہ عروسی میں پہلا قدم رکھنے کی دیر تھی۔ کوئی چیز ٹھاہ سے اس کے سر پر آلگی۔

اسے صحیح معنوں میں تارے نظر آگئے۔ دوسرا قدم رکھا تو کشن منہ پر آلگا۔ اس کے بعد تو گویا برسات سی ہوگئی۔

اس کی ”ارے..... آ..... ارے“ کی پروا کیے بغیر نئی نویلی، سجی سنوری دلہن کمرے کی ہر شے کو توپ کا گولہ بنا کر نہ صرف اس پر برساتی رہی۔ بلکہ چیخ چلا کر روتی بھی رہی۔ وہ توپ کے گولوں کی چھاؤں میں اس کے سر پر جا پہنچا جس کے ہاتھ میں اب کوئی باڈی اسپرے تھا۔

”اپنے دولہا کے استقبال کا یہ کون سا طریقہ ہے؟ آج کی رات ہی بیوہ ہونا ہے کیا؟“ اس کی دونوں کلائیاں تھام کر اسے بے حد قریب کر کے وہ سرگوشی میں بولا۔ ارسہ کے ہاتھ سے اسپرے چھوٹ کر گر گیا۔

”قصور تو بتا دو۔ پھر بے شک مارتی رہنا۔“ وہ رو رہی تھی۔ سعد کو بے بسی گھیرنے لگی۔

”اب کیوں کی مجھ سے شادی ’اتنا تماشا لگوا کر؟ اتنی ہتک کروا کر..... اب خیال آگیا نیک بننے کا..... تب کیوں نہیں کی جب ڈیڈی نے کہا تھا..... تب۔“ وہ پرانی بات یاد دلا کر سعد کو حیران ہی کر گئی۔

”تب مجھ میں کون سی برائی تھی؟ کیوں انکار کیا تھا؟“

”تمہیں کیسے پتا چلا کہ ماموں نے مجھ سے یہ بات کی؟“

”ہلا کو نے بتایا تھا۔ اس نے تمہاری اور ڈیڈی کی باتیں سن لی تھیں۔“ وہ آنکھیں پونچھ کر چلائی۔ سعد منہ کھولے اسے دیکھتا رہا۔

”تمہیں میرے انکار سے تکلیف پہنچی تھی؟“ گمبھیر سے لہجے میں پوچھا۔

”ہاں۔“ وہ بلا سوچے سمجھے بول اٹھی۔ ”نہیں بالکل بھی نہیں۔“ پھر بدک کر پیچھے ہٹی تو دیوار سے جا لگی۔ سعد بڑی دلنشین مسکراہٹ سجائے اس کے قریب ہوا۔ دونوں ہاتھ اس کے دائیں بائیں دیوار پر رکھنے کے بعد بڑی دلفریبی سے بولا۔

”جو سچ تھا‘ وہ تم نے بتا دیا۔ اب مزید مجھے خوار نہ کرو پہلے ہی بہت ہو چکا ہوں۔ اس کے بعد سزا بھی بھگتی اب مزید سزا نہیں۔ آج تو مجھے انعام چاہیے۔ اپنے ہی نہیں تمہارے بھی دل کی خواہش پوری کرنے پر۔ چوری چھپے مجھ سے محبت کرتی رہیں اور اوپر اوپر سے.....“

”پتا نہیں کیا بکے جا رہے ہو۔“ سعد کی وارفتگی دھڑکنیں بے حال کر گئی۔ وہ اسے دھکیلتی بیڈ پر جا بیٹھی۔ سعد کے جاندار قہقہے کا ساتھ اس کی شرمگیں ہنسی نے بھرپور طریقے سے دیا تھا۔ ایک تھکا دینے والی ذہنی اذیت کے بعد بالآخر راہ میں پھول بکھر گئے تھے۔



اعتذار

کچھ ناگزیر وجوہات کی بنا پر اس ماہ عالیہ بخاری کے ناول ”دیوار شب“ کی قسط شامل اشاعت نہیں ہے۔ اس کے لیے قارئین سے معذرت خواہ ہیں ان شاءاللہ آئندہ ماہ آپ ”دیوار شب“ کی قسط پڑھ سکیں گی۔

سمیرا حمید



”تو پھر کیوں سناتی ہیں مجھے مٹکی کی باتیں.....؟“
”مرجانی نجانے کیوں یاد آجاتی ہے.....“
”صاف کیوں نہیں کہتیں کہ مجھے دیکھ کر یاد آجاتی ہے۔“

دادی نے جواب نہ دیا۔
”بھاگی کیوں تھی مٹکی.....؟“ پھر سوال،

نانی کہتیں ”ہماری تو سات نسلوں میں کوئی اس جیسا نہ ہوا‘ نہ ہو..... اب تو ہر نماز کے بعد ایک ہی دعا ہے۔ ایسا بھی کیا لچکنا‘ مٹکنا‘ ارے مالا! ٹک کر بیٹھ کہیں ناکہ بڑھوتری ہو..... پھلے پھولے..... اچھل کود تو ڈنگر بناتی ہے..... پھول تو نرم و نازک بیل پودوں پر لگتے ہیں‘ ڈنگروں پر تو سینگ ہی اگتے دیکھے ہیں.....“

نانی کی تو عادت تھی۔ بلا وجہ بات کو کہیں سے کہیں لے جاتی تھیں..... اور پھر دادی..... وہ کہتیں۔

”یہ تو مٹکی ہے.....“

”کون مٹکی.....“

”تھی کوئی ان کے گاؤں میں۔ گھوڑ سواروں کی پگڑیاں اڑا لیا کرتی تھی..... میلوں میں جاتی تو اس صفائی سے چٹکی بھرتی کہ اگلا تڑپتا الگ اور شرمندہ الگ ہوتا..... پانی بھرے گھڑوں میں بھنگ ملا جاتی تھی۔ کیا مجال کہ پھر مان بھی جائے۔ بھلے سے سارا گاؤں اکٹھا ہو جائے کہ ہم نے خود دیکھا ہے..... کئی مردمار لڑائیوں کا موجب بنی تھی مگر صاف بچ جاتی تھی..... اس کے کیے نقصان کے ہرجانے بھرتے بھرتے اس کے گھر والے آدھے رہ گئے..... عین شادی والے دن بھاگ گئی تھی۔“

”میں بھی بھاگ جاؤں گی..... پھر تو ٹھیک ٹھاک مٹکی بن جاؤں گی نا.....“

”ارے نہ نہ!“ دادی ایسے گڑبڑائیں جیسے وہ ابھی بھاگ کھڑی ہو گی۔

"بھاگی نہیں تھی۔۔۔ پگلا گئی تھی۔۔۔ پانی بھرنے گئی تھی۔" دادی تصحیح کرتیں۔

"شادی والے دن پانی۔۔۔؟"

دادی پھر سٹپٹا گئیں۔

"جھوٹ۔۔۔" اس نے انگلی لہرا کر کہا۔

"چلی گئی تھی کہیں۔ ہمیں کیا پتا کہاں گئی۔" انہوں نے بے زاری سے کہا۔

"کس کے ساتھ؟۔۔۔" مالا نے چٹخارا لیا۔

"نہ نہ ایسی نہ تھی۔" تکیہ ٹھیک کر کے دراز ہوتی دادی اٹھ بیٹھیں۔

"دو دن بعد نہر سے اس کی نعش ملی تھی۔" دادی ماضی کی نہر میں نئے سرے سے اس کی لاش ڈھونڈنے لگیں۔

"ہائے میں بھی مر گئی دادی۔۔۔" مالا خود کو مٹکی ہی سمجھ بیٹھی۔

"تو کیوں۔۔۔ خاک ڈال اپنے منہ میں۔۔۔ میری بچی!"

"خود ہی تو کہتی ہیں میں مٹکی ہوں۔"

"بس۔۔۔ ختم کر۔" دادی عاجز آ گئیں۔

"تو مری کیوں وہ؟" وہ آسانی سے پیچھا چھوڑنے والی کہاں تھی۔

"اللہ جانے۔۔۔!"

"آپ کو سب پتا ہے۔۔۔ دولہا پسند نہیں تھا۔" اس نے تکا مارا۔

"دولہا پر تو جان دیتی تھی۔۔۔ کھیل کے دنوں سے منگیتر تھا۔"

"ہائے کیوں کود گئی مٹکی نہر میں۔۔۔" سارا دن چپ سادھے گھومتی رہی۔۔۔

اماں نے کہا۔ "جا ٹیوشن پڑھ آ۔" اس نے سنا ہی نہیں۔

"جا مالا! ٹیوشن کا وقت ہو گیا۔" دادی نے یاد دلایا۔

"مجھے نہیں جانا۔" وہ بدک گئی۔

وہ مٹکی کا سوگ منا رہی تھی۔

اماں باورچی خانے میں غصے سے برتن پٹخنے لگیں "کہہ دیا نہیں تو اب نہیں" اور احمر کی ایک ہی فرمائش تھی کہ "یہ کم سے کم بارہ جماعتیں تو ضرور ہی پاس کرے" اور وہ تین سال سے بارہ جماعتیں پاس کر رہی تھی۔

اماں نے باورچی خانے کی کھڑکی سے دیکھا کہ وہ ٹیوشن کے لیے جا رہی ہے۔۔۔ وہ گھبرا گئیں۔

"مالا۔۔۔!" انہوں نے اسے روکا۔ ہاتھ میں پکڑی اس کی کتابیں دیکھیں کہ پوری ہیں۔۔۔ ساتھ ہی کلائی پکڑ کر دیکھا کہ بخار تو نہیں۔ اس کا انکار تو پہاڑ ہل جانے پر بھی نہیں بدلتا تھا۔ اب کیوں جا رہی ہے۔

"چھوڑ نہ جا۔۔۔ میں آلو بخارے کا شربت بنا رہی ہوں۔"

"مجھے نہیں پینا"۔۔۔ وہ چلی گئی۔

آج مالا بہت گم تھی خود میں۔

سر نے پوچھا۔ "ہاں بھئی مالا! ٹھیک ہو؟" (روز پوچھتے تھے مطلب پڑھنے والے مزاج ٹھیک ہیں)

مالا نے سر ہلا دیا۔ انہوں نے سر پر ہاتھ رکھا۔

"پیارا بچہ مالا۔۔۔"

"مٹکی نے نہر میں چھلانگ کیوں لگائی؟" وہ ہکا بکا اسے دیکھنے لگے۔

"کون مٹکی۔۔۔؟"

"دادی کے گاؤں کی۔۔۔" اس نے سر کو ساری بات لفظ بہ لفظ سنا دی جتنا دادی اسے بتا چکی تھیں۔ وہ سنتے رہے پھر اسے کتابیں کھولنے کے لیے کہا۔ وہ بار بار ایک ہی بات پوچھتی رہی۔

مٹکی۔۔۔ مٹکی۔۔۔

"اس بار پاس ہونا ہے کہ نہیں؟" انہوں نے تنگ آ کر کہہ دیا۔

"ہونہہ!" اس نے منہ بگاڑا۔ احمر ڈاکٹر بن رہا تھا۔ سب کہتے وہ بارہ تو پڑھے۔ اس کی جان کا عذاب تھیں کتابیں اور احمر کتابیں پڑھتے پڑھتے سو جاتا۔ اٹھتا پڑھتا، بیٹھتا پڑھتا۔ کھڑا۔۔۔ لیٹتا۔۔۔ بس پڑھتا ہی رہتا۔ دادی کہتیں۔

"جتنی کتابیں وہ پڑھ چکا ہے اب وہ صرف انسان نہیں رہا۔"

احمر کو غصہ آ جاتا۔ "کیا مطلب ہوا اس بات کا۔"

"میں نہیں جانتی اب تو صرف انسان بنے رہنے سے تو رہا۔" دادی ہنستیں اور وہ اور غصہ کرتا۔

چند سالوں پہلے جب دونوں کی بات پکی کرنی چاہی تو اس نے کہا تھا کہ ٹھیک ہے لیکن شادی وہ تب ہی کرے جب وہ بہت سا پڑھ لے گی۔

مالا دو بار میٹرک میں لگاتار فیل ہوئی تو ماسٹرز سے وہ بی اے پر آ گیا۔۔۔

تین بار ایف اے میں فیل ہوئی تو اس نے ایف اے پر ہی قناعت کر لی کہ بارہ تو ضرور ہی کرے مگر کیسے کرے وہ بارہ۔۔۔ دماغ میں اتنا کچھ گھسا رہتا تھا کہ کتابوں کو کہاں جگہ ملتی۔۔۔

ہر بار فیل ہونے پر وہ اپنی کتابیں جلا دیتی۔

رزلٹ سنانے والے کا تو وہ حال کرتی تھی کہ اب ابا اسے کمپیوٹر کے آگے بٹھا دیتے تھے کہ لو خود چیک کرو۔۔۔ پہلی بار ابا نے آفس سے گھر فون کیا۔ انہوں نے اس کا رزلٹ پتا کر لیا تھا۔ زین نے فون اٹھایا اور وہیں سے چلایا۔

"اے مالا! کالے چنے منگوا لے۔۔۔ قل ہیں تیرے پرچوں کے آج۔"

مالا چھت پر تھی بھاگ کر آئی۔ اس سے تین بار پوچھا۔

"سچ بتا زین! سچ بتا۔۔۔" وہ کھڑا دانت نکالتا رہا اور بلند بانگ سچ بتاتا رہا۔

وہ باہر نکلی۔ ایک طرف رکھا بلاّ اٹھایا اور گھما کر اس کے سر پر دے مارا۔

پرچے اس نے دیے۔۔۔ چیک بورڈ نے کیے۔۔۔ رزلٹ ابا نے اسے بتایا اور خون کی دھار نکلی زین کے سر سے۔

ماں۔۔۔ دادی۔۔۔ خالہ۔۔۔ احسان بھائی۔۔۔ سب لپکے۔

"اب بتا۔۔۔" وہ چلا رہی تھی پاگلوں کی طرح احسان بھائی نے اسے قابو کر کے کمرے میں بند کیا۔ زین کو اٹھا کر اسپتال لے کر گئے اسے کیا کہتے وہ تو مالا تھی۔۔۔ نرالی بی۔۔۔ دادی نے اسے یہ نام دیا تھا۔ کوئی نیا واقعہ ہوتا تو دادی اسے اسی نام سے پکارتیں۔

زین کے چھ ٹانکے آئے۔

ابا نے زین کو الگ سے سمجھایا "تجھے پتا تو ہے اس کے دماغ کا۔" اور وہ چپ ہو گیا۔ جانتا تھا بڑی، چھوٹی آپا کی "پگلی سی مالا" احسان بھائی کی "مالا او مالا" خالہ کی "میری جان مالا" دادی، نانی کی "بے چاری بچی مالا۔۔۔ چھٹانک بھر کی۔۔۔ مالا۔۔۔ مالا۔"

سات آٹھ سال کی تھی دہرا نمونیا ہو گیا۔ چند مہینوں بعد بالائی چھت سے نیچے آ گری۔۔۔ کیسے بچی؟ اللہ ہی جانتا ہے پر بچ گئی۔ دادی نے کھڑے کھڑے اپنی دونوں سونے کی چوڑیوں کو خیرات کرنے کا سوچ لیا۔۔۔ اماں نے سب فقیروں کو جمع کر کے کھانا کھلانے کی منت مان لی۔۔۔ بڑی، چھوٹی آپا مہینوں نوافل پڑھتی رہیں۔ ابا نے صدقے کے چھ بکرے دیے۔۔۔ خالہ نے دو غریب لڑکیوں کی شادی کروانے کی ٹھان لی۔۔۔ سو اب ذرا سا اوئی بھی کرتی تو۔

"ارے آرام سے۔۔۔ سر پر چوٹ آئی ہے کچھ ہو نہ جائے۔۔۔"

"کوئی اس کے پاس اونچا نہ بولے اس کا دماغ کمزور ہے۔۔۔" وہ بھلے سے پھٹا ڈھول بنی رہے۔ "انجم! بلاّ دے دے، اسے کھیلنے دے ورنہ روئے گی تو دماغ میں ٹیسیں اٹھیں گی۔"

وہ صبح سے شام بلاّ پکڑے کھیلتی رہتی۔ "انجم جا۔۔۔ گڈو جا۔"

سب کو بھیجا جاتا اس کے ساتھ کھیلنے کے لیے۔ منی، چنی سب گیندیں کروا کروا کر بھاگ چکے۔ اب اماں۔۔۔ پھر ابا۔۔۔ آپا۔۔۔ احسان بھائی۔۔۔ آخر میں زین۔

"دس روپے لے لے زین! اس کے ساتھ کھیل لے۔"

دس روپے لے لیے۔ زین گیندیں کروانے لگا۔ دس کے سو ہو جاتے۔۔۔ سو کے دو سو ہو جاتے۔۔۔ اب بلا ٹوٹے یا مالا کا شوق۔۔۔ احمر ایسے وقت "ہونہہ" شکل بنائے اسے دیکھ کر نکل جاتا۔

اماں اور خالہ دونوں بہنوں کی شادی ایک ہی گھر میں ہوئی تھی۔ خالہ دس سال بے اولاد رہیں۔ پھر احمر آیا پھر رانیہ اور سب سے چھوٹا عدیل۔ اماں بڑی تھیں ان کی پانچ اولادیں تھیں۔ بڑی، چھوٹی آپا کو بیاہ دیا۔ احسان بھائی ایک منے کے بابا بن گئے۔ اوپر نیچے آباد تھے دونوں گھر۔ خالہ نے مالا کے لیے منت پوری ہونے پر جن دو غریب بچیوں کی شادی کروائی تھی وہ ایسے ہی نہیں کروائی تھی۔۔۔ اپنی بہو مالا کی لمبی زندگی کے لیے کروائی تھی۔

احمر کی کبھی مالا سے نہیں بنی تھی۔ وہ تنگ آ گیا تھا۔ اس کے الٹے دماغ سے رسم کرنی چاہی تو احمر نے اس کے اگلے پچھلے کتنے ہی حصے سُنا ڈالے اور ثابت کیا کہ وہ پاگل ہے۔

خالہ کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔۔۔

"موت کو ہاتھ لگا کر پلٹی تھی۔ سر کے بل گری تھی چوٹ دماغ پر آئی تھی۔ اثر کہاں جاتا ہے۔"

پہلے تو اتنی سمجھ دار بچی تھی۔۔۔

"آٹھ سال کی بچی کہاں سمجھ دار ہو گی؟"

احمر یہ سُن سُن کر عاجز آ چکا تھا۔ اب وہ پھانسی لٹک جاتا تو بھی شادی مالا کے ساتھ ہی ہونی تھی تنگ آکر اس نے اسے پسند کرنے کی کوشش کی اور اس کے کالے سیاہ بالوں پر نظر ڈالنی شروع کی۔۔۔ مگر ایک دن وہ بال بالشت بھر کی پونی میں بدل گئے۔ اپنی سہیلی کے ساتھ گئی اور کٹوا آئی۔۔۔ دادی اور اماں نے غصے کے مارے رات کا کھانا نہ کھایا۔۔۔ ابھی مہینہ پہلے تو انہوں نے بڑے پتیلے میں ناریل کا تیل اور کڑی پتا ڈال کر پکایا تھا۔ جلنے کی بو سے سارا گھر ہی جلتی چتا کی بدبو چھوڑنے لگا تھا۔۔۔ گھنٹہ گھنٹہ بھر اماں اور خالہ مساج کرتیں اور جب بال کمر سے نیچے تک آ گئے تو پتا نہیں کہاں گئے۔

گھر کی تینوں خواتین گہرے صدمے سے دوچار ہوئیں۔ احمر نے اپنی اماں کے سامنے خوب تماشا کیا۔

"کسی دن سوتے میں میرے بھی بال، ناک، کان کاٹ دے گی اور آپ کے بھی۔۔۔" وہ چلایا۔

"وہ نہیں یہ پاگل نہیں ہے وہ۔"

"ہاں ہم جو ہیں۔۔۔" اس کی ایسی باتوں پر وہ صرف ہنستی تھیں ایک دن وہ اپنے کمرے میں چند دوستوں کے ساتھ بیٹھا مزاحیہ انگریزی فلم دیکھ رہا تھا اور بقول تینوں خواتین ان کے قہقہے اگلے محلے تک گونج رہے تھے۔

دروازہ دھڑ دھڑایا گیا۔ احمر سمجھا چائے ہو گی۔ دوست کو دروازہ کھولنے کے لیے کہا۔ اس بے چارے نے دروازہ کھول دیا۔ اسے دھکا دے کر وہ اندر آئی۔

سارے پلگ نکالے اور سی ڈی پلیئر اٹھا کر لے گئی۔

"مالا!" وہ دھاڑا۔ دوستوں کا لحاظ کیے بغیر۔ دوست ہکا بکا فلم دیکھ رہے تھے۔ منہ پر کوئی ماسک لگایا ہوا تھا اس نے۔۔۔ آواز پر رکی نہیں۔ دوست منہ پر ہاتھ رکھے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ ان میں سے ایک ایک رات اس کے یہاں ٹھہرا تھا مل کر پڑھنے۔ یہ ہی مالا اندر آئی اور بولی۔۔۔ "ریگل سے دہی بھلے لادو۔"

وہ ہڑبڑا کر اٹھا۔ اس کا بازو پکڑ کر باہر گھسیٹنا چاہا۔

"تم باہر چلو۔ میں آتا ہوں۔۔۔" ضبط کیے وہ بولا۔

"یہ پیسے پکڑو اور دس منٹ میں واپس آؤ۔"

"میرا دوست بیٹھا ہے۔۔۔ باہر نکلو۔" غصے سے احمر کے اعصاب تن گئے۔ شجاع بظاہر کتاب پر نظریں رکھے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اتنی خوب صورت احمر کی منگیتر۔

"السلام علیکم بھائی!" اس نے شجاع کی طرف رُخ موڑ کر کہا۔ شجاع سٹپٹا گیا۔

"پکڑ بھی لو پیسے۔۔۔" احمر نے فوراً پکڑ لیے تاکہ وہ چلی جائے مگر جاتے جاتے پلٹ کر کہنا نہیں بھولی کہ "اپنی الگ سے لانا۔ مجھ سے مت مانگنے بیٹھ جانا۔"

"ہم سے مت مانگنے بیٹھ جانا۔" احمر کا گروپ کینٹین میں بیٹھ کر آرڈر دیتا اور اس کی طرف منہ کر کے ضرور کہتا۔ وہ تو بات مذاق میں آئی گئی ہو گئی لیکن احمر ہی جانتا تھا کہ اس کی کتنی سبکی ہوئی۔ دوستوں کے گھروں میں مجال نہیں کہ کسی بہو بیٹی کی آواز ہی سنائی دے جائے اور جو اس کے دوست دروازے پر آ جاتے تو یہ منہ پھاڑ کر کہہ دیتی کہ "اوپر کسی کتاب میں گم ہو گا۔۔۔ جاؤ جا کر ڈھونڈ لو۔"

بڑی آپا کی رخصتی پر گلا پھاڑ پھاڑ اتنا روئی کہ دولہا بھائی گاڑی میں ساتھ بٹھا کر لے گئے۔ رونا ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ دلہن بنی آپا کی گود میں سر رکھ کر چلا چلا کر رو رہی تھی۔ دلہن کی منہ دکھائی تو خیر کیا ہوئی تھی۔ سب نے آکر اس کا منہ ضرور دیکھا۔۔۔

رات بیتی جا رہی تھی۔ دولہا بھائی صوفے پر بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ ذرا اس کی آنکھ لگی اور ابا جھٹ بانہوں میں اٹھا کر لے گئے۔ ولیمے کے بعد وہ آئیں تو ہوش بھی نہیں کہ کہاں ہیں آپا۔۔۔

کسی دور پرے کی شادی میں چلی جاتی تو اس کی شکل پر نظر پڑتے ہی کہا جاتا۔ "مالا بھی آئی ہے۔۔۔" یعنی دیکھو اب یہاں کیا ہوتا ہے۔۔۔

مالا پہلے تو چپ چاپ معصوم بنی گھومتی رہتی۔ گمان ہوتا کہ سنی سنائی سب افواہ ہے۔ مہمانوں والے گھر میں پتا بھی نہ چلتا کہ مالا کہاں ہے اور پھر کسی کونے سے کوئی دل خراش چیخ سنائی دیتی۔

"میرے بچے کی آواز لگتی ہے۔۔۔ کہیں گر نہ گیا ہو۔۔۔"

پتا چلا مالا مہندی لگا رہی تھی ہلا بیٹھا۔

"کہا تھا میرے قریب نہ آؤ۔۔۔ بگاڑ دیا میرا پھول۔"

اور جو ماں کا پھول بگڑ گیا۔۔۔ کوئی پروا نہیں۔

شادی والا گھر کمرۂ عدالت بن گیا۔۔۔

ابا، اماں نے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی اور اسے لے کر گھر واپس آ گئے۔۔۔

کام کرتی تو لگاتار کیے ہی جاتی سارے گھر کی صفائی، دھلائی، برتن۔ سب کے کپڑے استری ہو رہے ہیں اور یہ دورہ عین امتحان کے دنوں میں پڑا تھا۔

چھت پر چڑھ کر پتنگ اڑانے کا بھی اچانک ہی شوق چرایا۔ احمر نے دیکھ لیا۔ باؤلا ہو گیا۔

"اتارو اسے اماں!" وہ دھاڑا۔

جو بچے روایتی چال چلن سے ذرا پرے ہوتے ہیں۔ وہ پیارے بھی بہت ہوتے ہیں۔ ایسے بچوں پر اپنا آپ لٹا دینے کو جی چاہتا ہے۔ اس گھر میں بھی سب مالا پر اپنا سب کچھ لٹا دینے کے لیے تیار رہتے تھے۔

ابا نے اس کا نام صاعقہ رکھا تھا۔۔۔ کسی ڈرامے میں مالا نام سن لیا تو پیدائشی نام حرام ہو گیا۔ احمر ہی غصے میں ہوتا تو اسے "صاعقہ" صاعقہ کہتا اور وہ پاگلوں کی طرح اس پر جھپٹ پڑتی۔

وہ اسے پسند نہیں کرتا تھا۔ وہ اسے اہمیت نہیں دیتی تھی۔ بات کیسے بنتی یا کیوں بنی رہتی۔ خالہ کہتیں وہ مذاق کرتی ہے اسے تنگ کرتی ہے۔ احمر کو وہ مذاق نہ لگتا پہلے وہ سوچا کرتا تھا کہ یہ بیاہ کر چلی جائے گی تو سکون آجائے گا۔ مگر یہ خیال، خواب ہوا۔

"مجھے اس سے شادی نہیں کرنی۔"

"شادی ہو جائے گی، بچے ہو جائیں گے سب ٹھیک ہو جائے گا۔۔۔ بچوں والی مائیں بہت جلد اور بہت زیادہ سمجھ دار ہو جاتی ہیں۔" خالہ سمجھاتیں مگر یہ بات احمر ماننے کو تیار نہیں تھا۔ وہ کہتا۔

"اس میں ایک بھی گُن نہیں ہے۔"

"خالہ کہتیں۔ وہ گُن خود میں پیدا کر لے۔ کیا فائدہ اتنی کتابیں پڑھنے کا کہ اس کی چھاؤں نہ بن سکے۔ لڑکا بن کر سوچ رہا ہے۔۔۔ اس کے ابا اماں کی طرح سوچ ذرا۔"

"میں کیوں سوچوں اس کا باپ یا ماں بن کر۔۔۔ میری طرف سے جل مرے مالا۔" وہ جل کر کہتا۔ اسے لڑکیوں کی کمی تھی؟ ڈاکٹر بن رہا تھا کالج میں ہی بہت سی لڑکیاں اس کے پیچھے تھیں، مالا رہے اپنی نرالی دنیا میں

نرالی بن کر۔۔۔ اسے معلوم تھا کہ احمر اس کا منگیتر ہے۔۔۔ اس سے آگے وہ کیا کرتی۔۔۔ اکثر ہمیں معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ہم کو کیا کرنا ہے' کوئی بتادے تو بھی یہی خیال آتا ہے کہ یہی کیوں کرنا ہے؟؟ ایسے ذہنوں میں ذرا اور ہی طرح کے سوال اٹھتے ہیں کہ کتابوں کو دھویا کیوں نہیں جاسکتا' پانی میں بھگو کر انہیں نیا کیوں نہیں کیا جاسکتا؟؟

سب اچھا نہیں سوچ سکتے۔ مختلف سوچتے ہیں۔ اور مختلف غلط بھی ہو سکتا ہے۔

وہ غصے میں پاگل ہوجاتی اور جب غصہ نہیں ہوتا تو سب ٹھیک ہی ہوتا تھا۔

ماموں کے بڑے بیٹے کی شادی تھی۔ احمر اور زین کئی دنوں سے ہی وہاں تھے۔

دونوں پیروں میں مہندی لگوائے مالا دھوپ میں بیٹھی تھی۔ اسے اپنی مہندی کی ہمیشہ سے ہی بڑی فکر رہتی اکیلے میں جا بیٹھتی کہ کوئی خراب نہ کردے۔ گورے گورے ہاتھ پیروں پر مہندی ایسے کھلتی کہ پھول بوٹے اگ آئے ہیں۔

بہت دیر گزری تو نیچے جانے لگی سیڑھی پر پیر رکھا ہی تھا کہ ذرا نیچے سڑھیوں پر احمر اور سارہ کھڑے نظر آئے مالا پروا بھی نہ کرتی اور قریب سے گزر جاتی لیکن احمر نے اس کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا اور وہ اس کے سینے کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔

سارہ کی دو تین چوڑیاں ٹوٹ کر گری ہوئی تھیں اس کے پیروں کے پاس۔ احمر اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ دونوں دنیا مافیہا سے کھڑے تھے۔ احمر کی سانسیں اس کی پیشانی پر پڑ رہی تھیں۔ چوٹ کھائی مالا کے دل میں پہلی بار ٹیس اٹھی۔

"چھوڑو احمر!" سارہ نے اپنا ہاتھ آزاد کروانا چاہا۔

"کوئی دیکھ لے گا۔۔۔ مالا نے دیکھ لیا تو تماشا بنائے گی۔"

"دیکھ لے۔۔۔ کرلے تماشا۔۔۔ تماشوں کی ملکہ۔"

احمر اس کے اور قریب ہوا۔

وہ ہنسی "اتنی ہمت ہے۔۔۔؟"

احمر غیرت سے جیسے بھڑک اٹھا۔ "اس پر کبھی کا تھوک چکا ہوں۔۔۔ پھر تھوک دوں گا۔۔۔ مر جاؤں گا مگر اس جیسا غلیظ چانٹا نہیں پڑنے دوں گا۔"

"یہ چانٹا تمہیں کھانا ہی پڑے گا۔" سارہ نے مزالیا۔

"ہم تو اس پر پاگل ہیں۔" احمر نے لپک کر اس کا ہاتھ پکڑلیا۔

مالا نیچے اتر کر ان کے قریب سے گزر گئی۔ احمر گھگھیا کر رہ گیا۔ پر مالا نے جیسے دیکھا ہی نہیں۔ سارہ پارلر کے بہانے گھر سے ہی بھاگ گئی۔ رات گئے احمر بھی نظر نہ آیا کہ اب کچھ ہوا کہ اب۔

مہندی کا فنکشن نپٹا کر مالا بابا کے ساتھ گھر واپس آگئی۔۔۔ پھر ایسی بیمار ہوئی کہ دہرا نمونیا بھی پیچھے رہ گیا۔ گھر والے سب باؤلے ہوگئے۔

اس کی بیماری کے بھی نرالے انداز تھے۔ سر میں درد بھی ہوتا تو باری باری سب سے رات گئے تک دبواتی' جب تک سو نہ جاتی۔ اب کسی کو ہاتھ لگانے نہ دے رہی تھی۔ سفید رنگ سیاہ پڑ گیا۔ وہ عمر میں دس بارہ سال سیانی لگنے لگی۔ طبیعت ذرا سنبھلی تو اس نے نرالی فرمائش کی۔۔۔ زین تک رونے کے قریب ہوگیا کہ اب جو کہہ دیا وہی ہوگا۔ وہی کرنا پڑے گا۔

"مجھے خلیل ماموں کے احمر سے شادی کرنی ہے۔"

وہ مدو جسے بچے پانی میں سیاہی گھول کر پلا دیتے تھے کہ کوک ہے پی جاؤ۔۔۔ اور وہ گلاس بھر بھر پی جاتا۔

دادی۔۔۔ اماں۔۔۔ خالہ۔۔۔ باری باری رونے لگیں۔

"دیوانی ہوئی بھی تو کس کے لیے۔۔۔" چھوٹی آپا روتی رہیں۔

احمر بیٹھے بیٹھے سانس لیتا رہا۔ چپکے چپکے سیٹی بجاتا رہا' وہ ہاں کہہ کر "نہ" نہیں سنتی تھی۔۔۔ احمر جانتا تھا۔

ٹیوشن والے سر جھنجھلا اٹھے۔

"ارے بھئی! مٹکی کے کہیں دل پر چوٹ آئی ہوگی مالا! یہ دلوں کی چوٹیں ہی جان لیتی ہیں۔"

دماغ کی چوٹ سے مالا بچی رہی۔۔۔ دل کی چوٹ پر مر گئی۔



آج ہم ناگہاں کسی سے ملے
مدتوں بعد زندگی سے ملے

شمع کیا، چاند کیا، ستارے کیا
سلسلے سب کے تیرگی سے ملے

ان اندھیروں سے کوئی کیسے بچے
وہ اندھیرے جو روشنی سے ملے

خود سے ملنے کو عمر بھر ترسے
یوں تو ملنے کو ہم سبھی سے ملے

زندگی کے سلوک کیا کہیے
جس کو مرنا ہو، زندگی سے ملے

ہم پہ گزرا ہے وہ بھی وقت خمار
جب شناسا بھی اجنبی سے ملے

خمار بارہ بنکوی

بے قراری سی بے قراری ہے
وصل ہے اور فراق طاری ہے

جو گزاری نہ جا سکی ہم سے
ہم نے وہ زندگی گزاری ہے

بن تمہارے کبھی نہیں آئی
کیا مری نیند بھی تمہاری ہے

اس سے کہیو کہ دل کی گلیوں میں
رات دن تیری انتظاری ہے

حادثوں کا حساب ہے اپنا
ورنہ ہر آن سب کی باری ہے

جون ایلیا

صبا سحر



جواب

ایک لڑکی نے ہاسٹل میں داخلے کے لیے فارم پُر کیا اور اسے میز پر چھوڑ کر کسی کام سے باہر گئی۔ اس کے باپ نے فارم اٹھا کر پڑھنا شروع کیا۔ ایک سوال تھا۔

"کس قسم کی لڑکی کو روم میٹ بنانا پسند کریں گی؟"

لڑکی نے جواب میں لکھا تھا۔ "جو لڑکوں سے ملنے کی شوقین ہو" اس کے باپ نے اس جواب پر استفسار کیا تو لڑکی نے جواب دیا۔

"تاکہ وہ زیادہ وقت کمرے سے باہر گزارے اور میں سکون سے پڑھ سکوں۔"

(افشاں فرقان۔۔۔ سخی حسن)

خمیازہ

ایک شخص نے ایک مشہور اخبار میں فون کر کے کہا۔ "میں نے اپنی شادی کا اطلاع نامہ بطور اشتہار آپ کے اخبار میں چھپنے کے لیے دیا تھا۔ اسے روک لیا جائے۔"

"سر! معذرت ہے، کاپی پریس میں جا چکی ہے اور اخبار چھپنا شروع ہو چکا ہے۔" اخبار کے دفتر سے جواب ملا۔

"اوہ! اس کا مطلب ہے مجھے اب اس منحوس عورت سے شادی کرنی ہی پڑے گی۔" آدمی نے مایوس ہو کر کہا۔

(الماس تنویر۔۔۔ ہزارہ)

وجہ

ایک بہت بڑے بوتیک میں سیلزمین کو ہدایت کی گئی کہ گاہک کوئی چیز خریدے بغیر چلا جائے تو رجسٹر میں اس کی وجہ تحریر کی جائے۔

ایک دن ایک خاتون بہت دیر تک سیاہ رنگ کے مختلف لباس دیکھتی رہیں مگر خریدے بغیر چلی گئیں۔ سیلزمین بہت دیر تک سوچتا رہا کہ کیا وجہ لکھے۔ آخر کار اس نے لکھا۔

"خاتون نے بہت سے لباس دیکھے مگر کوئی خریدا نہیں۔ وجہ غالباً یہی ہوگی کہ ابھی خاتون کے شوہر کا انتقال نہیں ہوا ہے۔"

(رشیدہ بتول۔۔۔ اورنگی ٹاؤن)

شوہر

ایک خاتون ہر وقت اپنے شوہر سے لڑتی جھگڑتی رہتی تھی۔ اس کی چیخ و پکار سے پڑوسیوں کی زندگی عذاب بنی ہوئی تھی۔ ایک مرتبہ ایک صاحب ان کے پڑوسیوں کے پاس گئے اور ان سے کہا۔ "آپ کے پڑوس میں رہنے والی خاتون اس قدر بدتمیز اور جھگڑالو ہے۔ ہر وقت شور ڈالے رکھتی ہے۔ آپ اسے سمجھاتے کیوں نہیں؟"

"آپ ان کے پڑوسی ہیں؟" پڑوسی نے پوچھا۔

"نہیں، میں اس کا شوہر ہوں۔" صاحب نے جواب دیا۔

(بینا عابد۔۔۔ کورنگی)

منصوبہ بندی

پاکستان اور پڑوسی دشمن فوجیں اپنے اپنے محاذ پر جمی ہوئی تھیں۔ کافی دن گزر گئے اور کوئی فائر نہ ہوا۔ پاکستانی فوجیوں نے سوچا کہ مزا نہیں آرہا، ایسا کرتے ہیں۔ انہیں پکار کر مارتے ہیں۔ چنانچہ پاکستانی کمانڈر نے آواز لگائی۔

"جھندر سنگھ کھڑا ہو جائے۔"

جھندر سنگھ کھڑا ہو گیا تو پاکستانی فوجی نے اسے گولی ماردی۔ دوسرے دن آواز لگائی۔

"دھرمندر سنگھ کھڑا ہو جائے۔"

دھرمندر سنگھ کھڑا ہوا اور دوسرے ہی لمحے مارا گیا۔

اگلے دن دشمن نے ان کے طریقے پر عمل کر کے بدلہ لینا چاہا۔ انہوں نے آواز لگائی۔

"محمد علی کھڑا ہو جائے۔"

محمد علی کھڑا نہیں ہوا، بلکہ اس نے اپنی پوزیشن سے ہی آواز لگائی۔

"مجھے کس نے پکارا؟"

پکارنے والا سربجیت سنگھ کھڑا ہوا۔ محمد علی نے گولی چلادی۔

(ترنم اعجاز۔۔۔ گلستان جوہر)

سادگی

ایک مشہور فلمی ہیرو نے نئی اور قدرے شرمیلی ہیروئن پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کی اور اسے متاثر کرنے کے لیے گمبھیر لہجے میں بولا۔

"میں بہت سنجیدہ انسان ہوں، تم سے محبت کرتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ تم میرے بچوں کی ماں بنو۔"

"کتنے بچے ہیں آپ کے؟" نئی اداکارہ نے شرماتے ہوئے پوچھا۔

(فوزیہ سعید۔۔۔ کراچی)

اطمینان

ایک دبلی پتلی بیوی نے اپنے پیٹو شوہر کو ایک دعوت میں بریانی کی آٹھویں پلیٹ بھر کر لاتے دیکھا تو شرمندہ ہو کر بولی۔

"آپ کو خیال نہیں آتا کہ لوگ آپ کو دیکھیں گے تو کیا کہیں گے؟"

"نہیں بیگم! مجھے بھلا کوئی کیوں کہے گا۔" شوہر نے اطمینان سے جواب دیا۔ "میں تو انہیں یہ بتا کر کھانا لا رہا ہوں، میری بیوی منگوا رہی ہے۔"

(سمیرا بشیر۔۔۔ گلشن اقبال)

دس سال

ایک فلمی اداکارہ کسی رسالے میں اپنا انٹرویو پڑھ کر بری طرح غصہ کر رہی تھی۔ "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ان نو عمر لڑکوں کو صحافی کون بنا دیتا ہے۔ بھلا بتاؤ۔۔۔ میں نے اسے اپنی عمر بیس برس بتائی تھی۔ اس نے تیس برس لکھ دی۔"

اداکارہ کا شوہر کافی دیر سے اس کی جھنجلاہٹ دیکھ رہا تھا۔ اکتا کر بولا۔ "بیگم! اب اتنے غصے والی بات بھی نہیں ہے۔۔۔ اب بھی اس نے دس سال کم ہی لکھی ہے۔"

(پروین اختر۔۔۔ گلستان جوہر)

پسندیدہ ہیرو

دوسری جماعت کے ٹیچر نے بچوں سے پسندیدہ ہیرو پر مضمون لکھنے کو کہا۔ ایک صاحب کو یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ ان کے بچے نے اپنے والد پر مضمون لکھا ہے۔ انہوں نے اپنے بچے کی نظر میں خود کو بہت اہم محسوس کر کے بچے سے پوچھا۔ "بیٹا! تم نے اپنے پسندیدہ ہیرو کے طور پر مجھے ہی کیوں چنا؟"

"پاپا! مجھے معمر رانا لکھنا نہیں آتا نا۔" بچے نے معصومیت سے جواب دیا۔

(شگفتہ فیاض۔۔۔ مشی گن امریکا)

شگفتہ جاہ

ہاتھوں سے خوشبو آئے

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"آدمی اسی کے ساتھ ہوگا جس کے ساتھ اس کی محبت ہوگی۔" (بخاری، مسلم)

ایک اور روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ آدمی کچھ لوگوں سے محبت کرتا ہے، حالانکہ وہ ان سے ملا نہیں (یعنی ان کے ہم رتبہ نہیں)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"آدمی ان کے ساتھ ہوگا جن سے وہ محبت کرتا ہوگا۔"

فوائد و مسائل:۔

1۔ اس میں اہل خیر و صلاح کے ساتھ محبت رکھنے کی فضیلت کے علاوہ اللہ کے فضل و کرم کا بھی بیان ہے کہ وہ ان سے محبت رکھنے کی وجہ سے کم مرتبہ لوگوں کو بھی بلند تر درجوں پر فائز کرکے محبوبین کے ساتھ ملا دے گا۔

2۔ اس میں یہ ترہیب ہے کہ برے اور بدکردار لوگوں کے ساتھ خصوصی تعلق اور محبت نہایت خطرناک ہے کہ کہیں انسان کا حشر ان ہی کے ساتھ نہ ہو۔

قصیدہ لامیہ،

امام بیہقی انس بن مالک سے بیان کرتے ہیں کہ ایک دیہاتی آیا اور عرض کیا۔

"اے اللہ کے رسول! ہم آپ کے پاس آئے ہیں اور حالت یہ ہے کہ ہمارے اونٹ (بارش نہ ہونے کی وجہ سے) کمزور ہو گئے اور بچے کھانے پینے سے محروم ہو گئے اور اس نے یہ اشعار پڑھے۔

"ہم آپ کے پاس آئے اس حال میں کہ اونٹنی کے پستان سے خون نکل رہا ہے اور شیر خوار بچے کی ماں اپنے بچے سے غافل ہو گئی ہے۔"

"بچے کو بھوک سے کمزور ہو جانے کی وجہ سے نوجوان دونوں ہاتھوں کا سہارا دے کر کھڑا کرتا ہے اور وہ خود اک نہیں دے پاتا ہے۔"

"ہمارے پاس کوئی چیز نہیں ہے جسے لوگ کھائیں، سوائے کڑوا کسیلا پھل اور سڑے ہوئے کھانے کے، جس میں نقصان ہی نقصان ہے۔"

"اور آپ کے پاس آنے کے سوا ہمارے لیے کوئی راستہ نہیں ہے اور رسولؐ کے علاوہ امت کے لیے راستہ ہی کہاں ہے۔"

یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی چادر گھسیٹتے ہوئے منبر پر تشریف لائے اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد اپنے ہاتھوں کو آسمان کی طرف اٹھا کر یہ دعا فرمائی۔

"اے اللہ! ہمیں بارش عطا فرما مدد کرنے والی، خوشگوار، سبز کرنے والی اور مناسب سیراب کرنے والی، جلدی سے دیر سے نہیں، نفع بخش ہو نقصان دہ نہیں، جس سے جانوروں کے تھن بھر آئیں اور کھیتیاں لہلہا اٹھیں اور زمین مرنے کے بعد زندہ ہو جائے اور اسی طرح سے تم بھی دوبارہ اٹھائے جاؤ گے۔"

انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں:۔ اللہ کی قسم! آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ سینے تک بھی واپس نہیں آیا تھا کہ آسمان جھوم کر برسا، یہاں تک کہ لوگ یہ پکارتے ہوئے آئے۔

"اے اللہ کے رسولؐ! ہم غرق ہو گئے، غرق ہو گئے۔"

چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دونوں ہاتھوں کو آسمان کی طرف اٹھا کر یہ دعا کی۔

"اے اللہ! ہمارے ارد گرد برسا، ہمارے اوپر نہ برسا۔"

دعا کرتے ہی بادل مدینہ سے چھٹ گیا اور مدینہ کو تاج کی طرح گھیر لیا۔ یہ دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہنس پڑے جس کی وجہ سے آپؐ کے آگے والے دانت ظاہر ہو گئے۔ پھر آپؐ نے فرمایا۔

"خوبی اللہ ہی کے لیے ہے۔ ابو طالب نے کیا خوب کہا ہے، اگر وہ زندہ ہوتے تو ان کی آنکھوں کو (اپنے اشعار سن کر) ٹھنڈک پہنچتی۔ کون ان کے اشعار سنائے گا؟"

یہ سن کر علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کھڑے ہوئے اور عرض کیا۔ "شاید آپ صلی اللہ علیہ وسلم ابو طالب کے اشعار سننے کی خواہش رکھتے ہیں۔" انہوں نے اس قصیدہ کے کچھ اشعار سنائے۔

"ان کا رنگ گورا ہے۔ وہ یتیموں اور بیواؤں کے حامی ہیں۔ ان کے چہرے سے بارش کا فیضان طلب کیا جاتا ہے۔"

"آل ہاشم کے فقرا ان کے ذریعے پناہ پاتے ہیں اور وہ ان کے پاس نعمت اور خوش حالی میں ہیں۔

بیت اللہ کی قسم تم جھوٹے ہو کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہلاک کر دیے جائیں گے اور (اس بات میں بھی جھوٹے ہو کہ) ہم ان کی طرف سے قتال نہ کریں گے اور نہ ہی مقابلہ کریں گے۔

"بلکہ ہم انہیں تمہارے حوالے نہیں کریں گے۔ یہاں تک کہ ہم ان کے ارد گرد پچھاڑ دیے جائیں اور ہم اپنی اولاد اور بیویوں کو (آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جان بچانے کی خاطر) بھول جائیں گے۔

واقعہ یہ ہے کہ قبیلہ قریش اس معاہدے پر متفق ہو گئے کہ جب تک بنو ہاشم اور بنو مطلب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے حوالے نہ کر دیں، تب تک نہ تو انہیں پناہ دیں گے، نہ ان سے شادی بیاہ کریں گے اور نہ ہی ان سے خرید و فروخت کریں گے۔ چنانچہ بنو ہاشم اور بنو مطلب کے تمام افراد خواہ وہ کافر ہوں یا مسلمان، سب کے سب شعب ابی طالب میں داخل ہو گئے اور انہوں نے یہ عہد کیا کہ تادم حیات محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ باقی رہیں گے۔ اسی بائیکاٹ کے زمانہ میں ابو طالب نے یہ لامیہ قصیدہ کہا تھا۔

فصاحت،

ایک روز حضرت امام حسنؓ اپنے گھر میں تشریف فرما تھے کہ ایک شخص آپ کے پاس آیا۔ ضرورت مند تھا لہٰذا آپ سے صدقہ کا سوال کیا۔

امام حسن کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ بالکل خالی ہاتھ تھے لیکن صاف انکار کرتے ہوئے آپؓ کو حجاب آیا۔ آپؓ نے کہا۔

"کیا میں تم کو ایسی بات نہ بتاؤں، جس میں ثواب بھی ہے اور فائدہ بھی۔"

وہ بولا۔ "فرمائیے۔"

امام حسنؓ نے ارشاد فرمایا۔ "خلیفہ کے پاس جاؤ۔ اس کی بیٹی کا انتقال ہو گیا ہے۔ اس کی خدمت میں اچھی سی تعزیت پیش کرو۔"

اس آدمی نے کہا۔ "بتائیے کیا کہوں جا کر؟"

انہوں نے فرمایا۔ "اس سے کہنا وہ خدا سزاوار ستائش ہے جس نے اپنی بندی کو اپنے پاس بلا لیا اور آپ کو اس کی قبر پر آنے اور فاتحہ پڑھنے کا موقع دیا اور اسے یہ غم نہ دیا کہ وہ زندہ رہتی اور آپ کی قبر پر آ کر بیٹھتی۔"

وہ آدمی سیدھا خلیفہ کے پاس گیا اور تعزیت میں یہی الفاظ کہے۔

یہ الفاظ سن کر خلیفہ کا غم ہلکا ہو گیا اور اس نے اسے انعام مرحمت فرمایا پھر کہا۔

"سچ کہنا یہ الفاظ تمہارے ہی ہیں؟"

وہ بولا۔ "نہیں حضرت امام حسنؓ کے ہیں۔"

خلیفہ نے کہا۔ "سچ ہے وہ فصاحت کا معدن ہیں۔" خلیفہ نے اس آدمی کی سچائی پر پھر اسے انعام مرحمت فرمایا۔

خالدہ جیلانی

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ

ساجی عاصم ـــــــــــ ٹنڈو آدم

اب تو قسمت ہی اس سے ملادے تو ملادے محسن
وہ تو ہم سے بچھڑا ہے بارش میں پرندوں کی طرح

سیدہ لوبا سجاد ـــــــــــ کہروڑ پکا

یہ کیا کہ سانسیں اکھڑ گئی ہیں سفر کے آغاز میں ہی یارو
کوئی بھی تھک کر نہ راستے میں نڈھال ہوگا یہ طے ہوا تھا
جدائیوں میں نہ قربتوں کا ملال ہوگا یہ طے ہوا تھا
محبتوں میں ہر اک لمحہ وصال ہوگا یہ طے ہوا تھا

ندا، فضہ ـــــــــــ کراچی

ورق ورق پہ تیری عبادت تیرا افسانہ تیری حکایت
کتاب ہستی جہاں سے کھولی تیری محبت کا باب نکلا

زوباریہ خالد ـــــــــــ لاہور

درجہ بندی دیکھی جائے تو ہمارا یار اول ہے
روٹھ جانے میں، دل جلانے میں اور بھول جانے میں

صومیہ نذیر ـــــــــــ ہری پور ہزارہ

بے نور ہو چلی ہے بہت شہر کی ہوا
تاریک راستوں پہ کہیں کھو نہ جائیں ہم
اس کے بغیر آج بہت جی اداس ہے
محسن چلو کہیں سے اسے ڈھونڈ لائیں ہم

عائشہ، تحریم ـــــــــــ گوجرہ

وہ اداس دھوپ سمیٹ کر کہیں وادیوں میں چل دیے
اے میرے دل تو نہ دے صدا جو گزر گئے، سو گزر گئے
یہ سفر کتنا طویل ہے، یہاں وقت کتنا قلیل ہے
کہاں لوٹ کر کوئی آئے گا جو گزر گئے سو گزر گئے

بشریٰ باجوہ ـــــــــــ اوکاڑہ

آج ہماری خاک پہ دنیا رونے دھونے بیٹھی ہے
پھول ہوئے ہیں جانے کیسے اتنے سستے برسوں بعد
بھول بھی جاؤ کس نے توڑا، کیسے توڑا، کیوں توڑا
ڈھونڈ رہے ہو کیا گلیوں میں دل کے ٹکڑے برسوں بعد

سعیدہ ـــــــــــ مستالہ گوجر خان

تو میری زندگی ہے مگر جان من
اب وہ عشق و محبت کی رسمیں نہیں
میرے دل میں کئی گھاؤ ایسے بھی ہیں
جن کا درماں تیری دسترس میں نہیں

حمنہ جٹ ـــــــــــ عبدالحکیم

میری بے بسی، میری التجا، میری ضبط آہ پہ کر نظر
اسے مسکرا کر نہ ٹال دے میری زندگی کا سوال ہے

نوشین اقبال نوشی ـــــــــــ گاؤں بدو مرجان

ہے گزارنا مجھے وقت کو، ہے سنوارنا مجھے بخت کو
کبھی خوف ہے مجھے موت کا، کبھی زندگی کا وبال ہے
وہ چلا گیا مجھے چھوڑ کر مگر اپنی یاد بھی دے گیا
میں کھڑی ہوں کیسے مقام پر نہ فراق ہے نہ وصال ہے

خنسا جٹ ـــــــــــ عبدالحکیم

سبب جو ڈھونڈو گے تو عمر ہی بیت جائے گی
کہا نا یاد آتے ہو تو بس آتے ہو

شفق راجپوت ـــــــــــ گوجرہ

شب کی تنہائی میں اب تو اکثر
گفتگو تجھ سے رہا کرتی ہے
دل کو اس راہ پہ چلنا ہی نہیں
جو مجھے تجھ سے جدا کرتی ہے

شمع مسکان ـــــــــــ جام پور

تیرے وعدوں ہی پہ کب تک میرا دل فریب کھائے
کوئی ایسا کر بہانہ میری آس ٹوٹ جائے

ماریہ الماس ـــــــــــ ہارون آباد

محبتیں نہ بھلا میری نہ طویل ہجر کی رات کر!
کبھی بھول کر یہ عداوتیں، کسی شام کوئی بات کر

مان جٹ ـــــــــــ عبدالحکیم

نجانے کتنی شکایتیں تھیں، نہ جانے کتنے گلے تھے ان سے
جو ان کو دیکھا تو بھول بیٹھے، سوال سارے، جواب سارے

ارم کمال ـــــــــــ فیصل آباد

کہاں ہے ارض و سما کا خالق کہ چاہتوں کی رگیں کریدے
ہوس کی سرخی رخ بشر کا حسین غازہ بنی ہوئی ہے
کوئی مسیحا ادھر بھی دیکھے کوئی تو چارہ گری کو اترے
افق کا چہرہ لہو میں تر ہے زمیں جنازہ بنی ہوئی ہے

بیگم ظفر چودھری ـــــــــــ خانیوال

سمندر کے سفر میں اس طرح آواز دے ہم کو
ہوائیں تیز ہوں اور کشتیوں میں شام ہو جائے
اجالے اپنی یادوں کے ہمارے ساتھ رہنے دو
نجانے کس گلی میں زندگی کی شام ہو جائے

ارم احمد ـــــــــــ لاوہ

جنوں میں شوق کی گہرائیوں سے ڈرتا رہا
میں اپنی ذات کی سچائیوں سے ڈرتا رہا
محبتوں سے شناسا ہوا میں جس دن سے
پھر اس کے بعد شناسائیوں سے ڈرتا رہا

شازیہ فاروق احمد ـــــــــــ خان بیلہ محمد آباد

مخلص ہوں میں دشمن پر بھی کرتا ہوں بھروسا
تاعمر مجھے جینے کے آداب نہ آئے

صفیہ کوکب گوندل ـــــــــــ اسلام آباد

سب عکس ادھورے ہیں کہ سب آئینے جھوٹے
زخمی ہے بدن اور مسیحا نہیں ملتا

نمرہ، اقرا ـــــــــــ کراچی

کبھی یوں ملیں کوئی مصلحت کوئی خوف دل میں ذرا نہ ہو
مجھے اپنی کوئی خبر نہ ہو، تجھے اپنا کوئی پتا نہ ہو
تیرے اختیار میں کیا نہیں، مجھے اس طرح سے نواز دے
یوں دعائیں میری قبول ہوں میرے لب پہ کوئی دعا نہ ہو

سحر خان ـــــــــــ کوئٹہ

مجھے خبر نہ ہوئی کیا تلاش تھی اس کی
جو میری ذات کے صفحے پلٹ گیا یونہی

ارم کمال ـــــــــــ فیصل آباد

رات اندھیری تھی ڈر بھی سکتے تھے
ہم جو کہتے، وہ کر بھی سکتے تھے
بچھڑتے وقت تم نے یہ بھی نہ سوچا
ہم تو پاگل تھے، مر بھی سکتے تھے

ماریہ سندس ـــــــــــ چکوال

ایسا ہے حال ان دنوں، فرصت حال ہی نہیں
فکر سخن تو اک طرف، وقت خیال ہی نہیں
رشتہ جاں کو توڑ کے، شاخ شجر کو چھوڑ کے
کیسے ہیں پھول بے زباں ان کو ملال ہی نہیں

عدیلہ، مصباح ـــــــــــ لیہ

کنارا کر کے رشتوں سے وفائیں ہار کے محسن
محبت کی حقیقت کو جواب تجھے تو کیا سمجھے

ساجی عاصم ـــــــــــ ٹنڈو آدم

رات گہری تھی ڈر بھی سکتے تھے
ہم جو کہتے تھے، وہ کر بھی سکتے تھے
وہ جو بچھڑے تو یہ بھی نہ سوچا
ہم تو پاگل تھے مر بھی سکتے تھے

ندا، فضہ ـــــــــــ فیصل آباد

نگاہ عشق کا عجب ہی مشغلہ دیکھا
اسے ہی دیکھنا چاہیں جسے بے پناہ دیکھا

جویریہ کبیر ـــــــــــ ڈیرہ غازی خان

بھیگا کھڑا ہے مدت میں سوگوار دل
دھند کی صورت اداسیاں اترتی جاتی ہیں

آمنہ اجالا ـــــــــــ ڈہرکی

ہنسے تو آنکھ سے آنسو رواں ہمارے ہوئے
کہ ہم پہ دوست بہت مہرباں ہمارے ہوئے
کہیں تو آگ لگی ہے وجود کے اندر
کوئی تو دکھ ہے کہ چہرے دھواں ہمارے ہوئے

سندھو اجن ـــــــــــ سانگھڑ

کہاں یہ بس میں کہ ہم خود کو حوصلہ دیتے
یہی بہت تھا کہ غم پہ مسکرا دیتے
ہوا کی ڈور الجھتی جو انگلیوں سے کبھی
ہم آسمان پہ تیرا نام تک سجا دیتے



شاعری سچ بولتی ہے

سادیہ چوہدری

شاعری ایک ایسا خوبصورت اظہار جس پہ لکھنے والوں نے بہت کچھ لکھا اور اک اک لفظ سچ لکھا۔ مجھے پنجابی شاعری بہت پسند ہے۔ خصوصاً بابا بلھے شاہ کا کلام۔ چند اشعار آپ کی نذر بھی کرتی ہوں۔

ہیرے سستے مُل دے ویکھے
لعل تریکڑی وچ تولدے ویکھے
کوئی کسے نال پیار نئی کردا
دل دُنیا وچ رُلدے ویکھے
رنگ برنگی دُنیا ویکھی
کئی کئی رنگ اک پھل دے ویکھے
تو رُل گیا تے تاں کی ہویا بلھیا
اساں تے شاہ وی گلیاں وچ رُلدے ویکھے

کہتے ہیں عشق سچا ہو تو انسان شہادت پاتا ہے مگر یہ ملتا بھی نصیب والوں کو ہے جو اپنی نیتوں سے کھوٹ نکال دیں۔ نفس کو مار دیں۔ اس پہ بھی بابا بلھے شاہ کا کلام ہے۔

رب رب کر دے بڈھے ہو گئے مُلاّ پنڈت سارے
رب دا کھوج کھرا نہ لبھا سجدے کر کر ہارے
رب تاں تیرے اندر وسدا وچ قرآن اشارے
بلھیا رب تاں اونوں ملدا جیہڑا نفس اپنے نوں مارے

اور محمد بخش کہتے ہیں۔

مالی دا کم پانی لانا بھر بھر مشکاں پاوے
تے مالک دا کم پھل پُھل لانا لاوے یا نہ لاوے

آپ بور تو نہیں ہو گئے۔ چلیے آپ کو اُردو شاعری کی طرف لے آتے ہیں۔ اُردو شاعری میں مجھے محسن نقوی، احمد فراز، منیر نیازی، فرحت عباس شاہ، وصی شاہ، اعتبار ساجد اور امجد اسلام امجد بہت پسند ہیں۔ احمد فراز کی یہ غزل میری پسندیدہ ہے۔

لو اپنا جہاں دُنیا والو
ہم یہ دُنیا چھوڑ چلے

جو رشتے ناتے ہم نے جوڑے تھے
وہ رشتے ناتے توڑ چلے

کچھ سکھ کے سپنے دیکھ چلے
کچھ دُکھ کے سپنے جھیل چلے

تقدیر کی اندھی گردش تے
کھیل جو کھیلے، کھیل چلے

اب دوش نہ دینا اے لوگو!
دیکھو تو ہم خالی ہاتھ چلے

تیری ہر چیز کو ٹا دی ہم نے
لے کر کچھ نہ ساتھ چلے

اُس پار نجانے کیا ہو گا فرازؔ
اس پار تو سب کچھ ہار چلے

وقت کا ہر لمحہ تبدل و تغیر کا پیغام بر ہے۔ وقت بدلے تو بہت کچھ بدل جاتا ہے۔ محسن نقوی اسی تبدیلی کی بات کر رہے ہیں۔

ہم یوسفِ زماں تھے، ابھی کل کی بات ہے
تم ہم پہ مہرباں تھے ابھی کل کی بات ہے

ہم ہی تیری زبان پر تھے
موضوعِ داستاں تھے ابھی کل کی بات ہے

اے کاروانِ انقلاب و گل تم کو یاد ہو
ہم میرِ کارواں تھے، ابھی کل کی بات ہے

جن دوستوں کی کمی ہے آج حیات میں
وہ اپنے درمیان تھے ابھی کل کی بات ہے

کچھ حادثوں سے گر گئے محسنؔ زمین پہ ورنہ
ہم رشکِ آسماں تھے ابھی کل کی بات ہے

عشق میں دن اور رات محبوب کی یادوں سے مہکتے ہیں۔ وصی شاہ نے اسی کیفیت کو زبان دی ہے۔

ے میری آنکھوں سے اس لیے لالی نہیں جاتی
تیری یادوں سے جو کوئی رات خالی نہیں جاتی

تو جان بھی مانگے گا تو ہنس کے دے دیں گے تجھے
تیری تو کوئی بات میری جان ٹالی نہیں جاتی

کوئی آئے آکے تیرے یہ درد سنبھالے وصیؔ
ہم سے تو یہ جاگیر سنبھالی نہیں جاتی

ہمراہ تیرے جو پھول کھلاتی تھی دل میں
اب شام وہی کبھی درد سے خالی نہیں جاتی

ہم جان سے جائیں گے تبھی بات بنے گی
تم سے تو کوئی راہ نکالی نہیں جاتی

یہ ضروری نہیں عشق اسی سے ہو جو حسن کا پیکر ہو۔ اک لازوال داستان "لیلیٰ مجنوں" کی بھی ہے۔ لیلیٰ رنگ کی کالی تھی اور مجنوں "قیس" جو کہ بادشاہ کی اولاد تھا، اس کے پیچھے پاگل ہوا اور ایسا ہوا کہ اس کی ایک جھلک کے لیے بھیک مانگتا پھرتا تھا۔

بابا بلھے شاہ کہتے ہیں۔

کیتا سوال میاں مجنوں نوں
تیری لیلیٰ رنگ دی کالی اے
دیتا جواب میاں مجنوں نے
تیری اکھ نہ ویکھن والی اے
قرآن پاک دے ورق چٹے
اُتے لکھی سیاہی کالی اے
چھڈ دے بلھیا دل دے جھیڑیا
تے کی گوری تے کی کالی اے

پس یہی کچھ فرحت عباس شاہ نے بیان کیا ہے کہ

ے اُداس شامیں اُجاڑ رستے کبھی بلائیں تو لوٹ آنا
کسی کی آنکھ میں رت جگوں کے عذاب آئیں تو لوٹ آنا

ابھی نئی وادیوں نئے منظروں میں رہ لو مگر میری جاں
یہ سارے اک اک کر کے جب تم کو چھوڑ جائیں تو لوٹ آنا

نئے زمانوں کا کرب اوڑھے ضعیف لمحے، نڈھال یادیں
تمہارے خوابوں کے بند کمروں میں لوٹ آئیں تو لوٹ آنا

اگر اندھیروں میں چھوڑ کر تم کو بھول جائیں تمہارے ساتھی
اور اپنی خاطر ہی اپنے دیے جلائیں تو لوٹ آنا

میری وہ باتیں تو جن پہ بے اختیار ہنستا تھا کھل کھلا کر
بچھڑنے والے مری وہ باتیں تجھے کبھی رلائیں تو لوٹ آنا

میرا انتخاب کیسا لگا، ضرور بتائیے گا۔ اگر شعاع کی بزم میں اسے جلوہ افروز کیا گیا تو؛ اگر اتنی کرم نوازی ہو گئی تو ہم تہہ دل سے مشکور رہیں گے شعاع کے۔ اپنی آرا سے ضرور آگاہ کیجیے گا۔ میرا نام سادیہ چوہدری ہے۔ گجرات شہر کے گاؤں ڈوگہ دولت نگر سے تعلق ہے میرا۔ شاعری اور عشق دونوں میرا جنون ہیں اور خصوصاً یہ جنون بابا بلھے شاہ اور وارث شاہ کے کلام سے ہے۔ آپ کو کیسا لگا۔ میں آپ کی آرا کا انتظار کروں گی۔ خوش رہیں خوشیاں بانٹیں۔ ایسے جئیں کہ دُنیا مثال دے فخر کرے اور مریں تو آپ کا نام امر رہے۔ قابلِ رشک ہو۔ دُنیا ابد تک آپ کو یاد کرے۔ آپ نہ ہوں تو دُنیا ویران لگے۔ بقول شاعر۔

ے بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رُت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

امتہ الصبور

تاریخ کے جھروکوں سے

یہ لڑکی نور عنایت کون تھی

نور عنایت کا دوسری عالمی جنگ میں فرانس میں اپنے فرائض انجام دیتے ہوئے نازیوں کی زد میں آگئی اور بالآخر ان کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتر گئی۔ اس وقت اس کی عمر تیس سال تھی۔ اسے جارج کراس کا تمغہ تو پہلے ہی مل چکا ہے۔ اب خبر یہ ہے کہ لندن کے گولڈن اسکوئر میں اس کا مجسمہ نصب کیا جائے گا۔ 18 نومبر کو یہ تقریب ہوگی اور پرنسز این اس کی نقاب کشائی کریں گی۔

نور عنایت کون تھی؟

وہ ایک بزرگ عنایت خاں کی صاحبزادی تھی۔ یہ بزرگ صوفیا کے کسی سلسلے سے منسلک تھے اور یہ کہ یہ بہت خاموش لڑکی تھی اور فرانس میں جنگی مشن پر جانے سے پہلے وہ اپنے گھر کے قریب کے پارک میں بینچ پر بیٹھی کتاب کے مطالعہ میں غرق نظر آتی تھی۔

یہ بی بی اصل میں سلطان ٹیپو کی نواسی تھی۔ شعرو افسانے سے اسے بہت شغف تھا۔ کہانیاں لکھتے پڑھتے اسے مہاتما بدھ کی جاتکوں تک رسائی ہو گئی۔ اور ان جاتکوں سے اسے اتنا شغف ہوا کہ اس نے منتخب جاتکوں کو انگریزی میں منتقل کر کے ایک مجموعہ مرتب کر ڈالا۔

جاتکوں کا یہ انگریزی مجموعہ ان کے ہاتھ لگ گیا۔ پھر اس کے بارے میں لکھی گئی، ایک کتاب بھی نظر سے گزری۔ اس طرح اس بی بی کی تفصیلات ان کے علم میں آئیں۔ انہوں نے ہم سے اس قصے کا ذکر کیا۔ ہم نے کہا کہ سبحان اللہ، سلطان ٹیپو شہید کا مہاتما بدھ سے کہاں جا کر اور کس رنگ سے ٹانکا ملا ہے۔ ارے اس مجموعہ کو اردو میں ڈھالو اور اس قصے کو قلمبند کرو۔ سو انہوں نے یہ کام جھٹ پٹ انجام دیا۔ اب وہ مجموعہ زیر طباعت ہے۔ مگر کراچی میں اس کی اشاعت سے پہلے ہی اس کی تعارفی تقریب ہو گئی، جہاں ہم بھی موجود تھے۔

سلطان ٹیپو کی شہادت کے بعد باقی اولاد پر جو گزری وہ قصہ الگ ہے۔ مگر سلطان کی ایک بیٹی بھی تھی، جو اس وقت چودہ برس کی تھی۔ سلطان شہید کے دو وفادار خادموں نے خفیہ طریقے سے محل سے اسے نکالا اور سر رنگاپٹم سے میسور لے گئے۔ وہاں اس کی اس احتیاط کے ساتھ پرورش ہوئی کہ کسی کو اس کے حسب نسب کا پتا نہ چلا۔

وہاں ایک نامور موسیقار کا گزر ہوا، جسے راجا کے دربار سے بہت انعام و اکرام ملے۔ کسی صورت اس لڑکی کی شادی اس موسیقار سے ہو گئی، جس کا نام مولا بخش تھا۔ مولا بخش کو جب اصل صورت حال کا پتا چلا تو وہ میسور سے نکلا اور بڑودہ میں آن بسا۔ وہاں اس نے جو موسیقی کی ایک تربیت گاہ قائم کی تو اس تربیت گاہ میں پنجاب کے ایک نوجوان رحمت علی خاں نے داخلہ لے لیا۔

ادھر مولا بخش کے یہاں ایک بیٹی پیدا ہو چکی تھی اور اب اچھی خاصی بڑی ہو گئی تھی۔ اس لڑکی کی، سمجھ لیجیے کہ ٹیپو سلطان کی نواسی خدیجہ بی بی کی شادی رحمت علی خاں سے ہو گئی۔ خدیجہ بی بی کی جلدی ہی گود ہری ہوئی اور وہ ایک بیٹے کی ماں بن گئی۔ اس بیٹے کا نام عنایت خاں تھا۔ اس نے موسیقی کی تعلیم باپ سے لی اور تصوف میں فیض سید ہاشم مدنی نام کے ایک بزرگ سے حاصل کیا۔

یہ 1910ء کی بات ہے کہ عنایت خاں امریکا چلے گئے۔ وہاں موسیقی کے چکر میں ایک نوجوان خاتون سے ملاقات ہوئی جو ان پر ریجھ گئی۔ جلد ہی شادی بھی ہو گئی۔ جلد ہی ان کے یہاں ایک بیٹی پیدا ہوئی جس کا نام نور النساء رکھا گیا۔ یہی نور النساء آگے چل کر نور عنایت خاں کے نام سے جانی گئی۔

نور عنایت خاں کو انگریزی اور فرانسیسی دونوں زبانوں میں بہت مہارت تھی۔ دوسری عالمی جنگ کے زمانے میں وہ لندن میں تھی۔ عنایت خاں تو صوفی مست بن کر دلی چلے گئے تھے۔ وہیں مرکز نظام الدین اولیا کی درگاہ میں جگہ پائی۔

نور کی تربیت تو صوفیانہ فضا میں ہوئی تھی۔ مزاج بھی صوفیانہ ہی پایا تھا۔ مگر جنگ کے زمانے میں اسے فوجی جاسوسی کے ادارے میں کام کرنا پڑا۔ اس ادارے نے اسے ایک خاص مشن پر فرانس بھیج دیا، جو اس وقت نازیوں کے تصرف میں تھا۔ وہاں اس نے اپنے فرائض بڑی جانفشانی سے انجام دیے۔ مگر ایک وطن فروش فرانسیسی جاسوس نے نازیوں سے اس کی جاسوسی کی۔ یوں وہ نازیوں کی قید میں آگئی۔ مگر جبرو تشدد کے باوجود اپنے فرانسیسی ساتھیوں کا پتا بتانے اور باقی رازوں سے پردہ اٹھانے سے صاف انکار کر دیا۔ پھر جرمن گسٹاپو اسے زندہ کیسے چھوڑ دیتی۔ موت کے گھاٹ اتر گئی۔

قصہ کہانی سے جو نور کو شغف تھا، اسی کے زیر اثر اس نے بچوں کے لیے کہانیاں لکھیں، جو مقبول ہوئیں۔ شاید اسی حوالے سے اس کا تعارف مہاتما بدھ کی جاتک کہانیوں سے ہوا اور ان کہانیوں نے اس طرح اس کے دل میں گھر کیا کہ پھر اس نے ان کہانیوں سے اپنی پسند کا ایک انتخاب کیا۔ انہیں انگریزی زبان کا جامہ پہنایا۔ یہ مجموعہ 1939ء میں لندن سے شائع ہوا۔

نور النساء نے باپ سے جو تصوف کی تعلیم پائی تھی، شاید یہ اس کا اثر تھا کہ جاتک کتھاؤں سے اسے اتنا شغف ہو گیا اور بدھ تعلیمات میں اسے بہت معنی نظر آنے لگے۔ اس کی منتخب جاتکوں میں ایک جاتک ایسی ہے کہ لگتا ہے کہ اپنی زندگی کے آخری آزمائشی زمانے میں وہ گویا اسی رنگ میں بسر کر رہی تھی۔

یہ کتھا اس طرح ہے کہ ایک باغ میں بسر کرنے والے بندر اس طرح گھر گئے تھے کہ وہاں سے بچ کر نکل جانا ان کے لیے محال نظر آ رہا تھا۔ تب اس بندر نے جو ان کا گرو تھا، ان کی نجات کی ایک ترکیب سوچی۔ باغ کی ایک عقبی حد پر ایک گھنا درخت تھا جس کی شاخیں عقب میں بہتی ہوئی گنگا پر دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ دوسرے کنارے پر ایک ایسا ہی گھنا درخت کھڑا تھا، جس کی شاخیں دریا پر پھیلتے پھیلتے اس درخت کے قریب آ گئی تھیں۔ بس بیچ میں تھوڑا اکھانچا رہ گیا تھا۔ گرو بندر نے بندروں سے کہا کہ میں اس طرح پٹ لیٹوں گا کہ میرا سر ادھر کے درخت کی شاخ پر ہو گا اور ٹانگیں گنگا پار کے درخت کے شاخوں پر ہوں گی۔

سب بندروں نے ایسا ہی کیا اور صحیح سلامت گنگا پار اتر گئے۔ مگر ان بندروں میں ایک بندر گرو کی جان کا بیری تھا۔ وہ جان کر اس زور سے اس پر کودا کہ اس کی ہڈی پسلی ایک ہو گئی۔ اتنے بندروں کے گزرنے سے گرو کا حال تو پہلے ہی پتلا ہو گیا تھا۔ اب بیچ مچ اس کی جان پر آ بنی۔ اس نے بس جلدی ہی جان دے دی۔

مہاتما بدھ نے یہ جاتک سنا کے کہا کہ وہ گرو بندر میں تھا۔ میں نے ان کی جان بچاتے بچاتے اپنی جان دے دی۔ خیر! کوئی بات نہیں۔ پھر میں نے بندر کے جنم سے رہائی پائی اور اگلے جنم میں چلا گیا۔

نور النساء نے بھی تو نازیوں کے پھندے میں پھنس کر یہی کیا۔ نازیوں کو اپنے کسی ساتھی کا پتا نہیں دیا۔ ان کے عوض اپنی جان پر کھیل گئی۔

ہندوستان کی ایک خاتون شرابنی باسو نے نور پر ایک پوری کتاب "جاسوس شہزادی" کے عنوان سے لکھی ہے۔ وہاں بتایا گیا ہے کہ جب آخر میں نازیوں نے اس پر ہلہ بولا تو فرانسیسی زبان میں اس نے آزادی کا نعرہ لگایا۔ اس کے ساتھ ہی ایک گولی نے اس کا کام تمام کر دیا نور النساء نے اگر فرانس کی خدمت انجام دی تو یہ اس کی خاندانی روایات کے عین مطابق تھا۔ ٹیپو سلطان نے انگریزوں کے مقابلہ میں فرانس ہی سے تو رفاقت کا رشتہ قائم کیا تھا۔ باقی برطانیہ کی جو خدمت انجام دی اسے تاریخ کی بوالعجبیوں میں شمار کرنا چاہیے۔

(انتظار حسین)

تبصیر نشاط



ری میک

ماضی زندگی کے وہ لمحات ہیں جنہیں اکثر ادیبوں اور شاعروں نے اپنی تخلیقات میں نہایت اہمیت دی ہے۔ کسی نے کہا کہ۔

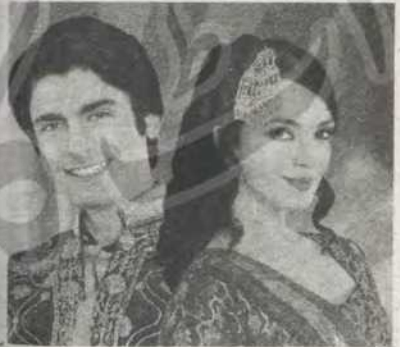
"یاد ماضی عذاب ہے یا رب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا"

تو دوسری جانب کسی نے یہ بھی کہہ ڈالا کہ

"نئے گلابوں کی بات کرتے تو کیسے کرتے
پرانے موسم دلوں کے اندر مہک رہے تھے"

مگر جناب! ہماری فلموں کے لحاظ سے ماضی کو تمام ماہرین نہایت یادگار اور خوش کن قرار دیتے ہیں۔ پرانے اداکاروں کی مثالیں دی جاتی ہیں تو پرانے نغمات آج بھی کانوں میں رس گھولتے محسوس ہوتے ہیں۔ بلکہ بعض کن رسیا تو سنتے ہی صرف پرانی موسیقی ہیں۔ "انجمن اور ارمان" ماضی کی وہ سپرہٹ فلمیں ہیں، جنھوں نے نہ صرف اپنے دور میں مقبولیت کے ریکارڈز توڑے، بلکہ آج کی نسل بھی انہیں سراہتی ہے۔ اسی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے ایک معروف نجی چینل نے ان دونوں فلموں کو نئے سرے سے تیار کیا ہے۔ "انجمن" میں وحید مراد کی جگہ عمران عباس اور رانی کی جگہ سارہ لورین (مونا لیزا) نے کام کیا ہے۔ جبکہ "ارمان" میں وحید مراد کا رول فواد خان اور زیبا کا کردار آمنہ شیخ نبھائیں گی۔ (فلمیں بنا کر یاد تازہ کر رہے ہیں یا لٹیا ڈبو رہے ہیں۔)

سارہ لورین تو اداکارہ رانی کا کردار شاید بخوبی نبھالیں مگر خدشہ ہے کہ فلم بین آمنہ شیخ کو اداکارہ زیبا کے متبادل کے طور پر شاید ہی قبول کر پائیں۔ کیونکہ زیبا اپنی اداکاری سے زیادہ اپنی معصوم شکل کی وجہ سے پسند کی جاتی تھیں۔ "ارمان" کی ہیروئین کا کردار تو ہے بھی ایسا کہ جس میں ہیروئین نہایت مظلوم و مسکین





ہے۔ (پھر تو آمنہ شیخ کے بجائے اس کردار میں اپنے شعیب ملک زیادہ جچیں گے۔)

اگر یہ فلمیں کامیاب رہتی ہیں تو یہ چینل مزید فلمیں بنانے کا بھی ارادہ رکھتا ہے۔ (پرانے فلم سازو! اپنی اپنی فلمیں بچاؤ)

واپسی

خوب صورت اداکارہ صاحبہ نے گو زیادہ فلموں میں کام تو نہیں کیا۔ لیکن آج بھی لوگوں نے انہیں یاد رکھا ہوا ہے۔ شادی کے بعد وہ شوبز کو خیرباد کہہ گئیں۔ مگر اپنے شوہر جان ریمبو کو دیکھ دیکھ کر ان کے دل سے شوق اداکاری دور نہ ہو سکا۔ لہٰذا انہوں نے کچھ منتخب ڈراموں میں کام کیا اور مارننگ شو بھی کیا۔ اب سننے میں آیا ہے کہ وہ مارننگ شو سے اکتا چکی ہیں اور اس سے کنارہ کشی کے لیے پر تول رہی ہیں۔

ادکار شان نے ان کا ارادہ بھانپ لیا اور جھٹ انہیں ایک فلم کی پیش کش کر ڈالی۔ ادھر صاحبہ تو جیسے کسی اچھی پیش کش کے انتظار میں تھیں۔ سو فوراً قبول بھی کر ڈالی۔ یوں اب وہ دوبارہ سلور اسکرین پر جگمگانے والی ہیں۔ فلم کے ہدایات کار خود اداکار شان ہی ہیں۔ یہ فلم جذبۂ حب الوطنی کو اجاگر کرنے کے لیے بنائی جارہی ہے۔ (جذبہ حب الوطنی کو اجاگر کرتے کرتے کہیں یہ فلم اداکارہ صاحبہ کے شوق و جذبات کو نہ لے ڈوبے۔ کیونکہ ہمارے ہاں شادی شدہ اور بھاری بھرکم ہیروئنیں ذرا کم ہی کامیاب ہوتی ہیں۔ ویسے بھی اب ہر کوئی صائمہ تو نہیں ہوتا ناں! جو اپنے سے آدھی عمر کے ہیرو کے ساتھ بھی ہٹ ہو جاتی ہیں۔ شاید اس کی وجہ شاہ جی کا آشیرباد بھی ہے۔ مگر صاحبہ بھی اداکار شان کے آشیرباد پر واپس آرہی ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ شاہ جی کا آشیرباد زیادہ کامیاب ہے یا شان کا۔)



الٹا چور......

اداکارہ مہ جبیں شوبز سے اچھے خاصے عرصے سے وابستہ ہیں۔ تاہم وہ اب تک کوئی بڑی کامیابی حاصل نہیں کر سکی ہیں۔ یہاں تک کہ اکثر لوگ ان کے نام تک سے واقف نہیں ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے معروف نجی چینل کی مقبول ڈراما سیریل "پیاسی" میں ان کا کردار سیکنڈ ہیروئین کا تھا۔ اس ڈرامے میں کام کرنے والی مونا لیزا آج بالی وڈ تک جا پہنچی ہیں۔ مگر مہ جبیں کو اپنے ملک تک میں کوئی نہیں جانتا اور وہ ابھی تک

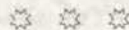
پیاسی ہی ہیں۔

یہ سال بھر پہلے کی بات ہے کہ اداکارہ مہ جبیں کو ایک معروف چینل سے ایک ٹیلی فلم کی پیش کش ہوئی۔ مہ جبیں نے بڑے اداکاروں کی طرح کہانی اور اپنے کردار کے بارے میں پوچھا۔ خیر! انہیں تمام تفصیلات سے آگاہ کر دیا گیا۔ ان کا کردار نہایت اہم تھا۔ تاہم پھر بھی مہ جبیں نے سوچنے کے لیے کچھ وقت مانگا۔ انہیں یہ وقت بھی فراہم کر دیا گیا۔ مطلوبہ مہلت کے بعد مہ جبیں نے کام کرنے کا ارادہ ظاہر کیا اور معاوضے کی بابت پوچھا۔ انہیں معاوضہ بتایا گیا تو مہ جبیں نے اس کا دگنا معاوضہ طلب کیا۔ پروڈیوسر کے پاس اتنا بجٹ نہیں تھا۔ (بجٹ ہوتا تو وہ کسی اے کلاس اداکارہ سے رجوع کرتے ناں!) چنانچہ مہ جبیں نے کام کرنے سے انکار کر دیا۔ پروڈیوسر نے دوسری اداکارہ لے کر فلم تیار کرلی۔

کچھ عرصے بعد ایک تقریب میں مہ جبیں کی مذکورہ پروڈیوسر سے ملاقات ہوئی۔ انہیں دیکھتے ہی مہ جبیں ان پر برس پڑیں اور کہا کہ۔

''آپ نے مجھ سے ٹائم لیا تھا۔ میں دو دن تک انتظار کرتی رہی۔ مگر آپ نے کوئی رابطہ نہ کیا۔ میں نے کسی اور کو بھی تاریخیں نہیں دی تھیں۔ میرا ٹائم ضائع ہوا۔''

پروڈیوسر صاحب ہکا بکا رہ گئے۔ انہوں نے لاکھ وضاحتیں کیں۔ تاہم مہ جبیں اپنے بیان سے ٹس سے مس نہ ہوئیں۔ (اب وہ سیاست دان تو تھیں نہیں کہ بیان دیتے ہی اس سے مکر جاتیں) یہی نہیں بلکہ مہ جبیں نے تقریب میں موجود ہر شخص کے پاس جا جا کر ان پروڈیوسر صاحب کی شکایت کی۔ (اوہو! یہ واویلا تو ان ہی جیسا ہے۔۔۔ یعنی پروڈیوسر صاحب ''کچھ دو'' کے اصول پر عمل کرتے تو وہ بیان سے مکر بھی سکتی تھیں۔)



کچھ ادھر ادھر سے

ہیوگو شاویز نے نائن الیون کے بعد امریکا اور جارج بش کو شیطان فاشسٹ اور درندہ کہنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اسرائیل کا بھی بہت بڑا مخالف بن گیا تھا۔ اس نے عراق' ایران اور شمالی کوریا کی اس وقت حمایت کی' جب یہ ملک خود اپنے حقوق کی بات کرتے ہوئے ڈرتے تھے۔ شاویز نے سلامتی کونسل میں کھڑے ہو کر بش کو شیطان' بزدل' قاتل' نسل کش' نشے باز' جھوٹا' منافق' نفسیاتی مریض اور دنیا کا بد ترین شخص کہا۔

(جاوید چودھری۔۔۔ زیرو پوائنٹ)

ریمنڈ ڈیوس نے پاکستان میں دو لوگ قتل کر دیے تو ہیلری کلنٹن سے لے کر صدر اوباما تک پوری امریکی حکومت اس کی سفارشی بن گئی۔ لیکن جب اس نے امریکی سرزمین پر امریکی شہری کو دو مکے اور تین لاتیں ماریں تو وائٹ ہاؤس' وزارت دفاع اور وزارت خارجہ کا کوئی کلرک تک اس کی مدد کے لیے نہیں آیا اور جیل اس کا مقدر بن گئی۔

(جاوید چودھری۔۔۔ زیرو پوائنٹ)

○ عباس ٹاؤن کی سو نعشیں اور گڑھی خدا بخش میں محترمہ بے نظیر بھٹو کا سرخ لہو کہہ رہے ہیں کہ ملک میں جب انصاف نہ ہو تو عباس ٹاؤن کی نعشوں کو انصاف ملتا ہے اور نہ بے نظیر بھٹو کو۔ تمام مرنے والے مٹی کی ڈھیری ہوتے ہیں۔

(جاوید چودھری۔۔۔ زیرو پوائنٹ)

○ یوں لگتا ہے کہ یہ کسی حکومت سے زیادہ کسی روایتی مافیا فلم کی کوئی کہانی ہے۔ جہاں خوب عیاشی کے بعد ڈرامے کے آخری حصے میں تمام کردار اپنے اپنے حصوں پر جھگڑے کے بعد ایک دوسرے کو مارنا شروع کر دیتے ہیں۔ کوئی پولیس کا مخبر بن جاتا ہے۔ کوئی اکیلا سب کچھ سمیٹ کر فرار ہوتا مارا جاتا ہے اور آخر میں ڈان اکیلا مقابلہ کرتا' منطقی انجام سے دوچار ہوا کرتا ہے۔ (ڈاکٹر شاہد مسعود۔۔۔ میرے مطابق)

شعاع کے ساتھ

ادارہ

ثانیہ مشعل...... چوہلی لکھا، تحصیل دیپالپور، ضلع اوکاڑہ

ابھی پچھلے دنوں ہی جب ہم نے فرخ سے کہا ہماری کوئی ایک خامی اور خوبی بتاؤ۔ ہم نے بھی "شعاع کے ساتھ ساتھ" میں شرکت کرنی ہے۔ تو اس نے کہا۔

"وہ تو میں بتا دیتی ہوں مگر "شعاع کے ساتھ ساتھ" سلسلہ لگتا ہے، بند ہو گیا ہے۔ میں نے کب سے جواب بھجوائے ہوئے ہیں، وہ شائع نہیں ہوئے۔"

مگر جناب کل رسالہ ہاتھ میں آتے ہی فرخ فاطمہ کا نام دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی (مبارک ہو فرخ) تو جناب! اب ہم نے بھی تھام لیا قلم۔

1 اگر شعاع سے وابستگی کے عرصے کے بارے میں سوچیں تو ذہن کے پردے پر ایک آٹھ، دس سالہ بچی کی شبیہہ لہراتی ہے۔ دو چوٹیاں آگے کی طرف ڈالے انہماک سے رسالہ پڑھ رہی ہے۔ جو کردار کو روتے دیکھ کر خود بھی رونے لگ جاتی ہے اور ہنستی مسکراتی تحریریں پڑھ کر اس کے بے ساختہ قہقہے نکل رہے ہیں۔ پانچویں کلاس میں دو رسالے میڈم خالدہ نے پھاڑ کر پھینک دیے مگر اس لڑکی کے شوق میں پھر بھی کمی نہ ہوئی۔ پہلے تو ہم رسالہ چھپ کر پڑھتے تھے مگر آٹھویں کلاس سے ہم نے ڈنکے کی چوٹ پر رسالے پڑھنے شروع کر دیے ہیں۔ عمر (بھائی) نے کئی دفعہ دھمکی دی ہے کہ میں سارے رسالے ابو کے پاس لے جا کے رکھ دوں گا۔ مگر کیا ایسا کبھی نہیں (ہونہہ)

چند ماہ پہلے جب ہمیں پتا نہیں تھا کہ شعاع میں "خط" کیسے اور کون سے لفافے میں بھجواتے ہیں۔ کسی سے پوچھے بغیر ہم نے خط لکھا، خاکی لفافے میں ڈالا، پتا وغیرہ لکھ کر پوسٹ کروا دیا۔ جب رسالہ آیا تو ہمیں بہت دکھ ہوا کہ ہمارا خط تو شائع ہی نہیں ہوا اور پھر فرخ کے آنے پر جب ہم نے اسے بتایا (منہ بنا کے) تو اس نے پوچھا "اس لفافے پر ٹکٹیں لگائی تھیں۔"

ہمارا سر مشرق مغرب گھوما تو فرخ نے چھت پھاڑ قسم کا قہقہہ لگایا اور جب قہقہوں کا یہ طوفان تھما تو ہم نے بہت ناراضی سے (اس پاگل پن) کی وجہ پوچھی اور پھر اس کے بتانے پر پتا چلا کہ غلطی ہماری ہے تو ہم نے (دل ہی دل) میں اپنے بے وقوفی پر زوردار قہقہہ لگایا۔ (ہاہا)

2 میٹرک کے پیپرز کے بعد ان دنوں ہم پریکٹیکلز نوٹ بکس تیار کرنے میں مصروف ہیں۔ مگر پھر بھی صبح نماز اور تلاوت قرآن سے فارغ ہو کر اگر لائٹ ہو تو یانی سب بہن بھائیوں کے یونیفارم استری کرتے ہیں۔ پھر جلدی سے صحن صاف کر کے امی کو آٹا گوندھ کے دیتے ہیں۔ سب کو اسکول اور کام پہ بھیج کر ہم اور امی ناشتا کرتے ہیں۔ اس کے بعد کمرے اور برآمدے کو صاف کر کے پوچا لگاتے ہیں۔ برتن امی کے کھاتے میں ڈال کے نوٹ بک نکال کر اس پہ طبع آزمائی کرنے کے بعد جب ظہر کی نماز سے فارغ ہوتے ہیں تو سبزی بناتے ہیں ساتھ ساتھ بہن، بھائیوں کو ہوم ورک کروانا ہوتا ہے۔ اس کے بعد آٹا گوندھ کر عصر کی نماز پڑھتے ہیں پھر عصر سے مغرب کے دوران ہم کوئی پرانا رسالہ پڑھتے ہیں۔ نہیں تو آج کل انگلش میں شاعری کا بھوت سر پہ سوار ہے سو شاعری کرتے ہیں۔ اس طرح رات ہو جاتی ہے سب کے بستر صحن میں لگا کے بقول امی کے "الٹے سیدھے سجدے" کرتے ہیں اور پھر سو جاتے ہیں۔

اب اس کے دوران شعاع کے لیے کیسے ٹائم نکلتا ہے؟ تو جناب ہمارے پیارے، آنکھوں کے تارے، راج دلارے شعاع کے لیے ٹائم ہی ٹائم ہوتا ہے۔ کھانا کھاتے ہوئے ہم زمین پہ پیڑھی پہ شعاع۔ سبزی بناتے ہوئے پاس شعاع، کھانا بناتے ہوئے ہمارے پاس شعاع اور اگر نیا آجائے تو پھر بات ہی کیا ہے۔ سارا شیڈول ایک طرف اور ہم اور شعاع ایک طرف۔ ساتھ میں "کوئی ڈسٹرب نہ کرے" کا آرڈر چونکہ پڑھنے کی رفتار ماشاء اللہ بچپن سے ہی بہت تیز ہے سو رسالہ آدھے دن میں ہی پڑھ لیتے ہیں۔

3 بہت ساری تحریریں ہیں، جو کبھی نہیں بھولیں ان میں ماہا ملک کی "ریگ زار تمنا" اور "بات لمحے بھر کی تھی" "راحت جبیں کی "زرد موسم" چاندی کی کٹوری" نمرہ احمد "قراقرم کا تاج محل" عمیرہ احمد کی "پیر کامل" اسماء قادری کی "وقت کے فیصلے" کنیز نبوی کی "تشنگی کا سفر" فرحت اشتیاق کی تحریر "دل سے نکلے ہیں جو لفظ" ایسی تحریریں ہیں، جو کبھی بھی بھلائی نہیں جا سکتیں۔

4 پہلے خامیاں بتاتے ہیں۔

غصہ بے تحاشا آتا ہے مگر ناجائز بات پر۔ ضدی بھی ہیں۔ تھوڑے چھپے رستم بھی ہیں (دل کی بات کسی کو نہیں بتاتے)۔ انا بہت ہے، اسی لیے کبھی کبھی نہ چاہتے ہوئے بھی کچھ غلط ہو جاتا ہے۔ تھوڑے بے وقوف ہیں اسی لیے اکثر اپنے ہی ہمیں بڑے گھاٹے دیتے ہیں۔ تھوڑے کمزور ہیں کوئی ذرا سی بات کر دے تو بے تحاشا رونا آتا ہے۔ جذباتی کہہ سکتے ہیں۔

اب خوبیاں بتاتے ہیں۔

فرخ کہتی ہے "ثانیہ! تمہاری گفتگو میں سحر ہے۔ تمہارا الفاظ کا چناؤ اور انداز بیاں بہت دلکش ہوتا ہے۔"

مصباح خاں اور رابی کہتی ہیں "تمہاری آنکھیں بہت خوب صورت ہیں۔"

حفصہ کہتی ہے "تم جب روڈ پہ چلو تو ادھر ادھر نظریں دوڑانے کے بجائے سر جھکا کر نظریں نیچی کر کے چلتی ہو" (شکریہ سہیلیو!؟)

ہمارا اپنا خیال ہے کہ ہم بہت مخلص ہیں۔ ایک خوبی جو ہمیں خود کو بھی اچھی لگتی ہے وہ یہ۔ ہے کہ "دل میں بغض رکھ کر کسی سے مسکرا کر قہقہے لگا کے باتیں نہیں کر سکتے۔"

تعریفی جملہ :

ایک دفعہ 8th کے بورڈ کے پیپرز تھے، ہوم اکنامکس کا پیپر تھا۔ اس میں ایک سوال ایسا آگیا تھا جو کسی کو بھی نہیں آتا تھا (پورے کمرے میں سے) تو ایک ٹیچر خالدہ اکرم جن سے میں نے پہلے بھی پڑھا تھا (نگراں تھیں) ہماری طرف آئیں۔ ہم سر جھکا کر پیپر کرنے میں مصروف تھے انہوں نے کہا۔

"ثانیہ! تمہیں بھی نہیں آتا؟"

ہم نے کہا۔ "جی ٹیچر جی! مجھے آتا ہے۔"

تو ان کی آنکھیں چمک اٹھیں اور بے ساختہ مسکراہٹ کے ساتھ بولیں "مجھے پہلے ہی پتا تھا تمہیں آتا ہو گا۔" تو ان کا یہ جملہ سن کر مسکراہٹ میرے لبوں پر بھی دوڑ گئی۔ پھر جناب ہم نے خود بھی کیا وہ سوال اور باقیوں کو بھی کروایا۔

5 یہ واقعہ ہمارے ساتھ تو نہیں البتہ ہماری چچی جان کے ساتھ پیش آیا ہے۔ برسات کا موسم تھا بارش خوب برسی تھی۔ اندھیرا ہو رہا تھا وہ کسی کام کے لیے احاطے میں جا رہی تھیں کہ ایک دم پاؤں پھسلا اور محترمہ گریں سیدھی گدھے کی "کمر" پہ۔ گدھے صاحب اس اچانک افتاد پر بوکھلا کر اٹھے اور بگٹٹ بھاگے۔ وہ ابھی تک کمر پہ ہی تھیں۔ یہاں تک کہ وہ کمر سے گر گئیں اور پھر اسی وقت انہوں نے ہمارے گھر آکر ہمیں سارا قصہ سنایا۔ گو دیکھا نہیں تھا مگر انداز بیاں اس قدر دلچسپ تھا کہ امی کی گھوریوں کے باوجود ہم قہقہہ ضبط نہ کر سکے (ہاہاہا) آج بھی یہ یاد لبوں پہ مسکراہٹ بکھیر دیتی ہے۔

نمرہ احمد کے ناول "مصحف" سے اقتباس۔

"ہم انگریزی کو تو خوب برٹش اور امریکن لہجے میں بولنے کی کوشش کرتے ہیں اور قرآن، جس کو عربی لب و لہجے میں پڑھنے کا حکم ہے۔ جس میں زبر اور زیر کو اصل سے زائد کھینچنا بھی حرام درجے کی غلطی شمار ہوتا ہے۔ اس کے سیکھنے کو اہمیت ہی نہیں دیتے۔"



موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

دیگی پلاؤ

اجزا :

چاول	ایک کلو
چکن	ایک کلو
پیاز	دو عدد
دہی	آدھا کپ
لہسن اورک پیسٹ	دو کھانے کے چمچے
ثابت گرم مسالا	دو کھانے کے چمچے
سفید مرچ	ایک چائے کا چمچہ
بادیان کے پھول	پانچ عدد
نمک	حسبِ ذائقہ
تیل	حسبِ ضرورت

ترکیب :

گوشت میں سونف، ثابت دھنیا، لہسن اورک پیسٹ، الائچی، بادیان کے پھول اور دیگر مسالا مع تین کپ پانی ڈال کر یخنی بنانے کے لیے چڑھا دیں۔ گوشت گل جائے تو چھان کر گوشت الگ کرلیں اور یخنی الگ۔ دوسری پتیلی میں پیاز براؤن کر کے نکال لیں۔ اسی تیل میں تھوڑا سا ثابت گرم مسالا اور لہسن ادرک پیسٹ ڈال کر فرائی کریں۔ یخنی ڈالیں۔ ایک ابال آجائے تو چاول ڈال دیں۔ ایک کنی رہ جائے اور پانی خشک ہوجائے تو دم پر رکھ دیں۔ پیش کرتے وقت اوپر براؤن پیاز ڈال دیں۔ رائتے اور سلاد کے ساتھ پیش کریں۔

بالٹی قیمہ

اجزا :

قیمہ	ایک کلو
پیاز	دو عدد
دار چینی	ایک چھوٹا ٹکڑا
ٹماٹر	دو عدد

بڑی الائچی	تین عدد
ثابت کالی مرچیں	ایک چائے کا چمچہ
زیرہ	آدھا چائے کا چمچہ
ادرک لہسن پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
پسی سرخ مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
ہری مرچ	تین عدد
دہی	ایک پیالی
لیموں کا رس	دو کھانے کے چمچے
نمک	حسبِ ذائقہ
تیل	حسبِ ضرورت

تیل گرم کر کے پیاز سنہری کرلیں۔ اس میں ٹماٹر شامل کر کے بھونیں۔ پھر دار چینی، الائچی، کالی مرچ، زیرہ، لہسن پیسٹ، لال مرچ اور نمک ملا کر پانچ منٹ تک پکائیں۔ پھر قیمہ شامل کر کے بھونیں۔ اب دہی ملا کر قیمہ گلنے تک پکائیں اور تیز آنچ پر پانی خشک کرلیں۔ لیموں کا رس ملا کر ڈش میں نکال لیں۔ مزے دار بالٹی قیمہ بڑی بڑی مرچوں سے سجا کر پیش کریں۔

کھچڑا

اجزا :

گوشت	ایک کلو
چاول	آدھی پیالی
گیہوں	ڈیڑھ پیالی
چار دالیں	آدھی آدھی پیالی
لہسن اورک پیسٹ	دو کھانے کے چمچے
پسا گرم مسالا	ایک کھانے کا چمچہ
سرخ پسی مرچ	ایک چائے کا چمچہ
ہلدی	آدھا چائے کا چمچہ
بھنا سفید زیرہ	دو کھانے کے چمچے
پیاز	تین عدد
ہرا مسالا	حسبِ ضرورت
نمک	حسبِ ذائقہ
تیل	حسبِ ضرورت

گیہوں نیم گرم پانی سے دھو کر ایک گھنٹے کے لیے بھگو دیں پھر نیا پانی ڈال کر ہلکی آنچ پر گلنے کے لیے رکھ دیں۔ دو کھانے کے چمچے تیل بھی ڈال دیں۔ جب لیس آنے لگے تو چٹکی بھر میٹھا سوڈا ڈال دیں اور اچھی طرح گل جانے کے بعد اتار لیں۔ ساری دالیں (مونگ، مسور، ماش، چنا) دھو کر ایک ساتھ بھگو دیں۔ آدھے گھنٹے بعد چولہے پر رکھ دیں۔ گل جائے تو باریک پیس لیں۔ چاول الگ بہت نرم ابال لیں۔ بڑی دیگچی میں گھی گرم کر کے گوشت کو سارے مسالوں کے ساتھ ڈال کر گلا لیں۔ گوشت گل جائے اور پانی خشک ہوجائے تو تھوڑا سا بھون کر گیہوں ڈال کر پانی ڈال دیں اور مزید پکنے کے لیے رکھ دیں۔ لکڑی کا چمچہ استعمال کریں۔ جب گوشت اور گیہوں خوب گل جائیں تو دالیں اور چاول بھی مکس کرلیں۔ دیگچی کو توے پر رکھ دیں۔ گاڑھا لگے تو مزید پانی ڈال کر ہلکی آنچ پر چمچہ چلاتے ہوئے پکائیں۔ پیاز کاٹ کر بگھار دیں۔ بھنا زیرہ اور تمام ہرا مسالا کتر کر اوپر ڈالیں۔ براؤن پیاز بھی چھڑک دیں۔ مزے دار کھچڑا تیار ہے۔ گرم گرم پیش کریں۔

چاول کا رائتہ

دہی	ایک کپ
چینی	ایک کھانے کے چمچہ
ابلے چاول	ایک کپ
پسی سرخ مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
رائی	ایک چٹکی
کڑی پتا	چھ پتے
نمک	حسبِ ذائقہ
تیل	دو کھانے کے چمچے

دہی کو بڑے پیالے میں پھینٹ لیں پھر چینی، چاول اور نمک ڈال کر فریج میں ٹھنڈا ہونے کے لیے رکھ دیں۔ فرائنگ پان میں تیل گرم کر کے رائی، کڑی پتا اور مرچ ڈال کر کڑکڑائیں اور دہی کے اوپر ڈال دیں۔ چاول کا رائتہ کسی بھی ڈش کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے۔



ادارہ

خوبصورتی کے راز

خوبصورت بال شخصیت کے حسن کو نکھار دیتے ہیں۔ خاص طور پر خواتین کی شخصیت کی کشش بالوں کی خوبصورتی کے بنا ادھوری رہتی ہے۔ خشک اور بے رونق بال شخصیت کے حسن کو ماند کر دیتے ہیں۔ بالوں کو مضبوط، صحت مند اور چمک دار بنانے کے لیے متوازن غذا استعمال کرنا چاہیے۔ بالوں میں خشکی اور سکری کا پیدا ہونا خواتین کا سب سے اہم مسئلہ ہے۔ اس سے بال خشک اور بے رونق ہو جاتے ہیں۔ ذیل میں چند نسخے دیے جا رہے ہیں۔ جن کی مدد سے بالوں میں خشکی اور سکری پر خاصی حد تک قابو پایا جا سکتا ہے۔

☆ سر میں روزانہ روغن بادام کا مساج کریں۔ اس سے خشکی اور سکری ختم ہو جاتی ہے۔

☆ دہی میں ایک انڈا اور روغن بادام ملا کر سر میں لگائیں۔ بیس منٹ بعد سر دھولیں۔

☆ بال دھونے کے لیے صابن کا استعمال ہرگز نہ کریں۔ شیمپو بھی کم سے کم استعمال کریں۔ بال دھونے کے لیے ریٹھا، آملہ اور سکاکائی استعمال کریں یا پھر دو انڈوں کی زردی ایک کپ گرم پانی میں پھینٹ لیں۔ اسے سر میں اچھی طرح لگائیں۔ دس منٹ بعد سادہ پانی سے سر دھولیں۔ اس عمل کے بعد شیمپو استعمال کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔

☆ زیتون کے تیل میں برابر مقدار میں شہد ملا کر ایک دن کے لیے رکھ دیں۔ اگلے دن اسے بالوں کی جڑوں میں اچھی طرح لگائیں۔ پندرہ منٹ بعد بال دھولیں۔ بال نرم ملائم اور چمک دار ہو جائیں گے۔

☆ ایک عدد انڈے کی سفیدی میں ایک کھانے کا چمچہ سرسوں کا تیل شامل کر کے اچھی طرح پھینٹ لیں اور پورے سر پر لگائیں۔ ایک گھنٹے بعد شیمپو کر لیں۔

☆ آدھی بالٹی پانی میں دو کھانے کے چمچے سرکہ ملائیں اور شیمپو کرنے کے بعد اس پانی سے بالوں کو دھوئیں۔ بالوں کے لیے بہترین مونسچرائز ہے۔ اس سے بالوں میں چمک بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

☆ ایک مٹھی روزمیری کے پتے، ایک لیٹر پانی میں ابال لیں اور رات بھر کے لیے رکھ دیں۔ صبح اسے چھان کر دو چائے کے چمچے سرکہ شامل کریں اور شیمپو کے بعد بالوں کو اس پانی سے دھولیں۔ بہت جلد خشکی سے نجات حاصل ہو جائے گی۔

شیمپو کرنے کے بعد بالوں کے سروں پر کنڈیشنر لگائیں اور رات کو سونے سے پہلے بالوں کو ہلکے ہاتھ سے روزانہ سو بار برش کریں۔ اس سے سر کی جلد کا دوران خون تیز ہو گا۔ نیز بالوں کو باقاعدگی سے تراشتے بھی رہیں۔ اس سے دو شاخہ بال ختم ہوتے ہیں اور بال بڑھتے ہیں۔

☆